

The background of the cover is a romantic night scene. It features a calm lake reflecting the ambient light. Lush green trees with yellow flowers frame the scene. Two ornate, glowing lanterns hang from above, casting a warm light. The overall mood is serene and romantic.

# اکرم محبت ہے

صائمہ اکرم چوہدری

## مجھے کچھ کہنا ہے

کہانیاں پڑھنا اور اُن کے کرداروں کے ساتھ ساتھ جاگتی آنکھوں خواب بُنا، میں نے کب شروع کیا..... میرے ذہن کی آخری سرحدوں پر بھی وہ سال، وہ لمحے محفوظ نہیں۔ مجھے بس اتنا یاد ہے کہ میں نے جب اُردو پڑھنا سیکھا تو بہت بچپن میں ہی کہانیوں اور افسانوں سے رشتہ استوار ہو گیا۔ مجھے کہانی بُنا اور انہیں تحریر کرنا کبھی بھی مشکل نہیں لگا۔ اس لئے کہ ایک اچھی کہانی پانی کی طرح اپنا راستہ خود بناتی ہے۔ مطالعے کی وسعت، مشاہدے کی طاقت، سوچنے والا ذہن، حساس دل کے ساتھ اگر مالک کائنات نے قلم و قرطاس کو برتنے کا ہنر بھی دے رکھا ہو تو ایسے لوگ ایک منظر سے پوری کہانی تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ تخلیق کی صلاحیت اللہ کچھ خاص لوگوں کے سپرد کرتا ہے۔ اور الحمد للہ میرا شمار بھی ان چند لوگوں میں ہوتا ہے جن کے لکھے ہوئے الفاظ کو ”زیادہ“ نہ سہی ”کچھ“ لوگ سراہتے ضرور ہیں۔ میں نے زندگی میں ایک کام بے دریغ اور کثرت سے کیا ہے، وہ ہے ”مطالعہ“ اور ”سفر“۔ میری بے چین طبیعت مجھے ہمیشہ کچھ کرنے یا لکھنے پر اُکساتی ہے۔ صادق آباد کی مصروف زندگی، کراچی کی ہاپیل، اسلام آباد کی پُر سکون خاموشی، ایبٹ آباد کی خوبصورتی اور کھاریاں کینٹ کی تنہائیوں نے بھی میرا قلم کے ساتھ رشتہ استوار رکھا۔

”اک رسم محبت ہے“ میری کچھ پسندیدہ کہانیوں کا ایسا مجموعہ ہے جن کو میں کتابی صورت میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کرنا چاہتی تھی۔ اپنے بہت سے ناؤلٹ میں نے کھاریاں پوسٹنگ کے دوران لکھے۔ جہاں ایف جی کالج کھاریاں کینٹ کے ہوٹل کی خاموشی اور اُداسی نے میرا کتاب اور قلم کے ساتھ رشتہ مزید جوڑ دیا۔ وہاں میں نے ابرنیساں کا لباس اوڑھے گلابی اور کاسنی موسموں کے سارے زاویے بھی خزاں میں لپٹے دیکھے۔ ایسا لگا کہ زندگی سوکھے ہوئے پتوں کا بے رونق جزیرہ ہے۔ پھر وقت نے انگریزی لی اور میرے ساتھ ساتھ موسمِ گل بھی حیران رہ گیا کہ اس کے دامن میں اتنے گلاب تھے۔ کھاریاں کینٹ میں گزارے آٹھ مہینوں نے میرے اوپر زندگی کے اور کئی درواکے۔

اس کتاب میں شامل شدہ تحریریں میری زندگی کے مختلف ادوار کی مختلف ”یادیں“ ہیں۔ ہر کہانی کا ایک پس منظر ہے۔ یہ ہمارے ہی معاشرے کی کہانیاں ہیں۔ اس کے کردار ہمارے

ساتھ ہی اسی فضا میں سانس لیتے ہیں۔ ان کے کردار ماورائی یا تصوراتی نہیں ہیں۔ یہ زندگی کی راہوں پر قدم قدم ہم سے نکراتے ہیں۔ ان میں سے کچھ کردار ایسے ہیں جن سے ہم نفرت کرتے ہیں اور ان جیسا بننے سے کتراتے ہیں۔ ان میں کچھ کردار ایسے بھی ہیں جو خلوص اور محبت کی مٹی سے گندھے ہوتے ہیں۔ وہ ہمیں جینے کا قرینہ سیکھاتے ہیں۔ جن سے مل کر زندگی سے محبت ہونے لگتی ہے۔ الحمد للہ میری زندگی میں ایسے بے شمار لوگ ہیں۔

جس طرح زندگی کے کیڑوں پر ہمیں ہر رنگ ملتا ہے، اسی طرح آپ کو میری کہانیوں میں اس سانچ کے مختلف رنگ ملیں گے۔ اس میں محبت کی رعنائیاں بھی ہوں گی اور نفرتوں کی خزاں بھی۔ زندگی اور سچائی سے بھرپور حقیقت بھی ہوں گے اور تلخ حقیقتوں کی سسکیاں بھی۔ وصل کی دلکش صبح بھی اور جدائیوں کی شام بھی۔ منزلوں کے سراغ کی لگن بھی اور خواہشوں کی قتل گاہ بھی۔ ہر وہ رنگ جس کو آپ کی نظر پاسکے۔ میرا دعویٰ ہے کہ دیدہ دینا ہو تو کوئی چیز پنہاں نہیں رہ سکتی۔

مجھے اس کتاب کے توسط سے عابدہ بیجو، فریحہ خان، صبا احتشام، فرزانه جاوید، شازیہ حسن، سعدیہ یاسر، کرن اور انتہائی محترم فاطمہ زاہدؒ کا شکریہ ادا کرنا ہے جو میری کہانیوں کی مداح بھی ہیں اور سب سے بڑی نقاد بھی۔ مجھے اپنے شریک حیات ڈاکٹر شبیر صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے جن کی میڈیکل کی بے پناہ مصروفیات مجھے قلم اور کاغذ کے ساتھ جوڑے رکھتی ہے۔ میں اپنی پیاری رائٹرز دوستوں آمنہ ریاض، تنزیلہ ریاض اور فرحانہ ناز ملک کی بھی مشکور ہوں جو مجھے اکثر لکھنے پر اکساتی ہیں۔ مجھے خصوصاً تنزیلہ ریاض کا شکریہ ادا کرنا ہے جن کے منفرد طرز تحریر کی میں سب سے بڑی ”فین“ ہوں۔ ان کے اپنے لیے لکھے گئے چند الفاظ میرے لیے قیمتی سرمایہ ہیں۔ مجھے اپنے کالج کی شعبہ اردو کی ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ میڈم شہزادی اور میڈم ڈاکٹر منیہ عباد سے انتہائی احترام سے اس کتاب کے توسط سے کہنا ہے کہ ”میڈم! مجھے ابھی آپ سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔“ سب سے آخر میں ادارہ القریش پبلی کیشنز کے بھائی محمد علی قریشی کی تعریف نہ کرنا سخت زیادتی ہوگی، جن کا خلوص، بہت سی لکھاری بہنوں کو ان کے ادارے کے ساتھ جڑا رہنے پر مجبور کرتا ہے اور بہت کم پبلشرز اپنی رائٹرز کو اتنی اہمیت دیتے ہیں، جتنا یہ ادارہ دیتا ہے۔ میری پہلی کتاب ”بند مٹی میں سلگتی ریت“ بھی اسی ادارے کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ اپنی اس کتاب کے بارے میں آپ کی آراء کی منتظر رہوں گی۔

صائمہ اکرم چوہدری

## بساط دل

میرے گمان کی آخری سرحدوں پر بھی کہیں نہیں تھا کہ دسمبر کی اس ٹھنھرتی رات کو سرد ہواؤں اور بارش سے بچنے کیلئے جب میں اپنی برائچ کے مین آفس کے جی ایم دانش وقار کے خوبصورت بنگلے ”محبت کدہ“ میں داخل ہوں گا تو زندگی مجھے اس طرح سے حیران کر دے گی۔ ایک فارن ڈیلی کیشن سے میٹنگ کے بعد جب ہم میریٹ ہوٹل سے باہر نکلے تو دسمبر کی سرد ہواؤں نے ہمارا استقبال کیا۔ ہوٹل کے گرم ماحول سے نکلنے اور گاڑی میں بیٹھنے تک کے مختصر عرصے میں ٹھنھرتی ہواؤں اور ہلکی بارش نے ہمارا خاصا برا حال کر دیا تھا۔ پھر بارش کی تیزی میں بھی ایک دم اضافہ ہوا تھا۔ دانش صاحب جو میری درخواست پر مجھے چکالہ ایئر پورٹ ہاؤسنگ سوسائٹی تک ڈراپ کرنے جا رہے تھے۔ انہوں نے اچانک گاڑی اپنے گھر کے راستوں کی طرف موڑ دی۔ وائٹ گیٹ سے پورچ تک کی روش کو عبور کرتے ہوئے کوئی احساس میرے اندر نہیں جاگا، لیکن دانش صاحب کی دھیمی مسکراہٹ اور نرم لہجے میں آج رات اپنے گھر رکنے کی درخواست کو میں ہرگز نہیں ٹال سکا۔ موسم کی سنگینی کا مجھے بخوبی احساس ہو گیا تھا۔

اسلام آباد کے چار روزہ قیام کے دوران اپنی فرم کے مین آفس برائچ کے جی ایم دانش وقار کی یہ آفر مجھے ہکا بکا کر دینے کیلئے کافی تھی، کیونکہ وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ میں انتہائی کم گورنر اور انتہائی محدود حلقہ احباب کے حامل شہرت کے مالک تھے۔ ان کا دو ٹوک انداز اور شخصیت کا وقار مد مقابل کو اپنی حدوں میں رہ دینے پر مجبور کر دیتا تھا۔ حالانکہ اسی فرم کی کراچی والی برائچ میں ایک پورا ڈیپارٹمنٹ میرے اندر تھا۔ میں اسلام آباد کے چار روزہ قیام میں اپنا بیشتر وقت ان کے ساتھ گزارنے کے باوجود ان سے بے تکلف ہونے کی جرأت نہیں کر سکا۔ حالانکہ میری شخصیت کی نمایاں خوبی میری خوش اخلاقی اور بہترین انداز گفتگو تھی اور اس بات کا

اعتراف تو میرے ایم ڈی بھی کرتے تھے۔

وائٹ اور بلیک ٹائلوں کے فرش پر چلنے اور ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر بیٹھنے تک کے عرصے میں مجھے گھر کے کینوں کی نفاست اور ذوق کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔ وائٹ اور گرے کلر سکیم کے ساتھ ڈیکوریٹ ڈرائنگ روم مجھے نہ جانے کیوں چونکا گیا۔ ایک مانوس سا جملہ میری یادداشتوں کی سماعت سے ابھرا۔

”تم کبھی میرا گھر دیکھنا؟ ڈرائنگ روم وائٹ اور گرے بیڈ روم پنک اور گیٹ روم گرین کلر سکیم میں ہوگا۔“ اور میں نے شرارت بھرے لہجے میں اسے چڑایا۔

”کیوں کسی سنگمر سے شادی کا ارادہ ہے؟ کیونکہ تمہارا من پسند گھر تو وہی بنوا کر دے سکتا ہے جتنے اپنے تمہارے ارادے ہیں۔“

”جی نہیں! میں اللہ سے دعا کروں گی کہ وہ ایک غریب بندے کی لائری نکال دے۔ کیونکہ وہ گھر تو اسی نے بنانا ہے۔“ اس کا معنی خیر لہجہ میرے اندر تک طمانیت کا احساس جگا گیا تھا۔ وہ بہت غلط ٹائم پر مجھے یاد آئی تھی۔ اک بیٹھا سا درد اچانک نمودار ہوا تھا۔ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر میں نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔ اسی لمحے دانش صاحب کسی ملازم کے ساتھ اندر داخل ہوئے تو میں فوراً سنبھل کر بیٹھ گیا اور شاید اس بات کو انہوں نے بھی محسوس کیا تھا، تبھی بلکے پھلکے انداز میں گویا ہوئے۔

”جینٹل مین! آپ آفس میں نہیں ہیں! اس لئے ایزی ہو کر بیٹھیں۔“ اور پھر ملازم کی طرف متوجہ ہو کر بولے۔ ”رشید! آپ صاحب سے پوچھ کر چائے بنائیں! میں ذرا ایزی ہو کر آتا ہوں۔“ ان کے کمرے سے نکلنے ہی میں اپنی سابقہ پوزیشن میں بیٹھ گیا۔

ڈرائنگ روم کی سیٹنگ میں کارپٹ اور پردوں سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے ڈیکوریٹیشن پیرس میں بھی نفاست کا رنگ جھلک رہا تھا اور دیوار پر لگی واحد پینٹنگ میں نیلگوں سمندر اور بیک گراؤنڈ میں اڑتے سفید بادل بہت خوشگوار تاثر چھوڑ رہے تھے۔ اسی وقت جب میں ہر چیز کا جائزہ لینے میں لگن تھا مجھے کسی کی نظروں کا حصار محسوس ہوا۔ ڈرائنگ روم کے ساتھ بنے ڈائنگ اور ان دونوں کو علیحدہ کرنے کیلئے لگائے گئے نفیس اور مہین سے پردے کے پیچھے چھپی سرخ و سفید رنگت والی ساڑھے تین سالہ بچی بڑی پرشوق مگر جھپنی مسکراہٹ کے ساتھ میرا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ مجھے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ اب کھل کر مسکرائی۔

”مے آئی کم ان سر.....!“

”ییس!“ میں نے بڑی خوش دلی سے جواب دیا تو وہ ذرا ہلکا اعتماد طریقے سے اندر داخل ہوئی۔ پنک ٹائٹ گاؤن میں پنک ہی سلیر پہنے بالوں کی پونی بنائے اپنی براؤن آنکھوں کی ٹپٹپاتی، نازک سی ناک اور گلابی لبوں والی گڑیا بالکل ایک باربی ڈول لگ رہی تھی۔

”آپ پاپا کے فرینڈ ہیں؟“ میرے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے اب وہ مکمل کونفیڈنٹ تھی اور مسکراتے ہوئے اس کے گالوں پر پڑنے والے ڈمپل اس کی معصومیت میں اضافہ کر رہے تھے۔

”جی ہاں! میں آپ کے پاپا کا ہی نہیں بلکہ آپ کا بھی دوست ہوں۔“ میرے پر جوش انداز پر وہ سنجیدگی سے بولی۔

”نو! میری مام کہتی ہیں کہ گرلز کی صرف گرلز ہی فرینڈز ہوتی ہیں اور آپ تو بوائے ہیں نا! اس لئے میں آپ سے فرینڈ شپ نہیں کر سکتی۔“ اس کے بات کرنے کے انداز، سٹائل اور خصوصاً مجھے سمجھانے کیلئے انگلی اٹھا کر سنجیدگی سے تنبیہی انداز نے مجھے ایک خوشگوار حیرت میں مبتلا کر دیا۔ میری سارے دن کی تھکن ایک منٹ میں ختم ہو گئی۔

”ائس! اوکے! آپ میری فرینڈ مت بنیں! میں بن جاتا ہوں۔“ میں نے درمیانی راستہ اختیار کیا۔ وہ میرے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے کچھ سوچ کر بولی۔

”ائس! گین۔ اوکے..... لیکن آپ دوبارہ مجھے ایسا مت کہیے گا! البتہ میں آپ کو پاپا کے آنے تک کمپنی دے سکتی ہوں۔“ اس کے سٹائل پر مجھے ایک دم ہنسی آ گئی اور یہ یقیناً اسے بری لگی تھی۔ ”انکل آپ میرے ساتھ جوک (مذاق) کر رہے ہیں؟“ اس کی شفاف آنکھوں میں غصے کی لہر تھی۔

”اوہ! نو! مائی ڈیر! آپ تو ماشاء اللہ بہت کیوٹ اور جینیئس ہیں۔ کیا نام ہے آپ کا؟“ میرے تعریفی جملوں نے اس کا موڈ شاید بہتر کر دیا تھا تبھی مسکراتے ہوئے بولی۔

”مسکان دانش!“

”اوہ! گڈ نیم..... اور کس کلاس میں ہیں؟“

”پلے گروپ!“

”اور سکول؟“

”بیکن ہاؤس!“ وہ سنجیدگی سے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔

”مکان آپ کے گھر میں کون کون رہتا ہے؟“ میں نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے یونہی پوچھا۔ وہ بڑوں کے سائل میں بولی تو میرے لئے اپنی مسکراہٹ کو چھپاتا دھواں ہو گیا۔

”ویسے تو میری مام منع کرتی ہیں کہ اجنبی لوگوں کو گھر کے سیکرٹ نہیں بتاتے، لیکن چونکہ آپ بچہ کے فرینڈ ہیں اس لئے بتا دیتی ہوں کہ ہمارے گھر میں مام، پاپا، اسید، میں اور میری لعل سسٹر مومنہ دانش رہتے ہیں اور ہماری ”کیٹ“ بھی..... اور پھر کچھ چپ رہ کر بولی۔“ اور پتا ہے ہمارے گھر میں بڑی کٹر فل ”اسپیرو“ (چڑیا) بھی ہیں۔“

”اچھا؟“ میں نے حیرانی کا اظہار کیا۔

”انگل آپ پیزا بھی لیں ناں، میری مام بہت ٹیسٹی بناتی ہیں۔“ اسے مہمان نوازی کا خیال آیا تو فوراً سنجیدگی سے بولی۔ میں نے فوراً اسے آفر کی۔

”آپ بھی لونٹاں.....“ وہ فکر مندی سے لبریز لہجے میں گویا ہوئی۔

”نو میں برش کر چکی ہوں، مام کہتی ہیں اچھے بچے رات کو برش کرنے کے بعد کچھ نہیں کھاتے۔“

”آپ کی مام بالکل ٹھیک کہتی ہیں۔“ میری تصحیح پر وہ بے ساختہ مسکرائی۔

”لیکن اسید بہت شرارتی ہے، وہ مام کے کہنے کے باوجود کبھی کبھی چھپ کر رات کو چاکلیٹ کھا لیتا ہے اور پھر مام اسے رات کو سوتے ہوئے کوئی سنوری بھی نہیں سناتیں۔ حالانکہ مام اسے اکثر کہتی ہیں کہ مکان آپ سے چھوٹی ہے، لیکن میری ہر بات مانتی ہے، لیکن وہ پتا نہیں کیوں ایسے کرتا ہے جبکہ میں اسے کہتی ہوں کہ مام تو نہیں لیکن اللہ میاں تو دیکھ رہا ہے ناں اور انگل اچھے بچے جھوٹ تو نہیں بولتے ناں؟“ اس کے سوالیہ انداز پر میں نے بے ساختہ اسے پیار کیا تو وہ بری طرح جھینپ گئی۔

”ارے یہ یہاں ہے اور ان کی مام نے پورا گھر چھان مارا ہے۔ بری بات مکان بیٹے آپ انگل کو تنگ کر رہے ہو؟“ فراؤزر اور ٹی شرٹ میں دانش صاحب ابھی ابھی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تھے۔ بالکل گھریلو حلیے میں بھی ان کی شاندار پرسنالٹی تھی۔ ان کے اس فقرے پر مکان نے ٹھیک ٹھاک احتجاج کیا۔ تبھی وہ انتہائی خراب موڈ میں بولی۔

”لیکن پاپا میں تو انگل کو تنگ نہیں کر رہی تھی بلکہ کہنی دے رہی تھی۔“

”اوہ سوری مائی لعل ڈول (گڑیا)“ دانش صاحب گھٹنوں کے بل بیٹھ کر انتہائی محبت سے لبریز لہجے میں اپنی بیٹی سے مخاطب تھے۔

”آپ انگل سے پوچھ سکتے ہیں۔“ اس کا غصہ ابھی بھی کم نہیں ہوا تھا۔

”نو نو مجھے اپنی بیٹی پر اعتماد ہے۔“ انہوں نے اس کے ماتھے پر پیار کیا۔

”تھینک یو پاپا۔“ اس کا موڈ ایک منٹ میں بحال ہو گیا، جبکہ میں بڑی خوشگوار حیرت سے باپ بیٹی کے لاڈ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اب باپ کی گود میں گھس کر بیٹھ چکی تھی۔

”صدیقی صاحب یہ میری بہت کیوٹ اور بہت زیادہ لاڈلی بیٹی مکان ہے۔“ دانش

صاحب کے تعارف کروانے پر وہ کھل کر مسکرائی۔

”پاپا، مام کہہ رہی ہیں کہ مکان کو فوراً بیڈ روم میں بھیجیں، رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔“

مام کا موڈ سخت آف ہو رہا ہے۔ ”پانچ سال کا شرارتی سا بچہ اندر داخل ہوا، اس کے مین نقش مکان سے خاصے ملتے جلتے تھے۔“

”اسید آپ نے انگل کو سلام نہیں کیا۔“ دانش صاحب کے ٹوکے پر وہ جھل ہوا اور انگل

ہی لمحے وہ میرے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے تعارف کروا رہا تھا۔

”آئی ایم اسید.....“ وہ بھی مکان کی طرح سرخ و سپید، لیکن جسامت میں خاصا

سارٹ تھا۔ بلیک شرٹ میں اس کی رنگت دنگ رہی تھی۔

”انگل! اسید بھی بیکن ہاؤس میں کلاس دن کا سٹوڈنٹ ہے۔“ مکان نے مزید

تعارف کروایا تو دانش صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ آفس سے مختلف حلیے اور

بڑے مہربان اور شفیق سی شخصیت کے حامل نظر آ رہے تھے۔

”صدیقی صاحب! یہ گھر میری جنت ہے چھوٹی سی۔“ دانش صاحب کے منہ سے نکلنے

والا یہ جملہ میرے لئے غیر متوقع تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اپنی کوئی فیملنگو میرے

ساتھ شیئر کریں گے۔

”سر اللہ تعالیٰ آپ کی اس جنت کو ہمیشہ سلامت رکھے۔ آپ کی شخصیت بہت حیران

کن ہے۔“ میں زیادہ دیر تک اپنی حیرت نہیں چھپا سکا۔ وہ آنکھوں میں تحیر سیٹے میری طرف

متوجہ تھے، تبھی میں نے وضاحت کی۔ اصل میں سر آپ اپنے پروفیشنل معاملات میں جس

طرح دو ٹوک اور حتمی انداز لئے ہوتے ہیں میرا خیال تھا کہ اپنی ذاتی زندگی میں بھی ایسے ہی

ہوں گے۔ حالانکہ آپ عمر میں مجھ سے چار پانچ سال ہی بڑے ہوں گے، لیکن آپ اپنے ہم عمر لوگوں کو بھی ایک حد میں رہ کر مخاطب کرتے ہیں اور یوں لگتا ہے کہ کوئی پچاس ساٹھ سال کا میچور سا باندہ ہم سے مخمومتگو ہے۔“ میرے کمٹنس پر وہ بے ساختہ تہقہہ لگا کر ہنسے تو ایک لمحے کو تو میں بھی جھینپ سا گیا۔

”اوه نو ڈیر! اصل میں میری عادت ہی ایسی ہے کہ میں جلدی کسی سے کھل مل نہیں سکتا اور پروفیشنل لائف کی دوستیوں کا میں قائل نہیں جو صرف مفادات پر مبنی ہوتی ہیں۔ میرا حلقہ احباب بہت محدود لوگوں پر مشتمل ہے اور ان کے درمیان میں خوب بولتا ہوں، انجوائے کرتا ہوں، میں اپنی پروفیشنل اور پرسنل لائف کو بالکل علیحدہ علیحدہ رکھتا ہوں اور الحمد للہ مجھے کبھی کوئی مسئلہ بھی نہیں ہوا۔“

”امیزنگ!“ میں واقعی دل کھول کر حیران ہوا۔

”اور پتا ہے اس گھر ”محبت کدہ“ کے کچھ اصول اور قاعدے ہیں جو اس گھر میں داخل ہوتے ہی ہم سب فیملی ممبرز پر لاگو ہو جاتے ہیں۔“

”مثلاً؟“ مجھے تعجب ہوا۔

”مثلاً یہ کہ گھر میں داخل ہوتے ہی میں اپنا موبائل آف کر دیتا ہوں۔ کوئی بہت ایمر جنسی ہو تو میرے آفس والے گھر کے پی ٹی سی ایل نمبر پر کال کر سکتے ہیں۔ وہ بھی بہت اہم کام کے سلسلے میں اور پھر گھر میں داخل ہوتے ہی میرا سارا وقت اپنی مسز اور بچوں کیلئے ہوتا ہے۔ ہم دونوں میاں بیوی بچوں کا ہوم ورک خود کرواتے ہیں، ان کے پرائمر سنٹے ہیں، ان کے ساتھ کھیلتے ہیں اور پھر پورے دو گھنٹے ہم دونوں میاں بیوی کے ہوتے ہیں، جن میں کبھی ہم لاگ ڈرائیو پر نکل جاتے ہیں یا کبھی کوئی مووی دیکھ لیتے ہیں یا کوئی ڈسکشن کر لیتے ہیں اور اس دوران ہمارے بچے بھی ہمیں ڈسٹرب نہیں کرتے۔“ میں سخت حیرانی سے ان کی طرف متوجہ تھا جو بڑے ہلکے پھلکے انداز میں مجھ سے مخاطب تھے۔

”اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ پچھلے سات سالوں کی میری ازدواجی زندگی میں ایسے لمحات نہیں، جن کو سوچتے وقت میرے دل کے کسی خانے سے کوئی کسک یا تلخ لہر نمودار ہوتی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ہر چیز دی ہے۔ بہت سمجھ دار مسز ہیں، تین پیارے پیارے بچے ہیں..... اور ہر چیز ہے۔“ دانش صاحب کا آسودہ لہجہ اور طمانیت سے بھرپور چہرہ ان کے ایک ایک لفظ کی

تصدیق کر رہا تھا۔ وہ اب بہت محبت سے اپنے بچوں کی طرف متوجہ تھے۔

”بیٹا! اب آپ دونوں خاموشی سے اپنے بیڈروم میں لیٹ جائیں، مومنہ کو نمبر پچھڑے ہاں اس لئے ماما کچھ اپ سیٹ ہیں۔ شاباش.....“

”لیکن پیادہ سنڈریلا والی سنوری.....“ مسکان نے افسردگی سے یاد دلایا۔

”وہ آج آپ کو پپا سنا میں گئے، لیکن بیٹا آج چھٹی نہیں ہو سکتی؟“ دانش صاحب نے کان کھجاتے ہوئے کچھ محتاط انداز میں پوچھا۔

”اٹس اوکے پپا.....“ اسید پیٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑا ہوا اور پھر بہن کی طرف متوجہ ہوا۔ ”سنڈریلا والی سنوری مجھے آتی ہے وہ میں آپ کو سنا دوں گا۔ آپ دیکھ نہیں رہیں پپا نے اپنے فرینڈ کو کبھی ٹائم دیتا ہے۔“ اسید کے انداز بیان پر میں نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ مسکان نے بے اختیار اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا۔

”سوری! میں بھول گئی تھی۔“ پھر اگلے لمحے وہ فوراً کھڑی ہوئی اور دانش صاحب کے گلے لگ کر پر جوش انداز میں بولی ”گڈ نائٹ پپا.....!“

”گڈ نائٹ جانو!“ دانش صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”گڈ نائٹ انگل.....“ وہ جاتے جاتے پلٹی اور مجھ سے مخاطب ہوئی تو میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

”جی صدیقی صاحب بتائیں اگر بھوک لگی ہو تو میں کھانا لگوادیتا ہوں۔“ وہ اب میری طرف متوجہ ہوئے۔

”نوسر ڈنر آپ کے ساتھ ہی تو کیا تھا۔“ میرے یاد دلانے پر وہ دھیرے سے ہنسے۔

”نہیں یار ڈنر اگر باہر ہو تو میں بس کارروائی ہی ڈالتا ہوں۔ اصل میں کھانا ہمیشہ میں رات کو اپنی مسز کے ساتھ ہی کھاتا ہوں۔ شروع سے ہی روٹین ہے، بچے جلد کھا لیتے ہیں اور میں اس لئے چیخ کر کے لیٹ آیا ہوں کہ اندر کھانا کھا کے آیا ہوں۔ اس معاملے میں میری مسز بالکل کپروماز نہیں کرتی۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ مجھے بھی وہ بچوں کی طرح ہی ٹریٹ کرتی ہے۔“ ان کی آخری بات پر میں بے ساختہ ہنس پڑا۔

”سر! آپ سے ایک بات پوچھوں اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو.....“ میرے جھپکنے پر وہ فوراً بولے۔

”بالکل سچے ہم گھر آئے مہمانوں کی باتوں کو مانتے نہیں کرتے۔“ ان کے دوستانہ انداز پر میں نے کچھ سنبھل کر پوچھا۔

”سر آپ کی لومیرج ہے؟“

”بہت خوب!“ دانش صاحب کے قہقہے پر میں ایک دم سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ان کی بے تکلفی نے مجھے دنگ کر دیا تھا اور پھر وہ بڑے ہموار لہجے میں گویا ہوئے۔

”صدیقی صاحب! اس میں آپ کا قصور نہیں ہے، بہت سارے لوگ مجھ سے یہی بات کرتے ہیں۔ میں قدرے خشک مزاج اور لئے دیئے انداز رکھنے والا بندہ ہوں، لیکن اس شادی میں میری اور میرے والدین کی بھی پسند شامل ہے۔ میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ میری مدر کا انتقال دو سال قبل ہی ہوا ہے جبکہ فادر کے انتقال کو پانچ سال ہو گئے ہیں، لیکن میری سز میرے والدین کی انتہائی لاڈلی بہو تھیں اور ویسے بھی.....“ وہ ذرا سنبھل کر بولے ”بات ساری انڈر شیڈنگ کی ہوتی ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو لومیرج بھی ناکام ہو جاتی ہے اور اربنچ بھی اور اس سے بھی بڑھ کر بات کہ یہ قسمتوں کے سودے ہیں۔“ وہ اپنی بات کے اختتام پر دھیمے سے انداز میں مسکرائے اور پھر مجھ سے استفار کیا ”اور آپ کے کتنے بچے ہیں صدیقی صاحب؟“ میں نے تعجب سے انہیں دیکھا جو مسلسل مجھے حیران کر رہے تھے۔

”ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے سر!“ میں نے سادگی سے بتایا۔

”بچے بھی اللہ تعالیٰ کا ایک خوبصورت تحفہ ہوتے ہیں۔“ انہوں نے ایک گہری سانس بھر کے بڑے مطمئن انداز میں کہا تو میں نے بھی تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ ایک دم ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا۔ کوئی تیزی سے اندر داخل ہوا۔ میں نے چونک کر اندر آنے والی شخصیت کو دیکھا۔ مجھے ایک دم شاک لگا۔ وہ بھی بری طرح خشکی تھی۔ اس کے چہرے پر بے یقینی اور حیرانی نمایاں تھی۔ میں جو ریلیکس انداز میں صوفے پر برجمان تھا، ایک دم تناؤ کی سی کیفیت میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میرا دماغ جھنجھٹا اٹھا تھا اور شدید تحیر کے عالم میں، میں نے اسے دیکھا۔

وہ بلاشبہ شاکل ہی تھی۔ پانچ فٹ تین انچ قد، انتہائی متناسب سراپا، دلکش نقوش البتہ بال جو شانوں تک اسٹیپ کنگ میں تھے اب طوالت میں کمر کو چھو رہے تھے۔ گزشتہ سات سالوں نے اس میں کوئی فرق نہیں ڈالا تھا۔ وہ ایک دم سنبھلی..... اور دانش صاحب کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کی پریشان سی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔

”دانش! مومن کا ٹمبر بچر بڑھتا جا رہا ہے۔ میری ڈاکٹر رشید سے بات ہوئی ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ بھابی مناسب ہوگا کہ آپ بچی کو کلینک پر لے آئیں۔“ اس نے مکمل طور پر مجھے اگنور کرتے ہوئے کہا۔

”اوہ ڈونٹ وری! میں دیکھتا ہوں اسے اور رشید سے خود بات کرتا ہوں۔“ دانش صاحب نے دھیمے لہجے میں تسلی دی اور پھر میری طرف متوجہ ہوئے۔

”سوری صدیقی صاحب! آپ کو میں روم دکھا دیتا ہوں! آپ آرام کریں ہم ذرا مومنہ کو دکھا کر آتے ہیں۔“ ان کا لہجہ ان کی پریشانی کا غماز تھا۔

”حوصلہ کریں دانش صاحب! آپ پریشان مت ہوں انشاء اللہ اللہ بہتر کرے گا۔“ میں نے عادت کے مطابق تسلی دی۔ وہ جاتے جاتے پلٹے۔

”اوہ سوری! میں تعارف نہیں کروا پایا۔ شاکل یہ ہماری فرم کے کراچی میں انچارج ہیں۔ بہت ایکٹو اور سختی بندے ہیں اور صدیق صاحب یہ میری اکلوتی سز ہیں اور اس گھر کو ”محبت کدہ“ بنانے میں سیونی پرسنٹ ان کا کمال ہے۔ انشاء اللہ صبح ناشتے پر آپ سے مزید تعارف کروائیں گے۔“ میں بمشکل مسکرایا۔ وہ اب بہت مطمئن اور پرسکون انداز میں کھڑی تھی۔

”جی ضرور.....“ میرا دل جانتا تھا میں نے یہ الفاظ کیسے ادا کئے نہ جانے اندر کیسی اتھل پتھل ہو رہی تھی اور پھر دانش صاحب کی رہنمائی میں گیسٹ روم میں داخل ہوتے ہوئے مجھے یقین تھا کہ اس کمرے کی ٹکسٹیم گرین ٹکری ہوگی اور واقعی ایسا تھا۔ میرا وجود ابھی بھی شاک کی کیفیت میں تھا۔ میں کافی دیر تک کمرے میں گھوم پھر کر دیکھتا رہا۔ ایک دم کمرے میں ٹھنک کا احساس بھر گیا۔ میں نے فوراً اٹھ کر پردے کھڑکیوں سے ہٹائے اور نہ جانے کیا سوچ کر ٹیرس پر چلا آیا۔ فضا میں خشکی کا عنصر بڑھ چکا تھا، لیکن سرد ہواؤں نے میرے وجود پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ اچانک میری نظر پورچ کی طرف جاتے دانش صاحب اور شاکل پر پڑی۔ دانش صاحب نے ایک بازو میں ننھے سے وجود کو کمرے میں لپیٹا ہوا تھا اور دوسرے بازو سے شاکل کے وجود کو گھیرے میں لئے وہ بڑے مطمئن انداز میں گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں فوراً کمرے کی طرف پلٹ آیا۔



ایک احساس زیاں تھا جو آہستہ آہستہ میرے وجود کا احاطہ کر رہا تھا۔ ایک نارسائی کی



آگ تھی جو مجھے اندر تک جلا رہی تھی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی مانوس خوشبو کا بھید کھل گیا تھا۔ میری اور شائل کی دوستی کا آغاز کب ہوا یہ میں نہیں جانتا۔ شاید اس وقت جب ہم نارٹھ ناظم آباد میں شفٹ ہوئے۔ وہ مجھ سے تین سال جو نیئر تھی۔ صرف دو بہنیں ہونے کی وجہ سے اس کا دل ہمارے گھر کے شور شرابے میں بہت لگتا تھا، تبھی وہ اپنے گھر میں کم اور پڑوس میں ہمارے گھر میں زیادہ پائی جاتی اور میں جو شوخ مزاج اور کچھ دل پھینک قسم کی طبیعت کا حامل تھا مجھے گندی رنگت دیکھتے ہوئے گال ستواں ناک اور جھالر جیسی پلکیں رکھنے والی دہلی پتلی سی یہ لڑکی پہلی ہی نظر میں اچھی لگی۔ حالانکہ اس وقت وہ چودہ سال کی اور میں سترہ سال کا تھا۔ پانچ بھائی اور دو بہنوں کے درمیان میں آنے کی وجہ سے گھر میں میری اہمیت ثانوی سی تھی۔ ایسے میں شائل کا ہر کام کیلئے بھاگ کر میرے پاس آنا میری طمانیت کا باعث بنتا تھا۔

اس دن وہ اپنے گھر میں کسی کام میں مصروف تھی۔ سبزیوں کا ڈھیر سامنے رکھے وہ اور منائل آپنی خاصی الجھی ہوئی تھیں۔ میری طرف دیکھتے ہی منائل آپنی شرارتا بولیں۔ ”شیطان کا نام لو اور شیطان حاضر!“ منائل آپنی کی بلند آواز پر میں نے بے اختیار اپنا سر کھجایا جبکہ وہ صرف مسکراتی رہی۔

”لوگ اکیلے ہی اکیلے بیٹھے مسکرا رہے ہیں خیر ہے ناں؟“ شائل نے ایک گہرا سانس لے کر کندھے جھٹکے۔

”کیوں کوئی جواب نہیں آ رہا۔“ میں نے پھر اسے چھیڑا۔

”دنیا میں کوئی ایسا آدمی نہیں ہے عادل صدیقی جو تمہیں چپ کروا سکے۔“ منائل آپنی نے دانت کچکا کر کہا۔

”الحمد للہ کوئی ایسا نہیں۔“ میرا اطمینان قابل دید تھا۔

”تم واقعی ڈھیٹ ہو۔“

”قسم سے آپنی آپ کے گھر میں آ کر معلوم ہوتا ہے کہ سکون اور خاموشی کس بلا کا نام ہے ورنہ ہمارے ہاں تو چڑیا گھر کا سا ساں ہے۔ جواد بھائی کے تین بچے فواد بھائی کے دو بچے پھر شعیب بھائی اس کے بعد زینر اباجی پھر سمیرا آپنی پھر میں اور اس کے بعد ہارون۔“

”اور دادو کو کیوں بھول گئے؟“ منائل آپنی نے یاد دلایا۔

”ہاں..... یار وہ تو ذہن سے نکل گئیں۔ حالانکہ وہ جتنی توپ چیز ہیں نکلی تو نہیں

چاہئیں۔“

”شرم کرو تمہاری بزرگ ہیں خیر سے میٹرک کے سٹوڈنٹ ہو مگر بات کرنے کی تمیز نہیں۔“ منائل آپنی نے مجھے گھورا۔

”سوری آپنی!“ میں نے بڑی تابعداری کے ساتھ کہا۔

مجھے نہ جانے کیوں اس کے گھر جانا ہمیشہ سے اچھا لگتا تھا۔ وہ صرف دو بہنیں تھیں، انکل اور آنٹی تھے۔ ان کے چھوٹے سے صاف ستھرے گھر میں خاموشی اور سکون کی سی کیفیت رہتی۔ منائل آپنی میری سمیرا آپنی کے ساتھ یونیورسٹی میں بی اے آنرز کی سٹوڈنٹ تھیں۔ جبکہ ہمارے اپنے گھر میں جواد بھائی اور فواد بھائی تو شادی شدہ تھے اور اپنی اپنی جائز میں مگن۔ زینر اباجی ماسٹرز کرنے کے بعد کسی اچھے رشتے کی منتظر شعیب بھائی ایم بی اے اور میں میٹرک اور ہارون آٹھویں کلاس میں تھا۔ سچتے اور بھتیجیوں کی وجہ سے ہمارے گھر میں خوب شور اور ہنگامہ رہتا اور اوپر سے دادو اور امی خاصی سوشل واقع ہوئی تھیں جس کی وجہ سے ہمارا گھر ایک چوراہے کا منظر پیش کرتا تھا جبکہ شائل کا گھر اس کے بالکل برعکس تھا۔ اس کی والدہ خاموش کم گو اور زیادہ تر اپنے کام سے کام رکھنے والی خاتون تھیں، لیکن میری والدہ خصوصاً دادو کے ساتھ ان کی خوب بنتی تھی، جبکہ شائل کے والد اپنے آرن سنور میں اور کاروباری مسائل میں الجھے ہوئے بندے تھے، لیکن بہت حلیم اور خوش گفتار طبیعت کے حامل۔

شائل کا کوئی بھی کام ہو تاتیا منائل آپنی نے کہیں جانا ہوتا تو اس کیلئے ہمیشہ میری یا شعیب کی خدمات حاصل کی جاتیں۔ منائل آپنی شوخ و چنچل اور چلبلی سی طبیعت کی حامل جبکہ شائل اس کے برعکس دھیمے سے مزاج کی تھی اور مجھے اپنے کارنامے سنانے کیلئے ایک اچھے سامع کی ہمیشہ ضرورت رہتی اور وہ اس کے عین مطابق تھی۔ اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولے حیرانی سے وہ جب میری باتیں سنتی تو اس کا یہ انداز مجھے بہت بھاتا اور مزید حیران کن تاثر دیکھنے کیلئے میں مبالغہ آرائی کی حدیں عبور کرتا جاتا، جبکہ وہ آرام سے میری باتوں پر یقین کرتی جاتی۔ ایسے لمحات میں اگر منائل آپنی یا سمیرا آپنی آ جاتیں تو میری طبیعت خاصے اچھے طریقے سے صاف کر کے جاتیں۔

رات کے کھانے کے بعد اس کی اور منائل آپنی کی عادت تھی چھت پر ٹہلنے کی اور ہماری طرف سے سمیرا آپنی بھی آ جاتیں تو مجھے اپنے کارنامے سنانے کیلئے خاصا ٹائم مل جاتا۔ دونوں



آپیاں ہمیں لفٹ کروائے بغیر اپنی باتوں میں مگن جبکہ ہماری اپنی ایک دنیا تھی۔ چونکہ دونوں گھروں میں چھتیس ملی ہوئی تھیں۔ ایک چھوٹی سی منڈیر جسے ہم بالکل خاطر میں نہیں لاتے تھے اکثر اوقات اسے کود کر ادھر ادھر جانے کا سلسلہ بھی جاری رہتا اور اب تو میں نے آنٹی کو قاتل کر کے اس کا ایڈمیشن بھی اپنے سکول میں کروا لیا تھا، لیکن سکول میں میری دوستیوں کا دائرہ خاصا وسیع تھا۔ اس کے باوجود میں بریک میں ایک آدھ چکر اس کی کلاس کا ضرور لگا لیتا، جہاں وہ اپنے ہی جیسی بوز کم گو اور اکتائی ہوئی اپنی دوست کے ساتھ خاموشی سے بیٹھی ہوتی اور مجھے حیرت ہوتی تھی کہ وہ دونوں خاموش رہ رہ کر تھکتی نہیں ہیں۔ اس دن میں اس کے گھر آیا تو وہ حسب معمول خاموشی سے اپنا ہوم ورک کرنے میں مگن تھی۔ منال آپنی یقیناً یونیورسٹی سے نہیں لوٹی تھیں۔

”سنو تم ہمارے گھر مت آیا کرو۔“ میری پتی ہوئی آواز پر اس نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔ میرے غصے پر اس کا رنگ ایک دم سے نفی ہوا تھا۔

”کیوں؟ کیا ہوا؟“

”کمال ہے تمہیں ذرا بھی احساس نہیں ہوتا۔ تمہارے گھر میں داخل ہوتے ہی سب کو اپنے اپنے کام یاد آ جاتے ہیں، بھابیاں اپنے بچے تمہیں تھما کر خود شاپس کے ڈراموں میں مگن، دادو تمہارے ہاتھ میں تیل کی شیشی پکڑا کر اپنی زلفیں کھول کر بیٹھ جاتی ہیں اور تو اور امی کی رنگت کھل اٹھتی ہے تمہیں دیکھ کر چلو کوئی ان کا ہاتھ بٹانے والا تو آیا اور سب سے بڑھ کر تمہیں بھی ”مدر ٹریا“ بننے کا شوق ہے، محال ہے کسی کو منع کر دو۔“

”اور تمہاری بھی تو شرٹس استری کرتی ہوں اور کمرہ بھی صاف کر دیتی ہوں۔“ اس کے یاد دلانے پر مجھے تاؤ آ گیا۔

”ہاں ہاں میری دفعہ تو بڑی جلدی جتا دیا، ان کو بھی احساس دلایا کرو۔“

”عادل میرا مطلب یہ تو نہیں تھا، بس مجھ سے انکار نہیں ہوتا۔“ میرے تیور دیکھ کر وہ روہانسی ہو گئی۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے کسی کا بھی کام کرنے کی، سوائے میرے.....“ میری عجیب منطق پر اس نے حیران ہو کر مجھے دیکھا اور حسب عادت اثبات میں سر ہلا دیا اور اس کی فرمانبرداری ہی تو مجھے بھاتی تھی۔

”اچھا، اثنو اب شاباش ایک کپ چائے بنا کر لاؤ..... اور دیکھو اگر کوئی اچھی چیز بنی ہے تو کھانا بھی لے آنا۔“

”پھر مجھے میٹھ کی یہ مشق سمجھاؤ گے؟“ اس نے ڈرتے ڈرتے فرمائش کی۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں.....“ میں نے حاتم طائی کی قبر کولات ماری۔

ایسے ہی دن گزرتے جا رہے تھے اور اب تو ہم کالج لائف میں داخل ہو گئے تھے۔ وہ فرسٹ ایئر میں اور میں فورٹھ ایئر میں تھا، جب منال آپنی کی شادی لاہور میں ان کے فرسٹ کزن کے ساتھ طے پا گئی۔ ان کے گھر میں پہلی شادی تھی۔ آنٹی کے ہاتھ پیر پھولے ہوئے تھے۔ زینیرا باجی اور سمیرا آپنی نے تو ان کے گھر میں ہی ڈیرے ڈالے ہوئے تھے اور وہیں پہلی دفعہ مجھے اپنی والدہ کے مزاج کچھ بدلے بدلے محسوس ہوئے۔ حالانکہ شامل اور منال کے بغیر تو ان کا کھانا بھی ہضم نہیں ہوتا تھا، لیکن ان کے سلوک میں کچھ سرد مہری شامل ہو گئی تھی۔ اس دن میں شادی کے کارڈز لینے کیلئے پرنٹنگ پریس جا رہا تھا جب امی نے کڑوے لہجے میں مجھ سے دریافت کیا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ بایک صاف کرتے ہوئے میں نے مصروفیت میں جواب دیا۔

”منال آپنی کی شادی کے کارڈز لینے۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے، تم لوگوں نے ٹھیک لے رکھا ہے ہر کام کا، ملازم کا، ہوا ان کے۔ دنیا سے نرالی ہے میری اولاد وہ دونوں ہیں تو سارا دن اس کے جوڑے ٹانگنے میں مگن اور شعیب ہے تو وہ فرنچیز کے بھاؤ تاؤ پوچھ پوچھ کر آ رہا ہے اور تو اور وہ سب سے چھوٹا جسے گھر کے کام کرتے تکلیف ہوتی ہے وہ بھی کل بڑے بڑے شاپراٹھائے شاپنگ کروا کر داکے لا رہا تھا۔“ میں نے امی کے برہم مزاج کو حیرانی سے دیکھا۔

”کیا ہوا ہے امی؟“

”پتا نہیں لوگوں کی بیٹیوں کی قسمیں کیسے دھڑا دھڑکھل جاتی ہیں اور یہاں زینیرا کی عمر نکلتی جا رہی ہے اور کسی کو احساس نہیں، اللہ نے بہوئیں بھی جن کر بے حس دی ہیں۔ بڑی کو کہا کہ اپنے خاندان میں کوئی رشتہ دیکھو تو نکا سا جواب دے دیا کہ امی معاف کیجئے گا، زینیرا کی عمر تو نکل چکی ہے آپ اب سمیرا کی فکر کریں۔“

”تو اس میں منال آپنی کا کیا قصور؟“ میری حیرانی پر وہ تپ کر بولیں۔

”قصور کیوں نہیں ہے اس کی ماں سے میں نے کہا کہ اپنے بھانجے سے زنیہ کی بات چلاؤ تو اپنی بیٹی کا جھٹ سے رشتہ طے کر آئیں۔“

”لیکن امی منال آپ کی بات چیت تو بچپن سے طے ہے۔“ میں نے یاد دلایا۔  
 ”بات چیت ہی طے تھی کوئی نکاح تو نہیں ہوا تھا۔“ امی کی منطق پر میرا دماغ گھوم گیا۔  
 ”استغفر اللہ یہ کیا آپ فضول بات کر رہی ہیں۔“

”ہاں ہاں اب میری اولاد کو میری باتیں فضول ہی لگتی ہیں۔ چھوٹی بہو کا بھائی اچھا خاصا قابل تھا۔ باتوں باتوں میں احساس دلایا تو آگے سے میسنی بن کر بولی امی زنیہ اچھے بہت عزیز ہے لیکن اعجاز کو منال بہت پسند تھی لیکن آنٹی مانی نہیں۔ اس لئے اعجاز تو اب بہت اپ سیٹ ہے میں اس سے اس ٹاپک پر بات نہیں کر سکتی اور ویسے بھی زنیہ کی عمر اعجاز سے زیادہ ہے۔“

”ہاں تو ٹھیک کہا ہے انہوں نے اس میں غلط بات کون سی ہے؟“ میری وضاحت تو انہیں سلا گئی، تبھی تو وہ دوپٹہ منہ پر رکھ کر رونا شروع ہو گئیں۔

”ہاں اب یہ کل کی اولادیں ہمیں غلط اور درست کی تمیز سکھائیں گی۔ منال میں کون سے ہیرے لگے ہوئے ہیں جو زنیہ میں نہیں ہیں۔“

”آپ ماں کی نظر سے ہٹ کر دیکھیں اور ویسے بھی امی آپ مائنڈ مت کیجئے گا“ آپ نے اور ابو جی نے اپنی فضول بحث میں زنیہ اباجی کے اچھے خاصے پروپوزل رنجیکٹ کر دیئے۔ کوئی چیز ابو جی کو پسند نہیں آتی تھی تو کوئی آپ کو اور اگر دونوں پاس کر دیتے تھے تو جواد بھائی اور نواد بھائی کوئی نہ کوئی کیڑے نکال کر انکار کر دیتے اور ویسے بھی لڑکی کے رشتے آنے کی ایک عمر ہوتی ہے..... اور آپ بھی تو اپنے سینڈرڈ سے ایک انچ بھی ہلنے کو تیار نہیں تھیں۔ حالانکہ ہر چیز انسان کو خواہش کے مطابق نہیں ملتی، کہیں نہ کہیں کپڑا مانز کرنا پڑتا ہے اور اب بھی آپ کا یہی حال ہے۔“

”تو کیا کسی ایرے غیرے راہ چلتے کے ہاتھ میں بیٹی کا ہاتھ تھما دوں۔“ وہ رونا بھول کر اب اشتعال انگیز لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ میری زبان کھینچ لیتیں۔

”میں اپنی بہن کا دشمن نہیں ہوں۔“ میں نے موٹر سائیکل صاف کرنے والا میلا کپڑا کھینچ

کر محن میں پھینکا۔ ”لیکن مجھے اب ان پر ترس آتا ہے۔ ان کی عمر کی لڑکیاں تین تین بچوں کی مائیں بن چکی ہیں اور یہاں کسی کو احساس نہیں۔ جواد بھائی اور نواد بھائی اپنے اپنے خاندانوں میں مگن، ابو جی کی اپنی کاروباری مصروفیات ہیں اور کسی کو احساس نہیں کہ ان کی عمر نکلتی جا رہی ہے اور آپ کو اب جا کر ہوش آیا ہے اور اب سمیرا اباجی کے اچھے اچھے پروپوزل آپ زنیہ آپ کی وجہ سے رنجیکٹ کر رہی ہیں۔ ایک غلطی پہلے کی تھی اور دوسری اب کر رہی ہیں۔ میری بھولی ماں لڑکی کی عمر بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ اب تو شعیب بھائی کو بھی جاب کئے چار سال ہو رہے ہیں، کچھ ان کا بھی خیال کر لیں۔ زنیہ اباجی کیلئے بنایا ہوا سینڈرڈ کچھ کم کر دیں ان کی ذات پر آپ کا بہت بڑا احسان ہوگا۔“ میں نے باقاعدہ امی کے آگے ہاتھ جوڑے تو وہ تسخرانہ انداز میں بولیں۔

”ہاں تاکہ تمہاری باری بھی جلد آئے۔ تم جیسے بھائی ہوتے ہیں جو اپنی خود غرضی میں بہنوں کو بوجھ سمجھ کر اتار دیتے ہیں خواہ وہ ساری زندگی روتی رہیں۔“

امی کے تلخ جملوں نے میری قوت گویائی سلب کر لی۔ میرا چہرہ تپ گیا اور میں ہونٹ چباتے ہوئے لمحہ بھر کو چپ رہ گیا۔ غصے میں بائیک پر بیٹھ کر میں نے زوردار کلک ماری۔ وہ ایک لمحے کو شارٹ ہوئی اور پھر بند ہو گئی۔ میں غصے سے نیچے اترا۔ امی اب دوپٹہ منہ پر رکھ کر خاموشی سے محن میں پڑی چارپائی پر لیٹ چکی تھیں۔ میں چلتے چلتے ان کے پاس رکا۔

”امی جان بے فکر رہیے میں کم از کم اپنے معاملے کیلئے آپ کو ہرگز نہیں کہوں گا اور آپ بے شک زنیہ اباجی اور سمیرا آپ کی شادی اگلے دس سالوں میں بھی مت کریں، لیکن یاد رکھیے گا کہ بڑے ہمیشہ درست فیصلے نہیں کرتے، کبھی کبھی اللہ تعالیٰ چھوٹوں کو بھی دورانہی اور معاملہ فہمی کی صلاحیت زیادہ دے دیتا ہے۔ لیکن اگر کچھ درست فیصلے درست موقعوں پر نہ ہوں تو ساری زندگی کیلئے ناسور بن جاتے ہیں اور بعض اوقات والدین کی غلطیوں کا خمیازہ اولاد کو بھگتنا پڑتا ہے اور میری دعا ہے کہ اللہ ہم پر رحم کرے۔“

میں غصے سے گھر سے نکلا اور نہ جانے کیوں میرے قدم ٹائفل کے گیٹ پر آ کر رک گئے۔ سامنے محن میں میری دادو آنٹی کے ساتھ تخت پر بیٹھی موسم سرما کی نرم دھوپ سینکنے میں مگن تھیں۔ برآمدے کے پار سامنے والے کمرے کے کھلے دروازے سے کارپٹ پر بیٹھی زنیہ اباجی بڑی خاموشی سے منال کے پیلے سوٹ پر گونا گونا لگانے میں مگن تھیں۔ میرا نہ جانے

نہیں۔  
”بس بیٹا! ماؤں کو سمجھدار ہونا چاہئے۔“ دادو کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ گئی تھیں۔

”جی اماں! یہ شامل کے والد ہیں! اب اٹھتے بیٹھتے ان کو اس کی فکر ہوگئی ہے۔ کہتے ہیں کہ بچیاں اپنے گھروں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ ایک دو سالوں میں شامل سے بھی فارغ ہو کر جھیلے چلیں گے۔“

”اب ہائے شامل کی ابھی عمر ہی کیا ہے؟“ دادو کو تعجب ہوا۔ میں بھی بے اختیار اٹھ بیٹھا تھا۔

”اماں! لڑکی کی عمر نکلتے میں کہاں دیر لگتی ہے اور اچھے رشتوں کی بھی مناسب عمر ہوتی ہے۔ میں تو کہتی ہوں کل عالم کی بیٹیاں اپنے گھر کو جائیں۔“ آنٹی کی بات پر میری زبان پھسلی۔

”پھر آنٹی! لوگوں کے گھروں میں تو صرف لڑکے ہی رہ جائیں گے۔“  
”کیوں بچے! ان کی شادیاں نہیں ہوں گی کیا؟“ دادو نے انگلی ناک پر رکھ کر تعجب کا اظہار کیا تو مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

کچھ دن کے بعد منال! آپنی کی شادی کے پروگرام شروع ہو گئے اور امی کا موڈ بھی کافی بہتر ہو گیا تھا۔ اس دن مہندی کی وجہ سے گھر میں مہمانوں کا خوب رش تھا۔ گھر کی چھت پر سٹیج کی ارتجھٹ کر کے میں نیچے اتر رہا تھا جب ڈھولکی کی آواز نے گھر میں ساں باندھ دیا اور میں تیزی سے نیچے اتر رہا تھا کہ اچانک مرجٹا کھر کے تنگ پا جامے اور کرتے میں جس پر نفیس گوٹے کا کام کیا ہوا تھا! فریج ٹاٹ باندھ کر ہلکے ہلکے میک اپ اور جیولری میں تیزی سے اوپر آتی شامل کو دیکھ کر میں بری طرح ٹھکا۔ گوری گوری ہتھیلیاں مہندی کے سرخ رنگ کے خوبصورت نقش و نگار سے نظر لگ جانے کی حد تک پیاری لگ رہی تھیں۔ سڈول کلائیوں میں ڈھیر ساری کالج کی چوڑیاں تھیں۔

”واؤ.....“ میرا لہجہ یقیناً معنی خیز تھا تبھی وہ ایک دم بلش ہو گئی۔ ”ویسے یار تمہیں ان ہتھیاروں سے لیس ہونے کی کیا ضرورت تھی۔“  
”فضول مت بولیں۔“

کیوں دل بھرا آیا۔ ان کے پاس ہی شامل دوپٹے پر ستارے ٹانگنے میں مصروف جبکہ منال اور سمیرا! آپنی کچن میں کسی بحث میں الجھی ہوئی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان کے بلند قہقہے پورے گھر میں گونجنے لگتے۔ مجھے آتا دیکھ کر دادو غصے سے بڑبڑائیں۔

”چلو تمہاری سرورہ گئی تھی۔ اپنے گھر میں جو باقی لوگ ہیں ان کو بھی بلالینا تھا۔ پتا نہیں کیوں میرے پوتے پوتیوں کا دل اپنے گھر میں نہیں لگتا۔“

”جانے دیں اماں! ان کے دم سے تو میرے گھر میں رونق ہے۔“ آنٹی نے میری حمایت کی جبکہ میں خاموشی سے ان کے پاس تخت پر آ کر لیٹ گیا۔ میرا کچھ بھی بولنے کو دل نہیں کر رہا تھا۔

”سچ اماں! ان بچوں نے تو میری ساری فکر ہی ختم کر دی ہے۔ ورنہ میرے تو ہاتھ پیر ہی پھولے ہوئے تھے۔ شاید میرے سگے بیٹے بھی ہوتے تو اتنی ذمہ داری سے کام نہ کرتے جتنی لگن سے عادل! شعیب اور ہارون کر رہے ہیں۔“

”تو احسان تھوڑی کر رہے ہیں منال! بہن نہیں ہے ان کی۔“ دادو کم ہی کسی کا احسان گردانتی تھیں۔ ”بس دعا کرو کہ ذنیرا کی بھی کہیں بات بن جائے۔“ دادو نے چہرے سے کبھی اڑاتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔

”ہاں دعا ہی کیجئے گا! دعا کرنے کا کس کے پاس ٹائم ہے۔“ میری بڑبڑاہٹ شاید دادو کی سمجھ میں نہیں آئی تھی تبھی وہ حیرانی سے مجھے دیکھنے لگیں۔

”ہاں! کیوں نہیں اماں! میں نے بھی دو چار لوگوں سے کہا ہوا ہے۔ میری بہن نے اپنی جھٹانی کے بیٹے کا بتایا تھا! لڑکا میکینکل انجینئر تھا! لیکن ذنیرا کی امی کہنے لگیں کہ فیملی بہت بڑی ہے ہم نے نہیں کرنا۔“ ان کے جواب پر دادو پھسکی سی ہنسی کے ساتھ بولیں۔

”بس بیٹا پتا نہیں عظمت کا معیار کیا ہے! بچی کی عمر نکلتی جا رہی ہے اور وہ کسی کی بات سنتی نہیں اور باپ اس کا ہے تو وہ بے پروا۔ کہتا ہے کہ جب وقت آئے گا خود ہی ہو جائے گا۔“

”لیکن اماں! کوشش تو کرنی پڑتی ہے۔ خدا سب کو رزق دیتا ہے! پرندوں کو بھی دیتا ہے لیکن ان کے گھونسلوں میں نہیں ڈالتا۔ بس اللہ بچی کی قسمت اچھی کرے! میں تو اٹھتے بیٹھتے دعا کرتی ہوں! بہت نیک بچی ہے ذنیرا! آنٹی کے لہجے کے غلوں نے مجھے اچھا خاصا شرمندہ کر دیا اور میں نے شکر ادا کیا کہ وہ ہماری والدہ محترمہ کے آج کل کے خیالات سے آگاہ

لوگوں کی قوم بہت چالاک ہوتی ہے اور تم تو نری اللہ میاں کی گائے ہو اور پھر میں تمہارا دوست بھی تو ہوں؟“ اس کے پلے میرے بات پڑی تھی کہ نہیں لیکن اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر مہندی کے فنکشن میں بھی وہ پیچھے رہی حالانکہ دلہن کی اکلوتی بہن تھی اور پھر شادی والے دن وائٹ نیٹ کے سوٹ میں وہ سادہ سادہ سی رات سے بھی زیادہ حاذب نظر لگ رہی تھی۔ پورے سوٹ پر لگے وائٹ ہی ٹگوں کی چمک اس کی آنکھوں کی چمک سے زیادہ نہیں تھی اور آج تو اس نے صرف ہلکی سی لپ سنک لگائی تھی۔

”یار تمہارے پاس کوئی اور سوٹ نہیں ہے؟“ میں نے ہمیشہ کی طرح اچانک آ کر اس سے پوچھا۔

”جی.....؟“ حسب توقع اس کی کشادہ آنکھیں حیرت سے مزید دا ہو گئیں۔ ”کیا مطلب؟“ اس کے گھبرانے پر مجھے ہنسی آ گئی۔

”عادل مجھے آپ کی پاس پارلر لے جاؤ گے؟“

”کیوں؟“ میرے تکیے لہجے میں استفسار پر وہ فوراً بولی۔

”اصل میں آپ کی جیولری گھر ہی رہ گئی ہے۔“

”شکر ہے! اور نہ میں سمجھا کہ محترمہ مزید ہتھیاروں سے لیس ہونے جا رہی ہیں۔“

”جی نہیں! آج نہ تو میں نے زیادہ جیولری پہنی اور نہ ہی گجرے اور میک اپ بھی نہیں کیا۔“ اس کے تاسف بھرے لہجے پر میں نے حیرت سے اس کی فریش اسکن اور جھلر جیسی آنکھوں کو دیکھا۔

”اچھا! تھوڑا سا انتظار کر لیں گے۔“ وہ اندر جاتے جاتے پلٹی۔

”یار ساری زندگی کر سکتا ہوں۔“ میرے دل سے کہے جملے پر وہ ایک لمحے کو ساکت رہ گئی۔ کچھ دیر مجھے غور سے دیکھنے کے بعد وہ اندر بڑھ گئی اور جب جیولری کے ڈبے اٹھائے باہر آئی تو کچھ خاموش تھی۔ اس کے ساتھ اس کی امی بھی تھیں۔

”عادل! ذرا دھیان سے جانا! رات کا ٹائم ہے۔“ ان کے فکر مند لہجے پر میں نے فوراً انہیں تسلی دی اور اگلے ہی چند لمحوں بعد میں تیزی سے گاڑی دوڑائے جا رہا تھا۔ ایک سگنل پر ایک بچے کے ہاتھ سے گجرے لے کر میں نے اس کی طرف بڑھائے تو وہ بے اختیار مسکرا

”ہاں اب تو بولنے کی کہاں دیکھنے کی باری ہے۔“

میری نگاہیں لہجہ اور شوخ انداز اس کا اطمینان رخصت کر رہا تھا تبھی وہ رو ہانسی ہو کر بولی۔

”عادل کیا مسئلہ ہے؟“

”اچھا ذرا میری طرف دیکھ کر پوچھو؟“

”فضول بات مت کریں۔“

”یار آج ہی تو صحیح بات کر رہا ہوں۔“ میری بات پر وہ فوراً پلٹی اور دھڑا دھڑا بیڑھیاں اترتی گئی۔ میری ارے ارے کی پکار کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا اور ایک گھنٹے کے بعد میں تیار ہو کر آیا تو وہ اپنی اور منائل آپنی کی سہیلیوں کے ساتھ ڈھولک پر گانے گا رہی تھی۔ وہ سب بڑے جوش سے گا رہی تھیں۔ جیسے ہی شامل کی مجھ پر نظر پڑی تالیاں بجاتے اس کے ہاتھ فضا میں معلق رہ گئے وہ بری طرح جھینپ گئی۔ میں مٹھائی کے ٹوکے پکچن میں رکھوا کر اندر آیا تو وہ اپنے کسی کزن کے پاس کھڑی بڑے غور سے اس کی بات سن رہی تھی اور اسکے سارٹ سے کزن کی پر شوق نظریں اس کے چہرے پر جمی دیکھ کر میری بھونٹیں تن گئیں۔ ایک دم ذرا پہلے والی سرشاری کچھ مدہم پڑ گئی۔ اس کا وہ کزن طبعاً خاصا شوخ مزاج تھا تبھی شامل مسلسل ہنس رہی تھی۔ میں تیر کی طرح وہاں پہنچا۔

”شامل ذرا بتاؤ کہ مٹھائی کے ٹوکے کہاں رکھوانے ہیں؟“

”امی سے پوچھ کر سنوور میں رکھوا دیں۔“ اس کے بے پروا انداز پر میں تپ گیا۔

”کیوں تمہیں بتاتے ہوئے کیا تکلیف ہو رہی ہے؟“ میرے سر د لہجے پر اس کے چہرے کا رنگ بری طرح متغیر ہوا تبھی وہ بڑی عجلت میں بولی۔

”اؤکے چلیں۔“ میں اسے لے کر ہی ٹلا۔ مٹھائی کے ٹوکے سنوور میں رکھ کر میں اس کی طرف مڑا۔

”سنو خبردار جو اس فضول بندے کے پاس مجھے دوبارہ کھڑی نظر آئیں اور کل اتنا زیادہ تیار شیار ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ فرسٹ ایئر کی طالبہ ہو اور بناؤ سنگھار دیکھو؟“ میرے تلخ اور طنزیہ لہجے پر اس کی آنکھوں میں ایک دم موٹے موٹے آنسو آ گئے۔ مجھے ڈھیروں خفت نے آن گھیرا اب کہ میرا لہجہ خاصا نرم تھا۔ ”دیکھو شامل میں تمہارے بھلے کیلے کہہ رہا ہوں۔ یہ

اُمی۔

”تمہارا فرسٹ ایئر کارزلٹ کب آ رہا ہے؟“

”توبہ! آج کے دن تو ایسی خوفناک باتیں نہ کریں۔“ اس کے بے ساختہ کہے جنے پر مجھے ہنسی آ گئی۔

”اچھا پھر کسی باتیں کروں؟“ میرے معنی خیز لہجے پر اس نے چونک کر دیکھا۔  
”بہت اچھی.....“

”تمہارے جیسی۔“ میں شرارتاً اس کی طرف جھکا تو وہ ہلکھلا کر ہنس پڑی اور اس کی ہنسی کی کھنک سے میں مبہوت ہو گیا۔

پھر مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیسے میرے قریب آتی مٹی۔ ہمارا ایک دوسرے کو دیکھے بغیر کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا۔ ہمارے درمیان کبھی لمبے چوڑے معاہدے نہیں ہوئے۔ ایک خاموش سا تعلق تھا جو روز بروز مضبوط ہوتا جا رہا تھا اور MIT کرنے کے بعد میرا اچانک انگلینڈ کا ویزا لگ گیا اور اسے معلوم ہوا تو وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔ اس دن میں اس کے گھر میں برآمدے میں رکھے تخت پر نیم دراز تھا جب چائے کا کپ میری طرف بڑھاتے ہوئے وہ سنجیدگی سے بولی۔

”عادل تم واقعی باہر جا رہے ہو؟“

”ہاں کیوں؟“ میں بری طرح چونکا تو وہ کچھ جھجک کر بولی۔

”اگر میں کہوں کہ نہ جاؤ.....؟“ میں ایک ٹک اسے دیکھتا رہ گیا جو گلابی سوٹ میں خود بھی پنک ہو رہی تھی۔ آنکھوں کی چمک ماند تھی۔ چائے کا کپ سائیڈ پر رکھ کر میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے ویسے ہی پوچھا۔

”تم ایسا کیوں کہو گی؟“ وہ قصداً تھوڑا سا مڑی۔ سامنے کمرے میں آگئی جائے نماز بچائے نماز پڑھنے میں مگن تھیں۔ اس نے اچانک اور غیر متوقع انداز میں مجھ سے پوچھا۔  
”میرے بغیر رہ لوگ گے؟“ میری گہری نظروں نے اس کا احاطہ کیا، بہت عرصے بعد خوشی و انبساط نے میرے دل کو چھوا۔

”تم رہ لو گی؟“ اس کی آنکھوں میں بے بسی تھی، تبھی میں نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا۔  
”اُس اوکے میں نہیں جاتا لیکن تم پلیز ایم اے کیلئے ڈھنگ کے سبجیکٹ کا انتخاب

کرلو۔ مجھے لڑکیوں کیلئے جرنلزم کا مضمون پسند نہیں۔“ میں نے باہر نکلے ہوئے بلا ارادہ ہی اس کی طرف دیکھا اور چونکہ وہ میری طرف ہی دیکھ رہی تھی اس لئے اس تصادم پر گڑبغا گئی اور پھر میرے کہنے پر اس نے اکتانکس میں اپنے فارم جمع کروادیے اور اب تو میری بھی جاب بہت اچھی ہو گئی تھی، لیکن زنیبا جی کی شادی کا مسئلہ حل ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اب تو سیرا آپنی کیلئے بھی آنے والے رشتوں میں خاصا تھقل آ گیا تھا۔ امی کا بلڈ پریشر ہائی رہنے لگا تھا اور شعیب بھائی بھی خاصے چڑچڑے ہو گئے تھے اور زنیبا جی تو بالکل خاموش ہو گئی تھیں۔

جبکہ میں روز بروز ڈپریشن کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔ شائل کیلئے آنے والے رشتوں کی تعداد میں اضافہ میری راتوں کی نیند اڑا رہا تھا۔ وہ ہر ہر پروپوزل پر گھبراہٹتی اور ایسے لمحات میں میں محض نظریں چرانے کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا۔ وہ میری رگ جاں تھی، لیکن گھریلو حالات کے شکنجے میں پھنس کر مجھے کوئی امید کے جگنو دکھائی نہیں دے رہے تھے اور اس دن تو حد ہو گئی۔ شعیب بھائی اپنی کسی کولیک میں انٹر سٹڈ تھے اور امی ہرگز بیٹیوں کی موجودگی میں چھوٹے بیٹے کی شادی کے حق میں نہیں تھیں۔

”پوری اکتیس سال عمر ہو گئی ہے میری؟“ وہ غصے سے چلائے۔

”کچھ شرم کر دو تم سے ڈیڑھ سال بڑی سیرا اور چار سال بڑی زنیبا ابھی بیٹھی ہیں۔“ امی کا لہجہ سلگ رہا تھا۔ دونوں بھابیوں نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کو اشارہ کیا۔  
”آپ میری شادی کروائیں میں اپنی دونوں بہنوں کیلئے خود دیکھوں گا۔“ شعیب بھائی آج فیصلے کے موڈ میں تھے۔

”ہاں جیسے ان دو بڑوں نے دیکھا تھا۔“ امی کا طنزیہ لہجہ انہیں بھی آگ لگا گیا۔

”آپ مجھے جواد بھائی اور فواد بھائی کے ساتھ مت ملائیں۔“

”کیوں تم آسمان سے اترے ہو تمہاری رگوں میں بھی تو وہی خون ہے۔“ امی نے غصے سے تیزی سے پالک کاٹنی شروع کر دی۔

”دیکھیں امی! عروج کے والدین زیادہ انتظار نہیں کر سکتے، پچھلے چار سال سے میں اسے ”لارے“ لگا رہا ہوں۔“ شعیب بھائی اب کھل کر میدان میں آ گئے تھے۔ امی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”شاباش میرے بچے تمہارا قصور نہیں ہے۔ شاید میرے دودھ کی تاثیر ہی ایسی ہے جو

ای اور ابو کو راضی کرنے میں زنیہ اباجی کی کوششوں کا دخل تھا۔ حالانکہ سب کچھ سوگ کی حالت میں ہوا، لیکن شعیب بھائی اپنی پسند کو حاصل کر کے خاصے مسرور تھے۔ شعیب بھائی کی شادی کو بمشکل چھ ماہ گزرے تھے اور اب تو میری شائل کے ساتھ خاصی انڈر سٹینڈنگ ہو گئی تھی۔ میں اکثر اسے ملنے کیسپس بھی پہنچ جاتا تھا۔ اس دن میں گیا تو بلیک سوٹ میں وہ سوگواریت کا مکمل اشتہار لگ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے افسردگی سے اطلاع دی۔

”منابل آپ آئی ہیں عامر بھائی کے کسی بہت اچھے دوست کا پروپوزل لے کر۔“  
”پھر.....؟“

”ابو جی اور امی بہت خوش ہیں۔“ میں نے حیرانی سے اسے دیکھا جو خاصی الجھی ہوئی تھی۔ ”عادل..... تم کچھ کر نہیں سکتے؟“  
”مثلاً؟“

”تمہیں جاب کرتے ہوئے تین چار سال ہو گئے ہیں خود مختار ہو.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑی تو میں نے ایک گہری سانس بھری۔

”دیکھو شائل یہ بات تم شروع سے جانتی ہو کہ میں نے کبھی تمہیں اپنے لئے باؤنڈ نہیں کیا اور میرے گھر کے سارے حالات تمہارے سامنے ہیں۔ امی بستر پر لگ گئیں اور زنیہ اباجی نے سب سے ملنا چھوڑ دیا ہے۔ ایسی چویشن میں بتاؤ میں کیا کروں؟“

”پھر بتاؤ کہ میں کیا کروں اب تو اپنے لئے آنے والے پروپوزل پر انکار کر کے تھک گئی ہوں اور اب تو امی بھی مجھ سے خفا رہنے لگی ہیں اور اس دفعہ منابل آپ بھی لگتا ہے کہ ہاں کروا کے ہی جائیں گی۔“ وہ خود بھی اچھی خاصی پریشان تھی۔

”اچھا پروپوزل کیسا ہے؟“ میرے پوچھنے پر وہ حیران ہو کر بولی۔

”ظاہر ہے کہ اچھا ہے تو امی ابو خوش ہیں۔“

”تم پھر تم ہاں کر دو۔“

”کیا؟“ اسے بری طرح شاک لگا۔

”دیکھو شائل! جو تمہاری عمر ہے اس عمر میں لڑکیوں کی شادی ہو جانی چاہئے اور میں اتنا خود غرض نہیں ہوں کہ تمہیں اپنا پابند کر کے بٹھالوں۔ مجھے معلوم نہیں کہ میرے گھر کے حالات کب بدلتے ہیں لیکن پلیز میرے اندر اتنا حوصلہ نہیں کہ شعیب بھائی کی طرح امی کو خفا کر کے

میرے بیٹے پر اپنی لڑکیوں کے پیچھے سگی ماں اور بہنوں کو بھول جاتے ہیں۔ وہ بڑا فواد بھی ایسے ہی دعوے کرتا تھا اب بیوی کی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور اس کے کانوں سے سنتا ہے۔ میں کہے دیتی ہوں کہ زنیہ کی شادی کئے بغیر میں اپنے کسی بیٹے کی اب شادی نہیں کروں گی۔“

”کیوں؟“ شعیب بھائی غصے سے گھومے اور بڑے تلخ لہجے میں گویا ہوئے۔ ”کیوں اگر زنیہ اباجی کی شادی ساری زندگی نہیں ہوتی تو ہم بھی ایسے ہی عمر گزار دیں، ہمیں کس بات کی سزا دے رہی ہیں آپ؟ اچھے خاصے ان کے رشتے اپنے ہاتھوں سے آپ لوگوں نے گنوا دیئے۔ اس لیکچرار احسان علی میں کیا خالی تھی۔ یہی ناں کہ اس کی پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اب بائسڈ مت کیجئے گا امی اس عمر میں اب باجی کیلئے ایسے ہی رشتے آئیں گے اور دو چار سال بعد ایسے بھی نہیں آئیں گے۔“ شعیب بھائی کا لہجہ اتنا سرد نہیں تھا جتنے الفاظ۔ امی کا چہرہ ایک دم فق ہو گیا۔ وہ انتہائی صدمے کی حالت میں اپنے سامنے کھڑے شعیب کو دیکھ رہی تھیں۔ سامنے بچن میں مصروف زنیہ اباجی کی رنگت بھی ایک دم پھکی پڑ گئی اور سیرا آپ نے انتہائی تاسف بھری نظروں سے انہیں دیکھا جو سب سے بے نیاز اپنے جواب کے منتظر تھے۔

”آپ کل شام کو میرے ساتھ چلیے گا۔ ورنہ شادی تو مجھے عروج کے ساتھ ہی کرنی ہے۔ خواہ آپ لوگ شامل ہوں یا نہ ہوں۔“ اپنی بات کہہ کر وہ رکے نہیں اور دھڑ دھڑ کرتے چلے گئے۔ میں نے دل پر ہاتھ رکھ کر جھکتی امی جان کو دیکھا اور گھبرا کر ان کے پاس پہنچا۔

”امی جان کیا ہوا؟“ انہوں نے غصے سے میرا ہاتھ جھکا۔

”چلے جاؤ تم بھی تو امی کے بھائی ہو، کل کو میرے سامنے آن کھڑے ہو گئے۔ تم بھی اپنی پسند بتاؤ میرا اور میری بیٹیوں کا اللہ مالک.....“ وہ بری طرح رو رہی تھیں۔

”امی میں آپ کو ایسا لگتا ہوں؟“ ان کی طبیعت کے بگڑنے پر میں گھبرا کر بولا۔

”وہ تینوں بھی ایسے نہیں لگتے تھے۔“ امی کسی گہرے صدمے کے زیر اثر آہستہ سے بڑبڑائیں۔

”لو جی، بیٹا اپنے منہ سے کہہ رہا ہے تو کر دین شادی ابھی تو اللہ کا شکر ہے ہمارے دیور شریف ہیں۔ ورنہ مرد باہر جھک مارنا شروع کر دیتے ہیں۔“ بڑی بھائی اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بڑبڑائیں اور ان کی بڑبڑاہٹ کو کبھی نے سنا تھا۔

شعیب بھائی کی شادی دو ماہ کے اندر اندر ان کی کولیگ کے ساتھ ہو گئی اور معلوم ہوا کہ

اپنی پسند کو حاصل کروں۔“ میں نے صاف صاف بات کلیئر کی جبکہ اس کا چہرہ سپید پڑ گیا۔ وہ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہ گئی۔ میں نے فوراً نظریں چرا لیں۔

”میرے بغیر رہ لو گے؟“ اس کی آواز گہرے کنویں ہی سے آئی تھی۔

”زندگی میں بہت ساری چیزوں کے بغیر بھی رہنا پڑتا ہے۔“

”لیکن عادل صدیقی میں کوئی چیز نہیں ہوں۔ ایک زندہ جیتی جاگتی حقیقت ہوں۔“

”دیکھو شکل میں نے یہ فیصلہ بہت دل پر جبر کر کے کیا ہے اپنی سب سے عزیز شے کو کسی اور کے حوالے کرنا آسان نہیں، لیکن میں تم پر کوئی ظلم نہیں کر سکتا۔ میں زنیہ کو دیکھتا ہوں تو مجھے دکھ اور افسوس ہوتا ہے۔“

”تم مجھ کو آزما کر تو دیکھو بہت حوصلہ ہے میرے اندر۔“ وہ عجب لہجے میں گویا ہوئی۔

”جن سے محبت ہو انہیں آزما تے نہیں۔“ میں شدید کرب میں تھا۔

”میں ساری زندگی تمہارا انتظار کر سکتی ہوں۔“

”لیکن میں تمہیں ایسا کوئی سٹوپڈ کام کرنے کو نہیں کہوں گا۔“

”یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔“

”ہاں بالکل آخری!“ میرے حتیٰ لہجے پر وہ تیزی سے اٹھی اور اس نے پھر مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔

”دیکھو شکل! یہ میری خواہش ہے کہ تم ایک کامیاب اور اچھی زندگی گزارو۔“ میں نے اسے وضاحت دینے کی کوشش کی تو وہ ارد گرد کی پروا کئے بغیر چینی۔

”پلیز“ کچھ بھی مت کہو اور اب یہ مت کہنا کہ محبت کے اس سفر میں کبھی تم میرے ساتھ تھے۔ میں تم سے ملنا نہیں چاہتی۔“ وہ جاتے جاتے پلٹی اور میں وہیں کھڑا رہ گیا۔

پھر میری فرم کے کام کے سلسلے میں مجھے تین ماہ کیلئے ڈل ایسٹ بھیجا گیا تو وہیں مجھے اطلاع ملی کہ اس کی شادی ہو گئی ہے اور اس دن میں پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ مجھے لگا کہ کسی نے میرے جسم کا ایک حصہ مجھ سے علیحدہ کر دیا تھا اور پھر میں اپنا عرصہ وہاں بڑھاتا ہی رہا۔ میں جو تین ماہ کیلئے گیا تھا تین سال کے بعد سمیرا آپ کی شادی پر آیا تو معلوم ہوا کہ شکل کے امی ابو لاہور شفٹ ہو گئے ہیں اور پاکستان آ کر معلوم ہوا کہ وہ اسلام آباد میں ہوتی ہے اور اس کا ایک بیٹا بھی ہے..... پھر وقت گزرتا گیا اور میری بھی شادی ہو گئی، لیکن ازدواجی زندگی کا

اطمینان اور سکھ شاید میری قسمت میں نہیں تھا۔ سائرہ امی کی بھانجی تھی اور انہی کی خالستاپسند پر میری شادی ہوئی، لیکن ہم دونوں کے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ انتہائی جھگڑالو، فضول خرچ اور بے وقوف عورت تھی۔ کہیں سے اڑتے اڑتے اس نے میری شکل سے پسندیدگی کی خبر سن لی تھی تب سے اس کی زبان دو دھاری تلوار بن چکی تھی اور حیرانی کی بات یہ تھی کہ اپنی پانچوں بہوؤں میں سب سے زیادہ اسی کے امی کے ساتھ حالات خراب تھے۔ حالانکہ وہ سر اسران کی پسند پر اس گھر میں آئی تھی۔

میرے گھر میں بے ترتیبی اور پھو ہڑ پن کا عنصر نمایاں تھا اور دونوں بچے ماں کی عادات کی کاپی تھے۔ میں لاکھ ان کو سدھارنے کی کوشش کرتا لیکن وہ حد سے زیادہ ضدی تھے جبکہ سائرہ اپنے حلیے سے بے پردا ہر وقت شک کے ہتھیاروں سے لیس، بد مزاجی کا چلتا پھرتا اشتہار تھی۔ اب تو ہم سب بھائی علیحدہ علیحدہ ہو گئے تھے، لیکن سائرہ کی تنگ مزاجی کی وجہ سے کوئی بھی میرے گھر کا رخ نہ کرتا۔ وہ بڑھی لکھی جاہل تھی اور اب اس کے ہر عمل کے جواب میں میرا ہتھیار صرف خاموشی تھا..... لیکن آج ”محبت کدہ“ میں داخل ہوتے ہی میرے سارے زخم جاگ اٹھے۔ کئی محرومیوں نے سراٹھایا اور شکل کی خوش باش زندگی کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ ایسی ہی زندگی کے تو میں نے خواب دیکھے تھے۔

میری نظر سامنے والی کلاک پر پڑی۔ صبح ہو چکی تھی ساری رات میں اس کی یادوں کے ہمراہ تھا اور اب میرا سر پھٹ رہا تھا۔ فجر کی اذان پر میں نے اٹھ کر نماز پڑھی اور یونہی چہل قدمی کیلئے لان میں نکل آیا۔ حالانکہ صبح خاصی سرد تھی اور دھند میں ہر چیز لپٹی ہوئی تھی، اکتا کر میں اندر آیا تو ڈرائنگ روم سے گزر کر ٹی وی لاؤنج کو عبور کرتے ہوئے کسی نے مجھے پکارا۔

”عادل!“ میرا دل ایک لمحے کو دھڑکنا بھول گیا۔ میں پیچھے مڑا، وہ شاید کچن سے نکلی تھی۔ لائٹ پر پل کمر کے سوٹ میں وہ بالکل ویسی ہی فریش اور سمارت تھی جیسی کہ آج سے سات سال پہلے تھی۔ ایک نرم سا تاثر اس کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔

”بیٹھو میں تمہارے لئے چائے لاتی ہوں۔“ میں وہیں ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ گیا۔ ٹھیک دس منٹ کے بعد وہ بھاپ اڑاتا ہوا کپ میری طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔

”کیسے ہو؟“

”اللہ کا شکر ہے۔ دانش صاحب کہاں ہیں؟“ میں نے گھر میں پھیلے سناٹے کو دیکھتے



ہوئے پوچھا۔

”وہ صبح آٹھ بجے اٹھتے ہیں اور ابھی تو صرف چھ بجے ہیں۔“ وہ میرے سامنے والے صوفے پر بڑے ریلیکس انداز میں بیٹھی۔ اس کی نظریں میرے اوپر جمی ہوئی تھیں۔ وہ پہلے سے کافی زیادہ پراعتماد ہو گئی تھی۔

”تم کیسی ہو؟“ میں نے چائے کاسپ لینے سے پہلے پوچھا۔

”اللہ کا شکر ہے۔“ اس کے لہجے میں اطمینان اور سکون کی فراوانی تھی۔

”دانش صاحب کیسے ہیں؟“ میں جو پوچھنا چاہ رہا تھا کھل کر نہیں پوچھ سکا۔ وہ دھیرے سے مسکرائی اور پھر آہستگی سے گویا ہوئی۔

”میرے لئے تو اللہ کا بہت خوبصورت تحفہ ہیں۔ بہت لونگ اور بہت کیئرنگ۔ بحیثیت شوہر کے بہت زبردست، بحیثیت ایک باپ کے بہت مہربان اور بحیثیت انسان کے بہت عمدہ۔“ اس کی دولاٹوں میں اس کی کامیاب زندگی کا عکس جھلک رہا تھا۔

”تمہیں اب بھی یاد ہے کہ میں چائے میں چینی نہیں لیتا۔“ مجھے محسوس ہوا تھا ایک خوشگوار سے احساس نے میرا گھیراؤ کیا۔

”اچھا.....؟“ وہ حیران ہوئی۔ ”میں نے چینی نہیں ڈالی۔“ پھر ایک لمحے بعد بولی۔

”اصل میں دانش بھی چینی نہیں لیتے، اس لئے مجھے یاد نہیں رہا۔“ اس کے جواب نے اس خوشگوار احساس کو چند سیکنڈ میں ختم کر دیا، جو میرے اندر نمودار ہوا تھا۔

”اور باقی گھر والے کیسے ہیں؟“ اس نے سادہ سے لہجے میں دریافت کیا۔

”امی کا سال پہلے انتقال ہو گیا جبکہ دادو تو چار سال پہلے دنیا سے گزر گئی تھیں۔ سمیرا آپ کی شادی کو بھی چار سال ہو گئے۔ وہ کونسلہ ہوتی ہیں اور شعیب بھائی کے ماشاء اللہ تین بیٹے ہیں اور پچھلے سال ہارون کی بھی شادی ہو گئی۔ وہ انگلینڈ میں ہوتا ہے اور جواد بھائی اور فواد بھائی اپنے بچوں کے ساتھ کراچی ہی ہیں۔“

”اور زنیہ اباجی؟“ اس نے کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”انہوں نے شادی ہی نہیں کی۔ آج تک وہ شعیب بھائی کے ساتھ ہوتی ہیں۔“

”کیوں؟“ اسے شدید حیرت ہوئی۔

”ان کا کہنا تھا کہ میری زندگی کے بہترین سال تو والدین نے فضول شیڈرڈ کی ضد

میں ضائع کر دیئے اور اب باقی ماندہ زندگی وہ کسی رنڈوے یا دوسری شادی والے کے بچوں کو سنبھال کر ضائع نہیں کر سکتیں، وہ وہیں جاب کر رہی ہیں۔“

”اوہ..... نو.....“ اسے حقیقتاً صدمہ ہوا تھا۔ وہ مسلسل تاسف کے انداز میں سر ہلا رہی تھی اور پھر کچھ سنبھل کر بولی ”اور تم.....؟“

”میں.....!“ میں تنہی سے ہنسا ”تم نے ٹھیک کہا تھا شامل دانش کہ..... اپنی سب سے عزیز شے کسی اور کے حوالے کر کے بندہ کیسے خوش رہ سکتا ہے۔ آج تک سوچتا ہوں کہ میں جو دوسروں کو مشورے دیتا تھا کہ اگر کچھ درست فیصلے درست موقعوں پر نہ کئے جائیں تو وہ انسان کیلئے ناسور بن جاتے ہیں تو خود ایسا کیوں نہ کیا۔“

”کیا مطلب!“ وہ بری طرح الجھی۔

”میں شعیب بھائی کی کامیاب ازدواجی زندگی کو دیکھتا ہوں کہ اگرچہ ان کا فیصلہ کرنے کا انداز اور طریقہ غلط تھا، لیکن انہوں نے درست موقع پر درست فیصلہ کیا تھا۔“ میں کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ گیا تھا۔

”عادل!“ وہ ایک گہرے صدمے کی کیفیت میں بولی۔ میں نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں۔ کئی سال پہلے کا رکا ہوا ایک آنسو بغاوت کر گیا۔

”میں نے تو تمہاری بات مانی تھی۔ تم نے جاتے جاتے مجھے صرف ایک بات کہی تھی ناں کہ میری خواہش ہے کہ تم بہت مطمئن اور خوشحال زندگی گزارو، یقین مانو اس گھر کو محبت کدہ بنانے میں حقیقتاً سیونٹی پرسنٹ میرا ہاتھ ہے۔ میں نے دانش کی کسی بات سے کبھی اختلاف نہیں کیا اور اللہ کا شکر ہے کہ وہ قدر کرنے والے بندے ہیں۔“ وہ خواب کی سی کیفیت میں بولی تھی۔

ناشتے کی ٹیبل پر دانش صاحب اور بچوں سے ملاقات ہوئی۔ وہ خاصے خوشگوار موڈ میں ننھی مومنہ کو گود میں بٹھائے بیٹھے تھے۔ شامل کچھ خاموش تھی اور افسردگی کی سی کیفیت میں بچوں کو ناشتہ کروانے میں مگن تھی۔ جبکہ دانش صاحب بار بار مجھے ڈھنگ سے ناشتہ کرنے کی تلقین کر رہے تھے۔

”کم آن شامل! دیکھو ہماری مومنہ اب ماشاء اللہ کتنی فریش ہے اور تم ابھی تک افسردہ ہو۔ فائف اچھی سی چائے بنا کر دو۔“ وہ زبردستی مسکرائی اور ان کیلئے چائے بنانے لگی۔ چائے

کا کپ ان کی طرف بڑھا کر اس نے مومنہ کو اٹھالیا جو قلقاریاں مار رہی تھی۔

”ارے میرے بیٹے کو میری گود سے کیوں لے لیا؟“ وہ مصنوعی خشکی سے بولے۔ میں نے بڑی حسرت سے اس خوشگوار منظر کو دیکھا اور دل میں اس کی خوشیوں کی مزید دعا مانگی۔

”ارے مسز یہ کیا.....؟“ پہلے ہی گھونٹ پر دانش صاحب نے برا سامنہ بنایا۔ ”یار تم نے اس میں شوگر نہیں ڈالی۔ کمال ہے تم آج کیسے بھول گئیں کہ میں ہمیشہ دن اینڈ ہاف اسپون چینی کا لیتا ہوں۔ لگتا ہے میری بیٹی کی خرابی طبیعت نے ہماری مسز کو خاصا اپ سینہ کر دیا ہے۔“

### خالی ہاتھ

وہ جینٹھ کی ایک جس زندہ شام تھی جب رام بلڈنگ کے بالکل سامنے کالی ماما کے مندر میں بچے والی کھٹی کی آواز نے دل میں عجیب سی کثافت بھر دی تھی۔

مندر کا دروازہ چونکہ منہدم ہو چکا تھا اس لئے سامنے چوڑے پر بڑے فخر سے بیٹھی بنے شاربازوؤں والی کالی ماما کو دیکھ کر دل نے وحشت بھری جھرجھری لی تھی۔ آج پتا نہیں کیوں پوری گلی میں سناٹا تھا۔ مندر کے اندر بچنے والی کھٹی کی آواز نے پوری فضا میں ایک ارتعاش سا پیدا کیا تھا اور اس کے بعد اداسی سے لبریز خاموشی نے پورے ماحول کو پھر اپنی بانہوں میں لے لیا تھا۔

قیام پاکستان سے پہلے بننے والی ”رام بلڈنگ“ شاید کسی زمانے میں شان و شوکت کی حامل رہی ہو لیکن اب بوسیدگی، خستگی اور کھٹن اس کے درود یوار میں رچ بس سی گئی تھی اور رنگ و روغن بھی شاید ایک صدی پہلے کروایا گیا تھا اس لئے اب اس کی ”باقیات“ بھی تقریباً تاپید تھیں۔ اس عمارت میں تنگ و تاریک سے آٹھ فلیٹ تھے اور ایسا لگتا تھا کہ یہاں بسنے والے سارے کینوں کی قسمت ایک جیسی تھی۔ غربت اور افلاس نے ان لوگوں کا دامن بالکل ایک ضدی بچے کی طرح پکڑا ہوا تھا۔

اس نے جیسے ہی رام بلڈنگ میں قدم رکھا، بجلی دغا دے گئی۔ میڑھیوں پر لگا ساٹھ واٹ کا بلب جھلکے سے بند ہو گیا۔ اتنے سال رہنے کے باوجود وہ ان انتہائی تنگ سیلن زندہ میڑھیوں سے آشنا نہیں ہوئی تھی اس لئے گھپ اندھیرے میں دیوار ٹول ٹول کر ادھر پرچہ رہی تھی۔ آج تو ویسے بھی صبح سے اس کے وجود میں بھانپڑے جل رہے تھے۔ اس کے روم روم میں اضطراب کسی دہکے ہوئے سیال مادے کی طرح گھوم رہا تھا۔ اس نے ہاتھ میں آج کا اخبار اٹھا

ناشتہ کرتے ہوئے میں اچانک چونکا۔ بے اختیار سامنے بیٹھی شائل کو دیکھا جس نے فوراً نظریں چرائی تھیں۔ ایک خوشگوار سا تاثر میرے اندر بیدار ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی لہروں نے میرے سارے وجود کا احاطہ کر لیا۔ میں ایک دم ہلکا پھلکا ہو گیا۔ گزشتہ سات سالوں کی زندگی میں گزری تمام تلخیاں دکھ اور پریشانیاں ایک دم کہیں چھپ گئی تھیں۔

مجھے یاد تھا تو بس اتنا کہ بے شک شائل دانش ایک کامیاب اور بھرپور زندگی گزار رہی تھی جس کی میں نے خواہش کی تھی اور شاید کہ میں درست وقت پر اگر درست فیصلہ کر لیتا تو آج میرے گھر کے گیٹ پر بھی ”محبت کدہ“ کے الفاظ کندہ ہوتے۔ وقت کو واپس لانا تو میرے اختیار میں نہیں تھا، لیکن اپنی اگلی زندگی کو گزارنے کیلئے میرے لئے یہ صرف ایک بات ہی کافی تھی کہ سات سال گزرنے کے باوجود شائل دانش کو آج بھی یاد ہے کہ ”عادل صدیقی چائے میں شوگر نہیں لیتا۔“

اور ہم جیسے لوگ جو بساط دل پر ٹھیک وقت پر درست مہروں کا استعمال نہیں کرتے ایسے بے وقوفوں کیلئے کبھی کبھی ایک فخر کے کی خوشگواہی ہی ساری زندگی کی ضامن بن جاتی ہے۔ جیسے کہ شائل کا ایک جملہ میرے لئے زاد راہ بن گیا تھا۔



رکھا تھا جس کی خبریں اب اس کیلئے باسی ہو چکی تھیں۔

وہ سیکنڈ فلور کے ایک بوسیدہ سے فلیٹ کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ لوہے کے بدرنگ دروازے کو دھکیلا تو وہ کھلتا ہی چلا گیا۔ وہ جانتی تھی کہ دروازہ کھلا ہی ہوگا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئی، بجلی صاحبہ آگئیں اور دو کمرے چھوٹا سا باورچی خانہ اور انتہائی مختصر سائی دی لائونج روشن ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ ابا کا کمرہ بند تھا۔ وہ شاید دو انیوں کے زیر اثر سو رہے تھے حالانکہ وہ دبے قدموں اندر داخل ہوئی تھی لیکن نمرہ کی آنکھ پھر بھی کھل گئی تھی۔ ”کیا ہوا سو گئی تھیں؟“ اس نے نمرہ کا ہاتھ کاچھا سا چہرہ غور سے دیکھا وہ نیلے رنگ کا لان کا ملگجا سا سوٹ پہنے ہوئے تھی جو کثرت دھلائی کی وجہ سے بدرنگ ہو چکا تھا، لیکن اس کے چہرے پر ہمیشہ کی طرف مسکراہٹ تھی۔

”ابا کو کھانا دیا اور انہوں نے دوائی تو ٹائم پر لی ناں؟“ اس کی فکر مندی پر نمرہ مسکرائی اور اثبات میں سر ہلا کر انتہائی محبت سے اپنی بڑی بہن کو دیکھا اور تشویش بھرے لہجے میں پوچھا ”آپ نے کھانا کھایا؟“

”نہیں.....“ اسے آج کھانے سے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ جس کوفت کا گھبراہٹا کر وہ گھبرائی تھی وہ ابھی تک اعصاب پر حاوی تھی جس نے بھوک پیاس سب کچھ ختم کر دی تھی۔ ”کھانا لے کر آؤں؟ آج میں نے بھنڈی گوشت بنایا ہے۔“ نمرہ کے اشتیاق بھرے انداز پر وہ جبراً مسکرائی اور دوپٹہ اتار کر کرسی پر بھینکا اور پٹکھا تیز کیا۔

”یار! بس ایک اچھا سا چائے کا کپ بنا دو بھوک بالکل بھی نہیں ہے۔“ وہ غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔ پانچ منٹ کے بعد وہ شاور لے کر واپس آئی تو گرمی کا احساس کچھ کم ہو چکا تھا۔ تو لیہ باہر ٹیرس نما چھوٹی سی گیلری میں لگی رسی پر پھیلا کر واپس آئی تو نمرہ چائے کے دو کپ لے کر اندر آ چکی تھی اور اب اس کی طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔

”کیا ہوا؟ ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟“ چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنی اشارہ سالہ بہن کی محویت کو نوٹ کیا اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”پتا نہیں کیوں ایسے لگ رہا ہے جیسے آپ کچھ پریشان ہیں۔“

”کون میں؟“ وہ مصنوعی حیرت سے پوچھ رہی تھی۔ اسے علم تھا کہ اس کی یہ چھوٹی سی حساس دل کی حامل بہن چہرے سے دل کا حال جاننے میں ماہر ہے۔ اٹھارہ سالوں میں اس

نے زندگی کو خوب برت لیا تھا اور تلخ تجربات نے اسے وقت سے پہلے بہت بڑا کر دیا تھا۔ ”پریشانیاں تو ہماری زندگی کا حصہ بن چکی ہیں مائی ڈیئر۔“ اس نے چائے کا سپ لیتے ہوئے محبت پر لگے اکلوتے پتلے کو رنجیدگی سے دیکھا جس کی ہوا آج ضرورت سے زیادہ گرم لگ رہی تھی۔

”کیا سوچ رہی ہیں اپنا؟“

”سوچ رہی ہوں جیسے ہی نئی ملازمت مل گئی فوراً ایک ایئر کنڈرلر لوں گی۔ ابا بے چارے اتنے گرم کمرے میں سارا دن رہتے ہیں۔“ نمرہ نے چونک کر بہن کا چہرہ غور سے دیکھا جس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔

”کیا یہ ملازمت بھی ختم ہو گئی؟“ نمرہ فکر مندی سے پوچھ رہی تھی۔

”ہاں آج قوت برداشت ختم ہو گئی اس لئے استعفیٰ ان کے منہ پر مار کر آ گئی۔“ اس کی آواز میں عجیب سی تلخی رچی ہوئی تھی۔ اس کے جواب پر نمرہ کی مسکراہٹ لمحے بھر کو ڈمگ گئی ضرور تھی، لیکن لیوں سے جدا نہیں ہوئی تھی۔

”چلو اللہ بہتر کرے گا۔ آپ ٹینشن نہ لیں، کوئی نہ کوئی اور راستہ نکل آئے گا۔“ نمرہ نے اپنے مخصوص ہمت دلاتے ہوئے لہجے میں اسے دلاسا دیا۔ اس نے نوکری ختم ہونے کی وجوہات نہیں پوچھی تھیں، کیونکہ اسے علم تھا کہ ہمیشہ کی طرح ایک ہی وجہ ہوگی جس نے اس کی باہمت بہن کے صبر کا پیمانہ لبریز کر دیا تھا۔



اس نے تاب گھا کر اس شاندار انٹریئر والے آفس کا منتقل چوبی دروازہ کھولا تو اسے سی کی مخصوص ٹھنڈک میں زبردست مہک والے ایئر فریشنر آئرمی خوشبو نے طبعیت فریش کر دی تھی..... اس نے بڑے تمکنت بھرے انداز سے گرے کارپٹ والے فرش پر قدم رکھا تھا۔ باہر کی سخت گرمی کے موسم میں اس کمرے کا ماحول اسے کسی جنت سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ اس شاندار آفس میں موجود لیپ ٹاپ پر مصروف شخص کی شخصیت اس آفس سے زیادہ شاندار تھی۔ وہ مردانہ وجاہت سے بھرپور تھا۔ گرے پینٹ پر سفید لائنوں والی شرٹ اور گرے ٹائی میں وہ کسی بھی خوبصورت ہیرے کسی طور کم نہیں لگ رہا تھا۔

عانینے اسے متوجہ کرنے کیلئے پُر اعتماد انداز سے سلام کیا تو وہ بری طرح چونکا۔ اس

”میں اجازت ضرور مانگتی، اگر کوئی تعلیم یافتہ اور مہذب انسان میرا پوسٹارٹم کرنے کے شغل میں مصروف نہ ہوتا۔“ اتنا کیلیلا جواب۔ ارحم کو شدید جھٹکا لگا تھا۔ لمحہ بھر کو اس کی زبان منگ ہوئی۔

”دیکھیں بی بی!“

”میرا نام بی بی نہیں عانیہ جمیل ہے۔“ اس نے بات کاٹ کر فوراً صبح کی تو ارحم کے چہرے پر ناگواری اور جھنجھلاہٹ کے رنگ تیزی سے پھیل گئے۔

’اسی نام ہی کا تو سارا فساد ہے۔ وہ دل ہی دل میں کھولا تھا‘ کیونکہ اس کے نام کے سحر میں اس نے تصوراتی خوبصورتی کا ایک پیکر اپنے ذہن میں بنالیا تھا جو اسے دیکھتے ہی ریت کے محل کی طرح زمین بوس ہوا تھا۔

’اتنا خوبصورت نام اس طرح کی عام سی لڑکی کا بھی ہو سکتا ہے؟‘ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا اسی وجہ سے اسے جھٹکا خاصا زوردار لگا تھا۔

”آپ اپنا سی وی دکھانا پسند کریں گی؟“ اس کے طنزیہ انداز پر عانیہ تناؤ کا شکار ہوئی اور اب اس کا اپنا مزاج بھی خاصا براہم ہو چکا تھا اس کے باوجود اس نے اپنے براؤن بیگ سے نیلے رنگ کی عام سی فائل نکالی تھی۔ یہ فائل اس نے بک شال سے چند روپے کی خریدی تھی۔ اس کے اوپر سفید رنگ کا تسمہ لگا ہوا تھا جس میں تین صفحات کا سی وی پرویا گیا تھا۔

ارحم نے سخت ناپسندیدہ نظروں سے اس عام سے گتے کی بنی فائل کو دیکھا۔ بد قسمتی سے وہ حد درجہ برانڈ کوشس بندہ تھا اور ہر چیز میں خوبصورتی اور نفاست اس کی پہلی ترجیح ہوتی تھی۔ ان چیزوں پر وہ کسی صورت میں بھی سمجھوتہ کرنے کا قائل نہیں تھا اس وقت وہ خود بھی جو رجیو آرمانی کا پینٹ شرٹ سوٹ ہیوگو بوس کی ٹائی اور چینل فائیو کا پرفیوم لگائے ہوئے تھا۔ عام چیز تو اس کی نظروں کے آگے کسی صورت بھی نہیں ٹھہرتی تھی۔

اس نے بمشکل ایک منٹ اس کے سی وی پر سرسری نظر ڈالی اور فائل ٹیبل پر رکھ دی۔ ہاتھ میں پکڑا قیمتی پین فولڈر میں لگایا اور لا تعلق سے انداز میں بیٹھی عانیہ کو دیکھا جو آفس میں لگی بیننگ کو بہت غور اور توجہ سے دیکھ رہی تھی۔

”دیکھیں عانیہ! مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ہمارے چینل کیلئے جو کوالیفیکیشن

کے چہرے کے تاثرات بڑی تیزی سے تبدیل ہوئے۔ ناگواری کی بھرپور لہر نے بڑی تیزی سے اس کے وجود کا احاطہ کیا تھا۔ اتنی ہی سرعت سے مد مقابل نے اسکے تاثرات کو بڑی حیرت سے پڑھا تھا۔

”مجھے عانیہ جمیل کہتے ہیں۔“ اس نے فوراً اپنا تعارف کروایا، لیکن سامنے بیٹھے شخص کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

”مجھے رضا کاظمی نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔“ وہ مد مقابل کی تیوری کے بل کم کرنے کیلئے مجبوراً مزید بولی تھی جبکہ ارحم بخاری جاچتی نظروں سے اس کا جائزہ لینے میں مگن تھا۔ اسے رہ رہ کر اپنے لنگویے دوست رضا پر شدید غصہ آ رہا تھا جو بد قسمتی سے اس کا بزنس پارٹنر بھی تھا اور پچھلے چار روز سے وہ عانیہ جمیل نامی لڑکی کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔

”یار! وہ بہت زبردست لڑکی ہے“ قلم پر اس کی گرفت خاصی مضبوط اور حالات حاضرہ پر گہری نظر ہے۔ وہ ہر لحاظ سے انتہائی زبردست لڑکی ہے۔“

ارحم بخاری نے ایک دفعہ پھر رضا کی ”زبردست“ لڑکی کو غور سے دیکھا، سفید ملل کے عام سے دوپٹے نیلے رنگ کے پھولوں والی لان کی قمیض کے ساتھ وہ سفید شلوار میں ایک انتہائی ”عام“ سی لڑکی تھی۔ اس کے پیروں میں وہ اڑھائی سو کی شاید کسی سیل میں خریدی گئی چپل اور کندھے پر براؤن کلر کا بوسیدہ سا چمڑے کا بیگ تھا جو اس کی کمزور معاشی حالت کی داستان کھل کر سنارہا تھا۔ اس نے درمیان سے مانگ نکال کر بال بنا رکھے تھے جبکہ چہرہ میک اپ سے بالکل مبرا تھا۔ نین نقش اس کے اچھے تھے اور رنگت بھی صاف تھی، لیکن وہ کہیں سے بھی رضا کے بتائے گئے ”زبردست“ کے خاکے پر پورا نہیں اترتی تھی۔

وہ بالکل اس کے سامنے والی سیٹ پر بڑے ٹھہراتق سے گردن اٹھا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا انداز اس کے حلیے کے بالکل برعکس تھا جس کی وجہ سے ارحم کو اس پر نہ جانے کیوں غصہ آنے لگا تھا۔

”کسی بھی تعلیم یافتہ مہذب انسان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ بغیر اجازت کسی کے آفس میں بیٹھ جائے۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رضا کا غصہ اس پر اتار بیٹھا تھا اور اس کی یہ کوشش نادانستہ تھی۔

دروارہ ہے آپ اس پر پورا نہیں اتریں اس لئے آئی ایم سوری۔“ اس نے اپنی طرف سے بھرپور شاٹ لگائی جبکہ دوسری طرف اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

”ہاں! مجھے بھی اندازہ ہو رہا ہے کہ جس پوسٹ کیلئے مجھے رضا صاحب نے بھیجا ہے میری کوالیفیکیشن اس لحاظ سے زیادہ ہے۔“ عانیہ نے اسے کلین بولڈ کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

”زیادہ ہے؟“ ارحم کے طنزیہ انداز میں حیرت کی فراوانی تھی۔ اسے عانیہ کے تاثرات سراسر اپنا مذاق اڑاتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ اپنے بیک سے چیونگم نکال کر اب لا پرواہی سے منہ میں ڈال رہی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ آپ کو اپنے بارے میں ضرورت سے زیادہ غلط فہمی ہے۔“ وہ متعثرانہ انداز سے مسکرایا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس لڑکی کو آخر کس چیز کا زعم ہے۔

”مجھے اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں، لیکن میں آپ کی یہ خوش فہمی دور کرنا چاہتی ہوں کہ آپ کے چینل کو جمعہ جمعہ ابھی آٹھ دن بھی نہیں ہوئے ابھی تو آپ کے اپنے پورے خاندان کو اس کے نام کا بھی علم نہیں ہوگا، جبکہ میں جس چینل کو چھوڑ کر آئی ہوں اس سے تو حکومت وقت بھی خوفزدہ ہے۔ آپ لوگ یونیورسٹی سے تازہ تازہ فارغ التحصیل بیروزگار نوجوانوں کو انٹرویو کیلئے بلوائیں تو وہ شاید اپنی خدمات اس نئے چینل کو دینے پر راضی ہو جائیں ورنہ میرے جیسے لوگوں کیلئے تو ہر چینل کے دروازے کھلے ہوں گے وہ یہاں آ کر اپنا ٹائم کیوں ضائع کریں گے۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

ارحم کے اعصاب تن گئے تھے۔ اس نے بمشکل اپنے اندر اٹھتے جوار بھالنے کو دبایا تھا اور تیوری پر پل ڈالے اس منہ پھٹ اور بدتمیز لڑکی کو دیکھا تھا جس کے اعصاب خاصے مضبوط تھے۔ وہ اپنی فائل بیک میں ڈال کر اب چڑانے کے انداز میں چیونگم چبا رہی تھی۔

”رضا صاحب کو میرا پیغام دے دیجئے گا کہ برائے مہربانی مجھے مزید بار بار فون کر کے میرا وقت ضائع کرنے کی کوشش نہ کریں تو بہتر ہے، کیونکہ میں زیادہ دیر تک مروت کا مظاہرہ نہیں کر سکتی۔“ وہ اب باہر نکل رہی تھی۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے چیونگم کا بڑا سارا غبارہ بنا کر پھوڑا تھا اور اس کی اس حرکت پر ارحم مشتعل ہو کر اسے کھری کھری سنانے کیلئے کھڑا ہوا، لیکن وہ آفس سے جا چکی تھی۔

”کیا چیز تھی یہ.....؟“ وہ جی بھر کے بد مزہا ہوا تھا۔



ارحم کا دماغ بھک کر کے اڑا تھا۔

وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مظہر صاحب اس ال میزڈ بدتمیز اور فضول سی لڑکی کی وجہ سے اپنے سب سے لاڈلے بیٹے کی طبیعت ایک منٹ میں صاف کر دیں گے۔ وہ پہلی دفعہ زندگی میں پاپا کے سامنے خائف ہوا تھا جو بول نہیں رہے تھے بلکہ ان کے منہ سے آگ کے گولے نکل رہے تھے جو تاک تاک کر اس کے اور رضا کے اوپر لگ رہے تھے۔

ابھی ایک گھنٹہ پہلے ہی تو انہوں نے ان دونوں کو ہنگامی میٹنگ کیلئے بلایا تھا۔ رضا اس سے دس منٹ پہلے ہی پہنچا تھا اور گھبرائی ہوئی نظروں سے سرمئی مگر کے ٹوپس سوٹ میں مظہر صاحب کو دیکھ رہا تھا جن کے چہرے کے نقوش غصے کی زیادتی سے بگڑے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر مخصوص دھیمی اور پروکاری مسکراہٹ آج ناپید تھی اور آج تو وہ لفظوں کے چناؤ کے معاملے میں بھی سخت غیر محتاط تھے۔

”رضا! تمہیں کس سٹوڈنٹ نے کہا تھا کہ عانیہ جمیل کو انٹرویو کیلئے اس ڈفر کے پاس بھیجو جس کو خود جرنلزم کی الف بے کا نہیں پتا، میں چار دن کیلئے ملک سے باہر کیا گیا، سارا معاملہ ہی خراب کر دیا۔“ وہ اس قدر مشتعل کیوں ہو رہے ہیں ارحم یہ سمجھنے سے قاصر تھا اور ”ڈفر“ کے خطاب پر اس نے احتجاجی نظروں سے پاپا کو دیکھا جو اس وقت آنکھیں ماتھے پر رکھے بیٹھے تھے۔

”اصل میں انکل! اس نے مجھے اچانک ہی بتایا تھا کہ اس کے پاس ایک اور آفر بھی موجود ہے اس لئے میں نے ارحم کے پاس بھجوا دیا۔“ رضا نے ایک مرتبہ پھر صفائی دینے کی ناکام کوشش کی۔

”ماشاء اللہ!“ انہوں نے طنزیہ نظروں سے اپنے سپوت کو دیکھا۔ اب کے وہ بولے نہیں ہنکارے تھے۔

”تمہیں پوری دنیا میں ایک یہ ہی عقل مند ملا تھا جس کے پاس اس اچھی خاصی لڑکی کو بھجوا دیا، کیا قریشی صاحب مر گئے تھے یا میں نے پاکستان واپس نہیں آنا تھا۔“

وہ بری طرح جھنجھلا رہے تھے۔ ان کے سخت طنزیہ لہجے پر ارحم نے ناگواری سے صوفے

پر پہلو بدلاتھا۔ اس کے ذہن و دل بھی سخت کھولن میں تھے اور رضا کے چہرے پر پوشیدہ منظوم ہونے والی مسکراہٹ کو صرف ارحم بخاری ہی پڑھ سکتا تھا اور یہ تحریر اسے مزید زچ کر رہی تھی۔  
”اگل! آپ اتنی زیادہ ٹینشن کیوں لے رہے ہیں، کوئی اور راستہ نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔“ رضا نے انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی جو بے سود گئی۔

”ٹینشن نہ لوں تو اور کیا کروں، مجھے لگتا ہے کہ وہ الو کا پٹھا سلطان ہاشمی اسے ایک دفعہ پھر ہار کر لے گا۔“ انہوں نے اپنے بدترین خدشے کا اظہار کیا۔

”یہ بات تو آپ اپنے ذہن سے نکال دیں کہ وہ سلطان ہاشمی گروپ میں واپس جائے گی۔ میں اس کے مزاج سے آگاہ ہوں اور وہ جس طرح ہاشمی کی طبیعت صاف کر کے آئی ہے اور استغنیٰ باقاعدہ اس کے منہ پر مار کر آئی ہے وہ دوبارہ کسی صورت وہاں نہیں جائے گی، چاہے وہ اسے ایک کالم کا ایک لاکھ ہی کیوں نہ دیں۔“ رضا کی تسلی پر وہ تھوڑا سا ٹھنڈے ہوئے تھے۔ چہرے پر تناؤ کی کیفیت میں بھی کمی آ گئی تھی۔

”لیکن وہ دنیا کا گھٹیا ترین انسان جمشید سبحانی بھی تو اس کے تعاقب میں ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ بھی اس کے چکروں میں ہے، ظاہر ہے کہ کام کی چیز کون اپنے ہاتھ سے گنوتا ہے۔ یہ تو ہماری اولاد ہے جس نے عقل نام کی چیز کو طاق پر سجا رکھا ہے ورنہ وہ اچھی خاصی راضی تھی اور صرف پیکیج ملے کر نا باقی تھا۔“ مظہر صاحب کی بات ارحم کو کوڑے کی طرح لگی تھی۔

”رہنے دیں پاپا! آپ خواہ مخواہ اسے اہمیت دے رہے ہیں جیسے ”بابائے صحافت“ کا خطاب اسے ہی ملنے والا ہو۔ ایسے کون سے پر لگے ہوئے ہیں محترمہ کو۔“

”وہ خاصے غلط موقع پر انتہائی بے تکا بولا تھا۔ مظہر صاحب نے انتہائی غضبناک نظروں سے اسے دیکھا اور ترش کر بولے۔

”رضا! ذرا بتاؤ اس احمق اعظم کو کیا چیز تھی وہ اس کی تو ایڈورٹائزنگ ایجنسی نے مت مار رکھی ہے اور رہی سہی کسر اس ایجنسی میں آنے والی سوکھی سڑی سفید چڑی والی بے وقوف لڑکیوں نے پوری کر رکھی ہے۔ ان جاہل اور دماغ سے عاری لڑکیوں کے ساتھ رہ رہ کر یہ خود بھی دیا ہی ہو گیا ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ میڈیا میں اس جیسے بے وقوف لوگ جو گھر آیا ٹیلنٹ اپنے حریفوں کے حوالے کر دیتے ہیں وہ زیادہ دیر تک چل نہیں سکتے۔“

مظہر صاحب آج حد درجہ برہم ہو رہے تھے، چونکہ ارحم کو ان سے اس قدر برہمی کی توقع نہیں تھی اس لئے وہ خفگی سے بولا تھا۔  
”مجھے تو اس میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی جس کی وجہ سے آپ میری انلٹ کر رہے ہیں۔“

”لا حول ولا قوۃ۔“ مظہر صاحب نے جھنجھلا کر پانی کا گلاس شیشے کی میز پر پٹا تھا اور شعلے برساتی نظروں سے ارحم کو دیکھا، جس کا چہرہ غصے کی زیادتی سے سرخ ہو رہا تھا۔

”تمہاری طرح اس نے بی گریڈ میں ساری ڈگریاں اکٹھی نہیں کر رکھی ہیں۔“ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے انہوں نے خاصا بڑا طنز کیا تھا۔ ارحم نے سخت احتجاجی نظروں سے انہیں دیکھا اور اس دفعہ بولنے سے پرہیز کیا۔

”پنجاب یونیورسٹی میں ایم فل میں گولڈ میڈل لے چکی ہے اور اس وقت سے لکھ رہی ہے جب تمہارے جیسے لڑکے اولیوں کی کتابوں میں متھا مار رہے ہوتے ہیں۔ ٹاپ کے اخبارات میں لکھ چکی ہے۔ ہائی ریننگ والے جیٹل پر کام کرنے کا وسیع تجربہ رکھتی ہے اور وہ جو سلطان ہاشمی نامور کالم نگار ہے اسے تو قلم بھی پکڑنا نہیں آتا، بے شمار ایوارڈز وہ اسی لڑکی کی وجہ سے لے رہا ہے۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا.....؟“ ارحم بالکل نہیں سمجھا تھا۔  
”مطلب تو صاف ظاہر ہے کہ سلطان اسی سے کالم لکھواتا تھا اور اپنے نام سے چھپوا کر

واہ واہ کرواتا تھا اور وہ جو سیاست پر اپنا مشہور و معروف پروگرام کر کے سیاستدانوں کے پرچے اڑاتا تھا اس پروگرام کے پیچھے بھی ساری محنت اور تحقیق اسی لڑکی کی ہوتی تھی جس کی وہ الو کا پٹھا کیش کر رہا تھا۔ اللہ جانے ایسے کاٹھ کے الو اس سلطان کو کہاں سے مل جاتے ہیں۔“ مظہر صاحب کے اس انکشاف پر باوجود خفگی کے ارحم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”لیکن وہ بے وقوف لڑکی کیوں اس کو لکھ کر دیتی ہے اپنے نام سے کیوں نہیں چھپواتی۔“ وہ بری طرح جھلایا تھا۔

”ہوتے ہیں ایسے خردماغ لوگ جن کو نام و شہرت سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ وہ صرف معاوضے کیلئے اپنی تخلیق کو دوسروں کا نام سوپ دیتے ہیں۔“ وہ اب سگار سلاک رہے تھے اور ان کا ذہن مختلف قسم کی سوچوں کو جمع تفریق کر رہا تھا جبکہ نظرات کا جال ان کے چہرے پر جوں کا

توں تھا۔

رضانے گلا کھنکھار کر ان کو اپنی طرف متوجہ کیا اور قدرے محتاط انداز سے کہا۔ ”میرے خیال میں انکل! مجھے عانیہ جمیل سے ایک دفعہ پھر بات کرنی چاہئے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی درمیانی راہ نکل آئے اور میں ارحم کے رویے پر ایکسکیوز بھی کر لوں گا۔“

منظہر صاحب کسی خیال سے چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ ”ہاں کر کے دیکھو! لیکن جس قسم کے مزاج کی وہ لڑکی ہے، میرا خیال ہے کہ مشکل سے ہی راضی ہوگی۔“ انہوں نے صاف گوئی سے کہا تو وہ کندھے اچکا کر رہ گیا۔



رضا انتہائی سخت صدمے اور تاسف بھری نظروں سے اپنے سامنے بیٹھے ارحم بخاری کو دیکھ رہا تھا، جولا پروائی سے چکن شاشک سے بھرپور انصاف کر رہا تھا۔

”یار! مجھے ابھی تک اس بات کا یقین نہیں آ رہا کہ تم نے اس لڑکی کو صاف شکل و صورت کی بناء پر رجحیکٹ کیا تھا، حالانکہ تم سے امید تو اسی بات کی رکھنی چاہئے لیکن میرا خیال تھا کہ وہ تو انکل کے آفس میں ہوگی، اس لئے تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہوگا۔“ میریٹ میں لچا کرتے ہوئے رضانے اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ اسے جب ارحم نے اصل وجہ بتائی تو اس کا دماغ بھی بھک کر کے اڑا تھا۔

”فارگا ڈسک رضا! اب تم پاپا کی طرح مجھے یہ لیکچر مت دینا کہ وہ کتنی ذہین و فطین ہے اور یہ کہ اس کا تعلق افلاطون کے خاندان سے ہے وغیرہ وغیرہ۔ مجھے اچھی طرح اندازہ ہے کہ پاکستان میں کیسا کیسا ٹیلنٹ رل رہا ہے۔ پاپا ایک دفعہ نیوز پیپر میں ایڈ تو دے کر دیکھیں! منوں کے حساب سے بیروزگار لوگوں کی درخواستیں آئیں گی اور بہت سے لوگ تو مفت میں بھی کام کرنے کو تیار ہوں گے۔“ وہ اب پاستا کھا رہا تھا۔

”لیکن ہمیں درجنوں کے حساب سے نا تجربہ کار لوگوں کی ضرورت نہیں ہے۔ مسابقت کی اس دوڑ میں کسی بھی چیلن کو اپنی جگہ بنانے کیلئے انویسٹمنٹ کے علاوہ زرخیز دماغوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ صحافت کی دنیا میں بھا کی جنگ ہے یار۔“ رضا کی بھوک اڑ چکی تھی۔

”تو تم اور پاپا بھا کی جنگ ہارس ٹریڈنگ کر کے لڑنا چاہتے ہو؟“ ارحم کے چہرے پر دل جلانے والی مسخرانہ مسکراہٹ تھی۔ رضا کو سخت افسوس ہوا تھا۔

”ہم نے کسی بھی قسم کی ہارس ٹریڈنگ نہ کی ہے اور نہ کریں گے۔ بہتر سے بہتر کی تلاش کئے نہیں ہوتی اور اگر کوئی بہتر معاوضے کیلئے کسی ادارے کو چھوڑ کر کسی اور جگہ جاتا ہے تو یہ اس کا حق ہے، ہم اسے اس حق سے محروم نہیں کر سکتے۔“ وہ ٹھنڈے پانی سے اپنے اندر کی جلن کم کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

”اور اگر وہ تمہارا ادارہ چھوڑ کر کہیں چلا جائے تو؟“ ارحم نے طنز کیا۔

”ہمیں تب بھی کوئی اعتراض نہیں۔“ وہ فوراً بولا تھا۔

”بہر حال جو کچھ بھی ہوا میں نے دانستہ طور پر نہیں کیا، مجھ سے خود بخود ہو گیا۔ تمہیں معلوم ہے ناں کہ میرے کچھ اصول ہیں اور میں ان سے انحراف نہیں کر سکتا۔ میں حد درجہ ایٹینس کنشس ہوں اور مجھے اپنی اس عادت پر کوئی شرمندگی نہیں۔ میں حد درجہ نفس طبیعت کا حامل ہوں اور جو لوگ مجھے پہلی نظر میں اچھے نہیں لگتے، میں ان سے بات بھی نہیں کرتا۔“ وہ ٹشو پیپر ڈسٹ بن میں ڈالتے ہوئے حد درجہ تلخ لہجے میں بولا تھا۔

”انسانیت کے ناتے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔“ رضا کا انداز طنز لے ہوئے تھا۔

”ہوتے ہوں گے، لیکن اپنی زندگی کیلئے اصول و ضابطے میں خود مرتب کرتا ہوں۔“ اس نے سکون سے جواب دیا تھا۔

رضا کا سارا موڈ غارت ہو گیا تھا، حالانکہ وہ ارحم کی ان عادتوں سے اچھی طرح آگاہ تھا لیکن آج نہ جانے کیوں اس کا دل دکھ اور تاسف کے گہرے احساس سے بھر گیا تھا۔ اس نے خفگی سے اپنے سامنے بیٹھے اپنے سب سے قریبی دوست کو دیکھا، جو گلاس ڈور سے اندر داخل ہوئی ایک قیامت کو اشتیاق بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سامنے ہی ایک محترمہ شعلہ جولا بنی اندر آ رہی تھیں۔ نیوی بلیو کلر کی ساڑھی میں اس کے وجود کے سارے زاویے نمایاں تھے۔ وہ اس قدر خوبصورت تھی کہ اس وقت لچ کیلئے آئے سب ہی لوگوں کی نظروں اس پر لگی ہوئی تھیں۔ آستینوں سے بے نیاز اس کی سفید دودھیابانہیں بہت دل آویز لگ رہی تھیں۔ بالوں کا نفیس سا جوڑا درمیں گردن میں نازک سا ٹیٹیکلس تھا۔ سیلنے اور مہارت سے کئے گئے میک اپ نے اس کے چہرے کے خوبصورت نقوش میں ایک محسوس کی جانے والی دکشی بھر دی تھی۔

وہ نزاکت سے قدم اٹھاتی پہلے سے ریزرو میز کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔ اپنے



اسٹائش سے پرس سے وہ اپنا بلیک بیری سیل فون نکال کر اب کوئی نمبر ڈائل کر رہی تھی۔  
 ارحم کی نگاہیں مقناطیس کی طرح اس کے خوبصورت چہرے پر لگی ہوئی تھیں جبکہ رضائے  
 سخت خائف ہوتی نگاہوں سے ارحم بخاری کو دیکھتے ہوئے انتہائی ناگواری سے کہا۔  
 ”بس کرو اسے دیکھنا آج کی قسط کیلئے اتنا ہی کافی ہے۔“  
 ارحم چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا اور اس کا خفا خفا انداز دیکھ کر ڈھٹائی سے ہنس پڑا  
 تھا۔

”اب بتاؤ اس لڑکی کو دیکھ کر خیال نہیں آتا کہ اس کا نام ”عانیہ“ ہونا چاہئے۔“  
 ”اس کے نام کا تو پتا نہیں، لیکن تمہارا نام ”لوفر“ ہونا چاہئے تھا۔“ رضائے جل کر کہا تو  
 ارحم کیلئے بے ساختہ تہمت پر بہت سے لوگ متوجہ ہوئے۔  
 ”یہ لڑکی میرے اگلے ایڈ میں آئے گی۔“ وہ بہت پر اعتماد انداز میں اسے اطلاع دے  
 رہا تھا۔

”ہر خوبصورت لڑکی عقل سے عاری نہیں ہوتی۔“ رضائے سابقہ طعنیہ انداز سے کہا۔  
 ”چلو دیکھتے ہیں۔“ اس کی مسکراہٹ میں واضح کھسیاہٹ تھی۔



”جسم کو جھلسا دینے والے لوگ تھپڑے اسے سخت اذیت میں مبتلا کئے دے رہے  
 تھے۔ اس نے سراٹھا کر چپکتے وکتے آفتاب کو دیکھا جو آج آتش فشاں بنا ہوا تھا۔ اس نے  
 لان کے دوپٹے سے چہرے پر آیا پسینہ صاف کیا اور اپنے چڑے کے بیگ کو دائیں سے  
 بائیں کندھے پر منتقل کیا۔

اس نے اپنے قریب موٹر سائیکل رکھنے کی آواز سنی تھی۔ وہ اس کے بہت قریب آ کر بیٹھا  
 تھا۔

”آ جاؤ بہت گرمی ہے میں تمہیں شاپ تک چھوڑ آتا ہوں۔“

وہ ایک دم اچھلی دل بے قابو ہوا لیکن سامنے مانوس چہرہ دیکھ کر اس نے سینے پر بے  
 اختیار کھانا تھام لیا۔

”تم کیا الہ دین کے جن کی طرح ہر جگہ نازل ہو جاتے ہو.....“ اپنی بے ترتیب  
 سانسوں کو قابو میں لاتے ہوئے وہ بمشکل بولی تھی۔ جواب میں اس کے لبوں پر ایک گہری

اور جاندار مسکراہٹ ابھری تھی۔

”ایک اسائنمنٹ کے سلسلے میں کسی سے ملنا تھا۔“ اس نے مختصر جواب دیا اور اس کے  
 ہاتھ میں پکڑا سبزی کا شاپر آرام سے لیا اور موٹر سائیکل کے آگے لٹکا دیا اور اسے بیٹھنے کا اشارہ  
 کیا۔ وہ بھی چوں چوں کے بغیر بیٹھ گئی تھی۔

دس منٹ کے بعد وہ اپنا موٹر سائیکل اس تنگ سی گلی میں داخل کر چکا تھا۔ اسے اس گلی  
 میں مہارت سے موٹر سائیکل چلانے کا خاصا تجربہ تھا۔ وہ اب مندر کے آگے موٹر سائیکل کھڑی  
 کر چکا تھا۔

”آؤ کالی ماما کو سلام کر آتے ہیں۔“ اس نے حسب معمول اسے چھیڑا تھا۔ معلوم تھا  
 کہ وہ اس بات سے خاصی چڑتی تھی۔

رام بلڈنگ کے آگے اس کے پڑوس میں رہنے والی گیتی آرا کے پانچوں چھوٹے بہن  
 بھائی کھیلنے میں مصروف تھے۔ ان دونوں کو دیکھ کر انہوں نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ وہ اپنی بوسیدہ  
 بلیو جینز کی پیٹ سے ٹافیاں اور چیونٹ نکال کر ان بچوں کو تقسیم کر رہا تھا۔

”تم تو کہہ رہے تھے کہ تم کسی اسائنمنٹ کے سلسلے میں جا رہے ہو؟“ عانیہ نے شکوہ  
 کناں نظروں سے اپنے سامنے کھڑے عبدالباری کو دیکھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ یہ ٹافیاں  
 اور چاکلیٹس صرف اسی دن خریدتا تھا جس دن اس نے عانیہ کے علاقے میں آنا ہوتا۔

”یار! تمہیں معلوم ہے ناں کہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔ اسائنمنٹ سے فارغ ہو کر مجھے  
 تمہاری طرف آنا تھا۔ تمہاری ایک امانت تمہیں دینی تھی۔“ وہ اس کے ساتھ اب بوسیدہ  
 میڑھیاں چڑھ رہا تھا جبکہ عانیہ نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔

”تم لوگ اپنی اس بلڈنگ کے مالک ہندو بیٹے سے کہتے کیوں نہیں ہو کہ اس عمارت  
 کا حلیہ درست کروائے کسی دن یہ زمین پر آن گرے گی۔“ وہ کئی دفعہ کا دیا ہوا مشورہ ایک دفعہ  
 پھر دہرا رہا تھا۔

”جس دن زمین پر آن گرے گی تب تو اس کو ٹھیک کروانا اس کی مجبوری ہوگی، لیکن اس  
 سے پہلے تو وہ ایک کان سے کن کر دوسرے کان سے اڑا دیتا ہے۔“ وہ سنجیدگی سے اس کی بات  
 کا جواب دے رہی تھی جو لا پرواہی سے میڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

”ویسے یہاں آ کر مجھے احساس ہوتا ہے جیسے میں برصغیر پاک و ہند کے دور میں آ جاتا

ہوں جہاں ہندو اور مسلمان دونوں مل کر رہتے تھے، تم لوگ آپس میں لڑتے نہیں ہو؟“ وہ یونہی باتیں کر رہا تھا حالانکہ وہ اتنے سالوں سے یہاں آ جا رہا تھا کہ کوئی بھی بات اس سے پوشیدہ نہیں تھی۔

”کیوں ہم لوگ انسان نہیں ہیں کیا؟ لیکن اس بلڈنگ میں رہنے والے ہندوؤں کے آباؤ اجداد اسی علاقے میں رہتے رہے ہیں اور یہ چند گھرا لیے ہیں جو تقسیم کے بعد بھی ہندوستان نہیں گئے اور پاکستان سے محبت کے معاملے میں کم از کم یہ لوگ ہم سے بہت آگے ہیں۔ جس دن پاکستان انڈیا سے ورلڈ کپ کا سیسی فائنل ہارا، اس دن یہ لوگ ہم سے زیادہ افسردہ تھے۔ گیتی نے تو پاکستان کی جیت کیلئے خصوصی پوجا کا اہتمام بھی کیا تھا۔“ وہ ہنستے ہوئے بتا رہی تھی۔ اس بلڈنگ کے چار فلور تھے اور ہر فلور پر چار فلیٹ تھے۔ عانیہ کا فلیٹ سیکنڈ فلور پر تھا۔

وہ سبز رنگ کے بدنما سے لوہے کے دروازے کو دھکیل کر اندر داخل ہو چکی تھی۔ سامنے ضعیف اور کمزور سے ابا چار پائی پر لیٹے خالی نظروں سے ٹی وی کو دیکھتے جا رہے تھے۔ عبدالباری نے بہت عقیدت سے انہیں سلام کیا تھا۔ ابا کی آنکھوں میں اسے دیکھ کر لمبے لمبے ایک چمک ابھری اور پھر معدوم ہو گئی۔

”ارے باری بھیا آئے ہیں۔“ نمرہ کے چہرے پر بے ساختہ خوشی کا احساس خاصا نمایاں تھا۔

”پہلی دفعہ تھوڑی آیا ہوں، جو اتنی خوشی کا اظہار کر رہی ہو۔“ اس نے جواباً اس کے سر پر چپٹ لگاتے ہوئے کہا۔ وہ ابا کے پاس چار پائی پر بیٹھ چکا تھا جبکہ عانیہ نے سبزی کا شاہرہ بکن میں رکھا اور منہ ہاتھ دھونے کیلئے غسل خانے میں کھس گئی۔

وہ منہ ہاتھ دھو کر واپس آئی تو وہ بڑی رغبت سے دال چاول کھا رہا تھا اور کم گو سے ابا اس کے قصوں پر مسکرا رہے تھے۔ اس کی آمد ہمیشہ ابا اور نمرہ کیلئے طمانیت کا باعث بنتی تھی۔

وہ عانیہ کے ساتھ ماس کیونی کیشن میں ماسٹرز کر چکا تھا۔ وہ کب اس کے اتنا قریب ہوا عانیہ کو اس کا احساس بڑی دیر بعد ہوا تھا۔ وہ اپنی تمام الجھنیں، غم اور پریشانیاں اس کے ساتھ شیئر کر کے خود ہلکی پھلکی ہو جاتی تھی۔ آج سے چھ سال پہلے اس کی آمد و رفت اس کے گھر میں تب شروع ہوئی جب بڑے ابا کو ہسپتال میں داخل کر دانا پڑا۔ ان کی ماں کے انتقال کو دس

سال ہو چکے تھے اور وہ صرف تین بہنیں تھیں۔ ابا نے بہت شوق سے انہیں تعلیم دلوائی تھی۔ بس نمرہ کی دفعہ حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ اسے اپنی تعلیم کو پرائیویٹ طور پر جاری رکھنا پڑا ورنہ اس کی دونوں بڑی بہنوں نے بہت اچھے تعلیمی اداروں سے ڈگریاں لے رکھی تھیں۔

وہ چار پائی پر دونوں ٹانگیں پھیلا کر ابھی لیٹی ہی تھی کہ باری کو اندر کمرے میں آتا دیکھ کر اس نے فوراً ٹانگیں اکٹھی کر لیں۔ اس نے سائینڈ میز پر رکھے خالی برتنوں سے اندازہ لگایا کہ وہ کھانا کھا چکی ہے تو ایک اطمینان کی لہر اس کے اندر دوڑ گئی۔

”کیا بنا جاب کا؟ وہ جو بخاری گروپ والوں نے تمہیں بلوایا تھا؟“ بے حد سنجیدگی بھرے انداز سے پوچھتے ہوئے وہ سامنے بڑی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

”کچھ بھی نہیں.....“ لہجے میں تلخی اور بے بسی کے طے جلے تاثر نے باری کو بھی افسردہ کر دیا تھا۔ وہ نمرہ کے ہاتھوں سے چائے کا کپ پکڑتے ہوئے حیرت سے بولا تھا۔

”لیکن ان لوگوں نے تو تمہیں خود بے حد اصرار کر کے بلایا تھا اور وہ کیا نام ہے رضا تمہیں بار بار کانٹ کر رہا تھا۔“

”بس یہ بڑے لوگوں کے اپنے جو نچلے ہوتے ہیں۔ کیا پتا چلتا ہے کہ کس بات پر مزاج برہم ہو جائے۔“

”تم کہو تو میں خود رضا سے بات کر کے دیکھوں۔“

”ہرگز نہیں۔“ وہ تیزی سے بولی تھی۔ ”مجھے ان کے ادارے میں اب کام نہیں کرنا۔“ وہ دو ٹوک انداز سے کہہ رہی تھی۔

”دیکھو عانیہ! تمہیں اپنے رویے میں بھی لچک پیدا کرنی چاہئے، زندگی ایسے نہیں گزرتی اور اس دور میں جب بیروزگاری کا عفریت منہ کھولے نو جوانوں کو نکلنے کو بے تاب ہے، تم ذرا ذرا سی بات پر استغنیٰ دے کر آ جاتی ہو۔“

”وہ ذرا سی بات نہیں تھی باری!“ اس نے احتجاجی نظروں سے اسے دیکھا جو چائے کے خالی گک کو ہاتھ میں گھما رہا تھا۔

”تمہیں معلوم ہے کہ وہ عام سی بات نہیں تھی۔ اپنی تخلیق کو کسی دوسرے کا نام دینا کوئی آسان کام نہیں۔ خون جگر جلانا پڑتا ہے۔ آدھی آدھی رات تک بیٹھ کر میں نے صفحات کالے کئے تھے۔ انٹھک محنت کی چکی پیسی تھی، تب جا کر اس سلطان کینے کا صحافت کی دنیا میں ایک

”اس لئے کہ تم جانتی ہو کہ وہ میرا سگا باپ نہیں ہے، میری ماں کا دوسرا شوہر ہے اس کے پیوں پر میرا کوئی حق نہیں۔“

ماحول ایک دم عجیب سا ہو گیا تھا۔ نمرہ نے گھبرا کر ان دونوں کے خاموش سگلتے ہوئے اُردوں کو دیکھا جو کسی دیمک زدہ الماری میں رکھی گرد سے اٹی کتابوں کی طرح لگ رہے تھے۔ ان کیلئے ان دونوں کی بحث کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ دونوں ایک دوسرے سے بے لڑتے جھگڑتے اور کبھی نہ ملنے کا عہد کر کے بھی اگلے ہفتے اکٹھے بیٹھے ہوئے ہوتے تھے۔ عبدالباری کے خلوص پر عانیہ جیل کو کبھی بھی شبہ نہیں ہوا تھا۔ وہ دنیا میں واحد شخص تھا جس پر وہ آنکھیں بند کر کے اعتبار کرتی تھی، جس کے سامنے اس نے کبھی خودداری اور جھوٹی انا کا فیہ نہیں تانا تھا۔ وہ بہت رجائیت پسند تھی اور بڑے بڑے حادثوں کو جھیل کر بھی مطمئن رہتی، لیکن رانی جو کہ عانیہ سے جھوٹی تھی، اس کے گھر چھوڑنے کے فیصلے نے اسے وقت سے پہلے تھکا دیا تھا۔ تھکن کا ایک واضح احساس اس کے چہرے پر نمودار ہو گیا تھا۔



کمرے میں اے سی کی وجہ سے دل کو طمانیت بخشنے والی خنکی پھیلی ہوئی تھی حالانکہ اس کی گاڑی میں بھی اے سی تھا، لیکن پارکنگ سے اس آفس کے درمیانی راستے میں پھیلی گرنی کی تمازت نے اس کا چہرہ سرخ کر دیا تھا۔

وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی، اس کے جلتے ہوئے مساموں کو عجیب طرح کی فرحت کا احساس ہوا۔ کمرے میں کسی دلفریب ایئر فریشنر کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس خوبصورت آفس کے وسط میں وسیع و عریض ٹیبل اور اس کے عقب میں ریوالونگ چیئر پر موجود ارحم نے بڑی خوشگوار مسکراہٹ سے مارہ شیخ کا استقبال کیا تھا۔ ارحم کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ اس نے بہت غور سے اس حسین و جمیل پیکر کو دیکھا۔

گلابی رنگ کے سوٹ میں اس کی گلابی رنگت دمک رہی تھی جبکہ اس کی قمیض کے سلیولس بازو میں سے جھانکتے ہوئے کندنی بازو کمر تک چھوٹے ہوئے گھنے سیاہ بال اور ستاروں کی طرح دمکتی آنکھیں اور ستواں ناک میں ڈائمنڈ کی نوزین..... کوئی بھی چیز آسانی سے نظر انداز نہیں کی جاسکتی تھی۔ اسے دیکھ کر یہی گمان ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی فرصت کے لمحے میں تخلیق کیا ہے اور لگتا تھا کہ وہ خود بھی اپنے حسن کے ہتھیار سے بخوبی واقف تھی اس

نام بنا تھا اور وہ مجھے میری ہی تحریر کا معاوضہ صرف پچیس پرینٹ دے رہا تھا اور خود پچھتر فیصد رکھ رہا تھا۔ چلو یہ بھی ٹھیک، لیکن اب ان ہی کالموں پر اس نے لاکھوں کا ایگری منٹ کیا اپنی کتاب کی رانٹلی کیلئے اور مجھے اس میں سے ایک پیسہ بھی دیے کو تیار نہیں۔“

وہ اپنے اندر پنپتے احساس کے زہر کو نکلتے ہوئے تنگی سے بولی تھی۔

”تو تم اپنے نام سے کیوں نہیں لکھتی ہو؟ ٹھیک ہے شروع میں کم معاوضہ ملے گا، لیکن کبھی نہ کبھی ایک نام تو بنے گا اور جب نام بن جائے گا تو لوگ تمہارے نعرے بھی اٹھائیں گے۔“

”آئی ایم سوری عبدالباری! میں اس کبھی نہ کبھی کے انتظار میں اپنے بیمار باپ کا علاج مؤخر نہیں کر سکتی۔ نمرہ کی پڑھائی ادھوری رہ جائے گی۔ یاد نہیں شروع میں اپنے آرٹیکل لے کر جہاں بھی گئی ہر ایک کی ڈیمانڈ تھی کہ فری لانسنگ کروں اور اگر معاوضہ بھی دیا تو اتنا کم کہ صرف ایک دن کا چولہا جل سکے۔“ وہ حد درجہ مایوس تھی۔

”لیکن کیا فائدہ عانیہ! تم خود کو ایسے ضائع کر رہی ہو دیکھو کتنے لوگوں کو پتا چل چکا ہے کہ سلطان ہاشمی کے نام کے پیچھے کسی اور کا ذہن ہے۔“ وہ جھنجھلا کر بولا تھا۔

”لیکن کوئی بھی اس ”اور“ کو اتنی محنت نہیں کرے گا، جتنی وہ سلطان بخاری کو کر رہا ہے۔ یہاں صرف نام اور ریفرنس چلتے ہیں۔ ٹیلنٹ کو کوئی نہیں دیکھتا اور تمہیں پتا ہے ناں کہ مجھے ریفرنس سے نفرت ہے۔ میری قابلیت کو کسی کی سفارش کی لاشی نہیں چاہئے۔“ وہ بھڑکی تھی۔ ایک لمحہ چپ رہ کر وہ تنگی سے گویا ہوئی۔

”مجھے بتاؤ عبدالباری! اگر میں غلط ہوں تو تم تو ایک بڑے باپ کے بیٹے ہو کیوں ان اخبارات میں دھکے کھاتے پھر رہے ہو؟ تمہارے باپ نے تو تمہیں اخبار تک نکالنے کا مشورہ دیا ہے، لیکن تمہاری خوددار طبیعت اس کی اجازت نہیں دیتی، تمہارے پاس تو ناپ کے ریفرنس ہیں، تم خود کیوں نہیں کسی اچھے ادارے میں جاتے؟“ اس کی بات پر عبدالباری کے چہرے پر تاریک سایہ پھیلا تھا۔

”میری بات اور ہے عانیہ!“ وہ دھیمے انداز سے بولا تھا اور بے ساختہ نظریں چرائی تھیں۔

”کیوں تمہاری بات اور کیوں ہے؟“ وہ سرکش ہوئی تھی۔

لئے ایک عجیب سی نخوت، محسوس کی جانے والی نزاکت و لا پرواہی اس کے انداز کا حصہ بن چکی تھی۔

ارحم بخاری نے اسی دن اس کا فون نمبر اپنی ایڈورٹائزنگ کمپنی کیلئے مانگ لیا تھا اور اسے قطعاً بھی اس معاملے میں دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا اور مائرہ نے نہ صرف دو دن بعد اس کے آفس کا وزٹ کیا تھا، بلکہ اگلے ایڈ کیلئے ایگری منٹ سائن کرنے میں بھی سوچ بچار نہیں کی تھی۔

وہ آج تیسری دفعہ اس کے آفس میں آئی تھی اور ارحم کو اپنے پورے آفس میں محسوس کی روشنیاں اترتی محسوس ہوئی تھیں اور دو تین ملاقاتوں میں ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ مائرہ شیخ نہ صرف حسین ہے بلکہ ایم اے انگلش کے بعد گفتگو کے فن پر بھی خاصا عبور رکھتی ہے۔ حالات حاضرہ پر اس کی خاصی گہری نظر تھی اور وہ خود کو شو بیز کی دنیا میں منوانا چاہتی تھی اس لئے اس نے ارحم کی آفر کو ایک لمحے میں قبول کر لیا تھا۔

وہ کون ہے؟ اس کا تعلق کس خاندان سے ہے؟ اس کا بیک گراؤنڈ کیا ہے؟ یہ وہ تمام سوالات تھے جن کے بارے میں مائرہ نے پہلی ملاقات میں بتا دیا تھا کہ وہ ان پر بات کرنا پسند نہیں کرتی۔ وہ اپنی ”ذاتیات“ کے بارے میں خاصی حساس تھی اور کسی حد تک منہ پھٹ بھی نہیں دیتی تھی، وہ جیسی کہ ہر کوئی اس سے محتاط ہو کر بات کرتا تھا۔ اس نے شو بیز میں اپنے سفر کا آغاز خاصے محتاط طریقے سے شروع کیا تھا۔ اندھا دھند رول قبول کرنے کی بجائے خاصی غور و فکر کے بعد اس نے ابھی ایک دو کمرشل ہی کئے تھے۔ ماڈلنگ کی دنیا میں وہ کئی دفعہ کیٹ واک کر چکی تھی، لیکن سفر کے آغاز میں اسے ابھی تک کوئی بمبائٹنگ ٹائپ چیز کرنے کا موقع نہیں ملا تھا، اس لئے وہ اپنے کیریئر کے بارے میں خاصی فکر مند تھی۔

وہ میریٹ میں ارحم کے ساتھ ڈنر کرنے آئی تھی، جہاں اس کی ایک مشہور و معروف چینل کے پروڈیوسر اور ڈائریکٹر کے ساتھ ملاقات طے تھی۔ وہ ان سے ارحم کے ریفرنس سے ملنے آئی تھی، اس لئے اسے امید تھی کہ آج معاملات کافی حد تک طے پا جائیں گے اور وہی ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ خاصی خوش تھی۔

واپسی پر ارحم اسے ڈیفنس میں اس کے گھر تک چھوڑنے آیا تو اس خوبصورت بچہ کو دیکھ کر اس نے توصیفی لہجے میں کہا کہ ”تمہارا گھر بہت خوبصورت ہے۔“

”یہ میرا گھر نہیں ہے، میں یہاں بے انگ گیسٹ کے طور پر رہتی ہوں۔“ اس نے فوراً ہجج کی توجیہ کی ایک سبک رفتار لہر نے ارحم کے چہرے کا احاطہ کیا۔

”تو پھر تمہارا گھر کہاں ہے؟“ وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے تجسس سے پوچھ رہا تھا۔

”فی الحال تو کوئی گھر نہیں البتہ مستقبل میں میرا ایک شاندار گھر بنانے کا ارادہ ہے۔“

اب کے اس نے محتاط لہجے میں جواب دیا تھا اور ارحم کو اندازہ ہو گیا تھا وہ اب اس موضوع پر مزید بات کرنا نہیں چاہتی، تب ہی وہ الوداعیہ جملے کہہ کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ اس نے گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے مائرہ کو دیکھا جس کے لمبے بال پشت پر لہرا رہے تھے اور وہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہی تھی ارحم کا دل اس کے ہاتھوں سے ویسے ویسے پھسل رہا تھا۔ اس نے جیسے ہی گھر کا گیٹ بند کیا تھا اسی وقت ارحم کے دل کا دروازہ پوری قوت سے کھلا تھا۔



ہال کے داخلی دروازے پر ایک قد آدم آرائشی شیشہ نصب تھا۔

نیوی بلیو کمر کے لباس میں وہ آج ضرورت سے زیادہ اچھی لگ رہی تھی یا پھر عبدالباری کو وہ ہر قسم کے حلیے میں اچھی لگتی تھی۔ آج پریس کلب میں صحافیوں کی کوئی ورکشاپ تھی اور عبدالباری کے بے پناہ اصرار پر وہ آج یہاں آئی تھی، تب ہی اسے خلاف توقع آتا دیکھ کر اس کے دل میں خوشی کا بے ساختہ احساس انگڑائی لے کر نمودار ہوا تھا۔

”کیا ہوا، اتنے غور سے کیوں دیکھ رہے ہو؟“ وہ تھوڑا سا پرل ہوئی۔ آج بہت عرصے کے بعد اس کے ہونٹوں پر لپ اسٹک دیکھ کر وہ کھل کر مسکرایا تھا۔

”کیا تکلیف ہے بھئی؟“ اسے معنی خیز انداز میں مسکراتے دیکھ کر وہ چڑ کر بولی تھی۔

”دیکھ رہا ہوں کہ آج تو لائف بوائے کی بجائے ”کس“ سے منہ ہاتھ دھویا ہے، تب ہی چمک رہی ہو۔“ وہ دونوں بازو سینے پہ لپیٹے گھرے جذبے لٹاتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”ہاں بس آج نمبرہ نے زبردستی لپ اسٹک لگا دی۔“ وہ بری طرح جھینپ کر بولی تھی۔ اس کے ہٹش کرتے رخساروں پر پھیلنے والی لالی کم از کم عبدالباری کیلئے بہت انوکھی اور دلچسپ تھی، جبکہ وہ خلاف عادت خاصی گھبرائی ہوئی دائیں بائیں گھومتے صحافیوں کو دیکھ رہی تھی۔ کئی جانے پہچانے چہرے گھومتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ اچانک اس کی نظر سلطان ہاشمی پر پڑی جو

اپنے بفل میں ایک مسکین اور گھبرائی گھبرائی سی لڑکی کو لئے ہال میں آ رہا تھا۔  
عانیہ کے چہرے کے تاثرات بہت سرعت سے تبدیل ہوئے تھے۔ اس کے ح  
چہرے کو دیکھتے ہوئے باری نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔

”گلتا ہے کہ کوئی اور بے وقوف اس گھاگ شکاری کے ہتھے چڑھ گئی ہے۔“ اس نے  
خاصی برہی سے تہمرہ کیا تھا جبکہ اس کے جواب میں عبدالباری نے ہنستے ہوئے کہا۔  
”یہ بے چاری تو شکل سے ہی ستم رسیدہ لگ رہی ہے دیکھو کتنی سراسمگی پھیلی ہوئی ہے  
اس کے چہرے پر۔“

وہ دونوں سبک روی سے چلتے ہوئے سامنے رکھے صوفوں پر بیٹھ چکے تھے۔ وہ لڑکی و  
درجہ استیجاب سے دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔

”کینے نے اپنی چرب زبانی سے اسے قابو کر لیا ہوگا“ شکل سے ہی سیاہ ناگ لگتا ہے۔  
وہ انتہائی جل کر بولی تھی جبکہ اس کے اس طرح چڑنے پر باری نے زوردار قہقہہ لگایا تھا۔ بہن  
سارے لوگوں نے مڑ کر اسے دیکھا جس میں سلطان ہاشمی بھی شامل تھا۔

”ویسے عانیہ! تم نے اس کا کیا نام رکھا تھا؟“ وہ ہنستے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”زنگی۔“ عانیہ کے چہرے پر بھی مسکراہٹ نے احاطہ کیا تھا۔

”بھلا کیا مطلب ہے زنگی کا؟“ اس نے جان بوجھ کر چھیڑا۔

”افریقہ کا دیسی آدمی جس کا رنگ کوہ کی طرح سیاہ اور ہونٹ موٹے موٹے ہوں۔“  
اس کا موڈ بھی خوشگوار ہو گیا تھا۔ جب چھوڑنے کے بعد اس نے آج پہلی دفعہ سلطان ہاشمی کو  
دیکھا تھا۔ اس کے کالم ابھی تک چھپ رہے تھے لیکن انداز تبدیل ہو گیا تھا اور لگتا تھا کہ آج  
کل یہی لڑکی اس کیلئے لکھنے کا فریضہ سرانجام دے رہی تھی جس کو وہ اپنی پرسنل سیکرٹری کہہ کر  
متعارف کروا رہا تھا۔ اس کا اپنا ایک پبلشنگ ادارہ تھا لیکن اس کے باوجود اسے ہر جگہ اپنا نام  
پھیلانے کا خاصا شوق تھا۔

”شکر کرو تم اس بخیل آدمی کے قبضے سے نکل آئیں وہ تو اپنا بخار بھی کسی کو نہیں دیتا۔“  
اسے آج عانیہ کو چھیڑنے میں مزا آ رہا تھا۔

”شکر وہ کرے کہ جس کا گنجا سر میرے ہاتھوں سے بچ گیا۔ انتہائی مکار اور فریبی شخص  
ہے مری نم ماہ کی محو ابھی ہضم کر گیا کم بخت۔“ عانیہ کا قصہ اور اضمحلال بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

اس کے چہرے پر پڑمردگی دیکھ کر عبدالباری نے فوراً بات پلٹی اور اسٹیج کی طرف اشارہ کیا۔  
جہاں پروگرام کا آغاز ہو چکا تھا اور آغاز سے ہی انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ خاصا بور پروگرام  
ہے تب ہی وہ بمشکل دو گھنٹے وہاں بیٹھے اور جب ہمت جواب دے گئی تو وہ دونوں پروگرام  
ادھورا چھوڑ کر ہی واپس آ گئے تھے اور اس وقت وہ پریس کلب کے لان میں کھڑے تھے۔

”رانی کے بارے میں تم نے سنا.....“ باری نے دانستہ بات ادھوری چھوڑی۔ ایک  
تاریک سا بادل اس کے چہرے پر لہرایا اور آنکھوں کی روشنی ماند پڑ گئی۔

”ہاں بہت اونچی ہواؤں میں اڑ رہی ہے۔ آئے دن خبریں سننے کو ملتی ہیں۔ بہت خوش  
ہے کہ اس کے باپ کا حوالہ اس کے ساتھ نہیں رہا۔“ وہ چلتے چلتے رکی۔ اس کے ہونٹوں پر  
ایک بے کس مجروح سی مسکراہٹ تیر رہی تھی۔

”باری! یہ قرب قیامت کی نشانیاں نہیں ہیں کہ وہ والدین جو سخت محنت کر کے اپنی اولاد  
کی پرورش کرتے ہیں انہیں پڑھاتے اور لکھاتے ہیں اور ہمیں بڑے ہو کر ان ہی کی ذات کے  
حوالے سے شرم آنے لگتی ہے۔“

وہ عشق پچپاں کی گھنی نیل سے ڈھکی دیوار کے پاس آ کر رک گئی تھی۔ اس کے پورے  
وجود پر افسردگی طاری تھی وہ تلخ انداز سے گویا ہوئی۔ ”اے شرم آتی تھی جب لوگ اسے کہتے  
تھے کہ یہ مشہور و معروف اسٹیج ایکٹر کی بیٹی ہے جسے لوگ بھانڈیا میراثی کہہ کر پکارتے ہیں  
حالانکہ ابا نے اسٹیج پر اتنے سال لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹیں بکھیریں لیکن خود وہ کس کسمپرسی  
کی حالت میں آخری دن گزار رہے ہیں، کس کو احساس ہی نہیں۔ دنیا کتنی بے وفا ہے ناں  
باری؟“ وہ خود کلامی کے انداز میں بول رہی تھی۔

”میرا باپ کبھی اسٹیج کی دنیا کا درخشاں ستارہ تھا۔ ظالم وقت کی دھول نے اس کے  
خود خال کو دھندلا دیا ہے۔ اب وہ ایسی عمارت بن چکا ہے جسے زمانے کے سرد و گرم نے کھنڈر  
بنا کر رکھ دیا ہے۔ شوگر جیسا موڈی مرض آ کا س نیل کی طرح اس کے وجود سے چٹ گیا ہے  
اور اتنی کسمپرسی کی حالت میں زندگی بسر کر رہا ہے کہ بعض دفعہ مجھے اس پر ترس آنے لگتا ہے۔“  
اس کی باتوں نے باری کو افسردہ کر دیا تھا۔

”یہی دنیا ہے یار.....!“ وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا تھا۔

”اصل میں باری! ابا کا مسئلہ ایک اور بھی ہے۔ وہ اپنے ماضی میں جینا چاہتے ہیں جب

وہ لوگوں کے دلوں پر راج کرتے تھے۔ وہ اس بات کو ماننے کیلئے تیار نہیں کہ وہ دنیا کے سچے اپنا کردار ادا کر چکے ہیں اور اب پردہ گر چکا ہے۔“ باری نے اس کی آنکھوں میں تیرنی کی کر دل سے محسوس کیا۔

”اصل میں عانیہ! سچ پر کام کرنے والوں کیلئے وہاں موجود سامعین کی تالیوں کا نشہ اور دلفریب ہوتا ہے کہ وہ چاہتے ہوئے بھی اس سے باہر نہیں نکل سکتے اور جس شخص نے اپنی زندگی کے اتنے قیمتی سال لوگوں کو دیئے ہوں، وہ اس تلخ حقیقت کو کیسے قبول کر سکتا ہے۔ اے اسی یوٹوپیا میں رہنے دو۔“ وہ دونوں بازو آپس میں باندھ کر اس لڑکی کو غور سے دیکھنے لگا جو اسے ساری دنیا سے عزیز تھی۔

”لیکن باری! زندگی ایسے نہیں گزرتی۔“ اس نے جھنجھلا کر عشق چپچاں کی نیل سے چہرہ پھول توڑے اور فضا میں اچھال دیئے۔

”کیوں نہیں گزرتی؟“ چند لمبے پر سوچ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے وہ قدرے سہاٹ انداز میں دوبارہ بولا۔

”مجھے دیکھو! میرے ماں باپ کی اس وقت علیحدگی ہوئی، جب میں پانچ سال کا تھا۔ میری ماں نے صرف اپنی اتنا کا جھنڈا بلند رکھنے کیلئے میری تحویل کیلئے قانونی جنگ لڑی اور اس کے بعد اپنی زندگی میں گمن ہو گئی۔ بابا فارن سروس میں جاپان چلے گئے اور وہیں شادی کر لی اور ایک نئی زندگی کا آغاز کر لیا۔ اب دونوں کے اپنے اپنے بچے ہیں اور اپنی اپنی زندگیاں ہیں۔ سالوں بعد ایک آدھ کو میرا خیال آتا ہے تو میرے اکاؤنٹ میں ہزاروں روپے ٹرانسفر کر کے سمجھتے ہیں کہ ان کا حق ادا ہو گیا۔ میں بھی تو زندگی گزار رہی رہا ہوں ناں۔“ وہ بہت پرسکون انداز میں کہہ رہا تھا۔

عانیہ نے رشک بھرے انداز سے اس کے آسودہ چہرے کو دیکھا۔ بلیک پینٹ پرٹی پنک کلر کی شرٹ میں وہ خاصا ہینڈسم لگ رہا تھا، اس کی ہائیٹ، براؤن آنکھیں، گھنی مونچھیں اور سرخ و سپید رنگت اسے ہزاروں لوگوں میں نمایاں کرتی تھی۔ وہ خالصتاً پٹھان تھا اور پٹھانوں والا مخصوص انداز اس کے ہر انداز میں نمایاں ہوتا تھا۔ عانیہ کو یاد تھا کہ اس کے ڈیپارٹمنٹ کی ماہم اس کے پیچھے پاگل تھی، لیکن وہ انتہائی من موچی بندہ تھا اور بہت کم لوگوں کو لفٹ کرواتا تھا۔

”اتنے غور سے کیوں دیکھ رہی ہو؟“ کسی دلفریب سے خیال نے باری کے لبوں پر بڑی نرم سی مسکراہٹ بکھیر دی تھی۔

”سوچ رہی ہوں کہ موسم خاصا خراب ہو رہا ہے، گھر چلنا چاہئے۔“ اس نے سیاہ سرمی رنگ کے بادل دیکھ کر سنجیدگی سے کہا جبکہ عانیہ کے اس بے تکے جواب پر باری نے مصنوعی غصے سے اسے گھور کر دیکھا تو وہ ہلکھلا کر ہنس پڑی۔

”دکھتی بد ذوق لڑکی ہو۔ اتنے خوبصورت اور رومانوی موسم کو خراب کہہ رہی ہو جبکہ مجھے تو یہ موسم بہت پر کیف سا لگ رہا ہے۔“ اس نے شہوت کے چٹوں سے لپٹ کر آنے والی ہوا میں موتیا کے پھولوں کی دلفریب مہک کو محسوس کرتے ہوئے لمبا سانس لیا۔

”جناب عالی! آپ رہتے ہیں ایک پوش علاقے کے خوبصورت فلیٹ میں، ذرا ہمارے علاقے کا حشر دیکھیے گا! آپ کو بارشوں سے چڑ ہو جائے گی۔ ساری رومانویت ناک کے ذریعے باہر نکل جائے گی۔“ وہ اب ہاتھ پھیلا کر بارش کے ننھے قطروں کو دلچسپی سے سمیٹنے لگی۔ بادلوں میں ارتعاش سا ابھر رہا تھا۔

”کم آن یار! ہر قسم کے حالات کو انجوائے کیا کرو۔ جب معلوم ہے کہ اس ماحول سے فی الحال نکلتا ممکن نہیں تو اسی میں خوبصورتیاں تلاش کیا کرو۔ یقین کرو، زندگی بہت آسان ہو جائے گی۔“ وہ بارش کی تیز بو چھاڑ سے بچنے کیلئے اسے شیڈ کے پاس لے آیا تھا۔ دونوں اب تو اتار سے برستی بارش کی بوندوں کو دیکھ رہے تھے۔

”باری! ابا کے انجکشن ختم ہو گئے ہیں۔“ اسے اچانک یاد آیا۔

”کوئی مسئلہ نہیں، واپس جاتے ہوئے لے لیں گے۔“ اس کے پاس ہر مسئلے کا حل موجود ہوتا تھا۔

”تو کیا تم میرے ساتھ جاؤ گے۔“ اس نے بظاہر سنجیدہ انداز سے پوچھا، لیکن شرارت اس کی آنکھوں سے نمایاں تھی۔

”آف کورس! اب اتنے اچھے موسم میں چھوٹی کے ہاتھ کے پکڑے کھائے بغیر تو بالکل نہیں جاؤں گا۔“ وہ اپنی عادت کے مطابق برا ماننے کے بجائے ہنس کر بولا تھا۔

”قدر گھنا دیتا ہے روز کا آنا جانا۔“ وہ پانی کے بلبلے غور سے دیکھتے ہوئے ہنستے ہوئے بولی تھی۔ آج وہ مکمل ترنگ میں تھی اور ایسا بہت کم ہوتا تھا۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو یعنی! لیکن یاد رکھنا کہ ہر کام اور ہر چیز کا ایک وقت مقرر ہے اس سے پہلے کچھ نہیں ہو سکتا۔“ وہ بہت خلوص سے اسے سمجھا رہا تھا۔ ”اور تمہیں اپنے بارے میں بھی کچھ سوچنا چاہئے۔“

”میرے پاس ابا ہیں ناں.....؟“ اس نے بے ساختہ نظریں چرائیں۔

”اور میں کہاں ہوں عانیہ؟“ وہ بہت آس سے پوچھ رہا تھا۔

”تم.....؟“ اس کے چہرے پر بہت خوبصورت رنگ پھیلا تھا۔ ”تم میری زندگی کے ہر راستے پر ہو۔“ اس نے بے ساختہ کہا تھا۔

”لیکن میں کب تک راستوں میں رہوں گا؟ ہم لوگ مل کر بھی تو یہ راستہ طے کر سکتے ہیں۔“ وہ آج بہت کھل کر کہہ رہا تھا۔ عانیہ کے ارد گرد کئی فانوس جگمگا اٹھے تھے۔

”میں نے کب انکار کیا ہے باری!“ اس کے جواب پر عبدالباری کے دل پر چاند کی کرنوں کی طرح خوشی برسی تھی اور آنکھوں سے جیسے روشنیوں کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔

”لیکن میں پہلے نمرہ کے فرض سے نبٹنا چاہتی ہوں۔“

عبدالباری آمادگی سے مسکرایا تھا۔



”توبہ استغفار اتنا بڑا جھوٹ!“ باری نے آنکھیں پھیلا کر باقاعدہ کانوں کو ہاتھ لگائے تھے۔

”تم کتنی جھوٹی ہو عانیہ! میں پورے تین دن کے بعد تمہارے گھر جاؤں گا۔“

”تو میں یہی تو کہہ رہی تھی۔“

”خواجوا! تم تو کہہ رہی تھیں کہ روز کا آنا جانا.....“ اسے بحث کرنے میں مزا آرہا تھا۔ آج کافی دنوں کے بعد اسے کچھ مطمئن دیکھا تھا، کیونکہ ابھی پچھلے ہفتے ہی تو اس کی ایک انگلش اخبار میں جاب ہو گئی تھی اور وہ کچھ مطمئن بھی تھی۔

”ہاں! تو یہ ہر تیسرے دن آنا بھی تو روز کا آنا جانا ہوتا ہے۔“ وہ کھلکھلا کر ہنسی مٹی اور اسے ہنستے دیکھنا کم از کم باری کیلئے بہت خوشگوار تجربہ ہوتا تھا۔

”باری! میں سوچ رہی ہوں کہ نمرہ کی شادی کروں۔“

”سبحان اللہ! کیا عمدہ سوچ ہے! آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ محترمہ! آپ نمرہ کے بجائے اگر اپنی شادی کر لیں تو وہ زیادہ بہتر ہے۔“

”میں؟“ اس نے کبھی اڑائی ”میں اپنے بارے میں تو سوچ بھی نہیں سکتی۔“

”تو پھر میں سوچ لیتا ہوں۔“ اس کے شرارتی انداز پر اس نے گھبرا کر اسے دیکھا۔

بڑی محویت سے نظریں ٹکائے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے اس طرح گھبرانے پر وہ خاصا غصہ ہوا تھا اور اس کے چہرے پر بکھری مسکراہٹ کے رنگ اور گہرے ہوئے تھے۔

”کیا سوچ لو گے؟“ اس کے انداز میں غلٹ تھی۔

”یہی کہ نمرہ کی شادی کیلئے کوئی لڑکا ڈھونڈ کر یہ فرض بھی نبٹا لیتے ہیں۔“ اس کا لہجہ متنبم

اور انداز شرارت لئے ہوئے تھا۔ عانیہ نے سکون کا سانس لیا تھا۔ ”لیکن تم اس کی شادی اتنی

جلدی کیوں کرنا چاہتی ہو؟“ وہ اب سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

”مجھے اب خوف آتا ہے باری! میں نے باہر کی دنیا دیکھی ہے۔ یہاں بہت فریب اور

دھوکہ ہے اور مجھے ڈر لگتا ہے کہ وہ بھی رانی کی طرح کسی کی باتوں میں آ کر ایک نئی دنیا کو بغیر

کرنے نہ نکل جائے۔ جب تک اماں زندہ تھیں میں بے فکر تھی لیکن اماں کی وفات اور پھر رانی

کا اتنا بولڈ قدم میں مزید کچھ اور بھگتنے کی سکت نہیں رکھتی۔“



وہ خاصا خود پسند واقع ہوا ہے اس کا احساس آج پہلی دفعہ مائرہ کو ہوا تھا لیکن وہ اس کے باپ کے نام اور مقام سے بخوبی واقف تھی اور کیریئر کے آغاز میں اس طرح کا سہارا اس کیلئے کتنا مفید ثابت ہو سکتا ہے اس کا اندازہ اسے اپنے پہلے پروجیکٹ سے ہی ہو گیا تھا اور وہ کم از کم ارحم سے بگاڑنے کی پوزیشن میں ابھی نہیں تھی اس لئے اس کی بات سے بدعزا ہونے کے باوجود وہ زبردستی ہنس رہی تھی۔

”مائرہ! تم دینی چلو گی.....؟“ اس کی اچانک آفر نے دوسری جانب موجود مائرہ پر گویا شادی مرگ طاری کر دی تھی۔

”دینی مگر کیسے؟“ اس کا دل انجانی لے پر دھڑکا تھا۔

”یار! ایک ملٹی پیشنل کمپنی کا ایڈ ہے میں نے تمہاری کچھ تصاویر دکھائیں فوراً مان گئے اور میں نے انہیں کہہ دیا تھا کہ وہ میری بہت اچھی دوست ہے اس لئے مجھے تو انکار نہیں کرے گی اور تمام معاملات بھی طے کر لئے ٹھیک کیا ناں.....؟“

اس کے الفاظ مائرہ پر ایک سحر طاری کر رہے تھے۔ ارحم کے لہجے میں چھپے اپنائیت کے رنگ اور حق جتنا انداز کم از کم مائرہ کیلئے طمانیت کا باعث بن رہا تھا اور وہ جواڑی اڑتی خبریں نئی ماڈل گرل رجا اور ارحم کے بارے میں سن رہی تھی ان ہی سے گھبرا کر اس نے آج کافی دنوں کے بعد ارحم کو فون کیا تھا۔ سارے اندیشے اور خوف بھاپ کی طرح اڑ گئے تھے۔

”اور پتا ہے مائرہ! میں تمہیں دینی میں ایک خاص گفٹ دوں گا۔“ وہ بے حد جذب سے کہہ رہا تھا اور اس کا آنچ دیتا لہجہ مائرہ کے اندر کن من جیسی پھوار برسا رہا تھا۔ اسے شوبز کی دنیا میں آئے ہوئے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا۔ وہ جس اکیڈمی میں ٹیوشن کیلئے جاتی تھی وہیں پر آنے والے ایک لڑکے عامر کے توسط سے اس نے اس فیلڈ میں قدم رکھا تھا لیکن کوئی خاص پذیرائی حاصل کرنے میں ناکام رہی تھی اور وہ اب کوئی شارٹ کٹ ڈھونڈ کر اپنا مستقبل محفوظ کرنا چاہتی تھی۔

”پھر ارحم! شام کو ہم مل رہے ہیں ناں.....“ وہ اس کی کیفیت محسوس کر کے ہنس پڑا جبکہ مائرہ اپنے اتھل پتھل دل کو سنبھالنے لگی۔



”ارحم! تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟“ رضا کو اس کی بات سن کر شاک لگا تھا۔ وہ اس کی

”جھٹکنس گاڈ..... تمہاری آواز تو سننے کو ملی۔ مجھے تو لگتا تھا جیسے صدیاں گزر گئی ہیں اور تم سے نہ بات ہوئی نہ تمہارا خوبصورت چہرہ دیکھا۔“ ارحم کی بھاری اور دلکش آواز میں گہرا انتظار اور بے تحاشا شکوہ پنہاں تھا۔

”جناب آپ خود آ جاتے ملنے.....“ وہ کھلکھلا کر ہنسی تھی اور ارحم کو یوں لگا جیسے مندر میں کسی نے ایک ساتھ بہت سی گھنٹیاں بجا دی ہوں۔

”محترمہ! آپ ٹھہریں مشہور و معروف ہستی اب ہم جیسے چھوٹے موٹے لوگوں کو کہاں لفٹ کروائیں گی۔ بہر حال! تمہارا نیا ڈرامہ دیکھا بہت آؤٹ کلاس تھا۔ تم نے تو سب کو اپنی لاجواب ایکٹنگ سے کلین بولڈ کر دیا۔ اب تو برنی صاحب بھی اپنے نئے پراجیکٹ کیلئے تمہارا انتخاب کرنے کا سوچ رہے ہیں۔“ اس کی اطلاع نے مائرہ کے اندر جوش اور ولولہ بھر دیا تھا۔

”ریلی ارحم! تمہیں کس نے بتایا.....؟“ وہ چپکی۔

”کم آن مائرہ کم از کم یہ بچوں والے سوال تم مجھ سے تو نہ کیا کرو۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہمارا اپنا پروڈکشن ہاؤس ہے اور سو کوٹیکٹس ہیں کوئی بھی بتا سکتا ہے۔“ دوسری طرف مائرہ بری طرح جھینپ گئی۔

”یار! یہ مت بھولا کرو کہ میں کس کا بیٹا ہوں۔ میرے پاپا کا میڈیا کی دنیا میں ایک نام ہے۔“ اس کے لہجے میں جھلکتا فخر مائرہ کو ایک لمحے کو چپ کروا گیا تھا..... اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا اور پھر کچھ سنبھل کر اس نے لا پرواہی سے کہا تھا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم اپنے پاپا کے نام کو کیش کرواتے ہو۔“

”آف کورس! لیکن میرا اپنا بھی جو مقام اور نام ہے لوگ اب اس کو بھی تسلیم کر رہے

ہیں۔“

ایمر جنسی کال پر اپنے سارے ضروری کام ادھورے چھوڑ کر اس کے جنگلے میں پہنچا تھا جہاں وہ اوندھے منہ لیٹا، چمیل سرچ کر رہا تھا۔

”ہاں تو اس میں اس قدر اچھبے کی کیا بات ہے؟“ وہ لا پرواہی سے کہہ رہا تھا۔

”تم واقعی مارہ شیخ کو پروپوز کرنے والے ہو؟“ اس کے حد درجہ حیرت والے انداز پر اس نے قہقہہ لگایا تھا، جبکہ رضا اس کے اس انداز پر جل کر رہ گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر ریویو کنٹرول اس کے ہاتھ سے چھینا اور وہ ”کھلا ڈالا“ چمیل بند کر کے دھڑام سے اس کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا۔

”مجھے لگتا ہے کہ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔“

”حالانکہ تم کہتے ہو کہ میرے پاس دماغ نام کی کوئی چیز نہیں۔“ وہ کی چین انگلی میں گھماتے ہوئے سراسر اسے چڑا رہا تھا۔

”میں تو آج بھی اس بات پر قائم ہوں درنہ تم اتنا فضول فیصلہ کبھی نہ کرتے۔“ رضائے صاف اس کا تسخراڑا دیا تھا۔

”تمہیں معلوم ہے ناں ارحم بخاری کبھی چھوٹے موٹے فیصلے نہیں کرتا اور کوئی عام چیز تو اسے پسند نہیں آتی اور جہاں تک مارہ کی بات ہے تو وہ پہلی لڑکی ہے جسے دیکھ کر میرے دل میں گھنٹیاں بجی ہیں۔ شوہز میں اس کا آغاز سفر ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اسے شہرت کا چمکا لگ جائے اس سے پہلے ہی اس کے حقوق اپنے نام محفوظ کروالوں اور اپنی بیوی کو شوہز میں لانے کا میرا تو کم از کم کوئی ارادہ نہیں۔“ وہ اب سنجیدگی سے بتا رہا تھا۔

”وہ شوہز چھوڑنے پر راضی ہو جائے گی؟“ رضائے طنز کیا۔

”لیس آف کورس! وہ ہمارے پروڈکشن ہاؤس میں کسی اور حیثیت سے کام کر سکتی ہے لیکن پروہ اسکرین پر نہیں۔“ وہ حد درجہ پر اعتماد تھا۔

”تم نے اس سے بات کی.....؟“

”نہیں، ابھی نہیں.....“ اس نے صاف گوئی سے کہا۔

”میرے خیال میں پہلے محترمہ کے خیالات جان لو پھر شیخ چلی کی طرح منصوبے بنانا۔“ رضائے سنجیدگی سے مشورہ دیا۔

”یہ شیخ چلی کے منصوبے نہیں ہیں یار! آج تک کس نے ارحم بخاری کو انکار کیا ہے؟“

ایک محسوس کن سی بے نیازی اور خود اعتمادی اس کی شخصیت کا پختہ حصہ بن چکی تھی جواب ناگواریت کا باعث بنتی تھی اور رضا تو اس سے باقاعدہ چڑنے لگا تھا۔

”خیر.....“ وہ اس کی بات کو نظر انداز کر کے بولا تھا۔

”اب اتنا بھی اندھیر نہیں مچا ہوا۔ یاد نہیں کہ وہ عانیہ جمیل کیسی طبیعت ستھری کر کے گئی تھی۔ آج تک انکل اس کی وجہ سے تمہیں ذلیل کرتے ہیں۔“

”وہ عانیہ جمیل!“ ارحم جی بھر کر بد مزہ ہوا۔

”وہ تو شکل سے ہی مڈل کلاس خاندان کا چلتا پھرتا اشتہار لگتی ہے اچھی خاصی چالاک لڑکی تھی۔ دیکھا نہیں اتنے مشہور گروپ میں جا کر شامل ہو گئی ہے۔ شکر کرو یہاں نہیں آئی ورنہ اپنی لالچی طبیعت کی بنا پر یہاں سے بھی چلی جاتی۔“

”شرم کرو کسی کے بارے میں اتنا غلط گمان نہیں رکھتے اور تم نے کہاں سے اس کا لالچ دیکھ لیا۔“ رضا کو بھی غصہ آ گیا تھا۔

”ظاہر ہے اس کا سی وی اٹھا کر دیکھ لو کسی بھی ادارے میں اس نے چھ ماہ سے زیادہ تک کر کام نہیں کیا یہ اس چیز کا بڑا واضح ثبوت ہے۔“

”ماشاء اللہ! کیا دلیل دی ہے آپ نے، صدقے جاؤں میں آپ کی ذہانت کے کیا خوب اندازے لگاتے ہیں آپ۔ لگتا ہے بزرگ سیاستدان پیر پگارا کے جانشین ثابت ہوں گے، کیونکہ ان کو بھی پیش گوئیاں کرنے کا خاصا شوق ہے آپ کی طرح۔“ رضائے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہتے ہوئے کشن اٹھایا اور سامنے والے صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ وہ اس کے بچپن کا دوست تھا اور بہت زیادہ بے تکلفی سے ان کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا تھا۔

”تم کیا مجھے یہاں طعنے دینے کیلئے آئے ہو۔“ ارحم کے لہجے میں خفگی جھلکی۔

”نہیں، آپ کے انتہائی بے ہودہ، فضول اور احمقانہ اقوال زریں سننے کیلئے آیا ہوں۔“ اس کے انتہائی طنزیہ انداز پر ارحم کو ہنسی آ گئی۔

”یہ گھر کی خواتین نظر نہیں آرہیں.....؟“ رضائے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس کی ماما اور بھالی کا پوچھا۔

”بھالی آج کل اپنی دیورانی اور نند سے ملنے انگلینڈ گئی ہوئی ہیں۔ عاصم بھائی کے ہاں بیٹا ہوا ہے ناں اور ماما آج کل اپنے پوتے کی شاپنگ میں مصروف ہیں، ان کا بھی اگلے ہفتے

جانے کا ارادہ ہے۔“ ارحم نے تفصیل سے بتایا۔ اس کے بڑے بھائی اعظم تو پاپا کے ساتھ الیکٹرانک میڈیا میں تھے جبکہ اس سے چھوٹے عاصم ڈاکٹر تھے اور FRCS کرنے اپنی بیگم کے ہمراہ انگلینڈ گئے ہوئے تھے اور ان سے چھوٹی بہن ندا تھی جو شادی کے بعد دہلی چلی گئی تھی اور آج کل وہ بھی انگلینڈ گئی ہوئی تھی۔ سب سے چھوٹے ارحم خود تھے جو اپنے والد مظہر بخاری کے ساتھ بہت کامیابی سے ایڈورٹائزنگ ایجنسی چلا رہے تھے۔

گھریلو ملازم نے ابھی ابھی چائے لاکر رکھی تھی اور رضا بے تکلفی سے اپنی پلیٹ میں اکٹھے دو کباب رکھے کھانے میں مگن تھا۔

”کس فیملی سے تعلق ہے تمہاری ماں؟“ رضائے ”تمہاری“ پر زور دیتے ہوئے خاصا بڑا طنز کیا تھا تب ہی وہ اچھل کر بیٹھ گیا۔

”پتا نہیں“ وہ اس موضوع پر کبھی بات نہیں کرتی۔ اس معاملے میں تھوڑی سی ریزور ہے۔“ ارحم کی بات پر وہ ایک لمحے کو چونکا اب اس کے چہرے پر بڑی دلچسپ مسکراہٹ تھی۔

”لگتا ہے اس کے حسن کی چکا چونڈ نے تمہارا دماغ ماؤف کر دیا“ ورنہ تم انسانوں میں بھی حسب نسب کھنگال کر پھر بات کرتے ہو جبکہ چیزوں میں تو تم براؤنڈ کونشس ہو ہی اور اوپر سے تمہاری والدہ محترمہ اس معاملے میں تم سے بھی چار ہاتھ آگے ہیں بلکہ سوائے انکل کے سارا خاندان ہی حد درجہ اسٹیشن کونشس ہے اس لئے پہلے اتنا پتا معلوم کروا لینا ورنہ آنٹی کا تمہیں پتا ہی ہے ناں۔“ رضائے بڑی وضاحت سے کہا تھا اور ارحم کو تھوڑا سا ناگوار لگا تھا۔

”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ اصل میں ماما بیک گراؤنڈ کو اہمیت اس لئے دیتی ہیں کیونکہ یہ انسان کی شخصیت کو بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے اور پھر جب آپ کسی گھر سے لڑکی کو لے کر آ رہے ہوتے ہیں تو یہ آپ کی آنے والی نسل کا بھی تو معاملہ ہوتا ہے اور دیے بھی رشتے داری اور رشتے ناٹے اپنے ہم پلہ لوگوں میں ہی ٹھیک رہتے ہیں۔“ اس نے چائے کپ میں اٹھیلے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

”سبحان اللہ! کیا اصول و ضوابط ہیں لیکن معذرت کے ساتھ میں اس معاشی تفریق پر یقین نہیں رکھتا“ اس لئے آپ اپنے قیمتی خیالات کا اظہار میرے سامنے مت کیا کریں۔“

اب پیزا کے ٹکڑے پر کچپ لگا کر کھا رہا تھا مزے سے۔

”بہت کمینے ہو تم“ پتا نہیں میری تم سے دوستی کیسے ہے؟“ اس نے جھنجھلا کر کشن اسے سنبھلایا۔

مارا جے رضائے ہنستے ہوئے کچھ کیا اور شرارت سے بولا۔

”اس لئے دوستی ہے کیونکہ میں بڑے باپ کا بیٹا ہوں۔ میرے سب کزنز اور رشتے دار پورے کرپس ہیں اور پھر میں تمہارا بد قسمتی سے بزنس پارٹنر بھی ہوں چونکہ اسٹیشن میں میں تم سے کسی طرح بھی کم نہیں اور اچھا خاصا ہینڈم بھی ہوں اس لئے تمہاری حسن پرست طبیعت کی بھی تسکین ہو جاتی ہے ورنہ تم نے مجھے گھاس کہاں ڈالنا تھی۔“ اس نے ہنستے ہنستے ایک تلخ سچائی بیان کی مگر جبکہ ارحم نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

”اپنی بک بک بند کرو اور اگر میں کمینہ ہوں تو ایک کمینہ کا دوست بھی کمینہ ہی ہوگا ناں۔“ اب وہ ڈھٹائی سے ہنس رہا تھا۔

”نہیں یار! کبھی کبھی کمینے لوگ کوئی اچھا کام بھی کر لیتے ہیں اور سمجھو مجھ سے دوستی تمہاری زندگی کا واحد اچھا کام ہے۔“ رضا بھی اب کھل کر قہقہے لگا رہا تھا جبکہ ارحم کے لبوں پر خجالت آمیز مسکراہٹ تھی۔

”یار! تم ذرا اس ماں کے کچھ اتنا پتا تو کرواؤ“ اس نے پہلے ایک ایڈ کھوسہ کیلئے بھی کیا تھا اور وہ اسے شو بزیکی دنیا میں لے کر آیا تھا۔ تم ذرا کسی سے کہہ کر معلومات تو کرواؤ۔“ ارحم نے وہ بات پٹاری سے نکال ہی دی تھی جس کیلئے اسے بلوایا تھا جبکہ رضا جو اطمینان سے کشن سر تلے رکھے ایک میگزین دیکھنے میں مگن تھا بہت آرام سے بولا تھا۔

”کیوں“ میرا تعلق کون سا خفیہ ایجنسیوں سے ہے یا وہ کون سا اسامہ بن لادن ہے جس کے پیچھے میں بندے لگا دوں؟“ رضا کے لاپرواہانہ انداز پر ارحم نے بے زاری سے اسے دیکھا۔

”یار! میں اس کے ساتھ سیریس ہوں اور تمہیں مذاق سوچ رہے ہیں۔“

”تو یہ کون سی نئی بات ہے۔“ وہ ہنوز غیر سنجیدہ تھا۔

”ٹھیک ہے نہ پتا کرواؤ میں خود کروالوں گا“ تم کیا سمجھتے ہو کہ تمہارے علاوہ کوئی اور یہ کام نہیں کر سکتا۔“ ارحم کے سنجیدہ انداز نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا اس نے میز پر رکھے اس کے ریموٹ کنٹرول سے اس کی کولنگ کو زیادہ کیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”کیا تم واقعی اس لڑکی کیلئے سیریس ہو؟“

ارحم نے ایک کاٹ دار نظر اس پر ڈالی اور خاموش رہا جبکہ اب رضا انتہائی سنجیدگی سے

دھننے کے بعد ان کی حالت کچھ سنبھلی تو عانیہ کی جان میں جان آئی۔

”ہائی گاؤ عانیہ! میرا تمہارے بارے میں یہ خیال آج بالکل غلط ثابت ہو گیا، میرا خیال تھا کہ تم بہت باہمت لڑکی ہو لیکن تم سے زیادہ بہادر تو نمرہ ہے۔“ وہ بجائے جواب دینے کے سکپاں بھرنے لگی تھی۔ اس وقت وہ تینوں ویٹنگ روم میں رکھے صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور عبدالباری عانیہ کے زرد چہرے کو تاسف بھرے انداز سے دیکھ رہا تھا، جو پچھلے کئی گھنٹوں سے وقفوں وقفوں سے رو رہی تھی۔

”اب تو انکل کی طبیعت کافی بہتر ہے، پھر کیا مسئلہ ہے، کیوں رو رہی ہو؟“ عبدالباری کی آواز میں پریشانی کے ساتھ جھلاہٹ بھی نمایاں تھی۔ وہ اب آنسو اپنے بازو کی پشت سے پونچھ رہی تھی۔

”ابانے تو آج میری جان ہی نکال دی تھی۔“

عبدالباری نے غور سے اسے دیکھا۔ جان تو واقعی نکلی ہوئی لگ رہی تھی۔ انتہائی زرد رنگ، کثرت گریہ سے سوچی ہوئی آنکھیں، وہ کم صم بیٹھی انگلیاں مسل رہی تھی اور اس وقت رات کے تین بج رہے تھے لیکن اس جدید سہولتوں سے آراستہ ہسپتال میں گویا دن نکلا ہوا تھا۔

”باری! یہ تو خاصا مہنگا ہسپتال ہے۔“ اس کے حواس ذرا بحال ہوئے تو اسے اندازہ ہوا اور اب ایک نئی فکر نے اسے گھیر لیا تھا۔ نمرہ بھی اس کی بات پر بری طرح چوکی تھی۔

”تو پھر؟“ عبدالباری اس کی بات نہیں سمجھا تھا۔

”صبح تک تو اس کا بل ہی ہزاروں میں بن جائے گا۔“ اس کے چہرے پر گہری سوچ کی پڑھائیاں تھیں۔

”کیسی باتیں کرتی ہو عانیہ!“ عبدالباری نے نرمی سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور اس کی لال انگارہ آنکھوں سے نظریں چرا کر بظاہر ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔ ”خود ہی تو کہتی ہو کہ عبدالباری! تمہارے اکاؤنٹ کا خزانہ بھرتا جا رہا ہے، اسے کچھ ہلکا کرو اور گاڑی لے لو میں نے بھی سوچا کہ اپنی ذات پر تو خرچ کرتا نہیں، چلو کہیں تو کام آئیں۔“

عانیہ کا سارا وجود ایک دم ہلکا پھلکا سا ہوا اور آنکھیں پھر سے چھلکنے کو تیار تھیں۔ ”خبردار! ایک بھی آنسو نکلا تو میں جان نکال دوں گا۔“ عبدالباری کی دھمکی پر وہ روتے روتے ہنسی تھی۔ اگلے دن نمرہ نے ابا کی طبیعت سنبھلنے پر اسے زبردستی کچھ دیر کیلئے گھر بھیجا۔ خود وہ ان

کہہ رہا تھا۔

”اگر تم اس کیلئے سیریس ہو تو پھر اس چیز سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کون ہے اور کس بیک گراؤنڈ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کیلئے اتنا ہی کافی ہونا چاہئے کہ تم اسے پسند کرتے ہو اور اپنی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتے ہو۔“ اس کی بات کے جواب میں ارجم نے اسے یوں دیکھا جیسے اس کی خرابی دماغ کا یقین آ گیا ہو۔

”یہ کیسے ممکن ہے جب تک اس کے اگلے پچھلوں کا پتا نہیں چلے گا، بات کیسے آئے بڑھے گی اور پھر تم ماما کو نہیں جانتے، وہ جب تک پورا شجرہ نسب نہیں کھنگال لیتیں، بات آئے کیسے چل سکتی ہے اور میں تو ماما اور پاپا کا سب سے لاڈلا بیٹا ہوں، میرے حوالے سے انہیں ویسے بھی بہت توقعات ہیں۔“

”ٹھیک ہے، پھر اس لڑکی کا خیال دل سے نکال دو۔“ وہ اتنے عام اور سرسری انداز سے کہہ رہا تھا گویا یہ بہت معمولی بات ہو۔

”یہ بھی ممکن نہیں ہے، وہ بری طرح سے میرے حواسوں پر چھا گئی ہے۔“

اس کے پسا انداز پر رضائے سخت بے یقینی سے اپنے سیما ب طبیعت دوست کو دیکھا، جو بری طرح سے الجھا ہوا تھا۔ اسے پہلی دفعہ معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا تھا۔



اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔

جب عبدالباری نے عانیہ کی حواس باختہ کال اٹینڈ کی۔ وہ بری طرح روتے ہوئے ابا کی طبیعت بگڑنے کی اطلاع دے رہی تھی۔ وہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ اس بات کا اندازہ اس کی بے ربط گفتگو سے ہوا تھا۔ اس سے زیادہ حوصلے میں تو نمرہ تھی، جس نے انتہائی تحمل سے بتایا تھا کہ ابا کی طبیعت بگڑنے پر وہ لوگ انہیں سول ہسپتال لے آئی ہیں، لیکن، میرجنسی میں موجود ڈاکٹر نے کہا ہے کہ کسی پرائیویٹ ہسپتال میں لے جائیں۔

وہ آدھے گھنٹے کے اندر اپنے دوست کی گاڑی لے کر وہاں پہنچا تو جمیل صاحب کی طبیعت واقعی سخت خراب تھی۔ اس نے ہسپتال میں موجود لوگوں کی مدد سے ابا کو گاڑی میں ڈالا اور ایک پرائیویٹ ہسپتال میں لے آیا، جہاں امیرجنسی میں موجود ڈاکٹر نے چیک اپ کے فوراً بعد بتا دیا تھا کہ انہیں انجائنا کا ایک ہوا ہے۔ انہیں فوراً کارڈیالوجی میں ایڈمٹ کر لیا گیا تھا۔

کے ساتھ تھی۔ ابا سو رہے تھے ان کا فقاہت زدہ جھریوں والا چہرہ دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔ عانیہ اور عبدالباری تھوڑی دیر پہلے ہی گئے تھے۔ ابا کو نیند کا انجکشن لگایا ہوا تھا اس لئے وہ دونوں مطمئن تھے۔ وہ اس پرائیویٹ روم میں ان کے ساتھ تباہی..... کل رات سے پہلی دفعہ اسے بھوک کا احساس ہوا تھا۔ وہ نرس کو ابا کا دھیان رکھنے کا کہہ کر کیفے میریا کی تلاش میں باہر نکلی۔

ایک جوس کا پیکٹ اور سینڈوچ لے کر وہ عجلت میں واپس آئی تو کمرہ نمبر چھ کی بجائے کمرہ نمبر پانچ میں داخل ہو گئی۔ اس نے تیزی سے دروازہ کھولا اور اندر سے باہر آتے شخص سے بری طرح ٹکرائی۔ ہاتھ میں پکڑا جوس کا پیکٹ ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گرا تھا۔

”اوہ آئی ایم سوری.....“ وہ حواس باختہ ہو گئی۔

”سو سوری! ایم سوری!“ وہ انتہائی مہذب اور نفیس انداز سے معذرت کر رہا تھا حالانکہ غلطی سراسر نمرہ کی تھی اور اسے کمرے میں داخل ہوتے ہی احساس ہو گیا تھا کہ وہ غلط کمرے میں آ گئی ہے۔ سامنے سنگل بیڈ پر لیٹی پچاس سالہ خاتون نے بہت دلچسپی سے اس نازک سی لڑکی کو دیکھا تھا۔ ان کے چہرے پر بڑا نرم سا تاثر تھا۔

”رضا! بچی کو اندر آنے کا راستہ دو بیٹا۔“ انہوں نے انتہائی محبت سے اپنے بیٹے کو کہا تھا جو انتہائی خفت زدہ انداز سے اس اٹھارہ انیس سالہ خوبصورت اور دلکش خندو خال کی حامل لڑکی کو دیکھ رہا تھا اور جو انتہائی جھینپے ہوئے انداز سے کھڑی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہیں کھڑی رہے یا باہر نکل جائے۔ جوس کا پیکٹ اس نے فرش سے اٹھالیا تھا۔

”ارے بیٹا آؤ ناں.....“ انہوں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی ان کی ٹانگ پر پلٹر چڑھا ہوا تھا اور اٹھنے کی کوشش میں ان کے منہ سے بے ساختہ کراہ نکلی تھی۔

”آپ انھیں مت لیٹی رہیں۔“ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر انہیں اٹھنے سے روکا۔ انہوں نے دوبارہ نیچے پرسر رکھ لیا ان کی آنکھوں کے نیچے حلقے نظر آ رہے تھے۔

”کیا ہوا آپ کو؟“ اس نے ان کے زرد پڑتے چہرے کو تشریح سے دیکھا۔

”بس بیٹا! اس عمر میں تو یہ سب چلتا رہتا ہے واش روم میں پاؤں سلب ہوا اور ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی اور بیٹے نے لاکر ہسپتال میں ڈال دیا۔“ وہ بچھے بچھے انداز سے نہیں۔

”ماما! پھر نرس کو بلاؤں؟ آپ کو واش روم لے جائے۔“ رضا نے اچانک مخاطب کیا

تو نمرہ فوراً بولی۔

”آئی! میں آپ کی کچھ ہیلپ کروں.....؟“

”ہاں ضرور بیٹا!“ ان کے چہرے پر بڑا نرم سا تاثر پھیلا تھا۔

”لیکن پلیز یہ ہاتھ میں پکڑا جوس کا پیکٹ اور سینڈوچ پہلے میز پر رکھ دیں یہاں سے کوئی نہیں اٹھائے گا۔“ رضا کے شرارتی انداز پر اس نے جھینپ کر دونوں چیزیں میز پر رکھیں۔

اس کے خفت زدہ چہرے پر خوبصورت رنگ بھیلے تھے۔

بے تحاشا گوری رنگت اور دلکش نقوش جس میں معصومیت رچی ہوئی تھی ضا کو اس کا چہرہ اپنے دل میں اترا تا محسوس ہو رہا تھا۔

وہ ماما کو اٹھانے میں اس کی مدد کرنے لگا، کیونکہ اس دھان پان سی لڑکی کیلئے مشکل ہو رہا تھا، پھر وہ انہیں واش روم لے کر گئی اور دوبارہ رضا کی مدد سے انہیں بیڈ پر لٹا دیا۔ رضا کے لبوں سے بڑی سکون پر سانس خارج ہوئی تھی جبکہ ماما اب اس کا انٹرویو لینے میں مصروف تھیں اور وہ انہیں اپنے ابا کے بارے میں انتہائی افسردگی سے بتا رہی تھی جبکہ صوفی کے ساتھ ٹیک لگائے رضا بڑی فرصت سے یہ سوچنے میں مصروف تھا کہ اس لڑکی کی شکل کس سے ملتی ہے اور یہ چہرہ شناسا کیوں لگ رہا ہے؟

”ماشاء اللہ! بہت پیاری اور سلجھی ہوئی بچی تھی۔“ اس نے ماما کے منہ سے یہ فقرہ سنا تو چونک گیا، وہ کمرے سے جا چکی تھی۔

”شام کو دیکھنے چلیں گے اس کے بابا کو.....“ وہ نیا پروگرام مرتب کر رہی تھیں۔

”پہلے آپ خود تو ٹھیک ہو جائیں اس کے بعد سیر سپاٹے کا پروگرام بنائیے گا۔ پاپا کی کل کی فلائٹ ہے اور میں تو یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں کہ گھر آتے ہی ہم چاروں بھائیوں کی شامت آجائے گی کہ ماں کا خیال نہیں رکھتے۔“ اس کی آنکھیں شرارت سے جگمگا رہی تھیں۔ وہ اپنے والدین کی آپس میں مثالی محبت پر اکثر دونوں کو تنگ کرتا تھا۔

”ہاں تو تنگ ہی کرتے ہو۔ ہزار دفعہ حسان سے کہا ہے کہ شادی کر لو کم از کم گھر میں

کوئی خاتون تو آجائے گی لیکن اس کے پاس ٹائم ہی نہیں ہے۔ میں اکیلی کیا کیا دیکھوں.....“ بہت خفگی سے وہ کہہ رہی تھیں حسان ان کا سب سے بڑا بیٹا تھا جبکہ اس سے

چھوٹا رضا اور اس سے دونوں چھوٹے جڑواں تھے اور آری میں تھے۔

اور محبت بھرے انداز پر وہ بری طرح چونکی اور فوراً کھڑی ہو گئی۔  
 ”آپ نمبرہ کو کیسے جانتی ہیں؟“ اس نے جھپکتے ہوئے پوچھا تو عالیہ بیگم نے صبح والا واقعہ  
 سنا دیا تو وہ بھی مسکرا دی۔

”رضا صاحب! آئیں ناں بیٹھیں۔“ اس نے گم صم اور شرمندہ سے رضا صاحب کو  
 مخاطب کیا۔

”بیٹا! آپ رضا کو جانتی ہیں۔“ انہوں نے متعجب ہو کر پوچھا۔ انہیں حقیقتاً اس لڑکی کے  
 منہ سے اپنے بیٹے کا نام سن کر حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

”ماما! یہ عانیہ جمیل ہیں۔ بہت اچھی کالم نگار اور زبردست اسکرپٹ لکھتی ہیں۔“ رضا  
 غلات آمیز انداز سے کہہ رہا تھا۔ اسے حقیقتاً وہاں عانیہ کو دیکھ کر شرمندگی ہو رہی تھی۔ ارحم  
 والے واقعہ کے بعد وہ خاصا شرمندہ تھا اور اسی وجہ سے دوبارہ اس سے رابطہ کرنے کی ہمت  
 ہی نہیں ہوئی۔

”آئی ایم سوری عانیہ! میں ارحم والے واقعہ کے بعد آپ سے رابطہ نہیں کر پایا۔ یقین  
 کریں مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔“ اس نے ہاتھ میں پکڑا پھولوں کا گلہ ستہ جمیل صاحب  
 کے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

”اُس اوکے رضا صاحب!“ اس نے متانت سے جواب دیا جبکہ عالیہ بیگم کو ان کی گفتگو  
 سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔

”بیٹا! نمبرہ آپ کی کیا لگتی ہیں؟“ وہ ڈھونڈنے سے بھی کوئی شبہت دونوں میں نہیں  
 نکال سکی تھیں اس لئے بے تابی سے بولیں تو رضا ماما کی بے تابی پر مسکرا دیا۔

”آئی! وہ میری سب سے چھوٹی بہن ہے۔ انٹر کیا ہے اس نے۔ آج کل پرائیویٹ  
 لبا سے کر رہی ہے۔“ اس کے جواب پر دونوں ماں بیٹے کے چہرے پر پھیلنے والے حیرت کے  
 رنگ بہت واضح تھے اس لئے وہ مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

”میں جانتی ہوں کہ اس کی شکل مجھ سے نہیں ملتی، میری دونوں چھوٹی بہنیں میری والدہ  
 پر ہیں۔ وہ بہت خوبصورت خاتون تھیں جبکہ میری رنگت اور نقوش ابا سے ملتے ہیں۔“ اس  
 کے تفصیلی جواب پر وہ دونوں بے ساختہ مسکرائے تھے جبکہ وہ اب سادگی سے کہہ رہی تھی۔

”میرے ابا کو شاید آپ نے دیکھا ہوگا، شیج جی کے نام سے انہوں نے سٹیج کی دنیا پر

”تو میں کس مرض کی دوا ہوں.....“ وہ دلفریبی سے مسکرایا اور شرارت سے سینے پر ہاتھ  
 رکھ کر گردن کو قدرے خم دیا۔

”تم.....!“ تعجب سے ان کی زبان سے بس یہی لفظ ادا ہوا تھا۔

”جو راضی نہیں ہے اس کے پیچھے پڑی رہتی ہیں اور جو راضی ہے اس کو لفت ہی نہیں  
 کروا تیں۔“ عالیہ بیگم خوشی سے بے ہوش ہوتے بال بال بچیں اور ماتھا بھی ٹھنکا۔

وہ بغور اسے دیکھنے لگیں۔ آف وائٹ پینٹ پر ایک بلیو شرٹ پہنے وہ خاصا خوبصورت  
 لگ رہا تھا اور چہرے پر تازہ شیو کا اثر بھی تھا۔ انہوں نے دل ہی دل میں ماشاء اللہ کہا اور  
 مسرت انگیز انداز سے بولیں۔

”چلو کوئی تو مانا، بس ذرا پلستر اتر جائے تو فوراً لڑکیاں دیکھتی ہوں۔“ خوشی کا واضح ہار  
 ان کے چہرے پر چمکا تھا۔

”لڑکیاں دیکھنے کی کیا ضرورت ہے، ایک ہی لڑکی کافی ہے۔“ گلاس میں پانی اٹھیلے  
 ہوئے وہ شرارت سے بولا تھا جبکہ وہ ایک دم ہنس پڑی تھیں۔ وہ اپنے چاروں بیٹوں کیلئے  
 بہت محبت کرنے والی ماں تھیں اور ان کی خوشی میں خوش رہتیں۔ ”سب سے چھوٹا عمر تو باقاعدہ  
 کہا کرتا تھا کہ اماں ہماری سہیلی ہیں۔“

”تو پھر یہ جو ابھی محترمہ آئی تھیں ان کے بارے میں کیا خیال ہے۔“ اس کا لہجہ شریقا  
 جبکہ عالیہ بیگم نے چونک کر بیٹے کے چہرے پر پھیلے اشتیاق کے رنگ دیکھے اور خود بھی کسی خیال  
 کے زیر اثر مسکرا دیں۔



وہ رات کو ہی بیگم عالیہ کو جمیل چیئر پر بٹھا کر ساتھ والے کمرے میں نمبرہ کے والد کی  
 عیادت کو پہنچا تو سامنے عانیہ جمیل کو دیکھ کر اسے دھچکا لگا..... اس کے چہرے پر لکھی بدحواسی اور  
 گھبراہٹ صاف پڑھی جا رہی تھی جبکہ عانیہ جو کہ کوئی میگزین پڑھنے میں مصروف تھی وہ بخاری  
 پروڈکشن کے رضا کو دیکھ کر حیران رہ گئی..... اس کی رضا سے ایک دو بار ہی ملاقات ہوئی تھی  
 جبکہ ٹیلیفونک رابطہ اکثر رہا تھا..... جمیل صاحب دو ایسوں کے زیر اثر سو رہے تھے جبکہ نمبرہ کو اس  
 نے گھر بھجوا دیا تھا، کچھ گھنٹوں کیلئے اور خود ابا کے پاس تھی۔

”بیٹا! آپ نمبرہ کی کیا لگتی ہیں؟ اور کیا یہ ان کے قادر ہیں؟“ عالیہ بیگم کے انتہائی شفیق

پورے تیس سال کام کیا ہے۔“

دونوں نے بے ساختہ گردن موڑ کر سوئے ہوئے جمیل صاحب کو دیکھا۔ بیماری نے انہیں اس قدر لاغر اور کمزور کر دیا تھا کہ پہلی نظر میں کوئی ان کو پہچان ہی نہیں سکتا تھا۔

”اوہ! بہت افسوس ہوا! ان کی بیماری کا سن کر اور میں تو حقیقتاً انہیں پہچان نہیں پائی حالانکہ ان کے دو تین ڈرامے میں نے دیکھ رکھے ہیں۔ اللہ ان کو صحت کاملہ دے۔“ وہ انتہائی محبت سے کہہ رہی تھیں۔ عانیہ غور سے دیکھنے پر بھی ان کے چہرے پر کوئی تسخّر کا ہنّ ڈھونڈنے میں ناکام رہی تھی، جو اکثر لوگوں کے چہروں پر ان کے ذکر سے پھیلتا تھا۔

”انہوں نے سٹیج کی بہت خدمت کی ہے، لیکن افسوس کہ ہمارے ہاں لوگ خدمات کا اعتراف زیادہ دیر تک نہیں کرتے اور زیادہ تر سٹیج کے اداکار انتہائی کمپری کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور بعض لوگوں نے تو اپنی زندگی کے آخری ایام بہت دردناک انداز سے گزارے ہیں۔“ رضا بھی افسردگی سے کہہ رہا تھا۔

”بس! کیا کیا جائے یہ ہمارے معاشرے کی ستم ظریفی ہے۔“ عانیہ بھی افسردہ ہوئی، لیکن عالیہ بیگم نے دانستہ موضوع تبدیل کر دیا تھا۔ ”بیٹا! آپ کی دوسری بہن کیا کرتی ہیں؟ شادی شدہ ہیں یا.....؟“ انہوں نے بات ادھوری چھوڑی تو ایک تاریک ساسیہ عانیہ کے چہرے پر دوڑا.....

”میری دوسری بہن شوہر میں ہے۔ آج کل اس کا ایک پرائیویٹ چینل پر ڈرامہ ادا ہے شاید آپ نے دیکھا ہو.....“

”کیا نام ہے آپ کی بہن کا.....“ رضا عجلت میں بولا تھا، اس کی چھٹی حس الارم بجا رہی تھی۔

”ماہرہ شیخ.....“ وہ آرام سے بولی تھی۔

رضا کو ایک دم جھٹکا سا لگا تھا۔ اس نے بے ساختہ گردن موڑ کر بے یقینی سے اسے دیکھا جو یہ ”بریکنگ نیوز“ سنا کر لاپرواہی سے الیکٹرک کینٹل میں چائے بنا رہی تھی۔

”ارے! یہ ماہرہ شیخ آپ کی بہن ہیں؟“ عالیہ بیگم کو سن کر خاصی خوشی ہوئی تھی۔ وہ اس کا ڈرامہ بہت شوق سے دیکھتی تھیں۔ ”تب ہی میں کہوں کہ نمرہ کے نقوش کچھ جانے پہچانے سے لگ رہے ہیں۔ دونوں کی شکل خاصی ملتی ہے۔“ عالیہ بیگم کی آواز میں خاصا جوش تھا، جسے

محسوس کر کے عانیہ مسکرا دی۔

”مفتخو کے دوران رضا نے قدرے محتاط انداز سے پوچھا۔“ عانیہ! کیا آپ کی سسٹر

ماہرہ کہیں بے ایگ گیسٹ کچے طور پر ڈیفنس میں رہتی ہیں؟“

”جی ہاں!“ اس نے بغیر کسی لگی لپٹی کے کہا۔ ”اصل میں اب اس کے شوہر میں آنے کے سخت خلاف تھے اور وہ ہر روز کی بحث سے اکتا کر احتجاجاً علیحدہ رہنے لگی اور ویسے بھی وہ خاصی نفس طبیعت کی مالک ہے، اسے ہمارے علاقے اور شخص زودہ فلیٹ سے نفرت ہے۔ بس کبھی کبھار ملنے کیلئے آ جاتی ہے۔“ عانیہ نے چائے کے کپ پکڑاتے ہوئے صاف گوئی سے بتایا اور اس کی یہی سادگی اور سچائی عالیہ بیگم کو بھار ہی تھی۔

”بس بیٹا! یہ نئی نسل اپنے بزرگوں کے تجربات سے نہیں سیکھتی۔ اپنے ماں باپ کی محنت کی قدر نہیں کرتی۔“

”رضا کے والد چاہتے تھے کہ یہ آرمی جوائن کرے لیکن یہ میڈیا میں آ گیا۔“ وہ انتہائی محبت بھرے انداز سے بتا رہی تھیں۔ ”لیکن مجھے ذاتی طور پر یہ قطعاً پسند نہیں کہ اولاد کو اپنی مرضی سے چلایا جائے، تجربے کرنے دو انہیں، ٹھوکر لگے گی تو خود سنبھل جائیں گے۔“

عانیہ نے مسکرا کر اس مہربان سی عورت کو دیکھا، جن کی آنکھوں اور ہر انداز سے محبت اور چاہت چھلک رہی تھی، جبکہ رضا اپنی ماں کی باتوں پر صرف مسکرا رہا تھا۔ اسی لمحے دروازہ دھڑ سے کھلا اور نمرہ اندر داخل ہوئی۔ اندر کا منظر دیکھ کر نہ صرف اس کی آنکھیں بلکہ منہ بھی بے یقینی اور حیرت سے کھلا رہ گیا۔

”السلام علیکم!“ اس نے گڑبڑا کر سلام کیا۔

”ماشاء اللہ جگ جگ جیو! آؤ ناں، دروازے میں کیوں کھڑی ہو، آپ بھی سوچتی ہوں گی کہ یہ ماں اور بیٹا تو جان ہی نہیں چھوڑ رہے۔“

وہ متبسم انداز سے پھر گویا ہوئیں ”اور اب تو یہ جان ساری زندگی نہیں چھوٹے گی۔“ عالیہ بیگم کی ذومعنی بات پر عانیہ نے چونک کر پہلے انہیں اور پھر رضا کو دیکھا، جس کی آنکھوں میں نمرہ کو دیکھتے ہوئے سواٹ کے بلب جگمگا رہے تھے۔ عانیہ کو پہلی دفعہ احساس ہوا کہ معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے۔



وہ توپ کے گولے کی طرح ایک دھماکے کی مانند دروازہ کھول کر رضا کے آفس میں داخل ہوا تھا۔ لیپ ٹاپ پر کام کرتے رضا نے سخت حیرت سے ارحم کو دیکھا جس کی آنکھوں میں شدید غصہ اور اشتعال بھرا تھا، بھینچی ہوئی مٹیوں اور سرخ چہرے کے ساتھ وہ مضطرب کی انتہاؤں پر تھا۔

”تم نے صبح نیوز سی؟ دیکھا ناں وہ الو کی پٹھی مجھ سے جھوٹ بولتی رہی ہے۔“ کمرے میں آتے ہی وہ بولا نہیں بلکہ دھاڑا تھا۔ رضا نے تاجبگی کے عالم میں اسے دیکھا جو صوفے پر غصے سے بیٹھا بار بار پہلو بدل رہا تھا۔

”کس الو کی پٹھی نے؟“ وہ حقیقتاً نہیں سمجھا تھا۔

”وہی مارہ شیخ.....“ اس کے بھڑک کر بولنے پر وہ بری طرح چونکا اور لاشعوری طور پر لیپ ٹاپ بند کیا۔ اس کے سارے حواس سرعت سے جاگے تھے۔

”کیوں کیا ہوا؟“ اس نے سنبل کر پوچھا۔

”ہونا کیا ہے؟ اس گھٹیا لڑکی سے میں نے پچھلے ہفتے ہی پوچھا تھا کہ تمہارے والدین کہاں ہوتے ہیں؟ مجھے انتہائی معصوم انداز سے بتانے لگی کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے اور وہ صرف تین بہنیں ہیں، لیکن رات وہ جو شیخ کے تھرڈ کلاس سے ایکسٹریج جی کا انتقال ہوا تو اس پر نیوز میں چھوٹی سی ڈاکٹومنٹری فلم دکھا رہے تھے جس میں انہوں نے خصوصی طور پر مارہ شیخ کا ذکر کیا۔ اندازہ کرو سارا عالم جانتا تھا اور میں ہی اس کے ہاتھوں الو بنا ہوا تھا، دیکھو کتنی دھوکے باز لڑکی ہے۔“ ارحم کو سخت صدمہ ہوا تھا۔

”اوہ سوسید! کب انتقال ہوا ان کا؟“ رضا کو حقیقتاً رنج کی کیفیت نے گھیر لیا تھا۔ ابھی پچھلے ہفتے تو وہ ان کو دیکھ کر آیا تھا تب بھی ان کی حالت خاصی خراب تھی اور اس نے دانستہ ارحم کو نہیں بتایا تھا کہ اس کا پروپوزل عانیہ جیل کی فیملی نے قبول کر لیا ہے۔

”رات کے کسی پہر ڈیڑھ ہوئی ہے جنازہ آج ہے۔“ وہ انتہائی بگڑے تیوروں کے ساتھ بتا رہا تھا۔

”یہ تو بہت افسوسناک بات ہے۔“ رضا نے تاسف بھرے لہجے میں کہا، لیکن وہ تو اپنے ہی غم میں الجھا ہوا تھا۔

”مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ وہ اس شیخ جی کی بیٹی ہے اس بھانڈے میراثی کی۔“

تفریح بھرے انداز سے کہہ رہا تھا۔

”ارحم پلیز! کسی مرے ہوئے شخص کے بارے میں ایسے الفاظ استعمال نہ کرو۔“ رضا کے لہجے میں اس قدر قطعیت اور سختی تھی کہ ارحم جیسا بد لحاظ شخص بھی ایک لمحے کو خاموش رہ گیا۔

”اور جہاں تک بھانڈے اور میراثی ہونے کی بات ہے تو ان کا تعلق بھی شوہر سے تھا اور ہمارا تعلق بھی شوہر سے ہے۔ اس لحاظ سے ہم بھی بھانڈے اور میراثی ہوئے۔“ رضا کے دلوک انداز پر ارحم نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔

”تم اپنے آپ کو اور مجھے ان تھرڈ کلاس ایکٹرز کے ساتھ ملا رہے ہو جو چیپ قسم کے مذاق کر کے لوگوں کا دل بہلاتے ہیں۔“

”تو ان ایکٹرز کو چیپ قسم کے جملے کون لکھ کر دیتا ہے؟ ہم لوگ ہی لکھ کر دیتے ہیں ناں؟“ وہ حد درجہ جھنجھلا رہا تھا۔

”اور جہاں تک بات مارہ شیخ کی ہے تو اس نے اپنے والد کے بارے میں چھپا کر غلط کیا، لیکن شاید اس میں بھی ہمارا قصور ہے اسے ہم جیسے لوگوں کی ذہنیت کا سامنا رہتا ہوگا تب ہی تو اس نے جیتے جاگتے شخص کو مار دیا۔ ہم لوگ انہی اداکاروں کے ڈرامے بہت شوق سے دیکھنے جاتے ہیں انجوائے کرتے ہیں اور بعد میں انہیں بھانڈے اور میراثی کہہ کر ان کا تسخر اڑاتے ہیں۔ ہم خود ایک بیمار قوم ہیں۔“ وہ ارحم کی پیشانی پر لکھ بڑھتی شکنوں کی پروا کئے بغیر بلا جھجک بول رہا تھا۔

”اور یہ جو عانیہ جیل ہے جس کے لفظوں کے پیچھے ہم پاگلوں کی طرح ریٹنگ بڑھانے کیلئے استعمال کرنا چاہ رہے تھے وہ بھی اسی شخص کی بیٹی ہے اور بڑے فخر سے اپنے باپ کا تعارف کرواتی ہے۔ اس کے باپ نے اپنی زندگی کے قیمتی تیس سال شیخ کے پودے کی آبیاری کرنے میں لگائے ہیں۔ اس شخص نے اپنی بیٹیوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا، ان کو شعور دیا، تم خود اس بات کو مانتے ہو کہ مارہ شیخ عام لڑکیوں سے بہت مختلف ہے اور تم اس کے باپ کو بھانڈے اور میراثی کہہ کر مذاق اڑا رہے ہو۔“ وہ مضبوط لہجے میں بول رہا تھا۔ کئی لمحوں تک تو ارحم کچھ بول ہی نہیں سکا تھا۔

”آئی ایم سوری! میں تمہیں بتا نہیں سکا تھا عانیہ اور مارہ کی چھوٹی بہن نمرہ کے ساتھ میرا رشتہ ماما نے فائل کر دیا ہے اور میری پسند اور خواہش اس میں شامل ہے۔“

”کیا!“ ارحم کا منہ بے یقینی سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اسے حقیقتاً شاک لگا تھا۔ اس کے چہرے پر انتہائی صدمے کی کیفیت لکھی صاف پڑھی جا رہی تھی۔ اس کے سر پر تو گویا پہاڑ ٹوٹا تھا۔ وہ گنگ رہ گیا تھا۔

”ابھی ایک ہفتہ پہلے فارن منسٹری کی ایک پوسٹ پر کام کرنے والے عبدالعید کے بیٹے عبدالباری کے ساتھ عانیہ جمیل کا نکاح اس کے والد کی خواہش اور بیماری کی وجہ سے اچانک کرنا پڑا! ہم لوگ بھی انوائیڈ تھے اور وہیں ماما نے نمرہ کیلئے میری بات کر لی۔“ وہ اسے تفصیل بتا رہا تھا جبکہ ارحم کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ صاف گوئی سے بولا تھا۔

”آئی ایم سوری رضا! یہ تمہارا ہی حوصلہ ہے ورنہ میرا غر ف اتنا بڑا نہیں میں کسی سچ ایکٹر کی بیٹی کے ساتھ کسی بھی قسم کا تعلق نہیں رکھ سکتا۔ بہر حال تمہیں بہت بہت مبارک ہو۔“ وہ بمشکل بولا تھا جبکہ رضا نے تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھا، جو کبھی نہیں بدل سکتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کے دل پر مہر لگی ہوئی تھی لیکن وہ اتنا جانتا تھا کہ اس کا اپنا آسمان بے حد چمکدار اور روشن تھا۔



کسی ڈراؤنے خواب کے زیر اثر مائرہ کی آنکھ کھلی تھی.....

اپنے تیز تیز دھڑکتے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے بازو کی پشت سے ماتھے پر آبِ پسینہ صاف کیا اور بمشکل اٹھ کر لائٹ جلائی، کمرے میں سواٹ کا بلب جلا لیکن اندر کی تیرگی ویسے ہی قائم تھی..... بلب کی روشنی میں فلیٹ کی خشکی اور نمایاں ہو رہی تھی۔

اس نے چھت کے گارڈر پر نظریں جمائے اپنی زندگی کی ڈائری ذہن میں کھول دی۔ طرف یادوں کی کرچیاں تھیں، جو دل و دماغ میں بیٹھے پچھتاوے کو تعاقب دے رہی تھیں۔ اس کے اعصاب شل ہو چکے تھے۔ وہ فلیٹ میں تنہا تھی اور تنہائی اور پچھتاوے کے ناگ اسے دن رات ڈستے تھے۔ وہ جب پیدا ہوئی تو ابانے اس کا نام رانی رکھا تھا۔ اس کی عادات بھی بہت شاہانہ تھیں اور وہ ابا کی حد درجہ لاڈلی بیٹی تھی اور اس لاڈ میں اس نے ہمیشہ اپنی منوائی اور اکثر اس کا ناجائز فائدہ بھی بہت دھڑلے سے اٹھایا۔

وہ بچپن سے ہی بہت خود غرض تھی اور ہمیشہ اپنی ذات کے بارے میں سوچتی۔ اس کو اب

نے شہر کے سب سے بہترین سکول میں تعلیم دلوائی اور جیسے جیسے وہ بڑھتی گئی اسے اپنے علاقے، فلیٹ اور ماحول سے چڑھتی گئی۔ وہ ابا سے اکثر لڑتی اور کسی اچھے علاقے میں گھر لینے کی فرمائش کرتی جو کہ ان کیلئے ممکن نہیں تھا، کیونکہ ان کے محدود معاشی ذرائع تھے۔

اسے ابا کے پروفیشن سے نفرت تھی اور وہ اکثر اپنی کلاس فیلوز کو ان کے بارے میں غلط بتاتی۔ اسے حد درجہ تذلیل کا احساس ہوتا، اگر اسے کوئی سٹیج ایکٹر کی بیٹی کے حوالے سے مخاطب کرتا۔ اسے ابا کا حوالہ سخت ناپسند تھا اور یہی وجہ تھی کہ جب اس کے ایک کلاس فیلو نے اسے شوہز جوآن کرنے کا مشورہ دیا تو اس نے ابا کی مخالفت کی وجہ سے گھر ہی چھوڑ دیا اور ہاسٹل میں رہنے لگی۔ وہ ایک ٹاپ کلاس ماڈل اور اداکارہ بننا چاہتی تھی۔ اپنی ذات کی شناخت کے سفر میں وہ سب کچھ چھوڑ آئی تھی۔ اسے ان بدبودار گلیوں سے گھن آتی تھی، وہ ایک ہی جست میں آسمان کو چھونا چاہتی تھی۔

جن دنوں ابا سخت بیمار تھے عانیہ نے اسے بار بار فون کیا کہ وہ آ کر ابا سے معافی مانگ لے لیکن وہ ہر بار اسے دھتکار دیتی تھی۔ وہ اپنے ماضی سے ہر قیمت پر چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی۔ خواہشات کی دیمک نے اس کے ذہن و دل کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا اور پھر اسے ارحم بخاری مل گیا۔ اس نے سوچا کہ اب زندگی سہل ہو جائے گی مگر وہ جانتی نہیں تھی کہ تقدیر اپنے دامن میں کون سی گھاٹ لئے، اس کی منتظر ہے۔

اور پھر ابا مر گئے اور ان کی وفات نے اس کا سارا پانسہ الٹ دیا تھا۔ میڈیا نے اس کے حوالے سے ان کی موت کو خاصی کوریج دی تھی اور اسے ابا کے انتقال کا اتنا دکھ نہیں تھا، جتنا ان کی ذات کے حوالے سے اپنی پہچان نے کرب میں مبتلا کر دیا تھا، حالانکہ بے شمار لوگوں نے اس سے بہت خلوص دل سے ان کی موت کی تعزیت کی تھی اور ابا کی خدمات کو سراہا تھا، لیکن ارحم بخاری کے الفاظ نے اسے آسمان سے زمین پر لا پھینکا تھا۔ وہ اپنی ہی نظروں میں بے وقعت ہو گئی تھی اور اسے پہلی دفعہ احساس ہوا تھا کہ اسی باپ کے حوالے سے عانیہ اور نمرہ نے خوبصورت زندگیوں کا آغاز کیا تھا اور وہ ابا کے نام پر فخر کرتی تھیں۔ تیرگی تو اسی کے حصے میں آئی تھی۔

عانیہ اور نمرہ دونوں اپنے گھروں میں بہت آسودہ حال تھیں اور ایک وہی تھی جس کی زندگی میں اضطراب اور بے چینی نے ڈیرے ڈال لئے تھے۔ اسے ابا کی موت کے بعد

احساس ہوا تھا کہ اس کا کتنا بڑا نقصان ہوا ہے۔ ارحم نے بھی انتہائی برے الفاظ میں اسے دھتکار دیا تھا اور اسے ٹھیک طریقے سے اس کی ”اوقات“ دکھائی تھی۔

اور وہ جو سمجھتی تھی کہ حسن ایک ایسا ہتھیار ہے جس کے ساتھ وہ دنیا فتح کر سکتی ہے، اپنے پہلے ہی قدم پر بری طرح گری تھی۔ آسائشات اور اپنی ذات کی پہچان کے جنون میں اس نے سکون کی دولت گنوا دی تھی اور تب اسے احساس ہوا تھا کہ اس کا کتنا بڑا نقصان ہوا ہے۔

اب اس سے آخری لمحے تک خفا تھے یہ احساس اسے کہیں بھی سکون نہیں لینے دیتا تھا۔ اس نے شوہر کی دنیا چھوڑ دی تھی۔ عجیب سی بے چینی طبیعت بن گئی تھی اس کی جو اسے ہر لمحہ مضطرب رکھتی تھی۔ عانیہ اور عبدالباری اپنے ایک بیٹے کے ساتھ بہت خوش و خرم تھے اور اکثر اسے لینے آتے لیکن وہ ہر دفعہ جانے سے انکار کر دیتی۔ اسے اس فلیٹ سے خوشبو آتی تھی ابا کی اور وہ ساری رات ننگے پاؤں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتی لیکن بے چینی نغم ہی نہیں ہوتی تھی۔ نمرہ بھی شادی کے بعد رضا کے ساتھ بہت مطمئن تھی اور اب رضا نے ارحم کے ساتھ اپنی پارٹنرشپ ختم کر کے اپنا بزنس شروع کر لیا تھا۔ اس کی دونوں فیکٹریاں بہت اچھا خاصا منافع دے رہی تھیں۔

بس ایک وہی سیٹ نہیں تھی۔ اسے رات بھر نیند نہیں آتی تھی۔ آج بھی ایک ڈراؤنے خواب کے زیر اثر اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ حلق بالکل خشک تھا اور کمرے میں جس اور گرمی کا احساس بڑھ گیا تھا۔ وہ سرعت سے اٹھ بیٹھی اور کمرے کی ساری کھڑکیاں کھول دیں، لیکن گرمی کا احساس جوں کا توں تھا۔ وہ ننگے پاؤں دوپٹے سے بے نیاز دروازہ کھول کر باہر ٹیکری میں نکل آئی۔

سامنے مندر میں بلب کی روشنی میں کالی ماما کی مورتی سے اسے عجیب سا خوف لاحق ہوا۔ کالی ماما جو موت کا پیغام تھی اس کو اپنا وجود مردہ لگ رہا تھا۔ تنہا اور خالی ہاتھ..... زیست کا یہ سفر اس کو پتا نہیں کب تک اکیلے کاٹنا تھا، کیونکہ پچھتاؤں کے موسم اتنی آسانی سے کہاں گزرتے ہیں۔ اس نے رنجیدگی سے آسمان پر اماؤں کے اداس چاند کو دیکھا۔ نیچے تنگ اور بوسیدہ گلی بالکل ویران تھی جیسے وہ تنہا تھی..... بالکل تنہا..... اور خالی ہاتھ۔



### اک رسم محبت ہے

پہلے آندھی اور پھر دھواں دھار بارش کے بعد پورا گھر بے ترتیب اور گرد سے اٹا ہوا تھا۔ انہوں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔

کالے سیاہ بادلوں سے ڈھکا آسمان اب مکمل رفتار سے برسنے کے بعد خاصا پرسکون تھا۔ الماس کے زرد کچھوں میں چھپی کونل کی آواز خالی گھر میں انہیں زندگی کا احساس دلا گئی۔ اے سی بند کر کے انہوں نے گھریلو سلیپر پہنے اور پورے کمرے کے پردے کھڑکیوں سے ہٹائے اور دروازہ کھول کر باہر نکلے تو فضا میں جس کا احساس ہو رہا تھا۔ لان میں لگے آم کے درخت پر کچھ کوئے شور مچا رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی وہ خوفزدہ ہو کر اڑے اور اب لان پرندوں کے وجود سے صاف ہو چکا تھا۔

برآمدے کا فرش مٹی سے اٹا ہوا تھا اور اب درختوں کے پتے اور بارش کے پانی کی وجہ سے ہر طرف کچڑ ہی کچڑ تھا۔ سفید ٹانکوں والا فرش گندا دیکھ کر انہیں خفقان ہونے لگا، ہر طرف بوگن دیلیا کے گلابی پھول بکھرے ہوئے تھے۔ کونے میں لگی ٹیل کے پیچھے سے ایک ننھی گی گھبری نے بڑی شرارتی نظروں سے ان کو دیکھا اور پھر بھاگ کر نیم کے درخت پر چڑھ گئی۔

درختوں کے پتے، ٹوٹی شاخیں اور ان میں جگہ جگہ کھڑا بارش کا پانی دیکھ کر انہیں گھریلو ملازم پر غصہ آنے لگا۔

جو شاید ان کی گھری نیند کا یقین کر لینے کے بعد پڑوس میں رہنے والے سول جج کے ملازم کے ساتھ گھس لگانے چلا گیا تھا اور اس کی یہ عادت انہیں زہر لگتی تھی۔

”میں آج ہی سارا حساب بے باق کر کے کسی اور ملازم کا بندوبست کرتا ہوں۔“ انہوں

نے مصمم ارادہ کیا۔

وہ جھنجھلا کر مڑنے لگے اور اسی وقت لان کے پاس لوہے کا گیٹ کھلنے کی آواز پر انہوں نے دیکھا۔ شرمندہ شرمندہ سارفتی آنکھیں چراتا ہوا اندر داخل ہو رہا تھا۔

ان کے غصے سے گھورنے پر اس نے گھبرا کر کندھے پر رکھے صاف سے منہ صاف کیا اور جلدی جلدی پورچ میں گول مول انداز میں پڑے پائپ کو کھینٹا اور تیزی سے لان میں لگے تل پر اس کا منہ فٹ کرنے لگا اور اگلے ہی دو منٹوں میں لان کے کونے میں پڑا گیلا ہماڑو اٹھا کر فرش دھونے کی تیاری کر چکا تھا۔

”فرش دھونے کے بعد تیر کا پنجرہ بھی صاف کر دیتا۔ اندر گند کا ڈھیر لگ چکا ہے جو تمہیں پتا نہیں کیوں نظر نہیں آتا اور پھر ہاتھ منہ دھونے کے بعد فوراً مجھے چائے کا کپ بنا کر سٹڈی روم میں دے کر جاؤ۔“

”جی صاحب!“ رفیق نے اتنی جلدی جان چھوٹنے پر اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے سر ہلایا۔ اندر جا کر انہوں نے اپنے کپڑے نکالے اور آدھا گھنٹہ شادو لینے کے بعد طبیعت میں کچھ تازگی کا احساس جاگا تھا۔ گیلے بالوں میں برش کرتے ہوئے ان کی نظر سائینڈ ٹیبل پر رکھی کالے رنگ کی فائل پر پڑی اور طبیعت پر عجیب سا بوجھ پھر ان گرا تھا جس سے چھٹکارا پانے کیلئے وہ کورٹ سے آنے کے فوراً بعد سو گئے تھے۔ کیونکہ دوپہر سے وہ اچھے خاصے ذہنی خلفشار کا شکار تھے۔

لیکن آنکھیں بند کرنے کے بعد چندا کی دو حیران اور بے یقین آنکھیں ذہن کے پردے پر ابھری تھیں۔

آج صبح کورٹ جاتے ہوئے انہیں لمحہ بھر کو بھی گمان نہیں ہوا تھا کہ جس اور گرمی کا یہ موسم ان کے اندر بھی آگ لگا دے گا..... آج موسم میں عجیب بے چینی کا عنصر بھی شامل ہو گیا تھا اور پھر کورٹ کے احاطے سے گزرتے ہوئے ایک چھتھرا پٹیر کے نیچے کا سنی شرٹ پروائٹ دوپٹہ اوڑھے لا پرواہی سے کسی وکیل سے باتیں کرتی لڑکی پر انہیں چندا کا گمان ہوا تھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ کندھے جھٹک کر اپنے جیمبر کی طرف بڑھ گئے۔

اور ٹھیک تیس منٹ کے بعد کمرہ عدالت میں اپنے وکیل کے ساتھ آتی لڑکی کو دیکھ کر وہ ایک دم سنائے میں آ گئے۔

چلتے چلتے وہ بھی رکی اور ہکا بکا انداز میں منصف کی سیٹ پر برجمان بندے کو دیکھ کر اس کا سانس ایک لمحے کو رک سا گیا تھا۔

وہ قیامت خیز دھماکوں کی زد میں تھی۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں اس کا گلابی مائل چہرہ پید ہو گیا تھا جبکہ دل پہلو میں خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خیر بے یقینی اور پریشانی کے رنگ نمایاں تھے۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ اضطرابی انداز میں اپنے بازو میں پڑے کڑے کو گھما رہی تھی۔

انہوں نے بہت غور سے سفید شلوار کا سنی قمیض اور سفید عام سے لان کے دوپٹے میں لمبے چندا کو دیکھا۔ اس کے کاندھوں تک آتے گھٹکریا لے بال آج بھی بہت مشکل سے کلب میں قید تھے۔

اس کے گلابی ہونٹوں کا کٹاؤ آج بھی نمایاں تھا۔

براؤن کٹورا آنکھیں آج بھی ویسی ہی سحر انگیز لگ رہی تھیں۔

چھوٹی سی تنکھی ناک میں پڑی ڈائمنڈ کی لوگ کا لشکارا آج بھی ویسا ہی تھا۔

خوبصورت گلابی پیر سفید رنگ کی پیٹوں والی چپل میں قید تھے۔

لیکن خلاف معمول اس کا چہرہ ہر قسم کے میک اپ سے عاری تھا۔

اس نے اپنے دائیں جانب کھڑے وکیل سے شاید اس کے بارے میں پوچھا تھا۔ تب ہی اس کے جواب سے چندا کے چہرے پر نمودار ہونے والا اضطراب اس کی تیز آنکھوں سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔

منصف کی کرسی پر بیٹھے ہوئے اس نے فائل کے نوٹس پڑھے۔

یہ عروج فاطمہ کا اپنے شوہر کی طرف دائر کردہ خلع کا کیس تھا۔

ان کا دل تیزی سے دھڑکا۔ انہوں نے بے یقینی سے اپنے سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھا جس کا نام تو عروج تھا اور اس کا اثر اس کے مزاج اور طبیعت میں بھی آ گیا تھا۔ وہ ہمیشہ جیتنا ہی پسند کرتی تھی۔ لیکن آج اس کی شخصیت میں وہ مخصوص دم خرم ناپید تھا۔ وہ خاصی بکھری بکھری اور کھٹکشا کا شکار لگ رہی تھی۔

لحات صدیاں بن گئے تھے۔

اور آج اپنی پرفیشنل زندگی کے پہلے دن انہوں نے بغیر کسی وجہ کے تمام کیسوں کی

”کیسی ہو؟“ انہوں نے سنبھل کر پوچھا اور ساتھ ہی رفیق کو سکواش بنانے کا اشارہ کیا۔  
 ”ٹھیک ہوں!“ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی اور بیگ کی زپ کو اضطرابی انداز میں  
 کھولنے اور بند کرنے لگی انہوں نے بہت غور سے اس کی اس لاشعوری حرکت کو دیکھا اور یوں  
 لگ رہا تھا جیسے وہ اسی کام کیلئے آئی ہو۔

”میاں جی اور بے جی کیسی ہیں؟“ اس نے بے تابی سے پوچھا۔  
 ”میاں جی!“ وہ زیر لب بڑبڑائی اور آنکھیں اٹھا کر انہیں دیکھا تو انہیں اس کی آنکھوں  
 میں دکھ بکھورے لیتا نظر آیا وہ آہستگی سے بولی۔  
 ”میاں جی کی تو ڈھنگ ہو گئی۔“

”اوہ!“ وہ ایک دم مضطرب ہو گئے۔ ”کب؟ کیسے؟“  
 ”دوسال ہو گئے۔“ وہ ہونٹوں کو کچلتے ہوئے تاسف بھرے انداز سے گویا ہوئی۔  
 ”اور بے جی!“ انہوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔  
 ”وہ زندہ ہیں لیکن اکثر بیمار رہتی ہیں۔ شوگر اور گھٹیا کے مرض نے وقت سے پہلے ہی  
 بہت بوڑھا کر دیا ہے۔“ وہ ایک لمحے کے توقف کے بعد بولی۔ ”ویسے وہ میرے ساتھ ہی  
 راتی ہیں۔“

”اور رمضو چاچا اور سیکینہ چاچی؟“  
 اس کے سوال پر اس نے حیران آنکھوں سے انہیں دیکھا اور تھیر آ میز لہجے میں بولی۔  
 ”آپ کو سب یاد ہیں؟“  
 ”ہوں۔“ وہ دیرے سے مسکرائے اور آنکھیں بند کر کے آہستگی سے بولے۔

”سب یاد ہے وہ لان میں لگا بوڑھا برگد کا درخت، وہ تمہاری گڑیا کی شادی پر لکڑی کا  
 فرنیچر تیار کرنا۔ وہ سیکینہ چاچی کے پان چرا کر کھانا۔ رمضو چاچا کو تنگ کرنا اور انکل فیضی کے  
 لان کے درخت سے کیریاں چرا کر لانا اور میاں جی سے ڈانٹ کھانا۔“ وہ ماضی میں کھو سے  
 گئے تھے اور پھر ایک یاد نے انہیں بے چین کیا تو فوراً مضطرب ہو کر آنکھیں کھولیں اور کھوجتے  
 ہوئے لہجے میں بولے۔

”تم کا مران سے طلاق کیوں لینا چاہتی ہو؟“  
 اس نے بے ساختہ آنکھیں چرائیں اور دیرے سے گویا ہوئی۔ ”میں اسی سلسلے میں

سماعت ملتوی کر دی تھی۔ ان کا شیوہ اور دفتری لوگ ششدر تھے کہ سینئر سول جج طلال منظور تو  
 اپنے کام کے معاملے میں انتہائی سخت دیا تدار اور اصولوں پر کوئی بھی سمجھوتہ نہ کرنے کی شہرت  
 کے حامل تھے اور اپنا عدالتی کام ہمیشہ مقررہ وقت پر بنانے کے قائل تھے۔  
 لیکن آج اسی طلال منظور نے عدالتی کارروائی کل تک ملتوی کر دی تھی۔

وہ چائے کا کپ لے کر لان میں پڑی چیئرز کی طرف آ گئے تھے۔ رفیق نے سارا گھر  
 چمکا دیا تھا۔ برآمدے میں رکھے گیلے محل کر خامے کھرے کھرے دکھائی دے رہے تھے۔ فضا  
 کچے آموں کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ سامنے سرسبز مہندی کی باڑھ میں بے شمار رنگ برنگ  
 چڑیاں غل چار رہی تھیں ایک ٹھنڈی ہوا کا بھیگا جھونکا کہیں سے آ کر درختوں سے ٹکرایا تو پتوں  
 پر اٹکی ہوئی بے شمار ننھی منی بوندیں پھوار کی طرح برس گئیں بادل پھر آ رہے تھے۔

انہوں نے چائے کا خالی کپ ٹیبل پر رکھا اور سگریٹ سلگا کر سامنے والی دیوار پر بیٹھی  
 چڑیا کو دیکھا جس کے پر بھیکے ہوئے تھے۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ ”صاحب جی! باہر  
 کوئی عروج فاطمہ آئی ہیں آپ سے ملنا چاہ رہی ہیں۔ میں نے بہت کہا کہ صاحب گھر پر کسی  
 سے نہیں ملتے لیکن وہ کسی طور نہیں مان رہیں۔“

”کیا.....؟“ ان کو زبردست جھٹکا لگا..... جلتا ہوا سگریٹ بہت تیزی سے انہوں نے  
 کیاری میں پھینکا تھا۔ رفیق نے ان کی اس حرکت کو ناگواری سے دیکھا اور بیزار سے بولا۔  
 ”جی گیٹ پر کھڑی ہیں۔“

”انہیں اندر لے آؤ.....“ وہ بدحواسی کے انداز میں کھڑے ہوئے۔ وہ حد درجہ مضطرب  
 اور بے چین لگ رہے تھے۔ سفید کاشن کے شلوار سوٹ میں ان کی نگہری ہوئی وجیہ شخصیت کی  
 ایک ایک ادا سے اداسی اور پریشانی ٹپک رہی تھی۔

وہ صبح والے سوٹ میں ہی ملبوس تھی۔ ہینڈ بیگ کندھے پر لٹکائے وہ دیرے دیرے  
 قدم اٹھاتی ادھر ہی آ رہی تھی۔ اس کے چہرے کے دلکش نقوش پر تعینوں کا غبار چھایا ہوا تھا۔  
 دروہام پر شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ انہوں نے فکر مندی سے اسے دیکھا جو ان کے  
 سامنے آ کر بالکل خاموش کھڑی ہو گئی تھی۔

”آئیے! تشریف رکھیے۔“ ان کے پر تکلف لہجے پر اس نے گلہ آمیز نظروں سے انہیں  
 دیکھا اور خاموشی سے لان چیئر پر بیٹھ گئی وہ بالکل گم صم سی تھی۔

کے لہجے میں صدیوں کی تھکن تھی، ایک بہت تلخ بات طلال کے لبوں تک آتے آتے رہ گئی، وہ معلق خاموش ہو گئے۔

وہ جاتے جاتے پلٹی۔ ”آپ کبھی بے جی کو ملنے آئیں نا، وہ آپ کو اکثر یاد کرتی ہیں۔“

”اچھا..... حیرت ہے؟“ ان کے بے یقین لہجے پر اس کے چہرے کی رنگت پھسکی پڑ گئی۔

”آپ مجھے معاف نہیں کر سکتے؟“ گیٹ پر ہاتھ رکھ کر وہ بہت دل گرفتہ انداز میں مخاطب ہوئی۔ وہ بشکل مسکرا کر بولے۔ ”کیوں آپ نے کیا کیا ہے؟“

وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ ”تمہارا آپ آپ۔ کر کے اجنبی اور پر تکلف انداز مجھے بہت اچھے طریقے سے جتا رہا ہے کہ میں نے کیا کیا ہے؟“

اپنی بات مکمل کر کے وہ رکی نہیں، اس سے پہلے کہ وہ اسے روکتے وہ سڑک پر کھڑے رکشے والے سے کرایہ طے کرنے میں مصروف ہو گئی۔

ساتھ والے گیٹ سے طاہر صاحب نے اسی وقت جھانکا تھا، وہ شرمندہ ہو کر وہیں سے پلٹ گئے۔

”لو اب ان کو صفائی دینا پڑے گی کہ ایک ان میرڈ بندے کے گھر میں کسی خاتون کا کیا کام؟“ وہ جھنجھلا سے گئے اور جاتے ہی اندر رفیق کو جھاڑا جو منہ کھولے اپنے صاحب کے خلاف توقع کاموں کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد انہوں نے اس کی فائل کا بغور مطالعہ کیا تو انہیں اندازہ ہوا کہ اس کی طرف سے لگائے گئے الزامات خاصے مضبوط اور جاندار تھے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ وہ بہت جلد کیس جیت جائے گی۔ لیکن ماضی کا ایک کیس ان کے دل و دماغ میں بھی کھل چکا تھا۔ انہوں نے تھک ہار کر نیکی سے ٹیک لگائی اور ماضی کا الم کھولنے لگے۔



وہ اگست کی کوئی گرم دوپہر تھی، جب وہ ابے کے ساتھ اپنا لوہے کا ٹرک، ایک ٹوکری، گز گئے اور بے شمار دیہات کی سوغات کے ساتھ شہر میں میاں جی کے گھر پہنچا تھا۔ کالج میں داخلہ لے کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا خواب اور بے شمار آرزوؤں کی پوٹلی لے کر جب وہ ابے کے ساتھ میاں جی کے گھر پہنچا اور خلاف توقع ان کا پر جوش استقبال اور اپنی زمینوں کے نشی منظور

آپ سے ملنے آئی تھی۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ انہوں نے تیزی سے بات کاٹی۔

”اور تمہیں تو کامران سے بہت زیادہ محبت تھی نا؟“ وہ بہت عجیب سے لہجے میں بولے۔

”ہوں!!“ اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔ ”وہ میری زندگی کا سب سے غلط اور بدترین فیصلہ تھا، حالانکہ میاں جی نے مجھے بہت سمجھایا تھا۔“ اس کے لہجے میں گہرا ملال اتر آیا۔

”پھر.....؟“

”میں پچھلے اڑھائی سال سے اس سے علیحدہ رہ رہی ہوں اور اب تو اس نے دوسری شادی بھی کر لی ہے اور میں نے سوچا کہ درمیان میں لٹکنے سے بہتر ہے کہ میں کوئی فیصلہ کر لوں، لیکن وہ دوسری شادی کرنے کے باوجود مجھے خود سے طلاق دینا نہیں چاہتا، کیونکہ اس صورت میں اسے ہماری بھر کم حق مہر مجھے دینا ہوگا۔ وہ چاہتا ہے کہ میں خود ہی تنگ آ کر کوئی انتہائی قدم اٹھا لوں۔“ وہ اب..... خاموشی سے جوتے کی نوک سے گھاس کرید رہی تھی، چہرے کے تاثرات کسی گہری سوچ میں گم ہونے کا پتا دے رہے تھے۔

”اچھا!“ انہوں نے پر خیال انداز میں سر ہلایا۔

”کتنے عرصے میں فیصلہ ہو جائے گا؟“ وہ سپاٹ لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

”یہ تو دوسری پارٹی پر منحصر ہے، اگر اس کا یہی ارادہ تھا تو میرا خیال ہے کہ دوسری تیسری پیشی میں ہی فیصلہ ہو جائے گا۔ وہ اپنا دفاع کرنے کیلئے چاہے اوپر اوپر سے لیکن تمہیں مصالحت کی ترغیب ضرور دے گا۔ ورنہ اس کا کیس کمزور ہو جائے گا۔ تمہارے وکیل نے اسے نوٹس تو بھیجوا دیا ہوگا۔“

”ہوں.....!“ اس نے سر ہلادیا۔

”اچھا میں چلتی ہوں۔ سکواش کا خالی گلاس سامنے ٹیبل پر رکھا اور وہ اچانک کھڑی ہو گئی۔

”بس میں چاہتی ہوں کہ فوراً فیصلہ ہو جائے، اس کے بعد میں بے جی کو لے کر گاؤں شفٹ ہو جاؤں گی۔ میں شہر کی فضاؤں، شور اور دھوکے بازیوں سے تنگ آ چکی ہوں۔“ اس

دین کو یہ یقین دہانی کہ اس کے پڑھا کو بیٹے کو یہاں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ طلال منظور کو اپنے خوابوں کی تعبیر دور دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

”منظور! تمہارے پتر نے تو بورڈ میں ٹاپ کر کے پورے پنڈ کی بلے بلے کرادی میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ جو آدموں کے باغ میں سارا دن چارپائی پر خاموشی سے کتاب کھولے بیٹھا رہتا ہے یہ بورڈ میں پوزیشن لے گا۔“ حقہ گڑ گڑاتے ہوئے میاں جی نے کلمے دل سے اسے سراہا تھا اور سبز چوکور خانوں والی دھوتی اور سفید لان کا کرتا اور کندھے پر رکے رنگین صافنے سے ماتھے پر آیا پسینہ صاف کرتے منظور دین کے چہرے پر بڑے غریب احساسات نمودار ہوئے تھے۔

”بس چوہدری صاحب! مولا کا کرم ہے میرے پتر کے حساب میں پورے سو میں سے سو نمبر آئے ہیں۔“ ابے نے ہنستے ہوئے اپنے پتر کا ایک اور کارنامہ بتایا۔

”اچھا!.....“ میاں جی چونکے اور پھر ہنستے ہوئے بولے۔  
”چلو تمہارا پتر یہاں رہے گا تو میری نالائق پوتی کو بھی پڑھا دیا کرے گا اس کی ریاضی تو بہت ہی کمزور ہے۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں چوہدری صاحب اس کی مجال ہے کہ انکار کر سکے۔“ ابے نے انہیں یقین دہانی کردائی اور پھر اس کی طرف مڑ کر بولے۔

”پتر! تمہیں چوہدری صاحب کے پاس چھوڑے جا رہا ہوں ان کی کوئی بھی بات تمہارے لئے حکم کا درجہ ہونی چاہئے۔ مجھے کوئی شکایت نہ ملے۔“

اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا اور آنکھوں ہی آنکھوں سے ابے کو یقین دہانی کردائی جو باہر جانے کیلئے پرتول رہا تھا۔

اسی لمحے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا۔ پنک شلوار قمیض میں اپنے گھنگھریالے بالوں کو بمشکل پونی میں قید کئے وہ بڑے لالباہلی انداز میں اندر داخل ہوئی تھی۔ کمرے میں دو اشیا لوگوں کو دیکھ کر وہ ہنسی اور پھر ابے کو غور سے دیکھنے پر اس کی آنکھوں میں شناسائی کی لہر ابھری اور وہ بڑے پر جوش انداز میں بولی۔

”منشی چاچا! گاؤں سے کیریاں لائے ہیں؟“  
”ہاں ہاں دی رانی! کیوں نہیں۔ اپنی چندا بیٹی کی فرمائش بھلا مجھے کیسے بھول سکتی

ہے۔“ ابے نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے یقین دہانی کروائی تو اس کی آنکھوں میں خوشی کے جگنوچک اٹھے اور وہ بڑی نوکری میں جھانکنے لگی۔

”چندا!.....!“ میاں جی کے تنبیہی لہجے پر وہ فوراً سیدھی ہو گئی اور سنجیدگی سے بولی۔  
”بے جی کہہ رہی ہیں کہ کھانا لگوا دوں؟“

”ہاں ادھر ہی بھجوا دیں۔ میں منشی منظور کے ساتھ ہی کھانا کھاؤں گا اور رمضو کو کہو کہ میرے ساتھ والا کمرہ طلال کیلئے سیٹ کر دے۔ یہ اب یہیں رہے گا۔“

”کون یہ.....؟“ چندا نے حیران نظروں سے پندرہ سولہ سال کے لڑکے کو غور سے دیکھا جو خاصا جھینپا ہوا اور دبوسا لگ رہا تھا۔ اسے خاصی مایوسی ہوئی۔

”چندا!“ میاں جی کے تنبیہی لہجے پر وہ پراعتماد انداز میں کندھے اچکا کر رہ گئی اور اگلے ہی لمحے وہ کمرے سے باہر تھی جبکہ میاں جی بڑے محبت بھرے لہجے میں کہہ رہے تھے۔

”بہت شرارتی ہے میری پوتی! اکثر اکلوتے ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھاتی ہے اور ہم دونوں بڑھے بڑھیا سوچ کر خاموش ہو جاتے ہیں کہ بن ماں باپ کی بچی ہے کہیں دل میں کوئی ملال نہ آجائے اسی کی خاطر شہر میں بیٹھے ہیں۔ ورنہ دیہات کی خالص آب و ہوا کو چھوڑنے کو کس ظالم کا دل کرتا ہے۔ نہ اس کے ماں باپ ٹریفک حادثے میں جاں بحق ہوتے نہ اس ننھی سی جان کو اتنی سی عمر میں اتنا بڑا صدمہ برداشت کرنا پڑتا۔“ میاں جی کا لہجہ گہرے دکھ میں ڈوبا ہوا تھا۔

”بس چوہدری صاحب! اللہ کی امانت تھی اس نے واپس لے لی۔ اللہ کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے۔“ ابے کے تانسف بھرے لہجے پر اس شرارت کی پڑیا کا چہرہ طلال کے ذہن میں نمودار ہوا۔ اسے تو وہ ہر لحاظ سے بڑی خوش باش اور مطمئن سی لگی تھی۔



اور پھر ایک ہفتے میں ہی اسے معلوم ہو گیا تھا کہ عروج فاطمہ عرف چندا نہ صرف چالاک بلکہ انتہا درجے کی ڈرامہ باز ہے۔ اس کی ایکٹنگ اتنی لاجواب اور فطری ہوتی کہ زمانہ شناس یاں جی اور بے جی بھی دھوکا کھا جاتے۔

ٹھیک صبح سکول کے جانے کے وقت اس کے پیٹ میں خطرناک قسم کا درد اٹھتا اور وہ اس کی شدت سے پیلی پڑ جاتی اور ٹھیک دس بجے وہ بالکل ٹھیک ٹھاک بیڑی کے درخت پر لٹکے

تھی کہ اس تک نہ پہنچتی۔

”وہ میزا کزن نہیں ہے۔“ چندا نے پرزور انداز میں تردید کی۔ شاید اس کا پینڈو حلیہ اس کے مردجہ کزن کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا، وہ اپنے گھٹنگریالے بالوں کو بہت مشکل سے پونی میں قید کر رہی تھی۔

”یہ ہماری زمینوں کا حساب کتاب رکھنے والے منشی چاچا کا بیٹا ہے۔ میاں جی کو غریبوں سے بہت ہمدردی ہے نا اس لئے وہ اسے یہاں لے آئے۔ کچھ اس بے چارے کو پڑھنے کا بھی شوق کافی ہے۔“ وہ اپنی چھوٹی سے ناک چڑھا کر اپنے دادا کی ہمدردانہ طبیعت کے ساتھ ساتھ اس کی بھی حمایت کر گئی۔

”ہونہ! پڑھ لکھ کر کون سا ڈپٹی کمشنر لگ جائے گا۔ رہے گا تو وہی نا تمہارے دادا کی زمینوں پر کام کرنے والے منشی کا بیٹا۔“ کامران کو شاید اس کی پڑھائی کی تعریف پسند نہیں آئی تھی، اس لئے خار کھائے لہجے میں بولا تھا۔

”ہاں کہہ تو تم ٹھیک ہی رہے ہو۔“ چندا نے اس کی بات سے اختلاف کرنا شاید سیکھا ہی نہیں تھا۔

اسی لمحے بے جی شاید اپنے چوزے کی تلاش میں ادھر نکل آئی تھیں، جو مرحوم ہو چکا تھا اور چندا کو لا پرواہی سے دوپٹے گلے میں ڈالے کامران کے بہت قریب دیکھ کر ان کا موڈ خاصا بگڑ گیا۔

”چندا! تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو؟“ بے جی اچانک اتنی زور سے بولی تھیں کہ وہ کھڑے کھڑے اچھل پڑی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

”توبہ ہے آپ تو جان ہی نکال دیتی ہیں۔ میں تو کامران کے ساتھ آپ کے چوزے کا افسوس کر رہی تھی، جس کو ایک موٹی تازی بلی کچھ دیر پہلے ہی مرحوم کر کے لچ کر گئی۔“ اس کی تازہ تازہ گھڑی کہانی پر طلال نے حیران ہو کر دیکھا، وہ دونوں سارے جہاں کا دکھ اور افسوس اپنے چہرے پر لئے کھڑے تھے۔

”کیا.....“ بے جی کو حقیقتاً صدمہ ہوا۔

”ہاں ہاں بے جی! میں تو اپنے کمرے میں بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ جب کھڑکی سے میری نظر اس کم بخت بلی پر پڑی جو اس معصوم چوزے کا تیا پانچہ کر چکی تھی اور بس اب تو تھوڑے

ہوئے جھولے پہ خوش باش جھولے لے رہی ہوتی۔ حالانکہ وہ ابھی نویں کلاس کی سٹوڈنٹ تھی، لیکن پڑھائی میں اس کا قطعاً دل نہیں لگتا تھا اور پھر اس کا ساتھ دینے کو انکل فیضی جو اس کے پڑوس میں مقیم تھے۔ ان کا بیٹا کامران آ جاتا اور دونوں کی فطرت میں سکون نہیں تھا۔ کامران کالج میں فرسٹ ایئر کا سٹوڈنٹ تھا لیکن وہ بھی اسی کی طرح تالائق، کام چوڑا لالہالی اور غیر ذمہ دار سا تھا۔ اگر کبھی چندا پڑھنے کا موڈ بنا کر بیٹھ ہی جاتی تو وہ کوئی اور شاندار سی شرات کا منصوبہ لے کر آدھمکتا اور چندا کا پڑھنے کا موڈ درہم برہم ہو جاتا اور ایسے میں بے جی دونوں کو خوب کوششیں۔

کامران لمبا تڑنگا لیکن خاصا دبلا پتلا تھا، لیکن رنگ اس کا خاصا گورا تھا اور اس کے معاملے میں وہ خاصا کوشش بھی تھا۔ دو چار کریموں کا مرکب جب تک رات کو سونے سے پہلے اپنے چہرے پر تھوپتا نہیں تھا، اسے نیند ہی نہیں آتی تھی جبکہ اس کے مقابلے میں چندا بھی کسی طور کم نہیں تھی۔ اسے لپ اسٹک لگانے کا خاصا شوق تھا اور اس شوق کی خاطر وہ بے جی کے دھمو کے بھی برداشت کر لیتی جو آئے دن اپنی پوتی کی حرکتوں پر ہوتی رہتی تھیں۔

طلال کا داغ لہ گورنمنٹ کالج میں ہو چکا تھا، وہ کالج سے آنے کے بعد اکثر اپنی کتابوں میں گم رہتا۔ اس دن بھی وہ لان میں شیشم کے درخت کے نیچے اپنی کتابوں کو پھیلانے لٹل بنانے میں مگن تھا، جب اس کی نظر لان کے دوسرے کونے کی طرف مہندی کی باز کے پیچے زمین کھودتے کامران اور چندا پر پڑی۔ پڑھائی میں گم ہونے کے باوجود طلال کو معلوم ہو گیا تھا کہ بے جی کی مرغی کے انڈوں سے جو بچے پیدا ہوئے تھے ان میں سے ایک بچہ چندا کے پاؤں کے نیچے آ کر شہید ہو چکا ہے۔ وہ آموں کے درخت پر چڑھی ہوئی تھی اور بغیر دیکھے نیچے چھلانگ لگانے پر یہ حادثہ ہوا تھا اور اب اس کی جان نکل رہی تھی کہ بے جی کو کہیں پانا چل جائے اور اس لئے وہ دونوں بڑی دلجمعی سے ثبوت زمین دوز کرنے میں مگن تھے۔

پندرہ منٹ اس کارروائی میں صرف کرنے کے بعد اب وہ دونوں لان میں لگے لٹے ہاتھ دھو رہے تھے۔ لگتا تھا کہ مشن کامیابی سے اختتام پذیر ہو گیا تھا۔

”یہ تمہارا پینڈو پروڈکشن کزن اتنا زیادہ پڑھتے پڑھتے تھک نہیں جاتا، اوپر سے شکل بھی سبحان اللہ ہے اور آنکھوں میں سرمہ اور سر پر تیل لگا کر تو اور بھی زیادہ ہونق لگتا ہے۔“ کامران ٹٹو سے منہ صاف کرتے شاید نہیں دیکھتا اسی پر تبصرہ کر رہا تھا اور آواز ہرگز اتنی کم نہیں



سے پر اور ہڈیاں رہ گئے تھے جو میں نے اور کامی نے ادھر قبر بنا کر دفن کر دیئے۔“

بے جی نے اس کی ”پڑھنے“ والی بات پر مشکوک ہو کر اسے دیکھا لیکن تب تک وہ انگلی کے اشارے سے ان کی توجہ تازہ تازہ بنائی قبر کی طرح مبذول کروا چکی تھی۔ بے جی کے چہرے پر غم اور تاسف ٹھاٹھیں مارنے لگا اور ایک منٹ کے بعد وہ کچھ یاد آنے پر بولیں۔  
”یہ منحوس رمضو کہاں گشت کرتا پھرتا ہے۔ ہزار دفعہ کہا ہے کہ ان معصوم جانوں پر نظر رکھا کرو لیکن اس کم بخت کی نظر پتا نہیں کہاں فٹ ہے جو اسے ادھر ادھر پھرتے معصوم جانور نظر ہی نہیں آتے۔ پچھلے ہفتے وہ چنڈال بلی ”اتنا خوبصورت“ کبوتر بغیر ڈکار لئے کھا گئی اور آج چوزے پر ہاتھ صاف کر گئی اور گھر کے ملازم پتا نہیں کہاں اندھے ہوئے پھر رہے ہیں جو اس موٹی بلی کیلئے یہ گھر ”ہالی ڈے ان“ بنا ہوا ہے۔“

بے جی کی پریشان صورت دیکھ کر کامی کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی اور اس کی کم بختی کہ یہ مسکراہٹ بے جی کی تیز نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی تھی۔ اگلے لمحے وہ اسے لتاڑ رہی تھیں۔

”تم اونٹ کے اونٹ کہاں منہ اٹھا کر ادھر ادھر پھرتے ہو۔ تمہیں اپنے گھر میں چین نہیں۔ سارا ٹائم تم میری معصوم پوتی کو بھی پڑھنے نہیں دیتے۔ ماں باپ نے بھی تمہیں شتر بے مہار کی طرح چھوڑ رکھا ہے۔ تمہارے تو گھر کے ڈھنگ ہی نرالے ہیں۔ ماں ہے تو سارا دان پارلر اور باقی ٹائم نام نہاد فنکشنوں میں مصروف رہتی ہے اور باپ ہے تو ہر وقت دو جمع دو چار ہی کرتا رہتا ہے اور بچوں کی پروا ہی نہیں۔“ بے جی اپنے چوزے کا غم اسے برا بھلا کہہ کر غلط کر رہی تھیں جبکہ وہ اپنی گھٹنوں سے پھٹی جینز کو تھوڑا سا جھک کے چھپانے میں مگن تھا اور ابھی تک بے جی کی اس پر نظر نہیں پڑی تھی۔

”بے جی! میں تو چندا کو میتھ کے نوٹس دینے آیا تھا۔“ اس کے معصوم لہجے میں بولے گئے جھوٹ پر بے جی کو قطعاً یقین نہیں آیا۔

”کیوں چندا نے اب کیا نوٹس میں گیا رہوئیں کے نوٹس پڑھنے شروع کر دیئے ہیں۔ اتنی لائق فائق تو میری پوتی کبھی نہیں رہی۔ ہر دفعہ دھکا لگا کر ہی پاس ہوتی ہے بلکہ مجھے تو لگتا ہے کہ سکول والے اپنے میاں صاحب کی عزت کا خیال کر کے پاس کر دیتے ہوں گے ورنہ اس کی قابلیت کا ہمیں بہت اچھی طرح اندازہ ہے۔“ بے جی کے ہاتھوں اس کی ٹھیک ٹھاک

عزت افزائی پر طلال کو خاصی خوشی ہوئی۔

”ہونہہ! میرے دادا غریبوں کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔“ اس کا فخر و غرور میں ڈوبا ہوا لہجہ ابھی بھی طلال کی سماعتوں میں محفوظ تھا اور اسے اس کی یہ بات بالکل بھی اچھی نہیں لگی تھی۔  
”اور لڑکے! بے جی نے اپنی عینک کا شیشہ صاف کر کے سامنے کھڑے کامی کو غور سے دیکھا۔

”تمہارے باپ کو کیا بزنس میں کھانا پڑ گیا ہے؟“  
”کک..... کیوں بے جی؟“ وہ حیرت زدہ لہجے میں بے جی کو دیکھنے لگا۔  
”یاس کی ساری جمع پونجی ڈاکو لے گئے؟“  
”نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں.....“ کامی کو حقیقتاً سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

”ایسا ہی لگتا ہے کہ تمہارا باپ خاصا غریب ہو گیا ہے اسے اپنے صاحبزادے کے پھٹے پرانے کپڑے نظر نہیں آتے یا تو اس بد شکل پینٹ کو گھٹنوں سے سلائی کروا دیا پھر مجھے بتاؤ میں تمہارے باپ کی خبر لیتی ہوں جسے ذرا خیال نہیں کہ جوان جہان بچے پھٹے پرانے کپڑوں میں شریفوں کے گھر منہ اٹھا کر چلے آتے ہیں۔“

کامی کی شاندار تواضع پر چندا کو ہنسی آگئی جبکہ وہ حیران پریشان انداز میں بے جی کو دیکھ رہا تھا جو افسوس بھرے انداز سے کامی کی گھٹنوں سے پھٹی جینز کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

”بے جی! یہ شائل تو آج کل فیشن میں ان ہے۔“ وہ جھنجھلا کر بولا۔ طلال کے سامنے بے عزتی کا احساس خاصا دگمنا ہو گیا تھا۔

”دفع دور..... آگ لگے ایسے بے شرم فیشن کو۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے کتے تمہارے پیچھے لگ گئے اور تم ٹھوکر کھا کر زمین پر گرے اور یہ پینٹ گھٹنوں سے پھٹ گئی۔ تو یہ تو بے قیامت کی نشانیاں۔ اب یہ میلے کالے گھٹنے دکھانا کون سا دہیات فیشن ہے؟ چلو جاؤ اپنے گھر شام کو اپنی ماں کو بھیجنا“ میں ذرا اس سے پوچھوں کہ بی بی جوان جہان اولاد پر نظر رکھنا کیا صرف پڑوسیوں کا فرض ہے؟“

کامران کا موڈ خاصا خراب ہو گیا تھا وہ غصے سے مڑا لیکن بے جی کا غصہ ابھی کم نہیں ہوا تھا اور ان کی نظر لان کی گھاس پر چادر بچھائے اپنی کتابوں میں مگن طلال پر پڑ گئی۔

”لو اب یہ بچہ بھی تو ہے کتنا بھلا مانس ہے۔ ہر وقت اپنے کام میں مگن اور صبح کو میاں جی کے ساتھ مسجد میں نماز پڑھنے جاتا ہے۔ اتنا باادب اور شریف بچہ بھی تو تمہاری ہی عمر کا ہے۔ مجال ہے کہ ایسی فضول اور بے ڈھنگی حرکتیں کی ہوں جو تم کرتے ہو کچھ اس سے بھی عقل یکھو۔“

کامران نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا جو کتابوں میں مگن نظر آنے کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کالر سے پکڑ کر اس پینڈو کو سڑک پر اٹھا کر پھینک دے۔

”ہونہہ.....“ وہ غصے سے پاؤں پٹختا ہوا گیٹ کی طرف چل پڑا۔ چندا نے خوفزدہ ہو کر اس کے بے حد خراب موڈ کو اور پھر شکوہ کنال نظروں سے بے جی کو دیکھا جو چوڑے کی قبر کا بنور جائزہ لینے میں مگن تھیں۔ وہ بھی غصے سے پاؤں پٹختی اندر چلی گئی۔



چندا کے سکول میں ہونے والے ٹیوشنوں کا رزلٹ آچکا تھا۔ وہ ریاضی اور فنرکس میں بہت بری طرح فیل تھی اور میاں جی کا پارہ عروج پر پہنچا ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کی دوسری غیر نصابی سرگرمیاں بالکل معطل اور میاں جی کی زیر نگرانی پڑھائی عروج پر تھی۔ اس وقت بھی وہ چھڑی پاس رکھے طلال کے پاس میٹھ کی کوئی مشق سمجھتی چندا کو بغور غصے میں دیکھ رہے تھے جس کی تمام تر توجہ اپنے رجسٹر کی بجائے کچھ فاصلے پر لیموؤں کا اچار ڈالتی بے جی پر تھی۔

”بس اگلا سوال اسے دو یہ خود کر کے دکھائے۔“ میاں جی کے غصے بھرے انداز پر چندا نے دہل کر مکمل توجہ رجسٹر کی طرف کی۔ حالانکہ دل چاہ رہا تھا کہ تازہ کٹا ہوا لیموں نمک مرچ لگا کر پٹھارے لے کر کھائے۔

اس کا حل شدہ سوال غلط دیکھ کر میاں جی خاصے اشتعال میں آگئے تھے۔ حتیٰ کہ طلال بھی گھبرا گیا کہ اس ٹکمی لڑکی کے دماغ میں کیسے الجبرے کے سوال ڈالے۔

”ایسی نامعقول اور نالائق اولاد خدا کسی کو نہ دے جو بوڑھے دادا کو ہر وقت ستاتی ہو۔ باپ جتنا اس کا لائق فائق اور ذہین تھا بیٹی اتنی کم عقل نالائق اور کند ذہن ہے جس کے دماغ میں بھوسہ بھرا ہوا ہے۔ وہ بچہ اتنی زیادہ محنت سے ایک ایک چیز سمجھا رہا ہے کہ اتنی دور بیٹھے مجھے سمجھ آگئی ہے مگر اس کے بیچے میں کوئی چیز آتی نہیں۔“

میاں جی کے اندر اشتعال کی ایک لہر اٹھی تھی جبکہ بے جی نے بڑے تاسف بھرے انداز سے اپنی پوتی کو دیکھا جو ان دونوں میاں بیوی کیلئے امتحان بنی ہوئی تھی۔

”میں کیا کروں اتنا تو مشکل میٹھ ہے۔“ چندا ہمت کر کے بولی۔

”تمہاری اس مشکل کا حل بھی میں نے ڈھونڈ لیا ہے۔“ میاں جی اب کے بڑے مستحکم

رہی ہیں۔ مجھے بھی انہوں نے بھگا دیا۔  
”کیوں؟“

”اس کا بھی کل کیمسٹری کا پیپر ہے نا۔“  
”تو ظاہر ہے کہ وہ پیپر کی تیاری چھوڑ کر کیسے جاسکتا ہے اس کے مستقبل کا معاملہ ہے۔“  
لال نے اسے سمجھایا لیکن وہ بات کاٹ کر بولی۔

”وہ بالکل جاسکتا ہے۔ اگر اس کی خونخوار می اسے کرے سے نکال دیں۔ وہ میری کوئی  
ات نہیں ٹالتا، تمہاری طرح تھوڑی ہے۔“ اس نے اپنی چھوٹی سی ناک چڑھائی تو وہ کچھ سوچ  
کر کھڑا ہو گیا۔

”اوکے ٹھیک ہے لیکن میرے پاس صرف ایک گھنٹہ ہے۔ اس سے مزید ایک منٹ بھی  
نہیں۔“ اس نے کھڑے ہو کر انگلی اٹھا کر وارننگ دی تو چندا کا چہرہ کھل اٹھا اور وہ جلدی جلدی  
وہل۔

”ہاں ہاں! کیوں نہیں۔ ہم یوں گئے اور یوں آئے اور ویسے بھی چار بجے میاں جی کے  
اٹنے کا ٹائم ہوتا ہے۔ ہم بس تین چار کیریاں توڑیں گے اور آ جائیں گے۔“  
”کیا.....؟“ وہ چلتے چلتے رکا اور مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔ ”تم تو کہہ رہی تھیں  
کہ بھنورے دیکھنے جانا ہے۔“

”ہاں تو ساتھ میں دو چار کیریاں بھی توڑ لیں گے تو کیا حرج ہے۔“ اس نے اتنے ہلکے  
ہلکے انداز میں کہا کہ وہ چاہتے ہوئے بھی اختلاف نہ کر سکا اور واقعی ایک گھنٹہ پندرہ منٹ کے  
بعد وہ کامیاب دورہ کر کے گھر واپس آ چکے تھے جو باغ جناح سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ اس  
”ورے سے ان دونوں کے تعلقات میں تو بہتری آئی تھی لیکن طلال کو ایک گھنٹہ مزید رات کو  
جاگنا پڑا۔“

امتحانات سے فراغت ملتے ہی وہ فوراً گاؤں چلا گیا تھا جہاں ابا اور بے بے اس کے  
بچپن سے منتظر تھے اور ایک مہینہ جنگی بجاتے گزر گیا تھا اور اگلے ماہ اس نے اکیڈمی جوائن  
کر لی تھی اس لئے واپس آ گیا اور یہاں آتے ہی اسے معلوم ہوا کہ چندا بھی کچھ بہتر نمبر لے  
کر اگلی کلاس میں ہو چکی ہے اور جب رزلٹ آیا تو اس کے اپنے کالج میں سب سے زیادہ نمبر  
البتہ پورے لاہور بورڈ میں اس کی دوسری پوزیشن تھی۔ بے جی کی خوش دیدنی تھی۔ انہوں نے

اور ہموار انداز میں بولے۔ چندا نے دہل کر انہیں دیکھا جو بے جی سے مخاطب تھے۔  
”یہ اگر نوں کلاس میں پاس ہوتی ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ میں اس کا رشتہ ڈھونڈتا ہوں  
جس میں سے قبل ہوگی اس سے اگلے مہینے اس کی شادی کر دوں گا۔ نہ رہے گا بانس نہ بے جی کی  
بانسری۔“

”کیا.....“ چندا کو یوں لگا کہ جیسے آسمان اس کے سر پر آگرا ہوا اس نے بے یقینی سے  
میاں جی کو دیکھا، جواب خاصے مطمئن انداز میں کوئی کتاب کھولے اس میں لگن ہو چکے تھے۔  
”لو یہ کیا بات ہوئی؟ کوئی ایسے بھی کرتا ہے؟“ وہ غصے سے بڑبڑائی اب کہ وہ مکمل دل و  
دماغ سے پڑھائی کی طرف متوجہ ہوئی، کیونکہ میاں جی سے کسی بھی چیز کی توقع کی جاسکتی تھی  
اور اس کے ہونے چہرے کو دیکھ کر طلال کو ہنسی آ گئی۔

اور پھر اگلے چند ماہ اس نے واقعی سنجیدگی سے پڑھائی شروع کر دی تھی، لیکن کامران  
کے ساتھ دو پہر کو اس کی سرگرمیاں ہنوز جاری تھیں۔ آئے دن دونوں کی شکایتیں ادھر ادھر  
سے موصول ہوتی تھیں جو اگر بے جی تک پہنچتیں تو وہ اسے سرزنش کر کے میاں جی سے چھپا  
جاتیں اور میاں جی کے پاس پہنچنے والی شکایتوں پر اس کی ٹھیک ٹھاک کھپائی ہوتی، لیکن وہ  
خاصی ڈھیٹ واقع ہوئی تھی۔

طلال کے فرسٹ ایئر کے ایگزام شروع ہو گئے تھے اور وہ مکمل طور پر پڑھائی میں غرق  
تھا۔ اگلے دن کیمسٹری کا پیپر تھا۔ جب رائل بلیو لان کے سوٹ میں بالکل فریش اور تروتازہ  
چندا اس کے کمرے میں آن دھمکی۔ اپنی سارے بالوں کی اس نے سر کے اوپر پونی بنا رکھی تھی  
جو اس کے بات کرنے پر ادھر ادھر حرکت میں آتی تو یہ منظر طلال کو بہت دلچسپ لگتا۔  
”چلو باغ جناح میں بھنورے دیکھنے چلتے ہیں۔“

سخت دو پہر کو اس کے منہ سے یہ عجیب سی فرمائش سن کر وہ ہکا بکا رہ گیا اور اس کے  
حیرت زدہ چہرے کو دیکھ کر چندا کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”ہاں ہاں! بہت مزا آتا ہے۔“ اس نے اسے ترغیب دی۔  
”جی نہیں! میرا کل پیپر ہے۔ مجھے کہیں نہیں جانا، تم کامران کے ساتھ چلی جاؤ۔“ اس  
نے صاف انکار کر دیا تو وہ ناگواری سے بولی۔

وہ چلا بھی جاتا لیکن اس کی می نے اسے کمرے میں لاک کر دیا ہے اور خود باہر بیٹھی پہرہ

نہیں؟“ اسے امتحان میں ڈال دیا تھا۔

”سائیکولوجی کے متعلق کیا ارادہ ہے؟“ طلال واقعی مشکل میں پڑ گیا تھا۔

”مجھے کچھ اندازہ نہیں ہے۔ ویسے نام سے تو دلچسپ سبکیٹ لگ رہا ہے لیکن میں نے

صرف امتحانوں کے دنوں میں پڑھنا ہے بس چلے گا۔“ وہ کچھ مطمئن ہوئی۔

”بس اس کے ساتھ سوشیالوجی اور اسلامیات اختیاری رکھ لو۔“ طلال کے فیصلہ کن

انداز پر وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

”ویسے کیا واقعی تمہیں کوئی بھی شعبہ پسند نہیں ہے؟ ڈاکٹر زائچینرز، پائلٹ، بینکرز وغیرہ

وغیرہ۔“ طلال کے لہجے میں حیرت تھی وہ ایک دم ہنس پڑی۔

”نہیں، خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ بس ان سب میں پڑھنا بہت پڑھتا ہے نا۔“ اس

نے اصل وجہ بتائی۔

”اچھا اگر بغیر محنت کے تمہیں کوئی اعزازی ڈگری ملے تو کون سی لینا پسند کرو گی؟“

طلال نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔ یہ لابیالی اور سر پھری سی لڑکی اسے بہت حیران کن لگتی

تھی۔

”تو میں لاء کر کے سول جج بنتی، مجھے ججز بہت اچھے لگتے ہیں۔ ہر کوئی ان کا احترام کرتا

ہے اور ڈرتا ہے۔“ وہ آنکھیں بند کئے بڑے مزے سے بول رہی تھی۔

”بس اس لئے؟“ طلال کی حیرت میں کمی نہ ہوئی۔

”نہیں، شاید اس لئے کہ میرے بابا بھی سول جج تھے اور بہت سینئر سول ججز میں ان کا

شار ہوتا تھا۔“

”اوہ.....“ طلال کو ساری بات سمجھ میں آ گئی تھی۔

”ویسے تم انجینئرنگ کے بجائے لاء کیوں نہیں پڑھتے اور پھر پیپرز دے کر تم بھی سول

جج بن جانا۔“ تم سے بہت اچھے لگو گے۔“ چندا کے ذہن میں اچانک جھماکا ہوا اور وہ آنکھیں

کھول کر جوش و خروش سے اسے دیکھنے لگی جو حیران ہو کر اس کا مشورہ سن رہا تھا۔

”یقین کرو طلال! تمہاری موجیں ہو جائیں گی۔ سرکاری گھر ملے گا، کیا ٹھاٹ اور

موجیں ہوں گی۔“ وہ اسے خواب دکھا رہی تھی۔ ”اور پھر سارے گاؤں کے لوگوں پر تمہارا

رعب ہوگا اور میں بھی اپنی کلاس فیلوز کو بتاؤں گی کہ یہ میرا کزن ہے۔“ چندا بڑے اشتیاق

دیکھیں پکا کر بانٹی تھیں اور اگلے سال بھی اس نے اپنی پوزیشن برقرار رکھی تھی اور ان دنوں جب وہ انجینئرنگ کالجز میں داخلے کیلئے معلومات لیتا پھر رہا تھا، ان دنوں کا مران اپنی FSC میں آنے والی سہلی کی تیاری میں مگن تھا۔

”طلال۔“ وہ جو اپنے کمرے میں انجینئرنگ کا پراسپیکٹس پڑھنے میں مگن تھا، جب وہ بغیر دستک دیئے اندر داخل ہوئی۔ ریڈ اور بلیک سوٹ میں اس کی رنگت دمک رہی تھی۔ اگرچہ اس کے مزاج میں کچھ لا پرواہی کا عنصر ابھی بھی شامل تھا، لیکن تھوڑا سا دھیما پن اور ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ اب وہ پٹہ لا پرواہی سے گلے میں ڈالنے کی بجائے وہ پھیلا کر لیتی تھی۔

”کیا ہوا؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ فرسٹ ایئر میں کون سے مضمون رکھوں۔ میں نے میاں جی سے کہا کہ کا مران سے مشورہ کر لیتی ہوں لیکن انہوں نے مجھے جھاڑ دیا کہ وہ نالائق خود پاس ہوا نہیں، تمہیں کیا مشورہ دے گا؟“ اس کا موڈ خاصا خراب تھا۔ طلال اس کے چہرے سے اس کی پریشانی کا اندازہ کر سکتا تھا۔

”پھر تم اب کیا چاہتی ہو؟“

”بس تم مجھے بتا دو کہ میں کون سے مضامین رکھوں۔“ وہ قدرے لا پرواہی سے بولی۔

”بھئی جس میں تمہارا انٹرسٹ ہے، وہ مضمون رکھ لو۔“

طلال کی بات پر اس نے ناگواری سے اسے دیکھا اور دو ٹوک انداز میں بولی۔

”پڑھائی میں میری دلچسپی کا تمہیں اندازہ ہے ہی اور میری ذہانت کے بارے میں تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔ اگر مجھے یہ ڈرنہ ہو کہ میاں جی میری شادی کر دیں گے تو خدا کی قسم! ساری کتابیں ایک طرف رکھ کر آرام سے زندگی انجوائے کروں، کیبل دیکھوں، گانے سنوں اور ہلا گلا کروں۔ مجھے پڑھنے پڑھانے کا قطعاً کوئی شوق نہیں۔“

طلال نے تاسف بھرے انداز میں اسے دیکھا جو سامنے پڑی کرسی پر بے تکلفی سے بیٹھے ہوئے اپنی دونوں ٹانگیں سامنے پٹنگ پر ٹکا چکی تھی اور اب تو دونوں کی آپس میں کافی کپ شپ ہوتی تھی، لیکن وہ بنیادی طور پر اپنی پڑھائی میں مگن رہنے والا محتاط سائز کا تھا۔

”اچھا..... اکنا کس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟“

طلال نے کچھ سوچ کر پوچھا، لیکن اس نے یہ کہہ کر کہ ”سوچ لو میں پڑھ سکتی ہوں کہ

بھرے لہجے میں اسے بتا رہی تھی۔

”لیکن میں نے تو کبھی سوچا ہی نہیں۔“ وہ کچھ پریشان نظر آنے لگا۔

”تو اب سوچ لو اس میں حرج کیا ہے۔“ اسے اب غصہ آنے لگا تھا۔

”لیکن میاں جی کیا کہیں گے؟“ اس نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا۔

”پورے ڈفر ہو تم“ میاں جی نے کیا کہتا ہے؟ تمہارا مستقبل ہے تم کچھ بھی سوچ سکتے

ہو؟“ وہ بڑے پراعتماد انداز سے اسے حوصلہ دلا رہی تھی جو خاصے مذہب کا شکار تھا۔

”مرد تم۔“ وہ غصے میں آگئی اور کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”تم کبھی بھی فیصلہ نہیں

کر سکتے تم سے اچھا تو کامی ہے۔ بڑے بڑے فیصلے چنگی بجا کے کر لیتا ہے۔ میں اسے یہ

آئیڈیا دوں گی اور وہ مان بھی لے گا۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے نکلی تھی اور زور سے

دروازہ بند کر کے گئی تھی جو اس کے خراب موڈ کی عکاسی کر رہا تھا۔

اور پھر ساری شام سوچتے ہوئے اور پھر کچھ جھجکتے ہوئے میاں جی کے کمرے میں گیا جو

اسے کشش کا شکار دیکھ کر الجھ گئے تھے۔ جب اس نے انہیں انجینئرنگ میں داخلہ نہ لینے کا بتایا

تو ان کے چہرے کا رنگ بڑی تیزی سے بدلا تھا اور جب اس نے اپنا اگلا ارادہ انہیں بتایا تو

دکھ برقی لہروں کی طرح ان کی چہرے پر دوڑنے لگا۔ وہ اس سے کچھ کہہ ہی نہیں سکے اور سب

کچھ اس کی مرضی پر چھوڑ دیا تو وہ خاصا مطمئن ہو گیا تھا اور پھر واقعی اس نے بی اے میں داخلہ

لے لیا تھا اور کامی نے اس کی اس بے وقوفی کا خاصا مذاق اڑایا تھا جبکہ چندا اس کے ساتھ

کھڑی لا پرواہی سے ہنستی رہی جس کا طلال کو خاصا دکھ ہوا تھا لیکن وہ کندھے جھٹک کر اپنے

کمرے میں آ گیا۔



وہ تھرڈ ایئر میں تھا جب بے بے کے اچانک انتقال کی خبر آئی۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ

کر گاؤں پہنچ گیا تھا۔ بے بے کے گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا وہ ان کی میت دیکھ کر

زار و قطار رویا تھا۔ اس کا دل کسی طور نہیں سنبھل رہا تھا۔ وہ ان کا..... اکلوتا بیٹا تھا اور ماں باپ

دونوں کو اسے پڑھانے کا جنون کی حد تک شوق تھا اور پچھلے دو تین سالوں سے تو وہ اپنی پڑھائی

میں بہت مگن تھا لیکن جب اسے وقت ملتا فوراً گاؤں کی طرف بھاگتا اور دوسرے تیسرے

دن فون پر تو ضرور بے بے سے بات کرتا۔ اب بے بے کا بے جان وجود دیکھ کر اس کا دل کسی

نے مٹی میں لے لیا تھا۔ میاں جی شہر سے ان کے جنازے میں شریک ہونے آئے تھے۔

اور تیسرے دن بے جی اور چندا کو اپنے گھر دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ بے جی نے اس

کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دلاسا دیا تو آنسو ایک دفعہ پھر آنکھوں میں مچل گئے۔

”مہربنیا! صبر۔“ بے جی کا اپنا دل بھی بھرا آیا تھا۔

اور چند دن کے بعد وہ شہر واپس آیا تو اس کا دل پڑھائی سے اچاٹ سا ہو گیا تھا۔

میاں جی کئی کئی گھنٹے بیٹھ کر اسے سمجھاتے اور اس دن وہ کہہ رہے تھے۔

”بیٹا! تمہارے باپ کو سب کہتے ہیں کہ یہ چوہدری جلال دین کا منشی ہے لیکن اس نے

اس وقت میرا ساتھ دیا جب میری دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ اکلوتے بیٹے اور بہو کی ایک سیڈنٹ

میں موت نے میری کمر توڑ دی تھی۔ مجھے زندگی میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی۔ پورے

تین ماہ میں حویلی سے باہر نہیں نکلا تھا اور اس وقت تمہارا باپ تھا جس نے بہت ایمانداری اور

خلوص سے میرا ساتھ دیا۔ حالانکہ بے شمار لوگوں نے میرے ساتھ دھوکے کئے کہ چوہدری

مددے کے زیر اثر ہے اسے کیا پتا چلے گا لیکن تمہارے باپ نے ہر سازش میں میرا ساتھ دیا۔

میرے لئے وہ سب بھائیوں کی طرح ہے اور اس کی اولاد کی حیثیت سے تم میرے لئے بہت

اہم ہو اور تم اپنے باپ کی امیدوں کا واحد مرکز ہو۔ اپنا نہ سہی بوڑھے باپ کا خیال کرو۔ دیکھو

کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے؟“

اور اسی دن شام کو وہ..... نہا دھو کر میاں جی کے ساتھ مسجد میں نماز پڑھنے گیا اور واپسی

پر بے جی نے اس کیلئے حلوہ بنا رکھا تھا۔ کچن میں ان کے ڈانٹنے کی آواز باہر تک آرہی تھی۔

”چندا! تم نے اگر مزید حلوہ نکالا تو چندا مار کر تمہارا ہاتھ توڑ دوں گی۔“

”کیوں میرا ہاتھ کیا فالٹو آیا ہے؟“ اس نے دوبارہ جواب دیا۔

”دو دفعہ پلیٹ بھر کر نکال چکی ہے حلوہ یہ اب طلال کا حصہ ہے۔“

”کیوں طلال کیا آسمان سے اتر ہے؟“ وہ بے نیازی سے کہہ رہی تھی۔

”میں کہتی ہوں چندا! زبان سنبھال کر بات کیا کر۔ تیری زبان کے آگے تو لگتا ہے

خندق ہے۔ بغیر سوچے سمجھے بولتی ہے۔ لوٹھا کی لوٹھا ہو گئی ہے مگر عقل نام کی کوئی چیز نہیں۔“

بے جی کو غصہ آ گیا تھا۔

”لو میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ ناراض انداز میں بولی۔

آنکھوں میں سرمہ اور بالوں میں بے تحاشا تیل ہوتا تھا۔ اب اور بڑے سائل آگئے ہیں جنہیں۔ وہ ہنستے ہوئے اسے چھیڑ رہی تھی۔

”خیر اب اتنا بھی پنڈو نہیں تھا میں اور ویسے بھی پنڈو ہونا کوئی بری بات نہیں۔ پنڈو لوگ بہت خالص اور کھرے ہوتے ہیں۔“ چندا کی ستائشی نظروں اور توصیفی لہجے سے طلال نے اندر خود بخود اعتماد آگیا تھا اور پھر جس طرح میاں جی اور بے جی نے بڑے غور سے اور تعریفی نظروں سے اسے دیکھا، وہ جھینپ گیا تھا۔

اور پھر گیت تک وہ اسے چھوڑنے آئی تھی۔ اسی وقت کامران اندر داخل ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ بری طرح ٹھٹکا اور پھر استہزائیہ لہجے میں ہنسا۔ ”واہ جی واہ! کوا چلائس کی چال اپنی چال بھی بھول گیا۔“

”نی الحال تو تم نیچے دیکھ کر چلو ورنہ راستے میں پڑے اس گملے سے تمہاری چال بھی بدل جائے گی۔“ طلال نے دوبارہ اسے جواب دیا۔

”مجھے سنگ مرمر پر چلنے کا سلیقہ آتا ہے۔“ کامران نے طنز کیا۔

”حالانکہ جو مزا اپنی مٹی پر چلنے کا ہے وہ سنگ مرمر میں کہاں؟“ طلال بھی خاصا تیز ہو گیا تھا۔ اب کے کامران نے اسے ٹیڑھی نظروں سے دیکھا۔

”خیر ہے کہیں ڈیٹ شیٹ پر جا رہے ہو؟“

”ہاں تھرڈ ایئر کی رومیسہ نے مجھے ڈنر پر انوائٹ کیا ہے۔“ طلال نے اس کی کالج کی گرل فرینڈ کا نام لے کر اسے چڑایا۔

”شٹ اپ۔“ وہ بری طرح چڑ گیا۔

”یہ رومیسہ کون ہے۔“ چندا نے تجسس بھرے لہجے میں دریافت کیا تو طلال نے طنزیہ نظروں سے کامران کو دیکھا۔ ”بتا دو؟“ اس کا انداز سراسر چڑانے والا تھا مگر اس سے پہلے ہی کامران بول اٹھا۔

”کوئی نہیں! ہماری کلاس فیلو ہے۔“ کامران نے دانستہ اپنا لہجہ سرسری بنایا۔

”ہاں کامی نے اسے اپنی بہن بنا رکھا ہے۔“ طلال آنکھوں میں شرارت لئے کہہ رہا تھا جبکہ کامران دانت پیس کر رہ گیا اور پھر چندا کا بازو پکڑ کر اسے غصے سے گھورتا اندر کی طرف چل پڑا۔

”بن ماں کے بچے کیلئے میں نے حلوہ بنایا تھا اور تمہارا پیٹ بھر گیا ہے لیکن نیت نہیں بھر رہی۔ شرم کر لے جب اس کی ماں گاؤں سے کبھی گزروالی کھیر تو کبھی زردے پکا کر بھیجتی تھی تب بھی ندیدوں کی طرح تو ان پر ٹوٹی تھی۔ اب میں نے بنایا ہے تو تب بھی اس کا بھی حصہ کھائے جا رہی ہے۔“

”لو وہ تو صرف بن ماں کا بچہ ہے جبکہ میں تو بن ماں کے ساتھ ساتھ بن باپ کی بچی بھی ہوں۔ صرف پانچ سال کی تھی جب ماں باپ انتقال کر گئے مجھے تو ان کی شکلیں بھی یاد نہیں لیکن میں تو ایسے روتی نہیں پھر رہی جیسے وہ اتنا بڑا ہو کر کمروں میں چھپ چھپ کے روتا ہے۔“ اس کے بچکانہ لہجے پر میاں جی انتہائی غجالت کا شکار ہو گئے تب ہی وہ غصے سے بولے۔

”چندا! تم باہر آؤ گی یا میں اندر آؤں؟“

اندر بالکل خاموشی چھا گئی تھی۔ ”اب زبان چلاؤ۔“ بے جی نے غصے سے اسے لٹکارا جو بیسگی ملی کی طرح اپنے کمرے کی طرف چل پڑی تھی وہ حقیقتاً میاں جی کے غصے سے خائف رہتی تھی اور ان کے سامنے اس کی اچھی خاصی بولتی بند ہو جاتی تھی۔



اس دن کالج میں کوئی فنکشن تھا اور طلال نے پہلی دفعہ پیٹ کوٹ پہنا تھا اور ٹائی مشکل سے باندھی تھی اور وہ بار بار ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لے رہا تھا۔ حالانکہ آئینہ بتا رہا تھا کہ پیٹ کوٹ اس کے لمبے قد اور بھرے بھرے جسم اور چوڑے شانوں پر کافی سوٹ کر رہا ہے لیکن ایک جھجک سی اس پر حاوی ہو رہی تھی اور اسی وقت چندا اونچی آواز میں باہر ہی بولتی آ رہی تھی۔

”طلال! میاں جی کہہ رہے ہیں کہ جاتے ہوئے مجھے مل کے جانا اور اگر چاچی سیکنہ تم سے پوچھے کہ اس نے تمہیں پان چراتے ہوئے مجھے دیکھا ہے تو صاف انکار کر دینا۔“ اس کے باقی لفظ منہ میں ہی رہ گئے تھے۔

”واؤ.....“ وہ گھوم پھر کر توصیفی نظروں سے اس کا جائزہ لے رہی تھی۔

”بہت پنڈم لگ رہے ہو۔“ چندا کے کنکشن پر وہ بری طرح جھینپ گیا۔

”قسم سے لگ ہی نہیں رہا کہ تم وہی چار سال پہلے والے پنڈو سے طلال ہو جس کی

بیچے خالی پلاٹ میں وہ شیطان کی سواری ”موٹر سائیکل“ چلانا سیکھ رہی ہے۔“ بے جی نے ایک اور جھانپڑا اس کی کمر پہ رسید کیا۔

”کیا.....؟“ چاچی سیکینہ کا بھی منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ”توبہ میری توبہ۔“ انہوں نے گال پیٹے۔ ”قیامت کی نشانیاں ہیں۔ اے لڑکی! تجھے پتا ہے کہ زمانہ کتنا خراب ہے؟“ چاچی سیکینہ کو تو اس کا یہ کارنامہ سن کر دھچکا لگا تھا۔

”ہاں تو آپ کو پتا کر جاتی تو آپ نے کون سا جانے دینا تھا؟“ وہ کھسیا کر بولی۔  
 ”یہ کون سا طریقہ ہے کہ اللہ رسول کے نام پر جھوٹ بول کے اس لونڈے سے موٹر سائیکل سیکھی جا رہی ہے۔ آج آئینے دو میاں جی کو تمہاری ٹانگیں ان ہی سے ترواؤں گی۔“ بے جی کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔ طلال نے بڑی دلچسپی سے اسے دیکھا جو اندر جانے کو پر تول رہی تھی۔

”تم کیوں ہنس رہے ہو؟ تمہیں شرم آنی چاہئے کسی کا مذاق اڑاتے ہوئے؟“ اس کی نظر اچانک مسکراتے ہوئے طلال پر پڑی تو اپنا سارا غصہ جو وہ بے جی اور چاچی سیکینہ پر نہیں نکال سکتی تھی اس کی طرف منتقل کر دیا۔

بے جی نے سخت غصے سے پہلے چندا کو اور پھر چاچی سیکینہ کو دیکھا جو اجنبی سے خود بھی سامنے کھڑی چندا کو دیکھ رہی تھیں۔

”دیکھا؟ دیکھا سیکینہ؟ اس لڑکی کی چار ہاتھ کی زبان۔ اسے تو چھوٹے بڑے کا کوئی لحاظ ہی نہیں۔ کچھ شرم کر لے کم بخت، تجھ سے کتنے سال بڑا ہے تیرے بڑے بھائی کی جگہ ہے۔“ چندا کے ستارے آج کل گردش میں تھے۔ تب ہی ایک دھمو کا مزید کھا کر وہ بلبل اٹھی اور کھا جانے والی نظروں سے طلال کو دیکھا اور بے زاری سے بولی۔

”بھائی کی جگہ ہے نا؟ بھائی تو نہیں ہے نا؟ اور جب اللہ نے بھائی نہیں دیا تو آپ خدائی کاموں میں کیوں مداخلت کرتی ہیں اور زبردستی رشتے بنا رہی ہیں۔ کوئی نہیں ہے بھائی والی میرا۔“ اپنی بات کہہ کر وہ رکی نہیں اور دھڑ دھڑ کرتی اندر کی طرف بھاگی۔ دروازہ ایک دھماکے سے بند ہوا۔

بے جی اس کی فرمائے بھرتی زبان دیکھ کر ششدر سی کھڑی رہ گئیں۔ ان کے چہرے پر اتنی سراسیمگی اور گھبراہٹ تھی کہ طلال اور سیکینہ دونوں کو اس پر بے تحاشا غصہ آیا تھا۔



وہ اس دن لان میں لیووں کے درخت کے نیچے انگش لٹریچر کی کتاب کھولے لیکن تھا جب بے جی اکل فیضی کے گھر سے چندا کا بازو پکڑے باہر ہی سے غصے سے بولتی آ رہی تھیں۔ ان کے کڑے تیور اور چندا کے چہرے پر گھبراہٹ اور بے چینی دوری سے نظر آ رہی تھی۔

”آئیے دو آج زمینوں سے تمہارے میاں جی کو تمہارا علاج میں کرداتی ہوں۔ چھٹاک بھر کی لڑکی نے ہمیں نگنی کا ناچ نچا رکھا ہے۔ شرم دیا کس چڑیا کا نام ہے اس کی خبر نہیں اور سارا دن بیروں میں پیسے لگے رہتے ہیں۔“

”آپ خواخواہ مجھے ڈانٹ رہی ہیں۔“ چندا نے احتجاج کرنا چاہا مگر بے جی نے زوردار دھمو کا رسید کیا اور اسی وقت چاچی سیکینہ جو گھر کی کینوں کی خاندانی ملازمہ تھی ہانپتی کانپتی باہر نکل۔

”بی بی جی اب اس نے کیا کیا ہے؟“

”نہ پوچھو سیکینہ! اس لڑکی نے تو میرا دماغ پلپلا کر کے رکھ دیا ہے۔ ہر وقت میاں جی سے کہتی ہوں جو ان ہوتی لڑکی کے بارے میں کچھ سوچو مگر میری بات پہ کوئی کان دھرے تب نا۔ سب اپنے حال میں مست ہیں۔ اگر میں اپنی آنکھیں اور کان کھلے نہ رکھوں تو بیزار غرق ہو جائے اس کا۔“ بے جی کی آواز مزید بلند ہوئی۔

”ہائے ہائے پتا بھی تو چلے کیا کیا ہے بچی نے؟ آپ خواخواہ خود کو ہلکان کئے جا رہی ہیں؟“ بے جی نے ایک ناراض نظر ساتھ کھڑی چندا پر ڈالی جو لاپرواہی سے سامنے لگے امرود کے درخت پر چڑھی گھری کی طرف متوجہ تھی۔ بے جی کے دھمو کے نے اسے بلبل کر رکھ دیا تھا۔ وہ شکوہ کنناں نظروں سے اب انہیں دیکھ رہی تھی۔

”میں کہتی ہوں کہ سیکینہ! پتا نہیں یہ میرے بیٹے کی اولاد ہمارے کس گناہ کی سزا ہے منہ پر جھوٹ بولتی ہے۔ صبح مجھے کہنے لگی کہ اکل فیضی کے گھر میں دو پہر کو میلاد ہے میں وہاں چلی جاؤں۔ ماتھا تو میرا تب ہی ٹھکا تھا کہ کامران کی ماں عذرا کو خدا نے اتنی توفیق کیسے دے دی پھر سوچا کہ ہدایت کی بات ہے اللہ جب دے۔ وہ تو شام میں میں نے سوچا کہ چلو دعائیں میں بھی شریک ہو جاؤں۔ وہ تو گیت پر ہی مجھے چوکیدار نے بتایا کہ گھر پر کوئی نہیں ہے۔ میرا تو مانو دل دھک کر رہ گیا۔ اس نامراد کا پوچھا تو وہ موا مجھے بتانے لگا کہ کامی میاں کے ساتھ

ہیں۔ ”کیا ہو گیا ہے بے جی؟ ابھی بچی ہے ٹھیک ہو جائے گی۔ اس عمر میں ساری لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں۔“ طلال نے تسلی دی تو وہ بھڑک اٹھیں۔

”رہنے دو سب لڑکیاں کب ایسی ہوتی ہیں؟ خود اٹھارہ سال کی عمر میں! میں ایک بچے کی ماں تھی۔ کبھی یہ رنگ ڈھنگ نہیں تھے اور پھر گاؤں میں بچیاں مجھ سے قرآن پڑھنے آتی تھیں۔ ایسے لہجہ تو کسی کے نہیں تھے۔ تمہارے میاں جی کی پورے گاؤں میں ایک عزت ہے نام ہے۔ مجھے تو سوچ سوچ کے ہول اٹھتے ہیں کہ جو ملازم یہاں کوٹھی میں کام کرتے ہیں وہ گاؤں جا کر اس کے ”کارنامے“ جب سناتے ہوں گے لوگ تو ہنستے ہوں گے کہ جلال دین کی پوتی اس کا خوب نام روشن کرے گی۔“

”بے جی! لوگوں کے پاس اتنا فضول نام نہیں ہوتا کہ ایسی باتیں سوچیں۔ آپ فکر مند نہ ہوں! خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔“ طلال کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انہیں کیسے تسلی دے۔

”اے بیٹا! مجھے اعتراض اس کی شرارتوں پر نہیں اب دوسری ”حرکات“ پر ہے۔ وہ جو بات بات پر جھوٹ بولتی ہے اور اوپر سے اس نے اب ایک نیا کام شروع کیا ہے مجھے تو بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ جلال نے چونک کر ان کا شرمندہ شرمندہ چہرہ دیکھا۔

”بس بیٹا! اپنے تک بات رکھنا! میں کسی ملازم یا میاں جی سے اپنا دکھ بیان نہیں کر سکتی۔“ وہ تھوڑا سا جھجکیں تو طلال نے ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

”سخت بے وقوف اور جذباتی لڑکی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ بچپن کے زیادہ لاڈ پیار نے اسے بگاڑ دیا ہے۔ پہلے پڑوسیوں کے آم جاسن اور سیکنہ کے پان شرارت سے جراتی تھی اور اب اس نے کبھی میرے تو کبھی میاں جی کے پیسوں پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا ہے۔“

”کیا.....“ طلال کو دھچکا لگا۔

”ہاں بیٹا!“ وہ تاسف بھرے انداز میں گویا ہوئیں۔ ”پہلے پہل تو میں سمجھی تھی کہ شاید میں رکھ کر بھول جاتی ہوں! لیکن اب ایک دو دفعہ میاں جی بھی جھنجھلائے ہوئے انداز میں کہہ رہے تھے کہ پتا نہیں پیسے کہاں خرچ کر کے بھول جاتا ہوں اور پھر ایک دن تو میں نے اسے میاں جی کے کرتے سے رنگے ہاتھوں پانچ سو روپے نکالتے دیکھا۔ میرا تو اوپر کا سانس اوپر

رات کا کھانا کھا کے وہ یونہی بے جی کے پاس آ بیٹھا جو کروشیہ ہاتھ میں پکڑے تیل بنانے کے بجائے کسی گہری سوچ میں گم تھیں۔ میاں جی کی یہ کوٹھی باہر سے بڑی جدید اور نئے طرز تعمیر کی حامل تھی جو چندا کے والد نے اپنی پسند سے تعمیر کروائی تھی جبکہ فرنٹ سے کوئی بھی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ بیک پر اس کی طرز تعمیر بالکل گاؤں میں بنے گھروں کی طرح ہوگی۔ گیٹ عبور کرتے ہی دائیں بائیں وسیع و عریض لان اور اس کے بعد لابی اور پھر دائیں طرف ڈرائنگ روم اور بائیں طرف مہمان خانہ تھا اور کوریڈر کے اختتام پر ٹی وی لاؤنج اور ڈائننگ ہال مشترکہ تھا اور ساتھ میں کچن بھی لیکن وہ کم کم استعمال ہوتا تھا اور ٹی وی لاؤنج سے ایک دروازہ صحن کی طرف کھلتا تھا اور سرخ اینٹوں والے اس صحن اور بڑے بڑے برآمدوں کے پیچھے قطار میں بنے ہوئے کمرے تھے اور کچن یہاں بھی تھا جو کہ زیادہ تر استعمال ہوتا۔ اس کے علاوہ صحن میں لیوؤں، امرود اور آم کے درخت بھی قطار میں لگے ہوئے تھے۔ بے جی کا زیادہ وقت یہیں گزرتا تھا اور میاں جی کی کرسی اور حقہ بھی یہیں برآمدے میں ہوتے۔

طلال اب گھر کا ایک فرد بن چکا تھا اس لئے آرام سے پورے گھر میں گھومتا لیکن وہ زیادہ وقت اپنے کمرے میں ہی گزارنا پسند کرتا یا پھر میاں جی کے ساتھ مہمان خانے میں ہوتا جہاں پر روز دو چار لوگ گاؤں سے کسی نہ کسی کام سے ضرور آتے۔

”بے جی کیوں پریشان ہیں؟“ وہ فکر مندی سے ان کے پاس کھڑا پوچھ رہا تھا۔

”یہاں بیٹھو میرے پاس۔“

”پتہ نہیں اس وقت ان کے لہجے میں کیا تھا کہ وہ کسی معمول کی طرح سر جھکائے ان سے کچھ فاصلے پر سخت پر بیٹھ گیا۔

”بس بیٹا! پریشانی تو زندگی کا حصہ ہیں ان سے فرار ممکن نہیں۔“ وہ پلکیں جھپک کر آنسو روکنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے گلوگیر لہجے میں بولیں۔

”بس چندا کی طرف سے پریشانی ہے مجھے اور میاں جی نے لاڈ اور پیار میں کبھی کوئی کمی نہیں رکھی کہ بن ماں باپ کی بچی ہے صرف پانچ سال کی تھی جب میرے پاس آئی۔ اسے گاؤں میں پھھر کاٹتے تھے۔ بھینسوں سے بو آتی تھی اور صرف اس کی خاطر ہم لوگ شہر میں بنی اس کوٹھی میں منتقل ہو گئے۔ ہمارے اکلوتے بیٹے کی نشانی تھی ہمیشہ اپنے کپڑے سے لگا کر رکھا لیکن اب سوچتی ہوں کہ کہاں کی رہ گئی۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو



اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہ غسل خانے میں تھے۔ میں نے اس لئے شور نہ مچایا کہ خاندانی ملازم کیا سوچیں گے! البتہ اس کی خوب کھچائی کی۔ اس وجہ سے وہ اب مجھ سے کتراتی ہے۔ کچھ میں نہیں آتا کہ کیا علاج کروں اس کا؟“

”لیکن وہ اتنے پیسوں کا کرتی کیا ہے؟“ طلال کو ایک اور سوچ نے پریشان کیا۔

”بیٹا! کرنا کیا ہے۔ کالج میں سہیلیوں کے ساتھ اڑاتی ہوگی۔ اوپر سے اسے اس بات کا مان کم ہے کہ چوہدری جلال دین کی پوتی ہوں جن کے کئی مربع زمین ہے۔ بس کالج میں شوخیاں مارتی ہوگی۔“ آج بے جی خاصی دکھی اور اکتائی ہوئی بیٹھی تھیں جو طلال کے ساتھ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر گئیں۔ کچھ انہیں یقین تھا کہ یہ شریف اور کم گو سا لڑکا کہاں بات کرے گا۔



وہ اپنے کمرے میں کمپیوٹر پر مصروف تھا جو اس نے کچھ دن پہلے ہی لیا تھا۔  
”طلال! تمہارے پاس پانچ سو روپے ہوں گے؟“ چندا نے جھانکتے ہی پوچھا۔  
”کیوں؟“ طلال نے کڑے تیوروں سے پوچھا اور کچھ بے جی کی باتوں کا بھی اس پر غصہ تھا۔

”بس مجھے کچھ ضرورت تھی۔“ اس نے شان بے نیازی سے جواب دیا اور پھر اس کے گھورنے پر فوراً وضاحت دینے لگی۔ ”جلدی واپس کر دوں گی“ مرکیوں رہے ہو۔“  
”میاں جی سے جا کر لے لو۔“ طلال کو نہ جانے کیوں غصہ آ گیا تھا اس کے انداز پر۔  
”کیسے لے لوں؟ ابھی پچھلے ہفتے تو ان سے ہزار روپیہ لیا تھا۔“ چندا کے منہ سے پھسلا اور وہ گڑبڑا گئی اور فوراً وضاحت دینے لگی۔ ”اصل میں کالج میں فن فیئر تھا، اس لئے خرچ ہو گئے۔“

”تو اب کیا کرنا ہے؟“ وہ کی بورڈ چھوڑ کر اس کا جائزہ لینے لگا جو سرخ ہاف سلیو سوٹ پر دوپٹہ لاپرواہی سے گلے میں ڈالے شاید ہلکی ہلکی لپ سنک لگائے ہوئے تھی تب ہی اس کا چہرہ دک رہا تھا۔ طلال کو یاد آیا بے جی صبح سے گاؤں گئی ہوئی تھیں اور یہ میک اپ ان کی غیر موجودگی کا کرشمہ تھا۔

”بتاؤ نا کیا کرنے ہیں؟“ اس کے لمبے چہرے اور سحر انگیز آنکھوں سے نظریں چراتے ہوئے اس کا لہجہ اب کے دھیمہ تھا۔

”اصل میں کامران کی اپنے ڈیڈی سے لڑائی ہو گئی ہے۔ وہ آج کل غصے میں گھر چھوڑ کر اپنے دوست کے ساتھ ہوٹل میں رہ رہا ہے۔ اسے ضرورت تھی۔“  
چندا کی اطلاع پر اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا اور وہ اس کے کڑے تیوروں سے گھبرا کر

”کچھ نہیں چاچی!“ وہ مدھم سا گویا ہوا اور ایک گہری سانس بھر کے پلیٹ پکڑی اور ایک نظر ادھیڑ عمر چاچی کی طرف دیکھا۔ اسے افسوس ہونے لگا کہ خرابی طبیعت کے باوجود وہ چندا کے جھوٹ پر ساری دوپہر اس کی خاطر لگی رہیں۔

”کیا بنے گا اس لڑکی کا؟“ وہ تاسف بھرے انداز میں سوچنے لگا، بیٹھا گجر بلا بھی اس کے اندر کی تنگی کو کم نہ کر سکا۔

”تم اتنے زیادہ جھوٹ کیوں بولتی ہو؟“ رات کو وہ اس کے سر پر تھا جو اشار پلس کے کسی ڈرامے میں کھوٹی ہوئی تھی، ساتھ ہی موگ پھلی کے خالی جھلکوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور رات کا کھانا کھا کر برتن بھی وہیں ٹرے میں اوندھے پڑے تھے۔ بے جی آج رات گاؤں میں رک گئی تھیں، اس لئے عیاشی ہو رہی تھی، ورنہ وہ اس کے ٹی وی دیکھنے کے سخت خلاف تھیں، جو اس نے ضد کر کے کیبل کی صورت میں لگوا رکھا تھا۔

”کون میں جھوٹ بولتی ہوں؟“ اس کا انداز سرسرا مذاق اڑانے والا تھا۔

”نہیں میں۔“ وہ چڑ کر بولا۔

”تمہارا تو خیر مجھے پتا نہیں، دیسے چھوٹا موٹا جھوٹ بول کے اگر کوئی بڑا فائدہ ہو رہا ہو تو کوئی مضائقہ بھی نہیں۔“ اس کی فلاسفی سن کر طلال کا دماغ کھول اٹھا۔ ”ہاں اس چھوٹے موٹے جھوٹ سے اگر کوئی بندہ ہرٹ ہو رہا ہو یا کسی کو نقصان ہو رہا ہو تو تمہارا اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”بندے کو سمجھ داری اور ہوشیاری سے رہنا چاہئے تاکہ کوئی اس کے ساتھ ایسا نہ کر سکے۔“ اس کی منطق بھی نرالی تھی۔ ”لیکن اگر تم جیسا عیار بندہ ہو تو ساری سمجھ داری دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔“ طلال کی طنزیہ نظروں پر وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

”آخر ہوا کیا ہے؟“ اس نے حیران ہو کر طلال کے سرخ چہرے کو دیکھا۔

”اپنے آپ سے پوچھو تم نے کیا کیا ہے۔“ اس نے انگلی اٹھا کر اس سے بھی زیادہ سخت لہجے میں کہا تو چندا کا رنگ تیزی سے اڑا۔

”تم نے ایک ہفتہ پہلے میاں جی سے دو ہزار روپے میرے نام پر لئے کہ طلال نے کہا ہے کہ مجھے ضرورت ہے اور آپ سے مانگتے ہوئے اسے شرم آتی ہے اور پھر مضو چا چا سے مختلف سی ڈیزائن فلموں کی منگوائیں اور جب میاں جی نے پوچھا تو جھوٹ بول دیا کہ طلال

ایک دفعہ پھر وضاحت دینے لگی۔ ”بھئی واپس کر دے گا نا میں لے کر دوں گی اور پھر تم نے تو مجھے دیئے ہیں۔“

”تم کہاں سے ”ڈاکہ“ مار کر واپس کر دگی؟“ طلال کے طنزیہ لہجے پر اس کے چہرے کا رنگ اڑا اور اگلے لمحے وہ غصے میں چپ کر بولی۔

”دینے ہیں تو دے دو زیادہ باتیں مت کر۔ میں بے جی سے بھی لے سکتی تھی لیکن وہ گاؤں گئی ہوئی تھیں اور اب تم سے کام آن پڑا ہے تو تم پہاڑ پر چڑھ کر بیٹھ گئے ہو۔“

اس نے طنزیہ نظروں سے سامنے تپی تپی کھڑی چندا کو دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ ”مجھے پتا ہے کہ بے جی تمہیں کیسے دیتیں؟“ لیکن پھر سوچ کر اپنے والٹ سے پانچ سو روپے نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

”یہ پہلی اور آخری دفعہ ہیں۔“

”ادنبہ۔“ اس نے غصے سے پکڑے اور دھپ دھپ کرتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

طلال نے کرسی سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں جی کی حق حلال کی کمائی ”نا جائز ذرائع“ سے حاصل کر کے ”کس“ پر لٹائی جا رہی ہے، لیکن وہ اس معاملے میں بے بس تھا۔

شام کو وہ اپنی اسائنمنٹ بنا کر فارغ ہوا تو سیکنہ چاچی جس کو نہ جانے کیوں سارے ملازم ”چاچی“ کہتے تھے اور سب کی دیکھا دیکھی اس نے بھی کہنا شروع کر دیا۔ وہ ایک پلیٹ لے کر تھکی ہاری اندر داخل ہوئیں۔

”یہ لو بیٹا! ساری دوپہر لگ کے گجر بلا بنایا ہے۔ مجھے تو چندا نے جب آ کر بتایا کہ طلال گجر بلا کھانے کی فرمائش کر رہا ہے، میں نے فوراً گاجریں پھیلنا شروع کر دیں کہ کہیں تم نے شام کو بی بی کے واپس آنے پر یہ گلہ کر دیا کہ سیکنہ چاچی سرور کا بہانہ کر کے گجر بلا بنانے سے انکاری ہیں تو وہ کیا کہیں گی؟ اب فافٹ کھا کے بتاؤ کہ کیسا بنا ہے؟“

طلال اس اچانک حملے پر ہکا بکا رہ گیا کہ اس نے کب چندا سے گجر بلا کھانے کی فرمائش کی جبکہ چاچی سیکنہ بنور اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ طلال سے اپنے تاثرات چھپانا دشوار ہونے لگے۔

”اے بچے! کیا مسئلہ ہے؟ مجھے بتاؤ؟ میں بھی تمہاری ماں کی جگہ ہوں۔“

باپ ہے تو ہر روز ایک نئی لڑکی کے ساتھ اس کا آنکھ منکا مشہور ہو رہا ہے، اوپر سے اللہ نے بیٹے بھی پورے چار دے دیئے، اگر کوئی بیٹی ہوتی تو شاید آنکھ میں حیا آ جاتی۔“ بے جی کو وہ آج کافی دنوں بعد یاد آیا تھا، اس لئے شروع ہو گئیں۔

”پھر جب ہم لوگ یہاں شفٹ ہوئے تو ان کے دونوں چھوٹے بیٹے کامی اور دانی ہماری چندا کے ہم عمر تھے اور سارا سارا دن اس کا دل لگائے رکھتے اور ہم نے اسی وجہ سے منع نہیں کیا، دن رات کا آنا جانا تھا لیکن کیا پتا تھا کہ لڑکوں کے ساتھ رہ رہ کر ہماری لڑکی بھی درختوں پر چڑھنا، کچے کھیلنا اور گلی ڈنڈا اور کرکٹ تک سیکھ جائے گی ان کم بختوں نے میری چندا کو بگاڑا تھا۔“

طلال کا بہت دل چاہا کہ ان سے کہے کہ ”اس وقت آپ کہاں ہوتی تھیں“ لیکن وہ چپ رہا، ان کی دل آزاری کرنا اسے اچھا نہیں لگا، تب ہی آہستگی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔



موسم بدل گیا تھا، اب وہ فورتھ ایئر میں آ گیا تھا اور اس دفعہ تھرڈ ایئر میں اس کی بورڈ میں تیسری پوزیشن تھی، جس کا میاں جی نے خاصا برا منایا تھا، لیکن اس سال وہ شروع سے ہی محنت کا ارادہ کئے ہوئے تھا، پچھلے سال بے بے کی وفات نے اس کا پڑھائی سے دل اچاٹ کر دیا تھا، لیکن اس سال اس کا ارادہ تھا کہ میاں جی کے سارے گلے شکوے منادے گا، چندا بھی سیکنڈ ایئر میں آ گئی تھی۔

طلال کچھ دنوں سے محسوس کر رہا تھا کہ چندا کے انداز کچھ بدل سے گئے تھے۔ اکثر وہ اس کے کمرے میں پائی جاتی اور بعض دفعہ تو اس کی واڈروب اور کمرے کی سینٹنگ بھی تبدیل کر دیتی اور اکثر رات کو اب اسے کمرے میں دودھ کا گلاس دینے ملازمہ کی جگہ وہ خود آ جاتی اور بہانے بہانے سے اسے مخاطب کرتی، تلال کو لگا تھا کہ وہ اپنی سابقہ ساری کوتاہیوں پر خاصی شرمندہ تھی اور اس کا اظہار اکثر اس کے رویے سے ہوتا تھا اور اسی وجہ سے تلال نے بھی اسے دوبارہ شرمندہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

اس دن وہ انگلش لٹریچر کی کوئی اسائنمنٹ بنانے میں مگن تھا، جب فالے کا شربت لئے وہ اندر داخل ہوئی، گلاس ٹیبل پر رکھ کر وہ سائیڈ والی خالی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

نے منکوائی تھیں، وہ تو آج میاں جی نے تھوڑی دیر پہلے مجھے ڈانٹا کہ تمہیں اگر کسی چیز کی ضرورت ہو یا پیسوں وغیرہ کی تو مجھے ڈائریکٹ کیوں نہیں کہتے، میری تو شرم کے مارے آنکھیں نہ انھیں، دل چاہا زمین پھٹے اور اس میں سما جاؤں اور پھر دوپہر کو تم نے سیکنڈ چارجی کو بخار کی حالت میں اٹھا کر گھر بیٹا بنوایا میرے نام پر تمہیں ڈوب کر مر جانا چاہئے اتنے جھوٹ اور فراڈ کرتے ہوئے۔“ وہ سخت طیش میں تھا۔

چندا پر جیسے کوئی بم گرا تھا۔ وہ پریشان نظروں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی، اس نے کہاں اس کا یہ روپ دیکھا تھا وہ شعلہ بار نظروں سے اسے گھورتے ہوئے مڑا اور وارننگ دی۔

”آئندہ میرے نام پر ایسی فضول حرکت کی تو میں میاں جی کو تمہارا سارا کچا چٹھا کھول کر بتا دوں گا اور یہ بھی بتا دوں گا کہ تم اکثر کالج واپسی پر کامران کے ساتھ بائیک پر کبھی آؤں کریم پارلر تو کبھی پیزا ہاٹ جاتی ہو۔“

چندا نے پھٹی پھٹی نظروں سے تلال کی پشت کو دیکھا تھا، وہ حقیقی معنوں میں دہلی سی گئی تھی۔



پورے پندرہ دن کے بعد تلال نے اسے دیکھا سفید چکن کے سوٹ میں بے جی کے ساتھ نماز پڑھتی وہ اسے خاصی مختلف لگی تھی اور پھر خاموشی سے چارجی سیکنڈ کے ساتھ کھانے کے برتن لگائی اور رات کو میاں جی کے پاس کتابیں رکھے اس میں بہت واضح تبدیلی آئی تھی اور پھر میاں جی کے ساتھ اسے مصروف دیکھ کر وہ چپکے سے بے جی کے پاس آن بیٹھا۔

”میرے مولانا لگتا ہے میری دعائیں سن لیں، اب تو اس لڑکی میں بڑی تبدیلی آئی ہے، میری ساری باتیں ماننے لگی ہے اور نماز بھی شروع کر دی ہے اور شکر ہے کہ وہ منحوس لہو اب نہیں آتا، لگتا ہے کہ چندا کے ساتھ اس کی لڑائی ہو گئی ہے میں نے تو اس سے چھٹکارے کیلئے وظیفہ کرنا تھا، مگر اس نے خود ہی کم کم آنا شروع کر دیا، زہر لگتا تھا مجھے وہ مستنڈا۔“

طلال کو بے جی کے انداز پر ہنسی آ گئی، اس نے بہت غور سے میاں جی کو اخبار سناٹی چندا کو دیکھا، جو کریم کلر کے سوٹ میں خاصی سو برگ رہی تھی۔

”اصل میں بیٹا! فیضی صاحب کے ساتھ شروع سے ہمارا ملنا ملنا ہے، لیکن ان کے گھر کے طور طریقے مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے، ماں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا رکھی ہے اور

”کیا؟“ طلال گنگ سا اسے دیکھنے لگا اسے ہرگز اس جواب کی توقع نہیں تھی۔  
 ”کون ہے وہ شخص؟“ اس کا دل بیٹھنے لگا وہ بڑے مدہم لہجے میں بولا تھا۔  
 ”اس بات کو آپ چھوڑیں۔“ وہ کچھ محتاط ہوئی۔  
 ”کیا کامران؟“ طلال نے اپنی طرف سے بہت درست نام لیا۔  
 ”نہیں!“ اس نے شدت سے نفی کی۔  
 ”پھر؟“ وہ الجھ گیا۔

”آپ نہیں جانتے کیا؟“ وہ بڑے ذومعنی لہجے میں بولی تھی، طلال نے سمجھتے ہوئے بھی نفی میں سر ہلایا، اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں، وہ چندا سے اس قدر ہمت اور جرأت کی توقع نہیں کر رہا تھا، اس کے انداز تو پہلے ہی اسے بوکھلائے دے رہے تھے۔  
 وہ جانے کیلئے کھڑی ہوئی دروازے کے پاس جا کر مڑی اور شوخی سے لبریز لہجے میں بولی۔

”اگر آپ نے اس شخص کو دیکھنا ہو تو ڈرینگ ٹیبل کے شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر دیکھ لیجئے گا۔“

وہ کمرے سے جا چکی تھی، لیکن طلال منظور اپنی جگہ پر بیٹھا رہ گیا تھا، وہ ایک لمحے کو خوفزدہ ہوا اور اگلے ہی لمحے اس نے اپنے دماغ سے تمام اندیشوں کو جھٹک دیا، اس کے زندگی کے دائرے کے ارد گرد بڑے خوبصورت رنگ پھیلے تھے، مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا احاطہ کر لیا تھا، وہ اسے اچھی تو شروع سے لگتی تھی لیکن درمیان میں اس کی کامران کے ساتھ حد سے بڑھی دوستی اور پھر مختلف حرکات نے اسے بدظن کر دیا تھا، لیکن اب اس کے تمام انداز اس کے من کو بھارے تھے۔



زندگی طلال منظور کیلئے بہت خوبصورت ہو گئی تھی، اب کالج سے آنے کے بعد اس کا سارا وقت کوشی میں گزرتا تھا، پہلے تو وہ جناح لائبریری چلا جاتا تھا سٹڈی کیلئے، لیکن اب اس کا زیادہ تر وقت گھر کے دالان میں گزرتا تھا، جہاں وہ بیٹھے بیٹھے چندا کو اپنی نظروں کے حصار میں رکھ سکتا تھا، وہ بھی کالج سے آنے کے بعد۔ اس کے آگے پیچھے تعلیمی کی طرح گھومتی رہتی اور طلال کی کسی بات سے انکار تو گویا بھول ہی گئی تھی۔

”طلال! یہ محبت کیا ہے؟“  
 ”دماغ کی خرابی ہے۔“ اس نے لاپرواہی سے جواب دیا، دماغ اسائنمنٹ میں الجھا ہوا تھا۔

”طلال! میں سنجیدگی سے پوچھ رہی ہوں۔“ اس کے احتجاجی انداز پر وہ چونکا اور اسے دیکھا جو فیروز کی کمر کے سوٹ میں خاصی تیار شیرادک رہی تھی اور چہرے پر گلایاں کھلی ہوئی تھیں، طلال نے ٹھنڈی آہ بھر کر کتاب بند کر دی۔ یہ تو طے تھا کہ اس کی موجودگی میں پڑھائی نہیں ہو سکتی، اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا، دوپہر کے تین بج رہے تھے اور یہ ٹائم میاں جی اور بے جی دونوں کے آرام کرنے کا تھا۔

”بتاؤ نا؟“ چندا نے پھر اصرار کیا۔ ”اگر کسی کو کسی سے محبت ہو جائے تو اس کا اظہار کیسے کرنا چاہئے؟“

”ظاہر ہے منہ سے۔“ طلال ابھی بھی غیر سنجیدہ تھا۔  
 ”یہ کیا فضول بات ہے؟ آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں؟“ وہ ناراض ہوئی۔  
 ”خیر ہے یہ تم“ کی بجائے آپ آپ کر کے کیوں بات ہو رہی ہے؟ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“

”نہیں دماغ خراب ہے۔“ وہ جل کر کھڑی ہو گئی جانے کیلئے۔  
 ”اوہو بھئی کیا ہو گیا ہے انگارے کیوں چبا رہی ہو، ذرا بیٹھو اور آرام سے بات کرو۔“  
 طلال نے فوراً صلح جو یا نہ انداز اپنالیا تھا، چندا نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر بیٹھ گئی۔  
 ”اچھا بتاؤ، کس کو محبت ہوئی ہے؟ کس سے؟“ اس نے بمشکل سنجیدگی سے پوچھا۔  
 ”مجھے۔“ اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا طلال کو شاک لگا اور اس نے کھوجتے لہجے

میں کہا۔  
 ”پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں کیسے محسوس ہوا کہ جو احساسات تمہارے اندر پل رہے ہیں وہ محبت ہے؟“

”بس میرا دل کرتا ہے کہ ایک ہی شخص کو سوچوں، ایک ہی شخص سے بات کروں اور اس شخص کو دیکھوں وہ سامنے ہو تو مجھے زندگی بہت خوبصورت اور دلکش لگتی ہے اور میرا دل ایک انوکھی لے پر دھڑکتا ہے۔“

طلال نے اسے کامران کے گھر جانے سے منع کر دیا اس نے بات مان لی۔  
طلال نے اسے فضول ڈرامے اور مودیز دیکھنے سے ٹوکا اس نے T.V دیکھا ہی چھوڑ دیا۔

طلال نے اسے کوکنگ سیکھنے کی طرف راغب کیا وہ کئی کئی گھنٹے گرمی میں سیکنہ چاچی کے ساتھ لگی رہتی۔

طلال کو سویر، سنجیدہ اور سلجھی ہوئی لڑکیاں اچھی لگتی تھیں وہ دو ماہ میں اسی سانچے میں ڈھل گئی۔

وہ تو اس کا دیوانہ ہو گیا تھا چندا کا ہر روپ اسے بہت اچھا لگ رہا تھا جس کی وجہ سے وہ اب آنکھیں بند کر کے اس کی ساری باتیں ماننے کو تیار تھا۔

وہ اس کا کمپیوٹر اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گئی۔ طلال نے اسے منع نہیں کیا اس کا سیل فون زیادہ تر اس کے استعمال میں رہنے لگا تو طلال نے اپنے لئے نیا خرید لیا۔ وہ بے دھڑک اس کے والٹ میں سے پیسے لے لیتی طلال کو اس کے اس انداز میں اپنائیت محسوس ہوتی تھی۔

اس کا اب لاء میں ایڈمشن ہو گیا تھا وہ بہت جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کیلئے بے تاب تھا اب تو چندا بھی تھرڈ ایئر میں آگئی تھی اور میاں جی کا اس کے گریجویٹشن کرنے پر فوراً بعد شادی کا ارادہ تھا اس دن وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ ”کنگ ایڈورڈ“ میں کسی کام سے موٹر سائیکل پر جا رہا تھا جب انارکلی بازار میں گارمنٹس کی ایک شاپ پر اسے کامران کے ساتھ کھڑی لڑکی پر چندا کا گمان ہوا لیکن پھر اپنا دھم جان کر وہ دوسری جانب متوجہ ہو گیا۔

شام کو اس نے سرسری طور پر چندا سے ذکر کیا تو اس کے چہرے کا رنگ، تیزی سے اڑا وہ فوراً پشت پھیر کر آٹا گوندنے لگی۔

”کمال کرتے ہو میرا انارکلی میں کیا کام۔“ اس کا لہجہ دھیما تھا۔

”ہاں میں نے بھی یہی سوچا تھا۔“ وہ ہلکے پھلکے لہجے میں کہہ کر وائش روم کی طرف بڑھ گیا تو چندا نے سکون کا سانس لیا۔

”ارے چندا یہ چوڑیاں کیا نئی لی ہیں۔“ بے جی کے حیران لہجے پر طلال نے ایک سرسری سی نظر اس کی گوری کلائیوں میں پڑی سرخ چوڑیوں پر ڈالی۔

”جی بے جی! میری کالج کی دوست نے گفت دی ہیں۔“ وہ گھبرا کر وضاحت دینے لگی۔ اس دن وہ رات کو دودھ کا گلاس اس کی ٹیبل پر رکھنے کیلئے آئی تو اس کے گلے میں جھولتی مولڈ کی زنجیر کے اندر خوبصورت سے لاکٹ نے چونکا دیا وہ چابی کی شکل کا لاکٹ تھا۔

”چندا! یہ تم نے کہاں سے لیا ہے؟“ اس کے عجیب سے لہجے پر وہ چونکی۔

”یہ کیا؟“

”بھئی یہ لاکٹ؟“

”یہ؟“ وہ گھبرا گئی۔ ”یہ تو میری دوست حرا نے مجھے گفت کیا ہے۔“

”کیا؟“ اسے خاصی حیرت ہوئی۔ ”اتنا مہنگا گفت؟“

”ہاں خاصے امیر والدین کی بیٹی ہے لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ وہ بے چینی سے بولی۔

”بس یونہی دو دن پہلے میں عامر کے ساتھ جیولری شاپ پر گیا تھا وہیں کای اس طرح کے لاکٹ پر خاصی بحث کر رہا تھا اس لئے مجھے یاد رہ گیا۔“

”کیوں؟ بحث کیوں کر رہا تھا؟“ وہ اپنے دوپٹے سے اس کی تصویر والے فریم کا شیشہ صاف کرتے ہوئے بظاہر سرسری لیکن دھڑکتے دل کے ساتھ بولی تھی۔

”اصل میں اس کے اپنے گروپ کے ایک لڑکے کو بھی وہی لاکٹ پسند آ گیا تھا اور دونوں اسے خریدنے کیلئے جھگڑ پڑے تھے اور ان کی بحث سے کافی لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ تب ہی مجھے یاد رہ گیا۔“

”پھر کس نے خریدادہ لاکٹ؟“

”پتا نہیں ہم لوگ تو وہاں سے نکل آئے تھے خیر چھوڑو یہ بتاؤ کہ میاں جی زمینوں سے آگئے؟“ اس کے ٹاپک بدلنے پر چندا کے چہرے کا رنگ نارمل ہو گیا تھا وہ اب میاں جی کے متعلق بتانے لگی۔

”میاں جی کو اچانک ہارٹ اٹیک ہوا تھا بے جی چندا اور سب گھر والے بوکھلائے ہوئے تھے خود طلال کے پیروں کے نیچے سے بھی زمین نکل گئی تھی وہ اپنی پڑھائی بھول کر ہر وقت ہاسپٹل میں ان کے ساتھ رہتا وہ خاصے کمزور ہو گئے تھے۔“

اس دن وہ ہسپتال سے گھر آیا تو کچن میں کامران کو چندا کے بالکل قریب کھڑے دیکھ

کر اس کا دماغ کھول گیا، وہ بڑی بے تکلفی سے دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

طلال کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی دیکھ کر چندا کے چہرے کا رنگ فق ہوا تھا، دم بخود اور ساکت کامی نے مڑ کر اسے دیکھا اور فوراً وضاحت دی۔ ”میں میاں جی کے بارے میں پوچھنے آیا تھا۔“ تلال کو اب اندازہ ہوا کہ وہ اس کے منہ لگنے سے دانستہ پرہیز کرتا ہے اور کیوں کرتا ہے؟ یہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ اس نے بغیر جواب دیے شلیف سے گلاس اٹھایا اور فریج سے بوتل نکال کر پانی ڈالنے لگا۔

”میاں جی کی طبیعت کیسی ہے؟“ چندا نے کچھ سنبھل کر پوچھا، وہ بہت غور سے اس کا ناراض چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”کافی بہتر ہے۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”کھانا بن گیا ہے، کون لے کر جائے گا؟“ اس نے پھر پوچھا۔

”میں! اور ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا۔ ”میں منہ ہاتھ دھو کر آتا ہوں، تم پیک کر دو۔“

وہ پندرہ منٹ کے بعد آیا تو کامران جا چکا تھا، کچن کے سٹول پر بیٹھی چندا کسی گہری سوچ میں گم تھی، اسے دیکھ کر وہ چونکی۔

”آپ مجھ سے ناراض ہیں؟“

”نہیں۔“ وہ دانستہ منہ پھیر کر بولا۔

”وہ تھوڑی دیر پہلے ہی آیا تھا۔ بلیوی میاں جی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔“ چندا کے نرم اور التجائیہ انداز پر اس کا دل پیچا، اس نے ایسی نظروں سے اسے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ”میں نے تم سے پوچھا؟“

”آئی ایم سوری تلال!“ اس کا لہجہ بھگ گیا۔ تلال کے دل کو کچھ ہوا، اس نے مڑ کر اس دشمن جاں کو دیکھا اور بے بسی سے بولا۔

”مجھے وہ تمہارے پاس کھڑا اچھا نہیں لگتا۔“

چندا نے گہرا سانس لیا اور میاں جی کیلئے کھانا ٹفن میں ڈالنے لگی، وہ بالکل خاموش تھی۔ تلال نے بھی ٹفن اٹھایا اور ایک بھر پور نظر اس دشمن جاں پر ڈالی۔

”سوری یار! تمہارے معاملے میں میرا دل کوئی کپہر و مائر نہیں کرتا۔ اسے میری چاہت

سمجھ لو یا مجبوری۔“ وہ کچن سے جا چکا تھا چندا اس کی چوڑی پشت کو دیکھتی رہ گئی۔



میاں جی گھر واپس آ گئے تھے، لیکن گھر میں عیادت کرنے والوں کا ہر وقت ہجوم لگا رہتا، تلال کے والد بھی صبح و شام زمینوں کے حساب کتاب کیلئے یہیں پائے جاتے تھے اور میاں جی پتا نہیں سارا دن لیٹے کیا سوچتے رہتے، جو تفکر کے بادل ان کے چہرے پر بسیرا کئے رہتے، حالانکہ تلال کے انہیں صبح و شام دلاسا دیتے تھے، لیکن میاں جی کا دل ان دنوں پتا نہیں کون کون سے اندیشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ انہوں نے اس رات بے جی کو بلا کر کچھ مشورے کئے تھے، جن میں سرفہرست چندا کی شادی کا مسئلہ تھا، جس کی وجہ سے وہ بوکھلائی پھر رہی تھی۔ بے جی کے سامنے تو اس نے خوب احتجاج کیا تھا اور انہوں نے اسے صاف صاف میاں جی سے بات کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

”میاں جی.....!“ اس نے دروازہ کھول کر جھانکا، اتفاق سے وہ اکیلے ہی تھے ”میں آ سکتی ہوں؟“

میاں جی لیٹے ہوئے تھے، انہوں نے آنکھوں پر رکھا ہوا بازو ہٹایا اور چونک کر اسے دیکھا، بے جی کے ذریعے اس کے خیالات سے آگاہی تو ہو گئی تھی، لیکن اس معاملے میں اب وہ بے بس تھے۔

”میاں جی! مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔“ وہ روہانسی سی ہو رہی تھی۔

”ہوں..... لیکن یہ مت کہنا کہ تم ابھی شادی کرنا نہیں چاہتیں۔ اس کے علاوہ جو کہنا چاہتی ہو کہو۔“ وہ سائیڈ سے اپنا چشمہ اٹھا کر اپنے صاف سے صاف کرنے لگے۔

چندا نے ایک احتجاجی نظر اپنے بہت زیادہ محبت کرنے والے لیکن قدرے سخت گیر دادا کو دیکھا اور ہیکلے لہجے میں بولی۔

”لیکن میاں جی! مجھے پڑھنا ہے کم از کم بی اے تو کرنے دیں۔“ اس کی آواز جیسے کنویں سے برآمد ہوئی تھی۔

”دیکھو بیٹا! میری طبیعت تمہارے سامنے ہے اور جو جو پوچھو تو مجھے اپنی سانسوں کا اب اعتبار نہیں، میری ایک وسیع و عریض جائیداد اور زمینوں کے معاملات ہیں، میں چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی میں کسی سمجھدار بندے کے سب کچھ حوالے کر جاؤں جو لاہمی نہ ہو، خوف خدا رکھتا ہو

اور تمہارا خیال رکھے ورنہ زمینداری میں سود خن اور سو خن ہوتے ہیں۔ تمہیں اور تمہاری بے جی کو تو لوگ میرے بعد بچ کھائیں گے اس لئے میں جو کروں گا تمہاری بہتری کیلئے کروں گا، بہتر ہے کہ تم بڑوں کے معاملات میں مت بولو۔“ ان کے مضبوط لہجے پر اس نے گالوں پر اتری نمی صاف کی اور خشکی سے سر جھٹکا۔

میاں جی نے اس کے انداز پر اپنی مسکراہٹ چھپائی اور سائیڈ ٹیبل پر بڑا اخبار اٹھا لیا جو اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ اس موضوع پر مزید بات کرنا نہیں چاہتے، وہ پاؤں پٹختی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔



چہرہ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں لئے وہ کسی سوچ میں گم تھی جب وائٹ ٹریک سوٹ میں لمبوس، تھمتا ہوا چہرہ لئے طلال ٹی وی لائونج میں داخل ہوا اور پھر چند لمحوں کیلئے تھم سا گیا۔

”میاں جی کے ساتھ مذاکرات کیسے رہے؟“ وہ گلا کھٹکھا کر بولا تو وہ چونکی اور برا سا منہ بنایا۔

”میاں جی نے پہلے کبھی میری کوئی بات مانی ہے جواب مانیں گے۔“ وہ ناراض لہجے میں گویا ہوئی۔

”اس کا مطلب ہے کہ مذاکرات ناکام ہو گئے۔“ اس نے غور سے اس کا بے زار چہرہ دیکھا۔

”جی ہاں!“ چندا نے ریوٹ سے ٹی وی آن کیا۔

”تو کون خوش نصیب آج کل زیر غور ہے آپ کی ہم سفری کیلئے؟“ طلال نے بوجھل دل کے ساتھ دانستہ خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

”کم از کم آپ نہیں ہیں۔“ اس کے تلخ لہجے پر بہت دیر تک وہ کچھ کہنے کے قابل ہی نہ رہا اور پھر قدرے آزدگی سے بولا۔

”مجھے معلوم ہے کہ میں اتنا خوش قسمت نہیں ہوں اور پھر مغل میں ٹاٹ کا پیوند کہاں لگتا ہے سب کہنے کی باتیں ہیں۔“ اس نے گویا اپنا ہی مذاق اڑایا تو چندا نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا جو پچھلے کچھ دنوں سے خاصا پریشان پریشان سا تھا۔

”میں نے بہت کہا کہ بی اے تو کر لینے دیں، لیکن وہ نہیں مانے۔“ چندا نے دھیسے لہجے

میں کہا۔

”ہاں میں نے بھی سوچا تھا کہ مجھے بھی کچھ ٹائم مل جائے گا لیکن.....“ طلال کو اپنی آواز خود اجنبی سی لگی۔

”کیوں؟“ اس نے یونہی پوچھا۔

”تاکہ خود کو تمہارے قابل بنا سکوں۔“ طلال نے اتنی گہری اور بھرپور نظر سے اسے دیکھا تھا کہ وہ دو سیکنڈ بھی اس کی آنکھوں میں نہ دیکھ پائی اور گھٹی پلکیں بے اختیار رخساروں پر آن گری تھیں۔

”اب کیا ہوگا؟“ چندا نے اضطراب کے عالم میں انگلیاں پٹختے ہوئے پوچھا۔

”میں خود میاں جی سے بات کروں؟“ طلال نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔

”دماغ خراب ہے آپ کا، ایک منٹ میں وہ آپ کو یہاں سے در بدر کر دیں گے۔“

اس نے بے اختیار منع کیا۔

”چلو دیکھتے ہیں۔“ وہ محتاط انداز میں بولا اور پھر لب چباتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

میاں جی کی جیسے ہی طبیعت سنبھلی وہ گاؤں چلے گئے۔ آج کل گندم کی کٹائی کی ہو رہی تھی اور ان کا وہاں ہونا بہت ضروری تھا اور اگلے دو دن بھی ان کا وہیں رہنے کا ارادہ تھا۔ بے جی کی طبیعت آج کل ناساز تھی، کچھ موسمی بخار تھا، وہ سر شام دوائی کھا کے لیٹ جاتی تھیں، اس دن اس کا بھی گاؤں جانے کا ارادہ تھا اور وہ گھر میں چندا کو بتا کر آیا تھا کہ کالج سے سیدھا گاؤں چلا جائے گا، لیکن اس دن اس کی طبیعت خاصی بے چین سی تھی اور دل کسی طور بھی قابو نہیں آ رہا تھا۔ چنانچہ کالج میں ہی اس نے گاؤں جانے کا ارادہ فی الحال کینسل کیا اور دو تین کلاسز لے کر گھر آ گیا اور سیدھا کمرے میں آ کر سو گیا۔ مغرب کی اذان کے وقت اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو بخار میں جلتے محسوس کیا، ابھی تک کسی نے بھی اس کے کمرے میں جھانک کر نہیں دیکھا تھا اور وہ شاید یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ گاؤں چلا گیا ہے۔

وہ بمشکل اٹھا، منہ ہاتھ دھویا اور باہر جانے کی ہمت نہیں ہوئی اور پھر دوبارہ لیٹ گیا، کافی نقاہت سی محسوس ہو رہی تھی اور دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو رات کے دس بج رہے تھے وہ کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔ سلیپر پہن کر وہ باہر نکلا تو سارا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ بے

جی کے کمرے میں جھانکا تو وہ سو رہی تھیں، ان کے کمرے میں ایک طرف چاچی سکیڑہ بھی مہری نیند میں تھیں۔ کچن میں آکر اس نے دودھ نکالا اور نیم گرم کر کے پیا تو کچھ توانائی محسوس ہوئی۔

اس نے چندا کے کمرے میں جھانکا تو وہ خالی تھا، اس نے دیکھا واش روم کا دروازہ بھی کھلا ہوا ہے۔ دو تین کمروں میں جھانکنے کے بعد وہ ٹی وی لاونچ میں آیا تو وہ بھی سنان تھا، اسے خاصی حیرت ہوئی کہ اتنی رات گئے وہ کہاں گئی، ڈرائنگ روم بھی ویران تھا، اب کہ اسے پریشانی ہوئی، الگ تھلگ بنی اینکسی کی لائٹ جلتے ہوئے دیکھ کر وہ تجسس سے مجبور ہو کر ادھر نکل آیا۔ اینکسی کے ایک کمرے کی کھڑکیاں لان کی سائیز پر کھلتی تھیں وہاں سے آتی کامران کی آواز سن کر اسے دھچکا لگا، تھوڑا سا سائیز پر ہو کر اس نے کھڑکی سے اندر جھانکا پردہ ہٹا ہوا تھا۔ سامنے کارپٹ پر صوفے کے ساتھ ٹیک لگائے بے تکلفی سے دونوں ٹانگیں پھیلائے کامران بیٹھا ہوا تھا جبکہ اس کے ساتھ لاپرواہی سے گلے میں دوپٹہ ڈالے اس کے کندھے پر سر رکھے چندا کو دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھا..... دونوں ایک دوسرے میں گم تھے، اس کا دل چاہا کہ وہ دروازہ کھول کر ان کے سر پر پہنچ جائے اور دونوں کو شوٹ کر دے، لیکن اس سے پہلے ہی کامران کی آواز نے اس کے قدم روک لئے۔ وہ بڑے متفرقہرے انداز میں کہہ رہا تھا۔

”یار! اب بس کرو اس پینڈو پروڈکشن کے ساتھ محبت کا ڈرامہ، جو اپنی اوقات بھولے بڑے اونچے اونچے خواب دیکھنے لگا تھا۔ میں تو بس اسے سبق سکھانا چاہتا تھا۔ بہت بڑھ چڑھ کر اسے طنز کرنے آگئے تھے نا، اب کوئی بات کرے تو ٹھیک ٹھاک بے عزتی کر دیتا۔“

”یار! میں کہاں کر رہی تھی یہ ڈرامہ؟ تم ہی نے اصرار کیا تھا ورنہ میرا اسٹینڈرڈ اتنا بھی لو نہیں کہ اپنی زمینوں کے نشی کے بیٹے کے ساتھ محبت و جنت شروع کر دوں۔“ چندا کا لہجہ خاصا زہرا لود تھا، باہر کھڑے طلال کا دل چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سا جائے۔

”ویسے یار! ایک بات تو میں مان گیا تم ایکٹنگ اتنی زبردست کرتی ہو کہ دل چاہتا ہے کہ تمہیں آسکر ایوارڈ سے نواز دوں اور جھوٹ اتنی خوبصورتی سے بولتی ہو کہ سچ بے چارہ شرمندہ ہو جاتا ہے۔“ اس کی چوڑیوں سے کھیلتا ہوا وہ خوشگوار لہجہ میں کہہ رہا تھا۔

”بکواس بند کرو۔ تمہارے لئے بولتی تھی۔“ وہ استحقاق بھرے انداز میں ایک شان سے گردن اٹھا کر بولی۔

”ہاں یہ بات تو میں مانتا ہوں کہ تم نے میرے لئے بہت کچھ کیا ہے، کبھی اپنے بڑھے دادا کے والٹ پر ہاتھ صاف کیا تو کبھی خرائٹ سی دادی کو ہاتھ کی صفائی دکھائی، بس یار! ڈیڈی سے لڑائی ہو جائے تو وہ فوراً جیب خراج بند کر دیتے تھے۔ اس لئے تمہیں تکلیف دیتا تھا، ویسے آخری دنوں میں تو تم نے اس لبو طلال کی جنب بھی خاصی ہلکی کروائی تھی میری خاطر، ایسے ہی تو میں تمہارا دیوانہ نہیں ہوں۔“ وہ تہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

”اچھا اب بتاؤ کہ میں میاں جی کو کیسے سمجھاؤں۔ وہ میری شادی کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔“ وہ قدرے نرموٹھے انداز میں بولی تھی۔

”یار! ایک تو میں تمہارے اس بڑھے کنجوس دادا سے بہت تنگ ہوں، کم بخت ہارٹ ایک کا جھٹکا بھی برداشت کر گیا، ورنہ ان کی ساری جائیداد کی اکلوتی وارث تم بن جاتیں اور ہم دونوں عیش کرتے، لیکن خیر کرتا ہوں میں، ڈیڈی اور ماما سے بات، حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ وہ اتنی جلدی میری شادی کرنے کے حق میں نہیں ہوں گے، ابھی تو میرا بی ایس سی بھی کلیئر نہیں ہے، لیکن تمہاری خاطر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا۔“ وہ بڑی والہانہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”اور اگر وہ نہ مانے؟“ چندا کے لہجے میں اندیشے جھلک رہے تھے۔

”تو کوئی بات نہیں۔“ اس نے ہاتھ جھاڑے۔ ”ہم کورٹ میرج کر لیں گے، پھر یہ اولڈ مین اور اولڈ لیڈی کیا کر لیں گے۔“ کامران نے لا پرواہی سے کہا۔

”لیکن کامی! یہ اچھی بات نہیں ہے۔“ چندا نیم رضامندی سے بولی۔

”یار! تمہارے لئے میں اہم ہوں یا باقی لوگ؟ اور پھر محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے؟“ وہ برامان کر بولا۔

”تمہارے لئے تو میں ساری دنیا چھوڑ سکتی ہوں۔ پتا نہیں تم نے مجھ پر کیا جادو کر دیا ہے کہ مجھے دنیا کا کوئی بندہ بھی تم سے زیادہ اچھا نہیں لگتا۔“ وہ بے بسی سے بولی تھی۔

”یار! یہ محبت کا جادو ہے۔“ وہ کھلکھلا کر ہنسا تھا اور اس کے ہاتھ بڑی بے تکلفی سے اس کی گردن میں پڑی چین سے کھیل رہے تھے۔

”ویسے تمہاری خوبصورت گردن نے میرے خنجر کی قیمت میں اضافہ کر دیا ہے۔“ وہ ڈھیت عاشقوں کی طرح بولا تو چندا کو اچانک یاد آیا۔

”یہ لاکٹ خریدتے ہوئے تمہیں طلال نے دیکھا تھا اور جب اس نے ذکر کیا تو میری تو



جان ہی نکل گئی اور پھر ایک دفعہ اس کو انارکلی میں ایک لڑکی پر میرا گمان بھی ہوا تھا، وہ تو شعر ہے کہ میں کبھی رنگے ہاتھوں نہیں پکڑی گئی۔“

”تو پھر کیا تھا۔“ وہ لا پرواہی سے بولا۔ ”تم تو ہزار دفعہ کالج سے میرے ساتھ مختلف جگہوں پر جاتی رہی ہو اگر دیکھتا تھا تو دیکھ لے میں کون سا اس سے ڈرتا ہوں زہر لگتا ہے مجھے یہ لبو جب دیکھو تمہارے میاں جی اسی کی مثالیں دے دے کر مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے تھے اور کالج میں بھی چار نمبر کیا زیادہ آگے موصوف گردن اکڑا کر چلا کرتے تھے۔ اب جب منہ کے بل گرے گا تو میں اس سے پوچھوں گا کہ اب بتاؤ بورڈ میں تو ٹاپ کرتے تھے اس میدان میں پاس ہو کر تو دکھاؤ۔“

وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا تھا اور اس سے زیادہ منہا للال کے بس سے باہر تھا۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا واپس اپنے کمرے میں آیا اور بیک میں کپڑے اور کتابیں ڈالیں اور جو جو چیز بیک میں آئی وہ ڈالی اور باہر نکل آیا.....

ایکسی کے پاس آ کر رکا..... اسی وقت کامران اور چندا باہر نکلے تھے اسے اپنے سر پر دیکھ کر دونوں کا رنگ اڑا تھا۔ چندا تو بہت ہی گھبرا گئی تھی۔ اس کے روئیں روئیں میں اضطراب کی کیفیت پنہاں تھی للال نے ایک نظر اسے دیکھا۔

اس ایک نظر میں غصہ، دکھ، تاسف اور بے اعتباری کے رنگ نمایاں تھے۔

”محبت اور جنگ میں ہر چیز جائز نہیں ہوتی۔ اس کے بھی کچھ اصول اور ضابطے ہوتے ہیں اور اچھا دشمن وہ ہوتا ہے جو سامنے سے آ کر وار کرے پیٹھ پیچھے وار کرنا کمزوری اور کم ظرفی ہوتی ہے اور اپنے پیاروں کو دھوکہ دینے والوں اور ان کی محبت کا ناجائز فائدہ اٹھانے والوں کے حصے میں ہمیشہ خسارہ ہی آتا ہے اس کا اندازہ بہت جلد تم لوگوں کو ہو جائے گا۔“

اپنی بات کہہ کر وہ رکنا نہیں اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے بھی کامران کے استہزائیہ قہقہے نے اس کا تعاقب کیا تھا۔ اسے معلوم نہیں کہ گاؤں تک کا سفر اس نے کیسے طے کیا، سارے راستے دل اور آنکھوں نے ماتم کیا تھا، خوابوں نے بین ڈالے خواہشوں نے دامن پکڑا اور اس رات وہ اس جذباتی بے وقوف اور ہر چکستی چیز کو سوتا سمجھنے والی خود غرض لڑکی کی محبت کو کہیں راستے میں ہی چھوڑ آیا تھا۔

وہ پورا ایک ہفتہ گاؤں میں بخار میں جلتا رہا اور پھر ابے کو اس کی حالت کے پیش نظر اس

کی تمام باتیں ماننا پڑیں، وہ خاموشی سے ان کو لے کر ملتان آ گیا تھا لاہور سے ملتان کی یونیورسٹی میں اس کی مائیکریشن بہت مشکل سے ہوئی تھی شروع شروع میں ابے نے اس سے اس اچانک ہجرت کے بارے میں بہت پوچھا اور وہ ٹالتا رہا اور ایک دن اسے پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھ کر ابے نے دوبارہ کبھی نہیں پوچھا تھا۔ اس نے شام کو پارٹ ٹائم ایک جاب بھی تلاش کر لی تھی اور وکالت کے بعد اس نے کچھ عرصہ پریکٹس بھی کی اور پھر ججز کے امتحان میں وہ ٹاپ ٹین میں شامل تھا۔

اسے سول جج بنے پہلا سال تھا جب کچھ بیمار رہنے کے بعد ابے کا انتقال ہو گیا۔ اپنی زندگی میں انہوں نے بہت کوشش کی، للال شادی کر لے لیکن اس کا عورت ذات سے اعتبار ہی اٹھ گیا تھا۔

اب چھ سال کے بعد عروج فاطمہ عرف چندا کو دیکھ کر ان کے زخموں کے سارے ٹانگے ادھر گئے تھے اس جذباتی اور بے وقوف لڑکی کے حصے میں خسارہ ہی آیا تھا۔

اس کا خلع کا کیس کچھ عرصہ چلا اور کامران کی طرف سے مصالحتی کوششیں ناکام ہو گئی تھیں اور اس دن عدالت میں منصف کی کرسی پر انہیں دیکھ کر کامران شاکد رہ گیا تھا، وہ آنکھوں میں سارے جہان کی حیرت اور خوف لئے دیکھ رہا تھا جیسے جج اسے پھانسی کی سزا سنانے والا ہو۔ اس کی دوسری بیوی ایک اینارٹل بچہ جنم دینے کے بعد کچھ پیچیدگیوں کا شکار ہو کر دوبارہ ماں نہیں بن سکتی تھی اس لئے وہ چندا کو نہیں چھوڑنا چاہتا تھا لیکن چندا شاید اب اس کی حقیقت سے باخبر ہو چکی تھی اس لئے وہ ایک لمحے کو بھی اس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تھی اور آخر کار فیصلہ چندا کے حق میں ہو گیا تھا اور اس لمحے کامران کی آنکھوں میں اس قدر بے بسی، شکست اور شرمندگی کے رنگ نمایاں تھے کہ للال کے دل سے سارے ملال کے رنگ دھل گئے اسے لگا کہ جیسے اس کی چھ سالوں کی طویل اذیت کا مداوا ہو گیا ہو۔



اس دن موسم پھر صبح سے ہی خراب تھا پہلے زور دار آندھی نے ہر چیز کو مٹی مٹی کر دیا اور پھر بارش سے ہر طرف کچڑ ہی کچڑ ہو گیا تھا، بوگن ویلیا کے پتے چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے.....

وہ کوفت زدہ انداز میں رفتی کو پائپ لگا کر برآمدہ دھوتے ہوئے دیکھ رہے تھے جب

بخت کر لیا تھا۔ اس گھر کے دروازے تو چندا کیلئے کھول دیئے تھے لیکن کہتے تھے کہ ساری جائیداد کسی ٹرسٹ کو دے جاؤں گا لیکن اس لالچی کو نہیں دوں گا، بس اسی مار پیٹ اور لڑائی جھگڑوں میں تین سال گزر گئے ایک بیٹا ہوا جو ذہنی طور پر بیمار تھا، ایک سال کے بعد وہ بھی وفات پا گیا اور پھر اس کم بخت نے تنگ آ کر ایک اور امیر گھرانے کی لڑکی چننا کر شادی کر لی، تب چندا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اس کا گھر چھوڑ کر آگئی اور تب اس کی آنکھیں اچھی طرح کھل گئی تھیں.....“ بے جی دوپٹہ آنکھوں پر رکھے رو رہی تھیں، وہ خاصی کمزور اور بوڑھی ہو گئی تھیں۔

”بس بیٹا! کچھ چیزیں وقت بہت اچھی طرح انسانوں کو سکھا دیتا ہے اور پھر تمہارے میاں جی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اب چندا دوبارہ اس منحوس کے جال میں نہیں پھنسے گی، تب انہوں نے اپنی زندگی میں ساری جائیداد اس کے نام کر دی اور پھر میاں جی کے انتقال کے بعد اس گھٹیا انسان کو جب پتا چلا کہ اس جائیداد کی تباہ وارت پھر چندا بن گئی ہے تب اس کی رال دوبارہ ٹپکنے لگی، وہ مصالحت کی کوششیں کرنے لگا لیکن اب بچی کو اس کی خصلتوں کا ٹھیک ٹھاک اندازہ ہو گیا تھا، بس اسی وجہ سے عدالت سے طلاق لے لی تاکہ وہ اسے دوبارہ تنگ نہ کر سکے۔“ بے جی کو بہت عرصے کے بعد کوئی اپنا ملا تھا، تب ہی وہ اپنا دکھ ان کے سامنے کھولتی گئیں۔

”مجھے رات چندا نے تمہارے بارے میں بتایا تو سمجھو۔ میرے تو دل کو سچے لگ گئے“ میرا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ رات کو ہی اڑ کر آ جاؤں۔ صبح سے بچی کو کہہ رہی تھی کہ نمبر ملا کر دو لیکن وہ تو عجیب ہی باتیں کر رہی تھی۔“ بے جی اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں بول رہی تھیں۔ طلال نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

”مجھ سے کہنے لگی بے جی، وہ بہت بڑا افسر بن گیا ہے، سرکاری گھر میں رہتا ہے، اس سے ملنے کیلئے پہلے ٹائم لینا پڑتا ہے۔ اس کے پاس کہاں ٹائم ہوگا کہ آپ سے ملنے آئے؟ ہیں بچے ایسا ہی ہے؟“ ان کے معصوم لہجے پر طلال کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”بے جی ایسا بھلا ہو سکتا ہے؟“ انہوں نے ان کے دونوں ہاتھ محبت اور عقیدت سے تھامے اور دھیسے لہجے میں گویا ہوئے۔

”میاں جی کا احسان تو میں ساری زندگی نہیں بھول سکتا اور میں آج کل جو بھی ہوں ان

چندا کا فون آیا اور بے جی کی آواز سن کر ان کے دل کو کچھ ہوا وہ اونچی آواز میں رو رہی تھیں۔ اور اگلے آدھے گھنٹے کے بعد ان کی گاڑی چوہدری جلال الدین کی کونٹھی کے آگے تھی جس کا رنگ مدھم پڑ گیا تھا اور گیٹ کا رنگ دروغن بھی جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔

اور ٹھیک اگلے پندرہ منٹ بعد وہ بے جی کا جھریوں بھرا کمزور ہاتھ پکڑے اپنے آنسوؤں کو پی رہے۔ سب کچھ ویسے کا ویسا تھا، وہی برآمدے میں پڑا میاں جی کا بڑا تخت، کونے میں مرغیوں کا ڈربہ، محن میں لگے لیموں اور امرودوں کے درخت اور نیم کے درخت کی موٹی شاخ پر چندا کا جھولا اور ان کے کمرے کی سینٹنگ بھی ویسی کی ویسی تھی جو چیزیں وہ جلدی میں چھوڑ گئے تھے کچھ جوتے، سوٹ، ڈائری، کتابیں سب ویسی ہی تھیں۔

”میاں جی کہتے تھے کہ ضرور طلال کو کوئی بات بری لگی ہے جو وہ اچانک چلا گیا۔ وہ کہتے تھے کہ وہ بہت خوددار اور سمجھ دار بچہ ہے، لیکن ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ تم کیوں چلے گئے اور پھر ان کو پتا چلا کہ منشی منظور دین اور تم دونوں گاؤں چھوڑ گئے ہو تو سمجھو کہ وہ کئی دن تک تمہاری تلاش کرتے رہے اور پھر تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ ان کو تم لوگوں کے جانے کا بہت صدمہ ہوا تھا۔ وہ اکثر تمہیں یاد کرتے تھے۔“ وہ بڑے دکھ سے بے جی کی باتیں سن رہے تھے جو اب بدیدہ لہجے میں ان سے مخاطب تھیں۔

”اس کے بعد چندا کی حرکات نے ان کی کمر توڑ دی تھی اس کے جذباتی اور غلط فیصلے پر انہوں نے بہت طوفان اٹھایا۔ وہ اس کامی کم بخت کے ساتھ اس کی شادی کے بالکل بھی حق میں نہیں تھے، ان کا کہنا تھا کہ جس طرح اس کا باپ کرپٹ اور لالچی ہے ویسا ہی بیٹا ہوگا، لیکن اس نے پتا نہیں چندا کو کیا گھول کر پلا رکھا تھا، جو اس کی مت ماری گئی۔ اسے اپنے بوڑھے دادا اور دادی کی عزت کا بھی خیال نہ رہا اور پھر پتا چلا اس نے کامران کی باتوں میں آ کر عدالت میں جا کر شادی کر لی ہے، میاں جی نے تو اسے اپنی جائیداد سے عاق کر دیا تھا.....“

”کیا؟“ طلال کو ایک دم شاک لگا۔

”پھر.....؟“ وہ سوالیہ نظروں سے بے جی کو دیکھنے لگا، چندا شاید کہیں اندر تھی۔

”بس بیٹا! وہ کم بخت، لالچی تو اس کی جائیداد کے چکر میں تھا اور میاں جی ٹھہرے زمانہ شناس، وہ تو اس کا مقصد جان گئے تھے، بمشکل ایک سال اکٹھے رہے اور پھر وہ ظالم چندا کو مار پیٹ کر یہاں بھجوا دیتا کہ جاؤ اپنے دادا سے اپنا حصہ لے کر آؤ، لیکن میاں جی نے بھی اپنا دل

ہنس دیئے۔ کھانا کھانے اور چائے پینے کے دوران بے جی نے بتایا کہ وہ لوگ اب گاؤں میں شفت ہونے والے ہیں اس کوٹھی کو کرائے پر دینے کا ارادہ ہے جبکہ زمینوں کی دیکھ بھال کرنے کی بجائے پچھلے دو سال سے ٹھیکے پر دے دی تھیں اور گاؤں والی حویلی کی دوبارہ مرمت کروالی تھی۔

اور شام کو جب وہ ایک بھرپور دن گزارنے کے بعد باہر نکلے تو چند گیٹ تک انہیں چھوڑنے آئی، سامنے لان میں لگے آم کے درخت کو انہوں نے بڑی دلچسپی سے دیکھا، اس کی گھنی چھاؤں کے نیچے بیٹھ کر وہ پڑھا کرتے تھے۔ مہندی کی باڑ سوکھ گئی تھی اور لان بھی جھاڑ جھکاڑ سانسوس ہو رہا تھا۔

”اور تم نے اب آگے کیا سوچا ہے؟“ وہ چلتے چلتے رکے تھے اور اپنے ساتھ چلتی چندا کو غور سے دیکھا، جو کافی سنجیدہ اور سوہری لگ رہی تھی، آنکھوں کے نیچے حلقے نمایاں تھے۔

”کچھ نہیں بس گاؤں میں ایک سکول کھولا تھا اب جا کر اسے خود سنبھالوں گی۔“ وہ خشک سے انداز میں بولی۔

”کون تم.....؟“ حیرت سے ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا، وہ اس کی پڑھائی سے دلچسپی سے اچھی طرح آگاہ تھے اور شاید اسے بھی اس حیرت کے پیچھے موجود کہانی کا انداز تھا، تب ہی مسکراتے ہوئے بولی۔

”میں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے انگلش کر رکھا ہے۔“

”کیا.....؟“ اس انکشاف پر وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگا، جو سامنے درخت پر بیٹھی تھا چڑیا کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

”یہ انقلاب کیسے آیا؟“ وہ خوشگوار حیرت سے بولے تھے جبکہ چندا نے سر دہا بھری اور زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔ ”طلال منظور صاحب! زندگی بہت کچھ بندے کو سکھا دیتی ہے اور آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ جو لوگ اپنوں کو دھوکہ دے کر ناجائز فائدہ اٹھائیں ان کے حصے میں خسارہ ہی آتا ہے۔ میں نے سوچا کہ ماضی کو یاد کروں تو سوائے ندامت اور شرمندگی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اس لئے اپنے حال کو بہتر کر لوں تاکہ زندگی میں کبھی مڑ کر دیکھوں تو اپنے بے شمار غلط اور جذباتی فیصلوں کے درمیان کوئی ایک چیز تو اطمینان بخش ہو۔“ اس کے چہرے پر ندامت اور دکھ ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

ہی کی وجہ سے ہوں مجھے یاد ہے کہ ابے کے اندر تعلیم کا شوق پیدا کرنے والے بھی وہی تھے اور بے بے مجھے شہر بھجوانے پر راضی نہیں تھیں، لیکن میاں جی کے سامنے بولنے کی ان میں ہمت نہیں تھی اور پھر جس طرح آپ دونوں نے اپنی زمین کے منشی کے بیٹے کو اپنے گھر میں محبت اور مان دیا میں تو مرکز بھی یہ احسان نہیں بھلا سکتا۔“

”اے لو جھلا ہو گیا ہے کیا؟ میاں جی نے کب تمہیں کسی ملازم کا بیٹا سمجھا؟ بہت پیار کرتے تھے تم سے اور جب تم نے وکالت کرنے کا ارادہ کیا تو کہنے لگے مجھے ایسا لگا کہ چندا کا باپ دوبارہ میرے سامنے آن کھڑا ہوا ہے۔ انہوں نے تو تمہارے لئے بہت کچھ سوچا تھا۔۔۔۔۔“

حتیٰ کہ تمہارا اور چندا کے رشتے تک کے بارے میں سوچ لیا تھا لیکن۔۔۔۔۔“

بے جی کا دل بھر آیا۔ اس انکشاف پر حیرت سے طلال کو جھٹکا ہی تو لگا تھا، انہوں نے بے یقینی سے بے جی کو دیکھا، جن کو آج اپنے آنسوؤں پر اختیار ہی نہیں تھا۔

”بے جی!“ وہ حیرت زدہ ہو کر خاموش ہو گئے۔

”ہاں بیٹا! جن دنوں وہ ہسپتال میں تھے انہوں نے مجھ سے ذکر کیا تھا اور پھر جب تم اچانک گھر چھوڑ کر چلے گئے تو وہ کافی عرصے تک بڑے حسرت بھرے لہجے میں مجھ سے اس خواہش کا تذکرہ کرتے رہتے تھے خیر یہ تو اللہ کے کام ہیں وہ ہی جانے۔“ وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئیں، پھر تجسس بھرے لہجے میں گویا ہوئیں۔

”اور تم سناؤ کتنے بچے ہیں تمہارے؟“

”بے جی! شادی ہی نہیں کی۔“ وہ زبردستی مسکرائے۔

”کیا؟“ بے جی کو جھٹکا لگا۔ ”آئے ہائے کیوں؟ کیا بڑھاپے میں کرنی ہے؟“

”بس بے جی شادی تو دل کی خوشی کا نام ہے جب دل ہی مر گیا تو کیسی شادی؟“ انہوں نے کھانے کی ٹرے نیبل پر رکھتی چندا کو دیکھ کر تاسف بھرے لہجے میں کہا، وہ بالکل خاموش تھی

پاٹ چہرے کے ساتھ وہ کچن کی کھڑکی سے دونوں کی باتیں کافی دیر سے سن رہی تھی۔

”لو! تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟“ بے جی ہکا بکا ان کی شکل دیکھ رہی تھیں۔

”کہیں کوئی چکر وکرتو نہیں؟“ بے جی کے رازدارانہ انداز پر طلال کو ہنسی آگئی۔

”استغفر اللہ بے جی میں آپ کو ایسا لگتا ہوں۔“

”لگتے تو نہیں ہو، لیکن بندے کا کون سا پتا چلتا ہے۔“ بے جی سادگی سے بولیں۔ وہ

چھ سال تازہ ہوا کے جھونکے دیئے ہیں۔ مجھے زندگی کی بد صورتیوں سے نبٹنے کیلئے توانائی دی تھی۔ مجھے کچھ مہینوں میں ہی ان کے خالص ہونے کا اندازہ ہو گیا تھا۔ لیکن ایک جھوٹی جذباتی اور خود غرض لڑکی کا ان پاکیزہ جذبات پر کوئی حق نہیں۔“ وہ اٹھتے ہوئے آنسوؤں پر اختیار کھو بیٹھی تھی۔

طلال نے آگے بڑھ کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا اور بمشکل بولے۔

”وہ لڑکی جتنی بھی جھوٹی، جذباتی اور خود غرض کیوں نہ ہو لیکن اس ڈائری پر گرے اس کے آنسوؤں کے خالص ہونے کی گواہی میرا دل دے رہا ہے۔“ وہ کچھ دیر کو رکے۔“ اور یقین کرو محبت خود غرض نہیں ہوتی، میں نے زندگی کے ہر لمحے میں تمہارے لئے دائمی خوشیوں کی دعا مانگی تھی، میری محبت کا ظرف بھی بڑا تھا اور ہے۔ اور گاؤں کے سکول میں سیٹ اور میرے چھوٹے سے گھر کے مالکانہ حقوق تمہارے ہاتھ میں ہیں جسے چاہو منتخب کر لو، لیکن ایک بات کا خیال رکھنا اس سکول میں اس سیٹ پر اور بھی بہترین لوگ آ سکتے ہیں، لیکن میرے گھر کے دروازے پہلے بھی کسی کیلئے نہیں کھلے تھے اور تمہارے علاوہ بھی کسی پر نہیں کھلیں گے۔“ موسم میں ایک تبدیلی آئی تھی۔ آسمان پر پھیلی گھٹا اب جوش میں آ کر برسنے کو چل گئی تھی، کچھ ننھی ننھی بوندیں دونوں پر آن گری تھیں۔

چندا کا دل تیزی سے دھڑکا تھا۔ اس کی آنکھ سے پانی کا ایک قطرہ چھٹک کر کندھے پر رکھے اس کے ہاتھوں پر آن گرا تھا۔ تلال نے بہت محبت سے اس قطرے کو اپنے ہاتھ پر دیکھا تھا۔

وہ روتے روتے ایک دم ہنسی تھی۔ اپنے سامنے کھڑے شخص کی اعلا ظرف محبت سے وہ اور کتنا منہ موڑتی۔

”تم تو کبھی بھی نہیں چاہتے کہ عروج فاطمہ کسی معزز سیٹ پر بیٹھے۔“ اس نے بازو کی پشت سے اپنی آنکھیں صاف کیں تو اس اعتراف پر تلال کا دل کھل اٹھا۔

”یقین کرو! میں اپنے ملازم رفیق سے بہت زیادہ تنگ ہوں اور اپنے گھر میں سے اسے نکالنے کا اس سے بہتر طریقہ مجھے کوئی اور نظر نہیں آیا۔“ وہ شرارت بھرے لہجے میں بولے۔

”مجھے سکول کے بچوں کے مستقبل کی خاطر یہ فیصلہ کرنا پڑا۔ یہ قربانی دینا پڑی کہ ایک

”اور پھر میں نے سوچا کہ عروج فاطمہ کیا ساری زندگی خود سے محبت کرنے والوں کو دکھ ہی دیتی آئے گی؟ میں نے جو کچھ کیا مکافات عمل کے تحت اس کا نتیجہ بھگتا، بہت سارے دلوں کو توڑا اور اس کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھا اور میں نے زندگی میں ایک چیز سیکھی ہے کہ ہمارے کسی بھی غلط فعل کو ہم ہزار جھوٹی تسلیاں دے کر خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کریں۔ غلط چیز غلط ہی ہوتی ہے اور پھر زندگی خود بھی گناہوں کی سزا دیتی ہے، بس اللہ مجھے معاف کر دے۔۔۔۔۔ ایم اے انگلش کرنا میاں جی کا خواب تھا، جو وہ میرے حوالے سے دیکھتے تھے، بس سوچا کہ مجھ سے خالص اور بے غرض محبت کرنے والوں کا کچھ تو مجھ پر حق بنتا ہے اور بس اسی سوچ نے مجھ سے سب کچھ کر دیا۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو چمکے تھے، لیکن بڑی مہارت سے اس نے چھپائے تھے۔

”تم کسی دن میرے سکول آنا اور دیکھنا کہ میں پرنسپل کی سیٹ پر کیسی لگتی ہوں؟“ وہ زبردستی ہنسنے ہوئے بولی تھی، تلال نے بڑے تاسف بھرے انداز میں اسے دیکھا۔

”تو کیا یہ طے ہے کہ عروج فاطمہ اس سیٹ پر ضرور بیٹھے گی؟“

”ہاں کیوں؟“ وہ چونکی اور یقین دلانے والے انداز میں بولی، قسم سے میں اب اتنی نالائق نہیں ہوں اور ہاں۔۔۔۔۔ وہ پلٹی اور اس کی طرف دیکھ کر کہا۔”میں ابھی آئی۔ دو منٹ کے بعد وہ باہر تھی، یہ تمہاری ڈائری میرے پاس امانت تھی۔“

طلال نے غور سے نیلی جلد والی ڈائری کو دیکھا جو اس نے ان دنوں باقاعدگی سے لکھنا شروع کی تھی، جب چندا اس کی زندگی میں آئی تھی۔۔۔۔۔ اس کے ورق ورق پر اس کی ان کہی محبتوں کی داستانیں رقم تھیں، اس نے بوجھل دل کے ساتھ ڈائری کھولی۔

اس کے بہت سارے صفحات پر لکھے الفاظ مٹے ہوئے تھے، ان پر گرے خشک آنسوؤں کو وہ اب بھی محسوس کر سکتے تھے، وہ سمجھ سکتے تھے کہ کسی کو ان لکھے گئے الفاظ نے رلا دیا تھا۔ تلال نے گہری نظروں سے اپنے سامنے لب کچتی چندا کو غور سے دیکھا، چھ سالوں نے اسے مکمل طور پر تبدیل کر دیا تھا۔

”کیا میری خالص اور سچی محبت کا اتنا بھی حق نہیں کہ یہ الفاظ میں نے جس کیلئے لکھے وہ اسے سنبھال کر رکھے۔“ ان کے گلے پر چندانے بے اختیار دیکھا اور فوراً نظریں چرائیں۔

”میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتی کہ ان کو مزید اپنے پاس رکھوں، ان الفاظ نے مجھے گزشتہ

تالائق پر پل.....“

اس کی بات منہ میں ہی رہ گئی تھی۔ ہاتھ میں پکڑی ڈائری چندا نے کھینچ کر ان کے کندھے پر ماری تھی، وہ ایک لمحے کو بوکھلا گئے اور اگلے ہی لمحے وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے، دروازے میں کھڑی بے جی نے یہ منظر بہت محبت سے دیکھا تھا، انہیں لگا تھا کہ ان کی بے وقوف پوتی کی زندگی میں نئے موسموں کو آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔



## اے عشق، ہمیں برباد نہ کر

مجھے دشمہ حیدر سے چڑکب؟ کیوں؟ اور کیسے ہوئی؟

میں نہیں جانتا، لیکن یہ بے زاری، کوفت اور جھنجھلاہٹ کا رشتہ خاصا پرانا ہے، کبھی کبھی میرا دل کرتا ہے کہ میں اس فضول، احق، بے ہودہ اور خود کو ”پھنے خان“ سمجھنے والی لڑکی کی گردن مروڑ دوں یا پھر مجھ کی طرح مسل کر رکھ دوں اور اگر کوئی جادو ٹونہ ہاتھ آئے تو اس اسٹوپڈ لڑکی کو کبھی بنا کر دیوار پر چپکا دوں، جس نے مجھے سر سے پیر تک سلگا کر رکھ دیا تھا۔ بعض اوقات مجھے اپنے وجود سے چنگاریاں سی نکلتی محسوس ہوتی تھیں۔

کبھی کبھی میرا دل کرتا کہ میں اسے کسی پرانی حویلی کے تہہ خانے میں اس وقت تک سزا کے طور پر بند رکھوں جب تک اسے زندگی بسر کرنے کا سلیقہ نہ آ جائے، اس پانچ فٹ سات انچ کی اونٹ جیسی لمبی لڑکی نے میرا سکون برباد کر کے رکھ دیا تھا، حالانکہ وہ انتہائی عام سی شکل و صورت کی مالک تھی البتہ نین نقش خاصے چیکھے تھے اور اپنے لمبے قد کی وجہ سے وہ بہت ساری لڑکیوں میں ممتاز نظر آتی تھی.....

مجھے نہ جانے کیوں خوا خواہ ہی اس پر غصہ آتا، اور میرا دل کرتا کہ اس فضول لڑکی کی کم سے کم ٹانگیں تو میں ضرور توڑ دوں، کیونکہ مجھے مرد مار ٹاپ لڑکیوں سے بہت الجھن ہوتی تھی، مجھے ایسی لڑکیاں زہر لگتی تھیں، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود میں دشمہ حیدر کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

اس لئے کہ وہ مجھے یعنی ریان علی کو بالکل نہیں جانتی۔

مجھے اس سے چڑکیوں ہوئی؟ ذرا ٹھہریے! اس کیلئے مجھے زیادہ نہیں بس اڑھائی سال پیچھے جھانکنا پڑے گا۔

کامیاب بزنس ڈیل کے بعد یونہی وہ پلے دیکھنے چلے آئے تھے جس کے ان دنوں خاصے چرچے تھے۔

اس پلے میں اسے ہندوستانی سٹائل میں ساڑھی باندھے ایک کلاسیکی رقاصہ کا کردار ادا کرتے دیکھ کر میرامنہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

میوزک کی تال پر اٹھنے والے اس کے پاؤں اور جسمانی اعضاء کی حرکت میں مکمل ہم آہنگی دیکھ کر ایک لمحے کو تو میں بھی مبہوت رہ گیا، اس کی پرفارمنس چیخ چیخ کر بتا رہی تھی کہ اس نے اس فن کو سیکھنے میں کتنا عرصہ لگایا ہوگا؟ لیکن نہ جانے کیوں اس پلے میں اسے دیکھ کر مجھے اس پر بے تحاشا غصہ آیا تھا اور سفیر میرے خراب موڈ کو نا سبھی کے انداز میں دیکھ کر صرف کندھے اچکا کر رہ گیا اور اس دن ہم ڈرامہ ادھورا چھوڑ کر ہال سے اٹھ آئے تھے اور وہیں مجھے معلوم ہوا کہ اس کا نام ”وشمہ حیدر“ ہے اور اس کا تعلق پاکستان سے ہے۔

چوتھی دفعہ میں نے پھر اسے پاکستان کے شہر ”ٹیکسلا“ میں دیکھا، میں کچھ غیر ملکی فرینڈز کو میوزیم دکھانے لایا تھا اور میرے وہم و گمان کی آخری سرحدوں پر بھی نہیں تھا کہ میرا اس سے پھر ٹاکرا ہو جائے گا، بلیو ٹراؤزر پر اس نے وائٹ ٹاپ پہن رکھی تھی اور ایک اسپینش لڑکے کا بازو بے تکلفی سے پکڑے وہ ایک دفعہ پھر میرا دماغ خراب کر گئی تھی۔

وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر میوزیم کے پائین باغ میں لگے پینل کے درخت کے بارے میں بہت جوش و خروش سے اسپینش زبان میں پاس کھڑے لڑکے کو بتا رہی تھی کہ یہ درخت خاص طور پر سری لنکا سے لا کر لگایا گیا ہے اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس درخت کی ایک جڑ ہے جس کے نیچے بیٹھ کر مہاتما بدھ نے ”نروان“ حاصل کیا تھا۔

میں نے بے تحاشا اٹھ آنے والے غصے پر قابو پانے کی کوشش کی اور کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا، جس کے کندھے پر وہ واہیات اسپینش لڑکا بڑی بے تکلفی سے ہاتھ رکھے بہت غور سے اس کی بات سن رہا تھا یا پھر سننے کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔

اس سے پانچویں مگر پہلی تفصیلی ملاقات ملک کے مشہور و معروف صنعتکار خالد اعوان کے بیٹے کے ولیئم میں ہوئی۔ بلیک ڈنرسوٹ میں محض حاضری لگوانے کے چکر میں وہاں آتے ہوئے میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ پٹانہ اور آفت لڑکی جو نہ جانے کیوں میرے لئے کوفت اور بیزاری کا سبب بن رہی ہے اب وہاں بھی موجود ہوگی۔

جب لندن کی ایک غیر معروف سڑک پر میں نے اسے ہیوی بائیک اڑاتے دیکھا وہ فل اسپڈ سے ایک اور بائیک کا پیچھا کر رہی تھی جس پر دو سیاہ فام اسے مسلسل چڑا رہے تھے اور پھر اچانک وہ ہوا جو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ ایک دم بائیک ان سیاہ فاموں کی بائیک کے آگے لا کر اسے روکنے میں کامیاب ہو گئی تھی اور اگلے دس منٹ میں وہ پانچ فٹ سات انچ کی لڑکی ان دو بھاری بھر کم سیاہ فاموں کی اچھی خاصی ٹھکانی کر کے لندن کی اس سنان سڑک پر اب بالکل خالصتاً لاہوری سٹائل میں پنجابی میں انہیں گالیاں دے رہی تھی اور وہ بھاگتے ہوئے مڑ مڑ کر اس کی طرح خوف اور بے یقینی سے دیکھ رہے تھے جیسے وہ دہلی تپتی سی لڑکی نہیں بلکہ ”جن“ ہو.....

اور کچھ فاصلے پر اپنی بائیک کے ٹائر بدلتے ہوئے میں نے یہ منظر بڑے ہکا بکا انداز میں دیکھا تھا، میلی بدرنگ، جینز پر بے ہنگم پرنٹ والی شرٹ پہنے اب وہ شرٹ کی آستین سے اپنا منہ صاف کر رہی تھی اس کے چہرے پر غصے اور اشتعال کے رنگ نمایاں تھے بڑی بے خونی سے اس نے اپنے بوائے کٹ بالوں میں ہاتھ پھیرا اور پھر اگلے ہی لمحے اس نے دو انگلیاں منہ میں رکھ کر زوردار آواز میں دسل بجائی اور پھر لا پرواہی سے ہاتھ جھاڑتے ہوئے بائیک پر بیٹھی اور اگلے ہی لمحے وہ اسے جیٹ جہاز کی طرح اڑائے جا رہی تھی اور میں کسی حد تک حیران نظروں سے اس پٹانہ لڑکی کو دیکھتا رہ گیا۔

اس سے پہلے کہ میں اسے بھول جاتا، اگلی دفعہ ٹھیک چار مہینے دس دن کے بعد اسے میں نے آسٹریلیا میں پاکستان اور انڈیا کا کرکٹ میچ دیکھتے ہوئے دی آئی پی انکلوژر میں دیکھا۔ وہ خواخواہ اوچی آواز میں بے ہنگم سا شور مچا رہی تھی اور ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگ، کوفت اور بیزاری کا شکار ہو رہے تھے جبکہ وہ ان کی جھنجھلاہٹ سے بے نیاز ہر فضول شارٹ پر تالیاں بجا بجا کر اپنی ہتھیلیاں سرخ کر رہی تھی۔ اپنے چہرے پر پاکستانی پرچم پینٹ کئے پٹی کپ پہنے گرین ٹراؤزر اور وائٹ شرٹ میں اسے دیکھتے ہی میرے ذہن میں جھماکا ہوا اور کچھ دیر سوچنے کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ ٹارزن کی جانشین وہی پھولن دیوی ہے جس نے اچھے خاصے بٹے کئے مردوں پر جوڈو کراٹے کے وار کر کے انہیں بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔

تیسری دفعہ میں نے اسے ”نیشنل سینٹر فار پرفارمنگ آرٹ“، بمبئی کے خوبصورت ترین آڈیٹوریم کے ایک پلے میں پرفارم کرتے ہوئے دیکھا اس دن میں اور میرا فرینڈ سفیر ایک

میں خالد صاحب کے بیٹے اور اپنے بزنس پارٹنر ارسل کو مبارکباد دینے کیلئے سٹیج کی طرف بڑھ رہا تھا جب بلیک سیلیوس بلاؤز اور شیفون کی ساڑھی میں بڑی نزاکت سے سیڑھیاں اترتی دشمہ کو دیکھ کر مجھے شاک لگا تھا۔

وہ آج کچھ خاص لگ رہی تھی۔ کافی دیر تک تو میں اس کے متناسب وجود سے اپنی نظریں ہی نہ ہٹا سکا جبکہ وہ کسی منسٹر کے ساتھ انتہائی بے تکلفی سے ملکی سیاست پر خاصا کھلاؤلا تبصرہ کر رہی تھی اور اس کے ارد گرد ملک کی کریم کا جھوم تھا۔

”یہ کیا چیز ہے؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں اپنے ساتھ کھڑے معیز سے پوچھا اور اپنا لہجہ دانستہ سرسری رکھا جبکہ نظریں ابھی ابھی اس پر تھیں۔

”کون یہ؟“ معیز نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔ اس نے بہت ابھی نظروں سے اب مجھے دیکھا تھا وہ لڑکیوں کے معاملے میں میری حد درجہ محتاط طبیعت سے اچھی طرح آگاہ تھا۔

”تم وحشہ حیدر کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟“ اسے شاید یقین نہیں آیا تھا۔ ہاتھ میں پلڑے ڈرنک کے گلاس کو اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور ٹشو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے میرے صبر کو مزید آزمایا..... اور کچھ دیر بعد خوش دلی سے کہا۔

”حیرت ہے کہ تم دشمہ حیدر کے بارے میں نہیں جانتے؟“

”کیوں یہ چیف منسٹر ہیں جن کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔“ میں تلخ ہوا۔

”چیف منسٹر نہ سہی منسٹر کی بیٹی تو ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے اطلاع دی۔

”کیا مطلب؟“ اب کے میں حقیقتاً چونکا..... جبکہ وہ بڑے نازل انداز میں کہہ رہا تھا۔

”یار! تم اتنے لاعلم ہو یا پھر پوز کر رہے ہو.....؟“ معیز نے سراسر مجھے چڑایا۔

”تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں جھوٹ نہیں بولتا۔“ میرے لہجے میں چھپی سنجیدگی

اور ہلکی سی خفگی پر وہ محتاط ہوا۔

”ویسے حیرت ہے یار! تم خالد اعوان کے اس بیٹے کا ولیمہ اٹینڈ کرنے آئے ہو جس

کے تمہارے بزنس میں فتنی پرسنٹ شیئرز ہیں اور تمہیں یہ بھی خبر نہیں کہ ارسل خالد کی شادی

منسٹر حیدر علی کی بیٹی شانزے کے ساتھ ہوئی ہے اور حیدر علی اعوان کے بیٹے فیصل اعوان کا نام

بزنس ٹائیکون کے حوالے سے لیا جاتا ہے اور فیصل سے تمہارے اچھے خاصے خرم ہیں اور اس کی

تینوں بہنیں شانزے، علیزہ اور دشمہ کم از کم ہمارے سرکل میں کسی تعارف کی محتاج نہیں..... اور

تم کہہ رہے ہو کہ تم دشمہ کو نہیں جانتے..... حیرت ہے؟“ معیز نے بے اختیار قہقہہ لگایا جیسے وہ میری لاعلمی سے بے حد محظوظ ہوا ہو۔

”اس میں اتنی بھی حیرانی کی بات نہیں ہے تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں سٹڈیز کے

سلسلے میں پچھلے پندرہ سال سے امریکہ میں ہوں اور میرا حلقہ احباب بھی خاصا سلیکٹو ہے اور

میں پاپا کی طرح زیادہ سوشل بھی نہیں، انکل حیدر سے تو میری کافی دفعہ ملاقات ہوئی ہے لیکن

ان کی فیملی میں میں صرف فیصل کو جانتا ہوں، باقی ممبرز کے بارے میں مجھے کبھی دلچسپی نہیں

رہی۔“ میں نے دل ہی دل میں اسے گالیاں دیتے ہوئے بظاہر لاپرواہی سے کہا۔

”تو پھر ایک دم کیسے دلچسپی پیدا ہو گئی؟“

معیز کے معنی خیز لہجے پر میرا دل چاہا کہ اسے اٹھا کر ہال سے باہر پھینک دوں۔

”کچھ نہیں یار! ان محترمہ کو بہنیں کے ”نیشنل سینئر فار پرفارمنگ آرٹ“ کے آڈیٹوریم

میں ایک بے ہودہ سارول کرتے دیکھا اس لئے پوچھ بیٹھا، غلطی ہو گئی معاف کر دو۔“ میرے

تاثرات نے معیز کو اچھا خاصا کنفیوژ کر دیا تھا۔

”اوہ سوری یار! اس نے قدرے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”اصل میں تمہارے

قادر کے حیدر علی سے اتنے گہرے ٹرمز ہیں کہ میں سمجھا کہ تم مذاق کر رہے ہو، خیر چھوڑو تم نے

یقیناً دشمہ کو وہیں دیکھا ہوگا کیونکہ اسے ڈرامہ، تھیٹر، مصوری، مجسمہ سازی اور فنون لطیفہ سے

خاصا لگاؤ ہے اور ان سے متعلقہ ایجوکیشن کے سلسلے میں وہ پوری دنیا گھوم چکی ہے اور سننے میں

تو یہ بھی آیا تھا کہ کلاسیکل رقص کی باقاعدہ تربیت کیلئے کچھ عرصہ انڈیا میں رہی ہے، بہت کمال

کی لیکن بہت موڈی لڑکی ہے اور حد درجہ ضدی بھی، تب ہی حیدر صاحب اس کے معاملے میں

بے بس ہیں۔“

”یہ تو کوئی قابل فخر بات نہیں۔“ میں نے ناگواری سے کہا۔ ”اور ایسی صورت میں جب

آپ کی فیملی کا شمار ملک کی بہت اہم فیملیز میں ہوتا ہو اور ”اعوان گروپ آف انڈسٹری“ کا

ملک کی پہلی دس انڈسٹریز میں نام آتا ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن حیدر صاحب کے باقی تین بچے تو بزنس میں حد درجہ انوالو

ہیں شانزے، علیزہ اور فیصل تینوں نے بزنس سے متعلقہ ایجوکیشن ابراؤ سے ہی کپلیٹ کی

ہے۔“

بورڈ دیکھ کر میری سسر شازے کی طرف متوجہ ہو گئے، کیونکہ وہ خاصی اسٹوڈ ہے اور اس کا ثبوت آج ان دونوں کا ولیمہ ہے۔“

وہ خاصے منہ پھٹ انداز میں اپنی بات کہہ کر قہقہہ لگا کر ہنسی تھی جبکہ پاپا اور انکل وحید کے سامنے بے تکلفی کا یہ مظاہرہ کم از کم مجھے خاصا ناگوار گزار تھا اور میں نے اپنی ناگواری کو زبردستی کی مسکراہٹ میں چھپایا۔

”وشمہ! مجھے لگتا ہے کہ تم آج سارے سیکریٹ آؤٹ کرنے کے موڈ میں ہو اور اس خطرناک موڈ میں، میں تمہیں کم از کم ان لوگوں کے سامنے کھڑا نہیں کر سکتا جن کی میرے بارے میں بہت اچھی رائے ہے۔“

وہ بازو پکڑ کر زبردستی دوسری طرف بڑھ گیا جبکہ وہ ہنسنے لگی۔  
”بہت شرارتی لیکن بہت ذہین لڑکی ہے۔“ پاپا کے کمنٹس پر میں نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

پاکستان آنے کے بعد میری مصروفیات کا لانتناہی سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور میں نے اکلوتے ہونے کے اسٹیشن کو جتنا عرصہ انجوائے کرنا تھا کر لیا اور اب میرے اوپر ذمہ داریوں کا ایک پہاڑ آن گرا تھا، میرے پاپا کا بزنس خصوصاً لیدر گارمنٹس کی دنیا میں ایک نام تھا اور کام کے حوالے سے ہمارا ایک معیار تھا..... میں اور ماہم، ہم دو ہی بہن بھائی تھے۔ ماہم مجھ سے پانچ سال چھوٹی اور فائن آرٹس کی طالبہ تھی..... اور پاپا کی حد درجہ لاڈلی جبکہ میں ماما کی جان تھا اور امریکہ میں ہونے کے باوجود ماما ہر تیسرے ماہ ملنے خود پہنچ جاتی تھیں۔

میں شروع ہی سے خاصا کم گو اور خشک مزاج قسم کا بندہ ہوں اور کبھی کبھی تو مجھے خود پر بھی حیرت ہونے لگتی، اس دور میں جب میرے ایچ فیلوز لڑکے چار چار لڑکیوں میں دلچسپی رکھتے تھے، مجھے اس ٹاپک سے حد درجہ بیزاری اور کوفت ہوتی تھی، حالانکہ میری کئی کلاس فیلوز لڑکیوں نے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا، لیکن میری ریزرو اور خشک طبیعت سے اکتا کر خود ہی پیچھے ہٹ گئیں۔ مجھے رائیڈنگ، گیمز، بکس اور کمپیوٹر سے دلچسپی تھی، میں صرف اور صرف اپنی کمپنی انجوائے کرنے والا بندہ تھا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں آدم بے زار تھا، میری سلیکلو لوگوں سے دوستی تھی، جن میں سرفہرست سفیر تھا، جو ان دنوں میری طرح اپنے پاپا کا بزنس سنبھال رہا تھا اور دوسرا سعد تھا جس کی یو این او کے فنانس سے متعلقہ ڈیپارٹمنٹ میں جاب

معیز نے فوراً صفائی دی جبکہ میں کندھے اچکا کر رہ گیا..... مجھے اس سے متعلق مزید جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔

اسی فنکشن کے اختتام پر میں پاپا کے پاس کھڑا انکل وحید کو اپنی جرمن فرم کے ساتھ ہونے والی میٹنگ کی تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا کہ ارسل خالد وشمہ حیدر کے ساتھ وہاں آ گیا، ارسل نے اپنا دایاں بازو اس کی کمر میں ڈال رکھا تھا۔

”ہائے ریان! یہ ذرا میری سالی آدمی گھر والی سے ملو۔“  
”ہائے!“ میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

”اچھا تو یہ ہیں انکل افتخار علی کے اکلوتے صاحبزادے، جن کے آج کل بزنس کمیونٹی میں خاصے چرچے ہیں۔“ اس نے دلچسپی سے کہا جبکہ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

”ویسے انکل! بیٹا آپ کا خاصا ہینڈسم ہے۔“ اس کی پاپا کے ساتھ بے تکلفی مجھے ایک آنکھ نہیں بھائی۔

میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”آپ مذاق اچھا کر لیتی ہیں۔“

”یہ مذاق نہیں ہے؟ کیوں ارسل؟“ اس نے بے دھڑک ہو کر پاس کھڑے ارسل سے کہا، جس کی آج اپنے ولیمہ پر باچھیں خواخواہ کھلی ہوئی تھیں۔

”میری یہ مجال کہ اپنی سالی آدمی گھر والی کی کسی بات سے انکار کر سکوں؟“ ارسل کی بات پر وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

”قسم سے ارسل! تم ایک نمبر کے رن مرید شوہر ثابت ہو گے۔“

”اس میں کوئی شک نہیں۔“ ارسل کی شوخیاں مجھے زہر لگ رہی تھیں۔

”میرا خیال ہے کہ یہ آپ کے برادران لاء ہوتے ہیں اور عمر میں کافی بڑے بھی۔“  
میرا انداز خاصا جتانے والا تھا، وہ ایک لمحے کو چونکی اور پھر ہنسنے ہوئے بے ساختہ بولی۔

”اگر آپ کا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ میں اس گھامڑی رسپیٹ نہیں کر رہی تو ایسا میں مر کر بھی نہیں کر سکتی، کیونکہ موصوف نہ صرف میرے بہنوئی بلکہ فرسٹ کزن بھی ہوتے ہیں اور کچھ عرصہ پہلے مجھے پٹانے کے چکروں میں بھی تھے اور پھر میری طرف سے نو لفٹ کا



تھی اور وہ آج کل امریکہ ہی میں تھا۔



میں اپنے بزنس کی دنیا میں خاصا مصروف تھا تب ہی میرے ذہن سے وہ وقتی طور پر جو ہو گئی تھی، لیکن اس دن اپنے گھر کے وسیع و عریض لان میں اسے پایا اور ماہم کے ساتھ بے تکلفی سے شام کی چائے پیتے دیکھ کر مجھے دھچکا لگا، حالانکہ لگتا نہیں چاہئے تھا کیونکہ اتنا علم تو مجھے ہو گیا تھا کہ وہ حیدر انکل کی بیٹی ہے جو پایا کے نہ صرف بہترین دوست تھے بلکہ ان کے بیٹے کے ساتھ میری کچھ پرائیویٹس میں پارٹنرشپ بھی تھی، اس حوالے سے اس کی میرے گھر میں موجودگی کوئی غیر معمولی بات تو نہیں تھی۔ اس سے اتنی ملاقاتوں میں اب مجھے اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ وہ خاصی انٹرا ماڈرن اور آؤٹ سپوکن لڑکی ہے، حالانکہ جس کلاس سے اس کا تعلق تھا اس میں یہ بات قطعاً معیوب نہیں سمجھی جاتی، لیکن اسی کلاس سے تعلق ہونے کے باوجود ہمارے گھر میں ان باتوں کا خاصا خیال رکھا جاتا تھا۔ ماما خاصی ڈیسنٹ ڈریسنگ کرتی تھیں اور یہی حال ماہم کا بھی تھا۔

”بھئی تم کہاں چپکے چپکے اندر جا رہے ہو؟“ پایا نے مجھے تیزی سے اندر کی طرف بڑھتے دیکھ کر ٹوکا۔

میں نے فوراً شرمندہ ہو کر وضاحت کی۔

”اکیچو کلی پایا میں نے سوچا کہ ذرا فریش ہو کر آتا ہوں۔“

”اچھے خاصے فریش اسمارٹ اور ہینڈسم تو لگ رہے ہیں۔“ وہ شرارتی لہجے میں بولی

تھی۔

”مجھے لگتا ہے کہ آپ کی نظر خاصی دیک ہے۔“ میں نے طنز کیا۔

”ارے بالکل بھی نہیں۔“ وہ خوش دلی سے ہنسی۔ ”ہینڈسم لوگ تو مجھے چار میل دور سے

بھی نظر آ جاتے ہیں۔ یاد نہیں انکل! اس دن کلب میں میجر صارم کو میں نے ایک میل کے فاصلے پر بھی دیکھ لیا تھا۔“ اس کا شوخ لہجہ مجھے اندر تک سلگا گیا تھا جبکہ نکلس پر ہاتھ صاف

کرتے پایا نے بڑا بے ساختہ تہقہہ لگایا۔

”لیس مائی ڈیر!“ پایا نے سر ہلایا، ماہم بھی مسلسل مسکرا رہی تھی جبکہ مجھے اپنا آپ اس

پروجیکشن میں خاصا اکورڈ لگ رہا تھا۔

”بھائی! بیٹھیں تا میں نے آج بہت مزے کے نکلس اور فش پکوڑے بنائے ہیں۔“

ماہم نے محبت بھرے لہجے میں مجھے اندر جانے سے روکا اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھ گیا۔

”ہاں بھئی۔ ماہم آج اپنے پایا کی ہار کو سلیم ریٹ کر رہی ہے۔“ اس نے ایک دفعہ پھر

پایا کو چھیڑا تو میں نے الجھن بھری نظروں سے پایا کو دیکھا جو خاصی رغبت سے اب گجریلے پر

ہاتھ صاف کر رہے تھے۔

”انکل! اب آپ مان جائیں کہ آپ بوڑھے ہو گئے ہیں اور اب مزید مجھ سے نہیں

جیت سکتے۔“

”خبردار لڑکی! بوڑھا مت کہنا، بوڑھا ہوگا تمہارا باپ۔“ پایا نے شرارتی لہجے میں

دارنگ دی۔

”جی ہاں! وہ بھی نہیں مانتے، یہ ساڑے بوڑھے ایک جیسے ہی ہوتے ہیں، ہے نا ماہم؟“

اب اس نے خاموش بیٹھی ماہم کو تبھی گھیننا جبکہ وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے خوش دلی سے

بولی۔

”نا بابا نا مجھے تو اس مسئلے سے دور ہی رکھیں۔“

”کیوں ریان! آپ کیا کہتے ہیں؟“

”جی!“ میں نے حیرت سے اسے دیکھا، مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ مجھ سے مخاطب

ہوگی، میری حیرت پر وہ ایک لمحہ چونکی..... الجھن بھری نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر

ٹھنک کر بولی۔

”یہ آپ کی ٹھوڑی پر تل ہے نا.....؟“

”کیا مطلب؟“ میں نے گڑ بڑا کر اسے دیکھا جبکہ وہ بڑے ہموار لہجے میں کہہ رہی

تھی۔ ”اصل میں پہلی مرتبہ جب میں نے آپ کو شانزے کے ولیمہ میں دیکھا تھا تب آپ کی

فرنج کٹ تھی، اس لئے نظر نہیں پڑی۔“

”پھر.....؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا، وہ کچھ پزل ہوئی۔

”اوکے بچو! انجوائے یور کمپنی، مجھے ایک بزنس ڈنر میں جانا ہے۔“ پایا ایک دم کھڑے

ہو گئے اور پھر مسکراتی نظروں سے وشمہ کی طرف دیکھا۔

”اوکے سویٹ ڈائز، نیکسٹ ٹائم تم اپنے ایک انکل کو اسنوکر میں نہیں ہرا سکوگی، اس لئے

مکمل تیاری کے ساتھ آنا۔“ پاپا کے شرارتی لہجے پر نہ جانے مجھے کیوں لگا کہ وہ زبردستی مسکرائی تھی۔ پاپا کے پیچھے ہی ماہم بھی میرے لئے تازہ چائے کا آرڈر دینے چل پڑی۔ اب ہم دونوں اکیلے تھے۔

”آپ کا اشار کون سا ہے؟“ وہ تجسس بھرے انداز میں بولی۔

”یو۔ لیکن میں اشارز پر یقین نہیں رکھتا۔“ میں نے بے تاثر انداز میں کہا۔

”ڈیٹ آف برتھ؟“ میری بے زاری کو خاطر میں لائے بغیر وہ بولی۔

”دس اگست۔“

اس کے چہرے پر ایک تاریک سا سایہ دوڑا تھا اس نے بے یقینی کے عالم میں مجھے دیکھا۔

”تم پر فوم کون سا استعمال کرتے ہو؟“ اس نے مدہم آواز میں پوچھا۔

”ہیوگوباس۔“ میں نے بے زاری سے جواب دیا۔ اس کے اس انٹرویو سے مجھے کوفت

ہونے لگی تھی جبکہ میرے جواب سے اب وہ بالکل خاموش ہو چکی تھی۔

”میں سمجھ نہیں پایا کہ تم کیا پوچھنا چاہ رہی ہو؟“ مجھے اس کی خاموشی سے الجھن ہوئی

اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر ٹھہر گیا۔

”کیا تمہیں میوزک پسند ہے؟“

”ہوں!“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تمہاری کتنی لڑکیوں سے دوستی ہے؟“ وہ پلکیں جھپکائے بغیر گہری نظروں سے میری

طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

”ایک بھی نہیں، میں لڑکوں کی کمپنی میں زیادہ انجوائے کرتا ہوں۔“ میرے سپاٹ لہجے پر

وہ گویا سانس لینا بھول گئی وہ اب ہاتھ کی پشت سے اپنی آنکھوں کو رگڑ رہی تھی۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا۔“ وہ جیسے کسی خلا سے بولی تھی۔

”کس بات پر؟“ میں نے فوراً پوچھا۔

”یہ سب کچھ بہت حیران کن ہے؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ نوئیور امپاسل۔“ وہ بڑبڑائی۔

اس کے ہونٹوں پر موجود مسکراہٹ مجھے بہت عجیب لگی، مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اس لڑکی

کے دماغ کا کوئی پرزہ ڈھیلا ہے۔ میں نے بیزاری سے سوچا۔

”بھاڑ میں جائے میرا دماغ تو نہ خراب کرے۔“

وہ اچانک اٹھی اور ٹھیک دو منٹ کے بعد وہ اپنی بلیک شیراڈ آندھی طوفان کی طرح اڑائے لے جا رہی تھی اور باہر آتی ماہم نے بہت عجیب انداز سے یہ منظر دیکھا تھا۔ میں خواخوہ شرمندہ ہو گیا۔



اگلے دن میں اپنی فرم کے ہیڈ آفس میں ارسل کے ساتھ اپنے نئے پرائیکٹس کو ڈسکس کرنے میں مصروف تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی ہم نے ایک کورین کمپنی کے ساتھ ایک کامیاب ڈیل کی تھی جس کی وجہ سے ہم دونوں کے موڈ خاصے خوشگوار تھے۔ فیصل حیدر بھی وہیں موجود تھا۔ ہم تینوں بیک گائز کی اڑان سے برنس کیونٹی میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی، ہم نے بہت جلدی اور تیزی سے تجربے کار بوڑھے لوگوں کو کئی معاملات میں کلک آؤٹ کر دیا تھا..... ہم تینوں خاصے پرجوش و متحرک تھے۔

لنچ سے فراغت کے بعد ہم چائے پینے میں مگن تھے جب میرے آفس کا دروازہ دھڑ سے کھلا، بلیک جینز پر مسرؤ ملگجی سی شرٹ میں وہ اچانک اندر آئی تھی۔

سو بے ہوئے پوٹے اور اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں اس کی خرابی طبیعت کی نشاندہی کر رہی تھیں۔

”دشی تم!“ سب سے پہلے فیصل کی نظر اس پر پڑی وہ بے چینی سے بولا جبکہ وہ بری طرح ٹھٹھکی جیسے اپنے بھائی اور بہنوئی کی یہاں موجودگی کی توقع نہ ہو۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“ فیصل بے صبرے پن سے بولا۔

”ہاں ٹھیک ہوں میں تو ریان سے ملنے آئی تھی۔“ وہ اپنی دھن میں کہتے کہتے رک سی گئی، میں جو سرسری انداز سے اسے دیکھ رہا تھا چونک اٹھا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”خیریت؟“

”ہاں خیریت ہی ہے۔“ وہ دھیمے لہجے میں گویا ہوئی اور بے تکلفی سے سامنے پڑے صوفے پر بیٹھ گئی، مجھے اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہوا، کیونکہ اس کا چہرہ خاصا سپاٹ اور لہجہ بالکل مدہم تھا۔ فیصل اور ارسل کا ارادہ نئی فیکٹری کیلئے سائٹ دیکھنے کیلئے جانے کا تھا۔ وہ دونوں ہی اکٹھے جانے کیلئے کھڑے ہو گئے تو میں نے حیرانی سے سامنے الجھی الجھی سی دشمہ کو دیکھا.....

مناسب لگتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ نور مائنڈ“ دے ہوئے لہجے میں حد درجہ سنجیدگی تھی۔  
 ”دیکھیں مس وشمہ حیدر! آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے میرے بارے میں اس طرح سوچا، لیکن یقیناً جاچے گا مجھے ان فضولیات سے کوئی دلچسپی نہیں یہ ڈرائے، تھیر وغیرہ کی آج کے دور میں کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ آج کا دور بہت فاسٹ دور ہے اور اب میڈیا اتنا ایڈوانس ہو چکا ہے کہ بچہ بچہ آگیا رکھتا ہے۔ آپ کن چکروں میں پھنسی ہوئی ہیں۔ ان سے نکل آئیے اور پلیز مائنڈ مت کیجیے گا، اگر یہ تجویز آپ کے بجائے کسی اور نے میرے سامنے رکھی ہوتی تو وہ اب تک مجھے اپنے آفس میں نظر نہیں آ رہا ہوتا، لیکن آپ انکل حیدر کی بیٹی ہیں اس حوالے سے میرے لئے قابل احترام ہیں۔“

میرے سخت اور درشت لہجے پر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا، وہ جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔  
 ”آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے ابھی تک مجھے اپنے آفس سے گیٹ آؤٹ ہونے کا حکم نہیں دیا، لیکن میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ انکل افتخار جیسے ناکس بندے، جنہیں فنون لطیفہ کے تمام شعبوں سے گہرا لگاؤ ہے، ان کا بیٹا اس درجہ تک خشک مزاج ہوگا اور مسٹر ریان علی! میڈیا چاہے جتنا مرضی فاسٹ ہو جائے اس پر چلنے والے جھنڈو اور خرافات ہماری ثقافت ہماری روایات اور ہمارے ملی ورٹے کو زندہ نہیں رکھ سکتے۔ وہ نسل نو کو گمراہ کر رہے ہیں اور اپنی روایات کو ہمیں خود زندہ رکھنا ہے، ان کی حفاظت کرنی ہے اپنی ایک جزیئریشن کو حقائق سے آگاہ کرنا ہے اور اس سلسلے میں ہر ایک کو اپنا فرض ادا کرنا ہوگا۔“ اس کے جذباتی لہجے پر ایک تسخیرانہ مسکراہٹ میرے چہرے پر نمودار ہوئی۔

”مس وشمہ حیدر! پہلے ہم اپنا قبلہ تو درست کر لیں، پھر میرا کارواں بننے کا شوق بھی پورا کر لیں گے۔ ورنہ یہ تو چراغ تلے اندھیرا والی بات ہے کہ ہم دعوے تو بڑے بڑے کریں لیکن اپنے اعمال پر ہماری نظریں پڑے۔ ایسے میں کوئی ہماری بات کہاں مانے گا اور پلیز مائنڈ مت کیجیے گا۔ یہ کلاسیکل رقص کی تربیت کیلئے بھیجنا اور گلوکاری کیلئے ریاض کرنا اور مغربی ڈریسز پہن کر اپنی قوم کو سقوط ڈھاکہ کے حقائق سے آگاہ کرنا، سچ کہیں تو بات کہیں بنتی نظر نہیں آتی۔ ہمارا مذہب ہماری روایات بہت خوبصورت ہیں، اگر ان کے بارے میں لوگوں کو آگاہ کرنا ہے تو اس کیلئے ضروری ہے کہ ہم ”خود“ بھی آگاہ ہوں ورنہ قول و فعل کے تضاد کے سہارے اگر کسی کو کچھ کہیں گے تو لوگ زیادہ دیر تک ہمیں برداشت نہیں کریں گے۔“

میرا دل چاہا کہ وہ بھی ساتھ ہی چلی جائے۔ میں کم از کم اسے کہنی دینے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھا۔

”وٹی! تم ہمارے ساتھ چلو گی؟“ فیصل نے چلتے چلتے رسماً پوچھا۔  
 ”نہیں۔“ وہ چونکی ”آپ لوگ جاؤ۔ مجھے ریان سے کچھ کام ہے۔“ اس نے صاف انکار کر کے سامنے پڑا نیوز پیپر اٹھالیا، ان دونوں نے بھی پھر اصرار نہیں کیا۔  
 ”چائے پیو گی؟“ میں نے بحالت مجبوری مہمان نوازی کے تقاضے نبھائے۔  
 اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”کیسے آتا ہوا؟“ میں نے اپنا تجسس دانستہ چھپاتے ہوئے لاپرواہی سے پوچھا۔  
 ”مجھے لگتا ہے کہ تمہیں میرا آنا اچھا نہیں لگا۔“ اس نے شاید میرا اندر تک پڑھ لیا تھا۔  
 ”نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔“ میں نے مروا کہا۔  
 ”حالانکہ ایسی ہی بات ہے ریان افتخار علی! تمہارے چہرے پر جھوٹ چھپتا نہیں ہے۔ بہت کھلی کتاب ہوتی۔“ وہ لگتا تھا کہ آج سارے ہی سچ میرے منہ پر بولنے آئی تھی۔  
 ”کیا یہی اچھا ہو کہ ہم وہ بات کر لیں جس کیلئے آپ آئی ہیں۔“  
 میں نے زبردستی چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا، کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ میں زیادہ دیر تک مروت نہیں نباہ سکتا۔

”اپنی ہاؤ لیو دس ٹاپک! انکچو کلی ہمارا تھیٹر کے حوالے سے آکاش کے نام سے گروپ ہے اور ہم بہت سنجیدہ لیکن قومی اور معاشرتی حوالے سے حساس موضوعات پر ڈرائے بنا کر عوام کے اندر آگیا پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اسی سلسلے میں دسمبر میں ہم ”سقوط ڈھاکہ“ کے حوالے سے ایک پلے عوام کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں، اس میں ایک مختصر سارول ہے لیکن خاصا اہم اور جاندار وہ میں چاہتی ہوں کہ آپ سے کرواؤں۔ آپ کا زیادہ ٹائم ویسٹ نہیں ہوگا۔ دو چار ریہرسلز ہوں گی اور صرف ایک ہفتہ چلے گا اور بس۔“

”آپ کو کس نے کہا کہ میں اس پر پوزل کو قبول کر لوں گا؟“ میں نے بمشکل خود پر ضبط کرتے ہوئے کہا تو اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔

”میں نے ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا، بس ایک تجویز آپ کے سامنے رکھی ہے، اگر آپ کو

ہی ہوتا تھا۔  
”او کے مابدولت چلتے ہیں۔“ وہ فوراً کھڑی ہوئی تو میں نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔

”تم ڈیڈی کو کہنا کہ وہ اپنی اس گلّاس فیکٹری کے بارے میں بے فکر ہو جائیں میں ایک برنس دو میں نہ سہی برنس سے وابستہ لوگوں کے ساتھ تو رہتی ہونا اور دو جمع دو کو بائیں کرنا کبھی نہ کبھی تو مجھے آہی جائے گا، خواہ ایک آدھ فیکٹری کی قربانی دے کر ہی سہی۔“  
وہ شرارتی لہجے میں کہہ کر رکی نہیں اور میرے لئے تعجب کی بات یہ تھی کہ اس نے مجھے بالکل بھی مخاطب نہیں کیا تھا۔

فیصل نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”یار! میری یہ سسٹر شروع سے ہی بہت عجیب ہے، بچپن میں اپنے سارے کھلونے سرورٹ کو ارٹز میں رہنے والے بچوں میں بانٹ آتی تھی اور پھر ماما سے ڈانٹ کھاتی۔ ایک دفعہ ایک زخمی بلی کا بچہ لے آئی اور ماما کو پورے ایک ہفتے کے بعد پتا چلا کہ وہ میلا کھیلا بچہ اس کے روم میں اس کے کمرے میں گھس کر سوتا ہے۔ ماما کو تو پورے دو دن اس بات سے ڈپریشن رہا اور پھر ماما کی ڈتھ کے بعد یہ اور بھی زیادہ حساس ہو گئی تھی، جس کی وجہ سے ڈیڈی نے اس پر کبھی سختی نہیں کی۔ یہ ہم چاروں بہن بھائیوں میں بہت منفرد مختلف اور بہت ناکس ہے، جن دنوں شمالی علاقہ جات میں زلزلہ آیا۔ یہ پورا ڈیڑھ ماہ اپنے گروپ کے ساتھ وہیں رہی ہے اور ہم لوگ ہنستے ہیں کہ یہ ”مدر ٹریسا“ ہم میں کہاں سے پیدا ہو گئی۔“  
فیصل نے ہنستے ہوئے اپنی بہن کی عادت پر روشنی ڈالی، جس سے کم از کم مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور سچی بات تھی کہ مجھے یقین بھی نہیں آتا تھا، تب ہی میں نے فوراً بات پلٹ دی اور اسے پتا ہی نہیں چلا اور اگلے ہی لمحے وہ اپنے نئے پراجیکٹ کی تفصیلات سے مجھے آگاہ کر رہا تھا۔



گرمی کی رت اختتام پذیر تھی اور ماحول میں شدید قسم کی آندھیوں کے بعد یکا یک موسم نے پلٹا کھایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آسمان برس اٹھتا اور ہر طرف جل تھل ہو جاتی، اچانک ہی اس شام تمام دن کی شدید گرمی اور جس کے بعد موسم بدلا اور دیکھتے ہی دیکھتے سرمئی بادلوں نے آسمان کو لپیٹ میں لے لیا اور ساری فضا میں اجلی ہو کر نکھر گئیں۔

میں نے کئی دنوں کا غبار آج نکالا تھا اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا اس نے سخت خفت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور مجھے خاصی کمینگی سی خوشی ہوئی۔  
اگلے ہی لمحے وہ کچھ بھی کہے بغیر میرے آفس سے باہر تھی اور مجھے کم از کم اس طرح خاموشی سے اس کے جانے کی ہرگز توقع نہیں تھی۔

اور پھر کافی دن تک سکون ہی رہا اور دل کی بھڑاس نکالنے کے بعد میری طبیعت بھی خاصی فریش تھی۔ ایک ہفتے کے بعد میں نے اسے اپنی اور فیصل کے مشترکہ سرمائے سے لگائی جانے والی فیکٹری میں دیکھا۔ اس دن دھانی کلر کے شلوار سوٹ میں وہ خاصے معقول حلیے میں تھی اور آفس میں مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے کا رنگ تیزی سے بدلا تھا، لیکن اس نے بہت جلدی سے اس پر قابو بھی پالیا۔

”جھینکس گاڈا! وشی تم نے ڈیڈی جی کا مشورہ مان لیا، مجھے تو سخت حیرت ہوئی جب ڈیڈی نے بتایا کہ تم پچھلے ایک ہفتے سے آفس جا رہی ہو۔“  
وہ اطمینان سے بیٹھتے ہوئے بولا جبکہ میں نے ناقابل فہم انداز سے دونوں بہن بھائیوں کو دیکھا۔ وشمہ کی فراخ پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔

”میں نے سوچا کہ میں بھی دو جمع دو اور بائیں کر کے دیکھوں اور مجھے بھی اندازہ ہو کہ پیسوں کی دوڑ میں بھاگنے کا کیا نشہ ہوتا ہے، جو روز بروز بڑھتا ہی جاتا ہے، ورنہ ہم فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والے حساس سے لوگ ہیں، جن کی نیٹوں کا اندازہ لوگ ان کی ظاہری شخصیت اور حلیے سے لگاتے ہیں اور ان پر قول و فعل کے تضاد کا فتویٰ لگا دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم کم از کم انسانوں کو انسان تو سمجھتے ہیں ورنہ.....“

وہ استہزائیہ انداز میں اپنی دلی کیفیات کو پس پشت ڈال کر خود اعتمادی سے بولی اور مجھے ایک لمحے میں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ”کس“ کو سن رہی ہے۔

”واہ یہ کیا بات ہوئی؟“ فیصل نے متحیر ہو کر پوچھا ”بھئی کیا کہنا چاہتی ہو؟“  
”چھوڑیں۔“ وہ زبردستی ہنسی۔

اشعار کے پردے میں، ہم کن سے مخاطب ہیں وہ جان گئے ہوں گے، کیوں نام لیا جائے۔ میں جی بھر کر بد مزہ ہوا جبکہ فیصل اس کے انداز پر مسلسل ہنس رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ فیصل سے کافی چھوٹی تھی لیکن اس کا انداز گفتگو ہر چھوٹے بڑے کے ساتھ ایک جیسا

وہ تبھی ایک سہانی اور دلربا سی شام تھی جب انکل حیدر کے ہاں ہونے والے بزنس ڈنر کے بعد محفل موسیقی کا بھی اہتمام تھا اور میری ساری فیملی انوائٹڈ تھی جبکہ انکل حیدر کی دونوں شادی شدہ بیٹیاں اپنی آل اولاد اور شوہروں کے ہمراہ استقبال کے لیے کیلئے گیٹ پر موجود تھیں۔ انکل حیدر کے گھر کا وسیع و عریض خوبصورت لان رنگ رنگی برنگی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا اور دور سے دکنے پر ایسا لگتا جیسے ننھے ننھے کئی دیئے جلا کر منڈیروں پر رکھ دیئے گئے ہوں.....

میں اس گید رنگ میں اپنے ملے ملانے والے لوگوں میں بڑی تھا جب بلیو سیلیولس شرٹ اور چوڑی دار پاجامے میں غلاف توقع دوپٹہ گلے میں ڈالے کرل تنویر کے بیٹے کیپٹن طلحہ کے ساتھ کھڑی دشمہ کو میں نے دیکھا..... اور مجھے خاصی حیرت ہوئی۔

اور پورے فنکشن میں وہ مجھے الگ تھلگ اور بے زاری دکھائی دے رہی تھی اس کی سسرز شانزے اور علیزہ اسے بار بار گھسیٹ کر مختلف لوگوں سے ملوا رہی تھیں اور کھانے کے دوران جب میں سفیر کے ساتھ نسبتاً ایک الگ تھلگ کونے میں کھڑا تھا جب ارسل کی سسر شانزے نے اچانک وہاں چھاپہ مارا۔

”ریان! تم میری چھوٹی بہن دشمہ سے ملے ہو؟“ وہ بڑی دلچسپی سے مجھ سے پوچھ رہی تھی جبکہ وہ بے زاری سے سامنے لگی مہندی کی باڑھ پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔

”جی بھابی! ایک دو دفعہ ملاقات ہوئی ہے۔“ میں نے ارسل کے حوالے سے انہیں بھابی کہہ کر زبردستی مسکراتے ہوئے جواب دیا کیونکہ ارسل کی وجہ سے ان سے کافی ملنا جلتا رہتا تھا۔

”یہ بہت زبردست مصورہ ہے اور اس حوالے سے اس کا کام خاصا منفرد ہے اور تھیر کے حوالے سے بھی اس نے کچھ بہت اچھوتے آئیڈیاز شیچ پر پیش کئے ہیں۔“

وہ بڑے جوش و خروش سے بتا رہی تھیں اور میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ ان سارے بہن بھائیوں کو ان محترمہ کو سر پر چڑھانے کے علاوہ کوئی کام نہیں۔

”رہنے دیں شانزے! انہیں اس ٹاپک سے کوئی دلچسپی نہیں یہ ان سب چیزوں کو

خرافات گردانتے ہیں۔“

اس نے بھرپور طنز کیا جبکہ شانزے کی سخت حیران نظروں سے گھبرا کر میں کھیا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس موقع پر سفیر نے دوستی کا حق ادا کیا۔

”ارے نہیں نہیں دشمہ! ایسی تو کوئی بات نہیں۔ ریان اچھا خاصا ذوق رکھنے والا بندہ ہے ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی بمبئی میں ہم نے آپ کا ایک پلے دیکھا تھا ہے ناریان؟“ سفیر نے تائیدی نظروں سے میری طرف دیکھا اور میں نے فوراً گھبرا کر وضاحت کی۔

”جی ہاں اور پورا دیکھ کر ہی اٹھے تھے۔“ میرے طنزیہ لہجے پر سفیر نے بمشکل اپنی مسکراہٹ کا گلا گھونٹا کیونکہ اسے یاد آ گیا تھا کہ اس دن ہم درمیان میں ہی اٹھ آئے تھے اور واپسی پر میں نے سفیر کو خاصا کوسا بھی تھا۔

”کیا؟ بمبئی میں؟ وہ جو نیشنل سینٹر میں ہم نے پر فارم کیا تھا؟“ اس نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا اور اس کا چہرہ چیخ چیخ کر بتا رہا تھا کہ اسے ہماری بات کا یقین نہیں آیا۔

”جی ہاں وہی جس میں آپ نے کلاسیکل رقص کا بھی مظاہرہ کیا تھا۔“ سفیر نے اسے مزید یقین دلایا اور اسے آ بھی گیا۔ تب ہی اس نے مزید اس حوالے سے سوال جواب کرنے سے پرہیز کیا۔

شانزے اسے وہاں چھوڑ کر کسی اور سائیڈ پر نکل گئی تھی جبکہ وہ بھی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

”اور کیا ہو رہا ہے آج کل؟“ سفیر نے اسے کمپنی دینے کی کوشش کی۔

”کچھ خاص نہیں بس فیصل اور ارسل بھائی سے آج کل بزنس کے اسرار و رموز سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں لیکن مجھے لگتا ہے کہ یہ میرے بس کا کام نہیں اس لئے شاید لندن واپس چلی جاؤں۔“ وہ دھیمے لہجے میں گہرا سانس لے کر بولی تھی۔

”اور طبیعت کیسی رہتی ہے آج کل.....؟“ سفیر کے سوال پر۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اچھی خاصی ہنسی کی لگ رہی تھی بس آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے محسوس ہو رہے تھے۔

”اللہ کا شکر ہے وہ جس حال میں جیسا رکھے۔“ وہ زبردستی مسکرائی جبکہ اس کی اس انکساری پر مجھے خاصی ہنسی آئی سفیر کی سیل فون پر کال آ گئی تھی وہ ایک سیکیورڈ کر کے آگے بڑھ گیا اور اس کو کمپنی دینے کے خیال سے مجھے کوفت ہونے لگی.....

”آپ کو مجھ سے چڑکیوں ہے؟“ اس نے اچانک ہی یہ سوال پوچھ کر مجھے ہکا بکا کر دیا۔

”کیا مطلب؟“ میں گڑبڑا گیا مجھے ہرگز اس سوال کی توقع نہیں تھی۔

کھانے کے بعد محفل موسیقی کا اہتمام تھا اور کھانے سے فراغت کے بعد ماما اور پاپا کی تلاش میں میں نے نظریں دوڑائیں..... اور نسبتاً ایک سنان اور اندھیرے میں ڈوبے گوشے میں کھڑے فیصل کو دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی تھی جس کی پشت میری جانب تھی اور پاس سے گزرتے ہوئے فیصل کی سرگوشی میرے کانوں سے ٹکرائی اور اپنا نام سن کر میں فطری طور پر وہیں کھڑا رہ گیا اور پھر کافی دیر تک وہاں سے ہل ہی نہیں سکا۔

”یار! ڈونٹ وری۔ تم کیوں ٹینشن لے رہی ہو میں ڈیڈی سے بات کر چکا ہوں اور انہوں نے کہا ہے کہ وہ انکل افتخار سے پہلی فرصت میں بات کریں گے اور جہاں تک بات ریان کی ہے تو وہ ایک سینس ایبل بندہ ہے اور جب اسے معلوم ہوگا کہ ہم دونوں ایک دوسرے میں انٹرسٹڈ ہیں تو یقیناً اس کا دوٹ اپنے دوست سفیر کے پرنسپل کی بجائے میری جانب ہو جائے گا۔“

”لیکن فیصل! ریان بھائی کی سفیر کے ساتھ بہت گہری فرینڈشپ ہے اور ان کے پرنسپل پر رات انہوں نے پاپا کو خوب تسلی کروائی ہے اور ماما بھی خاصی ایکسائیٹڈ لگ رہی تھیں۔“ ماما کے ہیکے لہجے نے میرے پاؤں جکڑ لئے تھے۔

”اوہ مائی گاڈ! اتنی بے خبری! میرا سر چکرا گیا۔“

”ڈونٹ بی سلی ماہم! یہ رونا بند کرو میں خود ریان سے بات کر لوں گا اور مجھے معلوم ہے کہ وہ بات انڈر سٹینڈ کر لے گا وہ بہت سلجھا ہوا معاملہ فہم لڑکا ہے اور تم کوئی ٹل کلاس کی روٹی دھوئی لڑکی نہیں ہو جس کی رائے معلوم کئے بغیر اس کی زندگی کا فیصلہ کر دیا جائے گا اور پھر مجھ میں کیا کمی ہے؟“ وہ خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔

”اچھا خاصا ایجوکیٹڈ اور ڈیڈی کی جائیداد کا اکلوتا وارث ہوں اور جہاں تک میرا خیال ہے انکل افتخار اور ریان بھی میرے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں۔“ میں وہاں کھڑا سوچ رہا تھا کہ اس کا اندازہ بالکل درست تھا۔

اور پھر میں وہاں رکا نہیں اور اس وقت میں ماما کے پاس کھڑا تھا جب بلیک سوٹ میں انفرادی سرخ آنکھوں کے ساتھ ماما وہیں چلی آئی اور ماما کی نظر فوراً اس کی آنکھوں پر پڑی تھی اور اس سے پہلے اس نے دانستہ لاپرواہ لہجے میں وضاحت دی۔

”ماما! مجھے لگتا ہے یہ لیننز مجھے خاصا اری میٹ (نگ) کر رہے ہیں؟“

”ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ میں نے سنبھل کر وضاحت دی۔ میں لاکھ بولڈ سہی لیکن اپنے فادر کے بیٹ فرینڈ اور اپنے بزنس پارٹنر کی فیملی ممبر سے یہ بات ڈائریکٹ کرنے کا حوصلہ نہیں کر سکتا تھا۔

”اچھا؟“ وہ طنزیہ انداز میں ہنسی ”آپ کو تو جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا۔“

”ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ میں نے مزید جھوٹ بولا۔

”اچھا مجھے تو لگتا ہے کہ مجھے دیکھتے ہی ایک بیزاری اور کوفت کا احساس آپ کے چہرے سے ظاہر ہونے لگتا ہے اور یہ ناپسندیدگی آپ کی آنکھوں سے جھلکتی ہے اور لہجے سے ٹپکتی ہے۔“ وہ خاصی منہ پھٹ تھی اس کا اندازہ مجھے ابھی ابھی ہوا تھا۔

”میں بھلا ایسا کیوں کرنے لگا؟“ میں نے اس سے زیادہ خود کو تسلی دی اور وہ سوئمنگ

پول کی گرل سے ٹیک لگا کر آرام سے بولی۔

”شاید اس لئے کہ آپ کو جیسی لڑکیاں اچھی لگتی ہوں یا پھر آپ لڑکیوں کو جیسا دیکھنا

چاہتے ہوں میں اس مروجہ خاکے پر پورا نہیں اترتی۔“

”اوہ!“ میں نے گہرا سانس لیا اس نے بلکہ ٹھیک تجزیہ کیا تھا اور میں اس کے ٹھیک

ٹھاک اندازے پر دل ہی دل میں خاصا متاثر ہوا لیکن اسے قبول کرنے میں کافی مصلحتیں درپیش تھیں اس لئے میں نے ایک اور مصلحت کی چادر اس پر تانی اور سنجیدہ لہجے میں دریافت کیا۔

”حالانکہ اس سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے؟“ یہ سوال پوچھتے ہوئے میں نے خود کو ٹٹولا اور

ایک خوفناک انکشاف میرا منتظر تھا کہ اگر وشمہ حیدر ایسی ہے تو اس سے مجھے واقعی کچھ فرق پڑتا

ہے اور کیا؟ اور کیوں کے چکروں میں میں پڑنا نہیں چاہتا تھا ابھی۔

”یہ تو مجھے پتا نہیں لیکن آپ کے چہرے کے تاثرات جھوٹ نہیں بولتے اور کچھ لوگوں

کے چہرے ان کے سارے سیکرٹ آؤٹ کر دیتے ہیں جیسے آپ کا چہرہ اور آپ تو ویسے بھی

چیزوں کی ظاہری حالت سے ہی رائے قائم کر لینے کے عادی معلوم ہوتے ہیں اور آپ کے

ارد گرد کیا ہو رہا ہے؟ اور حقیقت کیا ہے؟ آپ ان چکروں میں نہیں پڑتے اور ایسی بے خبری

اچھی نہیں ہوتی، بعض دفعہ ناقابل تلافی نقصان ہو جاتے ہیں۔“ اپنی بات کہہ کر وہ رکی نہیں اور

سامنے کرل تنویر کے گروپ کی جانب بڑھ گئی۔

”ہاں تو بیٹا اتار دو نا یہ بے ہودہ فیشن نے تم لڑکیوں کی مت ماردی ہے اچھی خاصی آنکھوں کا ستیاناس ماردیا ہے۔“ ماما کے فکر مند لہجے پر میں کہتے کہتے رک گیا۔

کہ آج ماہم نے تو لینز لگائے ہی نہیں وہ کبھی کبھار شوقیہ بلیو لینز استعمال کرتی تھی۔ ماما کو اچانک مسز فرخ نظر آگئی تھیں وہ فوراً ان کی طرف بڑھ گئیں اور میں نے بہت غور سے سامنے کھڑی اپنے سے پانچ سال چھوٹی بہن کو دیکھا۔ جس کو آج تک میں بچوں کی طرح ہی ٹریٹ کرتا آیا تھا۔

”ماہم! ادھر دیکھو میری طرف۔“ میرے گہرے لہجے پر وہ گڑبڑا گئی۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑا..... جو خاصا ٹھنڈا ہو رہا تھا وہ بری طرح پزل تھی اور مجھے اس کی گھبراہٹ پر پیار آ رہا تھا۔

”کیا ہوا بھائی؟“ اس نے گڑبڑا کر پوچھا۔

”کچھ نہیں اور تسلی رکھو تمہاری پسند اور رائے کے بغیر کچھ نہیں ہوگا۔“ میں نے اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے اسے حوصلہ دیا۔

”جی! سخت حیرت سے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور مجھے ہنسی آگئی۔

”سفیر میرا بیسٹ فرینڈ سہی! لیکن مجھے اپنی اکلوتی اور معصوم سی بہن سے زیادہ عزیز نہیں۔“ میرے دو ٹوک انداز پر بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی اور اس کے چہرے پر پھیلنے والی خوشی اور حیرت کے رنگوں نے اسے خاصا دلکش بنا دیا تھا۔ کچھ فاصلے پر کھڑا فیصل لپک کر ہماری طرف آیا تھا۔

”بھئی یہ بہن بھائی میں کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں؟“ اس کے تجسس بھرے انداز پر میں نے ہنستے ہوئے ذومعنی لہجے میں کہا۔

”تم؟ ہم بہن بھائی پر نظر رکھ کر بیٹھے ہوئے تھے کیا؟“

”کیا مطلب؟“ وہ بوکھلا گیا! میں نے شرارتی نظروں سے اسے دیکھا جبکہ ماہم اب ریلیکس تھی اور بڑی خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ ہم دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

”مطلب و مطلب کا مجھے نہیں پتا جو کام کرنے ہیں انسانوں کی طرح ڈائریکٹ اور اسٹریٹ فارورڈ ہو کر کرو نہ میں اس بات کا لحاظ زیادہ دیر تک نہیں کروں گا کہ تم میرے کچھ پرائیویسی میں برنس پانر بھی ہو اور تمہارے بارے میں ہم جیسی رائے رکھتے ہیں اس سے تم

بجڑی آگاہ ہو۔ اس لئے اب کھل کر میدان میں اتر آؤ۔“ میرے دو ٹوک انداز پر فیصل پہلے تو کچھ گڑبڑایا اور پھر سنبھل کر بولا۔

”یار! تم ایسے کہہ رہے ہو جیسے کوئی میدان جنگ ہو۔“

میں نے گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے ذومعنی لہجے میں کہا۔ ”محبت کا میدان بھی کسی میدان جنگ سے کم نہیں ہوتا۔“

”اوہ!“ اسے ساری بات سمجھ میں آگئی تھی۔ تب ہی بڑے گہرے لہجے میں بولا۔

”اس میدان میں تمہاری ہمدردیاں کس پارٹی کی طرف ہوں گی! دونوں طرف ہی بجوم دوستاں ہے؟“ فیصل نے بھی اب کھل کر بات کرنے کی ٹھان لی تھی اور اس کے اس انداز پر میرے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”ایسے موقع پر میں دوستوں سے زیادہ اپنے بلڈ ریلیشن کو اہمیت دوں گا۔“ میں نے ماہم کی طرف دکھ کر صاف بات کی اور ان دونوں کے چہرے میری اس بات پر کھل اٹھے تھے۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم میرا ساتھ دو گے۔“ فیصل کا لہجہ خود بخود پر اعتماد ہو گیا۔ ”کسی خوش فہمی میں مت رہنا! اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔“ میں نے اسے چھیڑا تو وہ دل سے قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ میں سٹیج کی طرف آگیا جہاں نامور گلوکاروں کے درمیان وشمہ نے مائیک پکڑ لیا تھا اور باوجود اس سے چڑنے کے میں دل ہی دل میں یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا کہ اسے سراور لے پر خاصا عبور تھا۔

پروگرام کے دوران ہی فیصل اور ارسل کو پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر تیزی سے بھاگتے دیکھ کر میں نے حیرانی سے سوچا ”انہیں کیا ہوا؟“

”یار! انکل حیدر کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔“

سفیر جو اندر سے آیا تھا اس نے اطلاع دی حیرت ہے ابھی دو گھنٹے پہلے تو پاپا کے ساتھ خوب قہقہہ لگا رہے تھے۔“ مجھے یقین نہیں آیا۔

”بس یار! وہ وشمہ کی بہت ٹینشن لیتے ہیں اب بھی وہ انشاء جی کی غزل انشاء جی انشو اب کوچ کرو گا رہی تھی۔ انکل تو دل پکڑ کر بیٹھ گئے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے ناقابل فہم انداز سے اسے دیکھا۔

”تمہیں نہیں پتا؟“ وہ سخت حیران ہوا۔

”کیا؟“ میرا دل انہونی کے خیال سے دھڑکا۔

”یہی کہ وشمہ کو بلڈ کینسر ہے۔“ سفیر نے حیرت سے میری طرف دیکھا، مجھے تو ایک دم شاک لگا اور دل تو گویا کچھ لمحوں کیلئے دھڑکنا بھول گیا، میں نے سٹیج پر زندگی کی تلاش میں ہم موت کے کتنے پاس آگئے۔

گاتی وشمہ حیدر کو دیکھا..... میرے دل کو حقیقتا دھچکا لگا۔

”اوہ مائی گاڈ! واقعی مجھے نہیں پتا تھا۔“

”اوہ!“ سفیر نے تاسف بھرے انداز سے مجھے دیکھا۔

”وہ تو گزشتہ کئی سالوں سے اس مرض میں مبتلا ہے۔ اسی وجہ سے تو روز بروز کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ کچھ عرصے کے بعد اس کا سارا بلڈ چینج ہوتا ہے اور یہ نہ صرف مہنگا بلکہ خاصا اذیت ناک مرحلہ ہوتا ہے، لیکن وہ خاصی بہادر اور ہمت والی لڑکی ہے اور اسی بیماری کی وجہ سے سارے بہن بھائیوں کی لاڈلی اور خصوصاً انکل حیدر کی تو اس میں جان ہے۔“ سفیر تو آج صبح معنوں میں مجھے حیران کرنے پر تھلا ہوا تھا، وہ مزید گویا ہوا۔

”اور تمہیں پتا ہے کہ وشمہ کی مدد کی بھی اسی بیماری میں ڈیجھ ہوئی تھی۔“

”کیا؟“ مجھے دوبارہ دھچکا لگا۔

”ہاں حیدر انکل انہیں لے کر ساری دنیا میں گھومے، لیکن موت سے بچھا نہیں چھڑا سکے“

آنٹی بہت زندہ دل اور بہت خوبصورت خاتون تھیں۔

”تمہیں ان سب باتوں کا کیسے پتا چلا؟ حالانکہ تم بھی میرے ساتھ ہی گزشتہ کئی سالوں سے باہر ہو۔“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”بس یار! ہم اپنے ارد گرد کی خبر رکھتے ہیں، تمہاری طرح صرف اپنے ہی دائرے میں نہیں گھومتے۔“ سفیر نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

”بس یار! ہم اپنے ارد گرد کی خبر رکھتے ہیں، تمہاری طرح صرف اپنے ہی دائرے میں نہیں گھومتے۔“ سفیر نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

”اوہ مائی گاڈ! میرے لئے یہ سب کچھ بہت حیران کن ہے۔“ میں نے گہری سانس بھر

کے سٹیج پر موجود وشمہ کو غور سے دیکھا اور مجھے اتنے فاصلے پر بھی اس کے چہرے پر پھیلی زردی پہلی دفعہ دکھائی دی تھی اور اس کیلئے میرے دلی جذبات نے اپنا رنگ بدل دیا تھا۔



ماہم اور فیصل کی شادی آنا فانا طے ہو گئی تھی اور اس سلسلے میں میرا کئی دفعہ انکل حیدر کے گھر جانا ہوا، لیکن وہ مجھے کہیں بھی نظر نہیں آئی، حالانکہ میں دانستہ طور پر اس کی تلاش میں تھا لیکن وہ منظر عام سے بالکل ہی غائب ہو گئی تھی، حالانکہ جس دن دونوں کی ڈیٹ فائل کرنا تھی اس فنکشن میں بھی اس کی عدم شرکت سب کیلئے حیران کن تھی اور پھر مجھے ماہم نے بتایا کہ اس کی طبیعت کچھ بہتر نہیں۔ پتا نہیں کیوں اب میرا دل کرتا تھا کہ میں اس سے ملوں اور اس سے اپنے سابقہ رویے کی معذرت کروں.....

اس دن میں یونی فیصل کے آفس میں چلا آیا۔ وہ کچھ الجھا الجھا سا تھا، اس کا چہرہ ستا ہوا اور بے زار بے زار سا تھا، حالانکہ وہ خاصا زندہ دل بندہ تھا۔

”خیریت یار؟“ میں نے مختصر اُپوچھا۔

”بس یار!“ وہ زبردستی مسکرایا اور اسی وقت ارسل اندر داخل ہوا جب میں فیصل سے پوچھ رہا تھا۔

”کوئی پرابلم ہے تو تم مجھ سے شیئر کر سکتے ہو۔“ میرا لہجہ بدستور نرم مگر اصرار آمیز تھا۔

”چھوڑو یار! پرابلم تو زندگی کا حصہ ہیں، تم ارسل کے ساتھ بیٹھو مجھے وشمہ کو ہسپتال چیک

اپ کیلئے لے کر جانا ہے۔“ اور وہ جاتے جاتے پلٹا۔ ”ارسل! تم ریان کو اچھی سی چائے پلاؤ

اور کمپنی دو میں بس گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک آتا ہوں۔“

اس کے آفس سے نکلنے ہی میں نے دانستہ خوشگوار لہجے میں ارسل کو مخاطب کیا۔

”یہ تمہارے سائلے کو کیا ہوا؟“

”کیا؟ فیصل کو؟“ وہ چونکا تو میں نے شرارت سے کہا۔

”کیا فیصل کے علاوہ بھی تمہارا کوئی اور سالہا ہے؟“

”نہیں یار!“ وہ بے اختیار جھینپ گیا۔ ”بس وشمہ کی وجہ سے گھر میں ٹینشن پھیلی ہوئی

ہے جس کی وجہ سے وہ اپ سیٹ ہے۔ دوسرے وشمہ کی پچھلے پندرہ دن سے انکل حیدر سے

بات چیت بند ہے اور وہ ناراض ہو کر اسلام آباد چلی گئی تھی، کل ہی فیصل اسے منا کر لایا ہے

کہ شادی کا موقع ہے اور ہر بندہ اس کا پوچھے گا۔“

”کیا مطلب؟ وہ انکل سے کیوں خفا ہے؟“ مجھے سخت حیرت ہوئی۔

ارسل کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں، وہ قدرے خشک مگر بے زار لہجے میں گویا ہوا۔ ”ان



تھی۔ ”اودہ“ جنہیں نہیں معلوم؟“ ارسل چونکا تو میں نے نفی میں سر ہلا دیا، وہ تذبذب کا شکار ہو گیا۔

”ڈنٹ وری یار! میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔“ میرے تسلی دینے پر اس کے چہرے پر کچھ پرسکون تاثرات نمودار ہوئے۔

”اصل میں یار! اب تمہاری بھی دشمنی کی فیملی کے ساتھ رشتے داری بن رہی ہے فیصل کے حوالے سے“ وہ جھجک کر رکا۔

”یار! میں نے کہا نا کہ میں بچہ تھوڑی ہوں جو کوئی اتھقانہ حرکت کروں۔“ میں نے اسے مزید دلاسا دیا تو وہ کچھ مطمئن ہوا۔

”بس کوئی ایسی خاص بات تو نہیں ہے۔ دشمن اپنے کلاس فیلو معاذ میں انٹرسٹڈ تھی اور اسے اپنی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتی تھی اور معاذ ان کی فیکٹری میں کام کرنے والے معمولی سے ملازم کا بہت خوددار قسم کا بیٹا تھا اور انکل حیدر مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگانے کے سخت خلاف تھے۔ نتیجتاً ایک زبردست محاذ کے بعد دشمن کو ملک سے باہر بھجوا دیا گیا۔ وہ کافی عرصہ ناراض رہی اور احتجاجاً اس نے ہمیشہ وہی کام کیا جو انکل کو سخت ناپسند تھا اور پھر آنٹی کی ڈشہ کے بعد ہی وہ پہلی دفعہ پاکستان آئی..... اب اس میں مینچورٹی تو آگئی ہے لیکن انکل کے ساتھ اس کے نظریاتی اختلافات جوں کے توں باقی رہے، باوجود اس کے کہ وہ ان کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی ہے۔“

”اودہ!“ مجھے ساری بات سمجھ میں آگئی تھی، دشمن واقعی ایک حیران کن کردار تھی۔



باپ بیٹی کے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ انکل خالصتاً بزنس مائنڈڈ اور سیاسی ہتھکنڈوں سے صرف اپنے فائدے کیلئے سوچنے والے بندے اور وہ محترمہ انسانیت کی علمبردار جس کی وجہ سے ان دونوں کا نظریاتی اختلاف اکثر ہی رہتا ہے، پہلے تو آنٹی مفاہمت کروادیتی تھیں، اب بے چارے فیصل اور شانزے، علیزے کی جان عذاب میں آئی رہتی ہے۔ لیکن دشمن تو اپنے پوائنٹ آف ویو سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹتی اور اس کی بیماری کی وجہ سے انکل کو ہی کپڑا مار کرنا پڑتا ہے اور کبھی کبھی تو وہ بھی اڑ جاتے ہیں جیسے کہ آج کل اڑے ہوئے ہیں۔“

میں نے سوالیہ نظروں سے سخت بے زار ارسل کو دیکھا۔

”اصل میں یار! انکل کی شہر سے کچھ فاصلے پر کروڑوں کی زمین ہے اور آبادی بڑھنے کی وجہ سے وہ زمین بھی شہر کا حصہ بن گئی ہے اور اس ویران زمین پر خانہ بدوشوں نے اپنی جھونپڑیاں بنا رکھی تھیں۔ اب جبکہ انکل نے اس زمین پر ایک ہاؤسنگ سکیم شروع کروانے کے ارادے سے ان خانہ بدوشوں کو زمین خالی کرنے کا آرڈر دیا تو وہ لوگ اکٹھے ہو کر انکل حیدر کے گھر آ گئے۔ جہاں خوش قسمتی سے ان کی ملاقات دشمن سے ہو گئی اور انکل کی یہ بد قسمتی کہ اب دشمن کا یہ اصرار ہے کہ اس زمین کی ملکیت کے حقوق ان غریبوں کو دے دیئے جائیں۔ لیکن انکل انسانیت اور ثواب کے چکروں میں اپنی کروڑوں کی مالیت کی زمین ہرگز گنوانے پر راضی نہیں۔ اس مسئلے کی وجہ سے باپ، بیٹی میں اکثر بحث رہتی تھی، جس کا انجام دشمن کی ناراضی اور گھر سے داک آؤٹ پر ہوا۔“ ارسل نہ جانے آج کس موڈ میں تھا جو انتہائی گھریلو مسئلہ مجھ سے شیر کر گیا۔

”یہ سب کچھ ٹھیک سہی، لیکن میں انکل کے موقف کے ساتھ ہوں، اس قدر قیمتی جگہ مفت میں دینا ہرگز دانش مندی نہیں۔“ میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”اودہ میرے یار! ہم سب ہی اس مدرٹریا کو یہی سمجھا رہے ہیں لیکن اس کے دماغ کے خانے میں یہ بات نہیں آرہی۔ رات شانزے کی بھی اس کے ساتھ جھڑپ ہوئی ہے اور میں نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ معاذ سے شادی نہ ہونے کی وجہ سے وہ سارے گھر والوں کو بہانے بہانے سے ٹارچہ کرتی ہے اور کوئی بات نہیں۔“

”معاذ؟“ مجھے ایک اور دھچکا لگا۔ ”یہ کون محترم ہیں؟“ مجھے وہ لڑکی ہر لمحہ حیران کر رہی

اور بڑی گہری نظروں سے میری طرف دیکھا اور اگلے ہی لمحے اس کی بات نے مجھے ہکا بکا کر دیا۔

”کیا ہوا؟ کسی نے آپ کو میری پیاری کے بارے میں بتا دیا ہے جو اتنا میری ہمدردی کا بخار چڑھا ہوا ہے، ورنہ میں تو وہی دشمہ ہوں جس کو دیکھتے ہی آپ کے ماتھے پر بل پڑ جاتے تھے۔“

”کون سی بیماری؟“ میں نے فوراً سنبھل کر دانستہ لاپرواہ لہجے میں پوچھا اور اس کے حلق سے نکلے قہقہے نے مجھے اچھی خاصی خفت میں مبتلا کر دیا۔

”مسٹر ریان علی! میں پہلے ہی آپ سے کہہ چکی ہوں کہ جھوٹ آپ پر سوٹ نہیں کرتا۔“ اور جو حرکتیں آپ کرتی ہیں، وہ بھی آپ پر سوٹ نہیں کرتیں۔“ میں نے گلہ آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔

وہ بے ساختہ ہنس پڑی اور بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

”مثلاً کون سی حرکتیں؟“

”یہی لندن کی سڑکوں پر مار کٹائی، سٹیڈیم میں خواجواہ اودھم مچانا اور فضول قسم کے تھیٹر میں ڈرامے کرنا وغیرہ وغیرہ۔“ میں نے سنجیدگی سے اس کے کارناموں پر روشنی ڈالی، وہ بری طرح چونکی اور کچھ لمحوں تک ہکا بکا کیفیت میں مجھے دیکھتی رہی اور پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

”تم نے مجھے کہاں لندن کی سڑکوں پر مار کٹائی کرتے دیکھ لیا؟“

”بہت اچھی طرح دیکھا تھا جن کی ایسی کی تیسری پھیر کر تم نے پنجابی میں سرعام انہیں گالیاں بھی دی تھیں۔“

میں نے خود پر قابو پا کر ہلکی مسکراہٹ سے اسے دیکھا جو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھ رہی تھی۔

”اودھ مائی گاڈ! تم وہاں کہاں تھے؟“ اس کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔

”تم سے کچھ فاصلے پر براہ راست میں نے یہ شوق دیکھا تھا۔“ میرے لہجے میں طنز تھا۔

”پھر تم میری مدد کیلئے کیوں نہیں آئے؟“ اس کی بات پر میں نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کیا۔

”مجھے اپنی ٹانگیں تڑوانے کا کوئی شوق نہیں تھا، تمہارا کیا بھروسہ ان کا ساتھی سمجھ کر

فیصل اور ماہم کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے تھے اور تب ہی مجھے پتا چلا کہ انکل نے دشمہ کی بات مان کر ان خانہ بدوشوں کو ایک متبادل جگہ دے دی ہے جس کی وجہ سے اس کے اپنے باپ کے ساتھ تعلقات خاصے بہتر ہو گئے تھے اس دن ماہم اور فیصل کے مایوں کا فنکشن مشترکہ طور پر ہمارے لان میں اریخ تھا، جب زرد کلر کے شلوار سوٹ میں لائٹ سائیک اپ کئے وہ خاصی تھکی تھکی گھر میں لگے فوارے کی سیڑھیوں پر بیٹھی سٹیج پر ہونے والے ہنگامے کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی اور میں خاموشی سے دبے پاؤں اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے چونک کر بہت حیرانی سے میری طرف دیکھا۔

”کیسی ہو؟“ میں نے بڑے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

وہ مسکرائی..... اور تھوڑا ٹھہر کر بولی۔

”اس نے پوچھا کہ کیسے ہو

اس خوشی کا حساب کیسے ہو؟“

میں نے اس کی آنکھوں میں چمکتے جگنوؤں سے بمشکل نظر چرائی۔ ”خیریت ہے آج بہت خوش دکھائی دے رہی ہو؟“

”ظاہر ہے کہ بڑے بڑے لوگ ہمارا حال احوال پوچھ رہے ہیں، خوشی سے مر جانے کو دل کر رہا ہے۔“ اس کے لہجے میں شرارت کے رنگ نمایاں تھے۔ میں آرام سے اس کے پاس سیڑھیوں پر ہی بیٹھ گیا تھا۔ اس نے بہت حیرت سے میری اس حرکت کو دیکھا لیکن خاموش رہی۔

”اور طبیعت کیسی ہے؟“

”بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں، مجھے کیا ہونا ہے؟“ اس نے فوراً نظریں چرائیں اور پھر چونکی

میرے بھی ہاتھ پیر توڑ دیتیں۔“

اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور کھکھلا کر ہنس پڑی۔ ”ایسا پاگل سمجھ رکھا ہے مجھے؟ اور ویسے جن کا ذکر تم کر رہے ہو وہ مجھے کافی دنوں سے ڈسٹرب کر رہے تھے اور اس دن ان کو دیکھ کر میرے ہاتھ پیروں میں کھلبلی شروع ہوگئی اور اس پھینٹی کے بعد دوبارہ انہوں نے میرے پیچھے آنے کی جرأت نہیں کی۔“ اس نے بڑے خوشگوار لہجے میں وضاحت دی۔

”اور وہ جو انگلینڈ کے ٹیسٹ میچ میں تم خواخواہ ہر فضول شاٹ پر شور مچا کر داد دے رہی تھیں اس وقت دنیا کی اہم ترین خاتون لگ رہی تھیں۔“ میں نے مزید دل کی بھڑاس نکالی۔

وہ ایک دفعہ پھر کھکھلا کر ہنسی۔ ”توبہ ہے تم کہاں کہاں میری جاسوسی کرتے رہے ہو بھی اس دن وہاں ٹیم کا ہر بندہ تھکا تھکا سا لگ رہا تھا اگر میں نے ان کی حوصلہ افزائی کر دی تو میرا کیا گیا“ ان لوگوں کو مزید کھیلنے کیلئے تو اتنا ہی مل گئی۔“

”اچھا؟“ میں نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا اور بھنا کر کہا۔ ”اور وہ جو ٹیکسلا میں کسی اسپینش کے گلے کا ہار بن کر تم ایک ایک چیز کی باریکیاں اور معلومات اس منحوس کو دے رہی تھیں؟“

وہ اس دفعہ بالکل نہیں چونکی اور دانت نکالتے ہوئے بولی۔ ”وہ تو میرا بہت اچھا دوست میکال تھا اور اس کے ساتھ اس کی فرینڈ ڈی سوزا بھی ان دنوں پاکستان آئی ہوئی تھی اور اس دن ڈی سوزا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لئے میں اور میکال اکیلے ہی چلے آئے اب تو ان دونوں کی شادی ہوگئی اور آج کل وہ دونوں چین چھوڑ کر انگلینڈ ہی شفٹ ہو گئے ہیں۔“ وہ کچھ لمحوں کے توقف کے بعد بولی۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تم مجھے کافی عرصے سے

جاننے ہو؟“

”ہاں اپنی اوٹ پٹانگ حرکتوں کی وجہ سے تم میرے ذہن میں رہ گئیں، لیکن جب مجھے ذرہ برابر بھی اندازہ نہیں تھا کہ تم انکل حیدر کی بیٹی ہو۔“

میں نے صاف گوئی سے جواب دیا تو وہ ایک دفعہ پھر ہنس پڑی۔

”اب تمہاری میرے بارے میں کیا رائے ہے؟“

میرے چہرے پر اس کے سوال سے مسکراہٹ دوڑ گئی اور میں نے صاف گوئی سے کہا۔

”تمہاری حرکتیں بظاہر فضول اور احمقانہ لگتی ہیں، لیکن ہوتی نہیں ہیں، بنیادی طور پر تم

ایک بہت اچھی لیکن حساس لڑکی ہو۔“

”شیور؟“ اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔

”وائے ناٹ!“ میں نے پر اعتماد انداز سے جواب دیا تو اس کے چہرے پر بڑے دلکش

رنگ پھیل گئے وہ بہت کھل کے مسکرائی۔

”لیکن تم ڈرینگ بہت فضول کرتی ہو۔“ مجھے اچانک یاد آیا۔

”ہاں میں اس کے معاملے میں بہت لاپرواہ ہوں۔“ اس نے اعتراف کیا۔

”حالانکہ لڑکیوں کو اس معاملے میں بہت کنشس ہونا چاہئے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ اس کے فوراً اتفاق کرنے پر مجھے سخت حیرت ہوئی۔



مہندی والے دن رسٹ اور نچ کلر میں اس کی جگہ دیکھنے کے قابل تھی وہ آج خوب دل لگا کر تیار ہوئی تھی اور بہت عرصے بعد میں نے اسے ایک مقبول حلیے میں دیکھا تھا، دونوں بازوؤں میں سوٹ کے ہم رنگ بھر بھر کے چوڑیاں پہنے بہت نازک جیولری کے سیٹ میں خوبصورت سی بندیا لگائے وہ ایک نظر دیکھنے میں ہی بہت دلکش لگ رہی تھی اور آج تو ماما اور ماہم نے بھی خصوصاً اس کی تعریف کی تھی۔

اور پھر ڈھولک بجاتے، گانے گاتی اور لڈی ڈالتے ہوئے وہ میری نگاہوں کا مرکز بنی رہی۔ رات گئے جب کھانا شارٹ ہوا تو وہ نہ جانے کب میرے ساتھ والی خالی چیئر پر آ کر بیٹھ گئی۔

”تم نے کیا آج مجھے گھور گھور کر دیکھنے کا ٹھیک لیا ہوا تھا؟“ میرے لئے پلیٹ میں چادل نکالتے ہوئے اس کے شکوے پر مجھے ہنسی آ گئی۔

”تمہیں کوئی اعتراض ہے تو بتاؤ؟“ میں نے پلیٹ پکڑتے ہوئے گہرے لہجے میں کہا۔

”بھئی آپ کے گھر میں آئے ہوئے ہیں، کیا کہہ سکتے ہیں۔“ اس نے انکساری دکھائی۔

”اگر آپ کو برا لگ رہا ہے تو بتا دیں۔ ہم کسی اور کو دیکھ لیتے ہیں۔“ میرے شرارتی لہجے پر وہ مسکرائی اور بڑے شاہانہ لہجے میں کہا۔

”ہم سا ہو تو سامنے آئے۔“

”یہ تو آج آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ میں نے تو صغی لہجے میں تائید کی۔

”وشمہ! اب زندگی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“

”کیا مطلب؟“ وہ چونکی۔

”میرا مطلب ہے کہ نیکسٹ پلاننگ کیا ہے فیوچر کے بارے میں؟“

اس کے چہرے پر ایک تاریک سا سایہ دوڑ گیا۔ ”ارے ہمیں تو پل کی خبر نہیں، کب عمر کے خیے اکھڑ جائیں، آپ کون سے فیوچر کی بات کر رہے ہیں؟“

اس کی بات پر ایک لمحے کو تو میں خود بھی لا جواب ہو گیا، لیکن پھر خود کو سنبھالا۔

”بھئی کوئی اپنی عمر لکھوا کر تھوڑی آتا ہے، کسی کو بھی اپنے اگلے پل کی خبر نہیں، لیکن

انسان کچھ نہ کچھ تو اپنے بارے میں سوچتا ہے نا۔“ میں نے اسے اکسایا۔

”میں نے تو بہت عرصہ ہوا اپنے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا، یوں لگتا ہے کہ خواہشوں

کے سارے پرندے اڑ چکے ہیں بس اب ہر طرف اداسی، تنہائی اور ویرانی ہے۔ اب تو دیے

ہی عمر کے نقشے میں رنگ بھرتا ہے۔“ وہ بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں بول رہی تھی۔

”یہ زندگی گزارنے کیلئے مثبت طرز عمل تو نہیں۔“ میں نے اسے سمجھانے کیلئے کہا۔

”زندگی صرف سانسوں کے تسلسل کے ساتھ چلنے کا نام نہیں، بعض اوقات ہم بہت خوش

باش ظاہر زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں لیکن ہمارا دل مر چکا ہوتا ہے اور پھر کوئی واقعہ کوئی چیز

ہمیں وقتی طور پر چونکاتی ضرور ہے لیکن زیادہ اثر انداز نہیں ہوتی اور بس ایسے ہی زندگی گزرتی

جاتی ہے۔“

”ایک بات پوچھوں وشمہ! اگر آپ مائنڈ نہ کریں۔“

میں تھوڑا سا جھجکا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“

”کیا زندگی میں کبھی آپ کو کوئی اچھا نہیں لگا؟ آئی مین لائف پارٹنر کے حوالے سے؟“

وہ جیسے زبردستی مسکرائی اور گہرا سانس بھر کر بولی۔ ”لگا تھا معاذ نام تھا اس کا۔“ دل کی

بات وہ اتنی آسانی سے بتا دے گی مجھے گمان تک نہیں تھا۔

”پھر.....؟“ میں سنبھل کر گویا ہوا۔

”پھر وہی ہوا جو بے پناہ طبقاتی تضاد رکھنے والے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔“ اس نے

معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ وہ انشاف کیا جو میں پہلے ہی سے جانتا تھا۔

وہ بڑے پراسرار انداز میں مسکرا کر بولی۔ ”پتا ہے ریان تمہارا سٹار ڈیٹ آف برتھ

عادات، زندگی کو گزارنے کے سارے انداز اس سے بہت ملتے جلتے ہیں، جب میں نے پہلی

دفنہ تمہیں تمہارے گھر میں غور سے دیکھا تو میرے دل کی ایک بیٹ مٹ ہوئی تھی۔“

اب کے چونکنے کی باری میری تھی۔

”اور میرے لئے ہر چیز بہت شاکنگ اور حیران کن تھی، تمہاری اور معاذ کے درمیان

اتنی زیادہ مماثلت میرے لئے بہت زیادہ حیرانی کا باعث ہے۔ حتیٰ کہ تم دونوں کی ڈیٹ آف

برتھ بھی ایک ہی ہے، اس کی تھوڑی پر بھی تل تھا، وہ بھی بہت سنجیدہ مزاج اور لڑکیوں سے

البرج تھا، لیکن جب میں اس کی لائف میں آئی تو میرے لئے تو یہی بات قابل فخر تھی کہ میں

اس کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی ہوں، وہ بہت ذہین، محنتی اور خوددار لڑکا تھا۔ زندگی کے

بارے میں اس کے نظریات بہت پختہ تھے۔ وہ بہت زبردست ڈبیر تھا اور ہمیشہ ٹاپ کرتا

تھا۔“

”پھر انکل کیوں نہیں مانے؟“

”کمال کرتے ہیں ریان آپ۔“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ ”ہماری کلاس میں ایسا

کہاں ہوتا ہے، ہم لوگ کسی بھی شخص سے ملنے سے پہلے اس کا بینک بیلنس اور اس کا اسٹیٹس

دیکھتے ہیں۔ ہماری کلاس کے اکثر لوگوں کو انسانیت کے معنی تک معلوم نہیں۔ آپ خود سوچیں،

اگر ماہم کی پسند فیصل کے بجائے کوئی لوئر مل کلاس کا لڑکا ہوتا تو کیا آپ اس کی شادی وہاں

کر دیتے۔“ اس نے تلخ لہجے میں مجھے آئینہ دکھا کر لا جواب کر دیا۔

میں بالکل خاموش ہو گیا۔

”پاپا نے مجھے زبردستی انگلینڈ بھجوا دیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ وقتی جذباتیت ہے اور وقت

گزرنے کے ساتھ ساتھ خود ہی ختم ہو جائے گی لیکن ہر گزرتے دن نے اس جذبے کو مزید

مضبوط ہی کیا ہے۔

میں آج بھی وہیں کھڑی ہوں جہاں آج سے چھ سال پہلے کھڑی تھی۔ اب مزید اذیت

برداشت نہیں کر سکتی۔“ وہ بے بسی سے مسکرائی۔

”تم انکل کو معاذ کیلئے کنوئیں کیوں نہیں کرتیں۔“ میں نے اس سے پوچھا۔

”بھئی تم ان کو سمجھاؤ کہ وہ ایک اچھا اور خوددار لڑکا ہے۔“

”لیکن اب کوئی فائدہ نہیں۔“ وہ اضطرابی کیفیت میں ہونٹ چبانے لگی۔

”کیوں؟ کیا اس نے شادی کر لی ہے؟“ میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس کا لہجہ سپاٹ اور بے تاثر تھا۔

”کیا اب وہ تم سے ناراض یا خفا ہے؟“

”نہیں۔“

”کیا اب اس کے والدین کا ارادہ بدل گیا ہے؟“ میں نے مزید کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”کیا اب تمہارے خیالات بدل گئے ہیں؟“ مجھے غصہ آنے لگا۔

”نہیں ایسی بھی کوئی بات نہیں۔“ وشمہ کا چہرہ یلکھت دھواں دھواں ہو گیا۔

”اب تو پاپا بھی بہت پچھتاتے ہیں۔“ اس نے مزید انکشاف کیا۔

”پھر آخر مسئلہ کیا ہے؟“ میں نے گہری نظروں سے اس کا چہرہ ٹٹولا۔

وشمہ نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا، اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ نچلا ہونٹ

دانتوں میں دباتے ہوئے اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ اس کا چہرہ ضبط سے سرخ پڑ

گیا، کسی انہونی کے احساس نے میرے دل کا احاطہ کیا۔

”اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا، کیونکہ آج سے چار سال پہلے معاذ کی نروس بریک ڈاؤن

کے نتیجے میں ڈنچہ ہو گئی تھی۔“

”کیا.....!“ میں ساکت رہ گیا۔

”اوہ آئی ایم سوری!“ تھوڑی دیر بعد میں نے تاسف بھری نظروں سے اس کی طرف

دیکھا، جس کے چہرے پر بے چینی، دکھ اور شکستگی مترشح تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں اب

شاید کبھی بھی اس کے سامنے نہیں بول سکوں گا۔

”انسان سوچتا کچھ ہے، چاہتا کچھ ہے، لیکن ضروری نہیں ہے کہ قدرت کا ہر کام انسانوں

کی مرضی اور خواہش کے مطابق ہی ہو۔“ وہ بہت دھیمے لہجے میں بولی، میں صرف سر ہلا کر رہ

گیا.....



فیصل اور ماہم کی شادی کے فنکشن خاصے دھوم دھام سے ٹھیک ٹھاک انداز سے ہو گئے

تھے اور باقی فنکشنز میں وہ مجھ سے بہت نازل انداز میں ملے تھے، جسے ہمارے درمیان اس ٹاپک

پر کبھی کوئی بات نہ ہوئی ہو۔ لیکن میری زندگی کا ضابطہ تبدیل ہو گیا تھا، میں جب کبھی تنہا ہوتا، دو

بیمچی ہوئی آنکھیں میرے وجود کا احاطہ کر لیتیں اور ٹھیک ایک ماہ کے بعد یہ خوفناک انکشاف

مجھ پر ہوا کہ وہ میری رگ رگ میں سا چکی ہے اور میں ریان علی جسے وشمہ حیدر سے نفرت اور

پڑتھی، مجھے علم ہی نہیں ہوا کہ میری بے زاری نے کب محبت کی وادی میں قدم رکھ دیا۔ میں

اپنے ہی دل کے ہاتھوں بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ میں ہر تیسرے دن ماہم سے ملنے اس کے گھر

پہنچ جاتا، لیکن اب اس نے مجھ سے بھاگنا شروع کر دیا تھا اور ایک دن تو اس نے مجھے صاف

صاف کہہ دیا تھا۔

”ایک ایسے سفر کا آغاز ہی نہ کرو تو بہتر ہے جس کے راستے کٹھن اور منزل کوئی نہ ہو۔“

”یہ انسان کے اپنے اختیار میں تھوڑی ہوتا ہے۔“ میں نے بے بسی سے جواب دیا اور

وہ مجھے دیکھ کر رہ گئی۔

ایک بے چینی نے میرے وجود کا احاطہ کر لیا تھا، ایک چہین تھی جو ہر وقت میرے دل

میں ہوتی رہتی، محبت نے بہت کڑا وار کیا تھا مجھ پر، اب مجھے احساس ہوا تھا کہ وہ تو بہت پہلے

ہی سے میرے اندر تھی، تب ہی اس کی حرکتوں پر مجھے غصہ آتا تھا، لیکن اس چیز کا ادراک مجھے

بہت دیر بعد ہوا تھا۔



اس دن میرے منبر کے والد کی ڈنچہ پر مجھے اچانک جنازے میں جانا پڑا اور میت دفن

کرنے کے بعد فاتحہ خوانی کر کے میں شہر خوشاں سے بوچھل دل کے ساتھ واپس آ رہا تھا جب

قبرستان کی دائیں دیوار کے ساتھ پتیل کے درخت کے نیچے بنی ہوئی قبر کے پاس کھڑی لڑکی

پر مجھے وشمہ کا گمان ہوا، میں اوپر سے چکر کاٹ کر سامنے سے آیا۔

بلیک کلر کے ٹکجے سے سوٹ میں بلیک کلر کی شال اوڑھنے، سرخ آنکھیں اور چہرے پر

افسردگی کی گہری تہ کے ساتھ وہ بلاشبہ وشمہ حیدر ہی تھی، آنسو ایک لڑی کی صورت میں اس کی

آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

خود کو بہت ریلیکس محسوس کرو گی۔“ میں نے خلوص دل سے مشورہ دیا تو وہ سر ہلا کر رہ گئی۔  
اس دن ماہم گھر آئی تو خاصی پریشان تھی۔ اسی سے معلوم ہوا کہ دشمہ کی طبیعت خاصی  
مجزبوتی جا رہی ہے اور وہ اور فیصل اسے لے کر تفصیلی چیک اپ کیلئے انگلینڈ جا رہے تھے.....  
میں فوراً اس سے ملنے کیلئے گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ سو رہی ہے اگلے دن گیا تو معلوم ہوا کہ  
وہ باہر گئی ہوئی ہے۔

دو دن کے بعد اطلاع آئی کہ وہ شانزے اور ارسل کے ساتھ عمرہ کرنے چلی گئی ہے۔ میں  
نے اس سے رابطہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن میری آواز سنتے ہی وہ کال کاٹ دیتی تھی.....  
اور پھر آخری دفعہ اس کی مجھے مدینہ سے کال آئی۔

”میں خود کو بہت ریلیکس محسوس کر رہی ہوں، اتنا کہ مجھے اب افسوس ہونے لگا ہے کہ  
جتنا وقت میں نے ”یوگا“ سیکھنے میں لگایا، اگر میں اللہ سے رجوع کرتی تو اب تک بہت پرسکون  
ہو چکی ہوتی۔“ اس کی آواز میں گہری طمانیت محسوس کر کے میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔  
”ریان! اپنی زندگی کے بارے میں کچھ بہتر سوچو، محبت بعض لوگوں کو اذیت کے سوا کچھ  
نہیں دیتی، تم چاہو تو ابھی کچھ نہیں بگڑا، فوراً شادی کر لو۔“ اس کے مشورے پر مجھے ہنسی آ گئی۔  
”تو ٹھیک ہے تم واپس آ جاؤ، ہم شادی کر لیتے ہیں۔“ میں نے اسے چھیڑا تو وہ ایک دم  
خاموش ہو گئی۔

”مجھ سے شادی تمہیں دکھ اور کسک کے سوا کچھ نہیں دے گی، کیا تمہیں اچھا لگے گا کہ  
میں ساری زندگی تمہارے اندر کسی اور کی پرچھائیاں تلاش کرتی رہوں۔ یہ بہت بد دینا بنی ہوگی،  
جو کم از کم میں تمہارے ساتھ نہیں کر سکتی۔ یقین کرو اس معاملے میں، میرا دل بے بس ہے۔“  
اس کے لہجے میں گہرے دکھ کی کاٹ تھی، جس نے میرے وجود کو چیر کر رکھ دیا تھا۔

اور پھر شانزے اور ارسل تو پاکستان آ گئے اور معلوم ہوا کہ وہ وہیں سے انگلینڈ چلی گئی  
ہے۔ وہ مجھ سے بھاگ رہی ہے اس کا مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا..... اور اس دن میں نے  
اسے میل کی کہ ”میں اگلے مہینے انگلینڈ آ رہا ہوں۔ اس لئے تم کہیں اور چلی جاؤ۔“

اور وہ اکتوبر کی ایک اداس کر دینے والی شام تھی..... فضا میں عجیب سا دکھ بلکورے کھا رہا  
تھا اور بے چینی نے میرے وجود کا احاطہ کر رکھا تھا اور اسی دن فیصل کا فون آیا کہ ”دشمہ چلی  
گئی۔“

”دشمہ!“ میرے تاسف بھرے لہجے پر اس نے چونک کر بے ساختہ اپنی آنکھیں بے  
دردی سے صاف کی تھیں اور الجھن بھری نظروں سے مجھے دیکھا جبکہ میں قبر پر لگے کتبے کے  
اد پر لکھے نام معاذ ابن سلیمان کی قسمت پر رشک کر رہا تھا۔ وہ شخص جو اس قبر کے اندر اس باہر  
کی دنیا سے بالکل بے نیاز تھا اور اسے خبر تک نہیں تھی کہ کوئی گزشتہ کئی سالوں سے اپنے زندگی  
کے ہر لمحے کو اس کے نام کر چکا ہے۔

”دشمہ! چلو گھر چلیں۔“ میں نے آہستگی سے اس کا بازو پکڑا اور اس نے بھی کوئی  
مزاحمت نہیں کی۔ قبرستان سے باہر اس کا ڈرائیور گاڑی میں موجود تھا، میں نے اسے گھر جانے  
کا کہا اور دشمنہ کو اپنی گاڑی میں بٹھایا، وہ بالکل گم صم سی تھی۔

”دشمہ!“ میں نے اسے پکارا۔

”سوری!“ اس نے اپنی آنکھیں ٹٹو سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”اصل میں آج  
معاذ کی برسی تھی۔ میں صبح اس کے گھر بھی گئی تھی۔ اس کی ماں کی طبیعت خاصی خراب تھی، جس  
کی وجہ سے میں خود بھی اپ سیٹ ہو گئی۔“

”تمہیں پتا ہے کہ جو لوگ تمہارے ارد گرد ہیں اور زندہ ہیں، ان کو تمہاری کتنی ضرورت  
ہے۔“ میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔

”پتا نہیں کیوں ریان! مجھے اپنے ارد گرد اپنے سے وابستہ لوگوں میں کوئی دلچسپی دکھائی  
نہیں دیتی۔ پاپا کو دیکھتے ہی مجھے احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے میری زندگی کی سب سے بڑی  
خوشی مجھ سے چھینی تھی۔ میرے انگلینڈ جانے پر معاذ بہت ڈسٹرب ہوا تھا۔ وہ سمجھنے لگا تھا کہ  
رشتے ناطوں سے زیادہ میں دولت کو اہمیت دیتی ہوں، میں نے کئی دفعہ واپس آنے کی کوشش  
کی لیکن پاپا نے اس معاملے میں اپنا دل سخت کر لیا تھا اور جب اس کی ڈیجھ ہوئی تو مجھے  
پورے ایک ہفتے کے بعد پتا چلا اور اس کی ڈیجھ کے بعد میں نے پاپا کو خاصا ریلیکس دیکھا۔  
لیکن انہیں شاید اندازہ نہیں تھا کہ انہوں نے بہت نقصان کا سودا کیا ہے..... میں ساری دنیا  
گھومی ہوں، یوگا، رقص، ہر چیز سیکھی کہ شاید کہیں سے مجھے سکون مل جائے، مگر بے چینی ہے کہ  
بڑھتی جا رہی ہے۔“ دشمنہ نے خاصی بے بسی سے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا اور میں نے خود کو اس  
سے زیادہ بے بس محسوس کیا۔

”دشمہ! نماز پڑھا کرو اور ہو سکے تو عمرہ کراؤ اور اللہ سے سکون کی دعا مانگو، یقین کرو تم

میں ایک دم سائے میں آ گیا.....  
مجھے یوں لگا کہ جیسے میرا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا ہو۔  
میں اور فیصل اس کی ڈیڈ باڈی لینے گئے تو اس کا چہرہ خاصا پرسکون تھا، وہ مسکرا رہی تھی  
اور مجھے یوں لگا کہ جیسے مجھ سے کہہ رہی ہو۔  
”دیکھا تم نے کہا تھا نا کہ میں آ رہا ہوں اس لئے تم کہیں اور چلی جاؤ“ میں نے تمہاری  
بات مان لی۔“



آج وشمہ کی ڈیڈ تھ کو پورے دس سال ہو چکے ہیں۔ وہ ٹھیک کہتی تھی کہ کچھ لوگوں کی  
قسمت میں محبت صرف اور صرف اذیت اور دکھ ہی لگھتی ہے اور وشمہ کے ساتھ ساتھ میرا شمار  
بھی شاید ان ہی لوگوں میں ہوتا ہے۔

وہ بہت حساس اور بہت خاص لڑکی تھی اور ”خاص“ لوگوں کے ساتھ زمانہ کچھ اچھا  
سلوک نہیں کرتا۔ اس نے اپنے اکاؤنٹ میں موجود تمام رقم ایک مدرسے کو ڈونٹ کر دی تھی  
اس کے حصے کی پراپرٹی سے فیصل نے ایک ٹرسٹ قائم کر دیا تھا..... یہ ساری باتیں یہ ساری  
چیزیں یقیناً اس کیلئے سکون کا باعث بنتی ہوں گی۔

لیکن میں دس سال گزرنے کے باوجود آج بھی وہیں ہوں۔ ماہم امی اور پاپا سب مجھ  
سے اصرار کر کے تھک گئے ہیں کہ میں اپنی زندگی کے سفر میں کسی اور کو شامل کر لوں، لیکن  
اس معاملے میں میرا دل خود میرے آگے ڈٹ جاتا ہے..... اور وہ کسی کی نہیں سنتا، جوں جوں  
وقت گزرتا جا رہا ہے میری محبت بھی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جا رہی ہے..... اور کبھی کبھی میں  
سوچتا ہوں کہ لوگ کہتے ہیں کہ ایک محبت کے بعد ہی دوسری محبت ہو جاتی ہے اور میرا دل کرتا  
ہے کہ میں چیخ چیخ کر دنیا کو بتاؤں کہ ایسا نہیں ہوتا، ہم پہلے شخص کی پرچھائیاں دوسرے میں  
ڈھونڈتے رہتے ہیں۔

اور میں کم از کم اپنی محبت کے ساتھ یہ بددیانتی نہیں کر سکتا، تب ہی تو کبھی کبھی تنگ آ کر  
کہتا ہوں۔

”اے عشق ہمیں برباد نہ کر۔“



## بات عمر بھر کی ہے

پتا نہیں کیوں اسے پچھلے چند روز سے یہی لگ رہا تھا کہ اس کا اماں کے ساتھ کراچی  
آنے کا فیصلہ غیر دانشمندانہ ہی نہیں سراسر ”احتمقانہ“ بھی تھا۔

وہ لان چیئر پر بیٹھی افسردہ انداز میں نیم وا آنکھوں سے درختوں کی شاخوں پر بیٹھی  
چڑیوں کو دیکھ رہی تھی جو گرمی سے بے نیاز ایک دوسرے سے اٹھکھیلیاں کرنے میں مگن تھیں۔  
لان میں بے شمار درخت تھے، لیکن آم کے درخت پر بیٹھا ایک کوا کتر کتر کریریاں نیچے پھینک  
رہا تھا اور اس کے باقی ساتھی کوؤں نے بھی طوفان بد تمیزی پھیلا رکھا تھا، کنزئی نے ایک کترا  
ہوا آم اٹھا کر درخت پر بیٹھے کوئے کا نشانہ لیا، جس کے نتیجے میں سارا غول وہاں سے احتجاجاً  
واک آؤٹ کر گیا۔ اب وہاں خاموشی کا راج تھا، درختوں کے پتوں کو چھو کر گزرتی ہوا اور دور  
کہیں۔ درخت پر بیٹھی کونل کی آواز بھی اس کی سماعت کو گراں گزر گئی تھی۔

قدرے تھکاوٹ محسوس کرتے ہوئے کنزئی ٹانگیں پھیلا کر نیم دراز ہو گئی۔ بڑے رقبہ پر  
مشتمل اس بنگلے کے وسیع و عریض لان میں دور ایک مالی کیاری میں کام کرنے میں مگن تھا اور  
جس کونے میں وہ تھی وہاں درختوں کا گھنا سا یہ اور سناٹا تھا۔

اس نے آنکھیں بند کیں تو ہلکی ہلکی غنودگی اس پر طاری ہونے لگی۔ اچانک کسی کے  
قدموں کی چاپ اسے اپنے آس پاس ابھرتی محسوس ہوئی۔

”آپ ٹھیک تو ہیں؟“

ایک مردانہ آواز پر اس نے بوکھلا کر آنکھیں کھولیں اور فوراً سنسبیل کے بیٹھ گئی۔

”جی.....!“ وہ حیران ہو کر ماموں شوکت کے پتا نہیں کون سے نمبر والے برخوردار کو

دیکھنے لگی۔ ابھی تک اسے ان کی ترتیب اور نام یاد نہیں ہوئے تھے وہ شاید عمر تھے۔

”کنزئی! آپ پریشان ہیں؟“

ناکھی کے عالم میں سامنے درخت کی شاخ پر بیٹھی نیلی چڑیا کو دیکھتے ہوئے اس نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا اور پھر بے تاثر لہجے میں بولی۔

”میں ٹھیک ہوں۔“

”پھرتی گرمی میں یہاں لان میں کیوں بیٹھی ہیں؟“

بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے انہوں نے دریافت کیا۔ اب کے کنزئی نے چونک کر انہیں دیکھا۔ وہ مسلسل اس کے سامنے کھڑے سوال و جواب کر رہے تھے شاید اس کی کچی نیند سے جاگی سرخ آنکھیں انہیں پریشان کر رہی تھیں۔

”کیوں گرمیوں میں لان میں بیٹھنا منع ہے؟“ کنزئی نے تنک کر کہا۔ کچھ لمحے اسے غور سے دیکھنے کے بعد وہ بولے تو ان کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔

”آپ کو شاید میرا پوچھنا برا لگا؟“

کنزئی نے حیرانی سے انہیں دیکھا جو بڑی لاپرواہی سے جوتے کی ٹوک سے لان کی گھاس سے چھیر چھاڑ کر رہے تھے۔

”میرا خیال ہے کہ جون کی اس تپتی دوپہر میں باہر بیٹھنا عقل مندی نہیں اور ایسی صورت میں جب لو بھی چل رہی ہو۔“

کنزئی نے چونک کر ایک جانچتی ہوئی نگاہ ان پر ڈالی، پھر آہستگی سے گویا ہوئی۔

”آپ تردد نہ کریں میں آجاتی ہوں، تھوڑی دیر میں۔“

”پراس.....“ کنزئی کو ان کا مہربان اور وضع دار قسم کا لہجہ بہت اچھا لگا۔ نیوی بلیو پینٹ اور لائٹ بلیو شرٹ میں ملبوس پرکشش اور دلکش شخصیت سمیت ان کے لہجے میں عجیب سی اپنائیت تھی جس کا فقدان اسے اس گھر کے باقی مکینوں میں نظر آیا تھا۔ وہ چند لمحے رکے اور پھر پر دو کار انداز میں سفید سنگ مرمر کی وسیع و عریض عمارت کی طرف بڑھ گئے۔

کچھ ہی دیر کے بعد وہ مرے مرے قدم اٹھاتی اپنے اور اماں کے مشترکہ کمرے میں آگئی۔ نیم تاریک کمرے کی خاموشی میں اماں کی جھنجھلائی ہوئی آواز گونجی۔

”کنزئی! کہاں تپتی دوپہروں میں گھومتی پھر رہی ہو؟“

وہی مخصوص دو ٹوک اور غصیلالہجہ۔ اچانک ہی بے چینی نے اس کے وجود کا حصار کر لیا

اور وہ خاموشی سے بیڈ پر لیٹ گئی۔

”اچھے خاصے محل میں آکر بھی شکل پر بارہ بجے ہوئے ہیں۔ کبھی خواب میں بھی پہلے ایسا مگر دیکھا تھا، ہونہ آخر نظام الدین کی بیٹی، کبھی خوش نہ ہوتا۔“

وہ ایک لمحے کیلئے سن سی ہو کر رہ گئی۔ جملے کٹے لہجے میں یہ واضح بڑبڑاہٹ صرف اور صرف اس کیلئے تھی۔ اس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے ایک نظر انہیں دیکھا جو بڑے پرسکون انداز میں آنکھیں بند کئے لیٹی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں نمی در آئی۔



ابھی پانچ روز قبل ہی وہ ایک بوسیدہ سابیگ گھسیٹے ہوئے اماں کے ساتھ کلفٹن کے اس شاندار بنگلے کے باہر پریشانی کے عالم میں چٹ پر لکھا ایڈریس بار بار پڑھ رہی تھی۔

”بی بی! یہی ایڈریس ہے دیکھیں باہر ”رانا شوکت علی“ اور بنگلے کا نمبر بھی یہی ہے ذرا جلدی اتریں مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ ٹیکسی ڈرائیور کی جھنجھلاہٹ اور کوفت سے لبریز آواز پر اس نے شرمندگی سے اپنے ہینڈ بیگ سے کرایہ نکال کر اسے فارغ کیا۔

”اماں! ماموں شوکت کا گھر یہی ہے کیا؟“ اس نے پریشانی کے عالم میں اماں سے تصدیق چاہی، مگر وہ خود سفید ٹانگوں والے اس بنگلے سے مرعوب اپنے تاثرات کو نازل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”ہاں! ہاں یہی ہوگا.....!“ اماں کے انداز پر نہ چاہتے ہوئے بھی کنزئی کو ہنسی آگئی۔ پھر چونکدار کو مطمئن کرنے کے بعد طویل روش کو عبور کر کے بیش قیمت چیزوں سے آراستہ ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہوئے اسے یقین ہو گیا تھا کہ اماں کو یقیناً مغالطہ ہوا ہے۔ ان کے خالہ زاد بھائی شوکت کراچی کے کسی مڈل کلاس علاقے میں رہائش پذیر ہوں گے۔

لیکن بریزے کی چکن کے انگری کھر کے سوٹ میں ملبوس خالہ صالحہ کو دیکھتے ہی اماں جس طرح بے تابی سے اٹھ کر گلے ملیں تو اس نے کچھ سکون کا سانس لیا اور انگلیاں مسلتے ہوئے متوقع بے عزتی اور شرمندگی کے ٹل جانے پر دل ہی دل میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ حالانکہ لمحے کے ہزارویں حصے میں وہ محسوس کر چکی تھی کہ خالہ صالحہ کے ملنے میں بے تابی کا عنصر خاصا کم ہے۔

”دیکھا..... میں نے کہا نہیں تھا کہ میرا بھائی عاصا امیر آدمی ہے۔“ اماں نے نظروں



ہی نظروں میں اسے اشارہ کر کے گردن اٹرائی۔

”شوکت بھائی نظر نہیں آرہے؟“ اماں نے ڈرائنگ روم کا جائزہ لیتے ہوئے بے مبری

سے پوچھا۔

”بھئی وہ کون سا فارغ بندے ہیں۔ ماشاء اللہ شہر میں چار چار فیکٹریاں ہیں اور ہم تو خود اس گھر میں رہتے ہوئے مہینوں ملنے کو ترس جاتے ہیں۔ رات میں بھی ان کا بزنس ڈز ہے شیرٹن ہوٹل میں۔ تم ابھی تو آئی ہو ذرا دو چار دن آرام کرو شوکت بھائی سے بھی ملاقات ہو ہی جائے گی۔“ خالہ صالحہ کے بظاہر عام لہجے پر کنزئی نے چونک کر اماں کو دیکھا جن کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی تھی۔

”کیا ہو گیا ہے سلطانہ! تمہارا اپنا گھر ہے۔ میں شوکت بھائی کو فون پر تمہاری آمد کا بتا دوں گی۔“ خالہ صالحہ کے لہجے میں قدرے اپنائیت کے رنگ محسوس ہوئے تب ہی ان کے دلجوئی کے سے انداز پر اماں کھل اٹھیں پھر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے تشویش زدہ لہجے میں بولیں۔

”یہ شوکت بھائی کے بچے نظر نہیں آرہے؟“

”بس سب اپنے اپنے کاموں میں مگن ہیں کسی کے پاس اتنا ٹائم ہے کہ اس بنگلے میں اپنی بیوہ پھسوا کیلئے ٹائم نکالے۔“ ان کے لہجے کے تاسف پر کنزئی کی آنکھوں کی حیرت بڑھ گئی۔

”صالحہ آہ! کتنے بچے ہیں شوکت بھائی کے.....؟“

”پانچ بیٹے ہیں ماشاء اللہ اور میرے ہی ہاتھوں پلے بڑھے ہیں۔ زرینہ بھابی کی وفات کے وقت سعد دو سال کا تھا اور مجھے تو وہ پھسوا می کہتا ہے۔“ صالحہ خالہ کے لہجے میں شفقت سی شفقت پہنای تھی۔

”سلطانہ! تم ڈھنگ سے کھاؤ مجھے یاد ہے تمہیں پالک گوشت بہت پسند تھا اور یہاں تم لے ہی نہیں رہیں۔“ کھانے کی ٹیبل پر ان کے ٹوکے پر اماں نہال ہو گئیں۔

”صالحہ آہ! آپ کو یاد ہے؟“

انہوں نے تعجب سے اماں کو دیکھا اور ناک پر انگلی رکھ کر گویا ہوئیں۔

”کمال کرتی ہو سلطانہ! مجھے سب یاد ہے اور تمہاری اور میری اماں میں کتنی محبت اور چاہت تھی۔ ہر ہفتے تم لوگ ہمارے اور ہم تمہارے ہاں ہوتے تھے۔ ساون میں محن میں جھولا

ڈنڈا چڑیاں رنگی جاتیں اور پکوان پکتے پھر تم بیاہ کر بہادپور اور میں کراچی اس کے بعد آہستہ آہستہ ہمارے سارے گھر والے کراچی اور تمہارے گھر والے حیدرآباد کے ہو کر رہ گئے۔“

”ارے آپ کو تو سب یاد ہے۔“ اماں کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پھر کنزئی کو مسلسل مگورتے پائے فوراً پالک گوشت کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”تمہاری بیٹی بہت پیاری ہے؟ کیا نام ہے اس کا؟“ وہ پہلی دفعہ پچھلے دو گھنٹوں میں اس کی طرف متوجہ ہوئیں اور وہ جو بڑے گمن سے انداز میں چاول کھا رہی تھی کنفیوز ہو گئی۔

”کنزئی نام ہے اس کا۔“ اماں خوشی خوشی بتانے لگیں۔

”یہ تمہارے پہلے شوہر نظام الدین سے ہے نا؟“

بہت ضبط کے باوجود نوالہ اسکے حلق میں پھنس گیا۔ یہ ذکر ہمیشہ اس کیلئے ناپسندیدہ رہا تھا وہ فوراً نظریں چرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”کنزئی تم کھا کیوں نہیں رہیں؟“ صالحہ خالہ نے نرمی سے ٹوکا تو وہ شیشا سی گئی۔

”میں لے رہی ہوں۔“ اس نے خواجواہ ہی پلیٹ اپنی طرف کھسکائی حالانکہ دل ایک دم ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا تھا۔

”اور دوسرے شوہر سے تمہارے کتنے بچے ہیں؟“

”اس کم بخت سے تو کوئی نہیں البتہ اس کے پہلی بیوی سے دو سنپو لیے ہیں وہ عورت خود تو مر گئی لیکن میرے لئے آفتیں چھوڑ گئی۔ اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر ان کم بختوں کو کھلایا مگر سوکن کی اولاد کہاں اپنی بنتی ہے منھوسوں نے میری زندگی عذاب کر رکھی تھی اس لئے تو میں کنزئی کو لے کر آپ کے پاس یہاں آ گئی ہوں۔“

اماں اپنے پسندیدہ موضوع پر شروع ہو چکی تھیں اور کنزئی کو معلوم تھا کہ اس موضوع پر وہ گھنٹوں بلا تکان بول سکتی ہیں۔ تب ہی اس کے بے زاری اور اکتاہٹ سے ادھر ادھر دیکھنے پر صالحہ خالہ نے اسے ملازمہ کے ساتھ کمرے میں بھجوا دیا۔



اسے ہرگز ہرگز توقع نہیں تھی کہ صبح ناشتے کی ٹیبل پر اماں ناموں شوکت اور ان کے بچوں بیٹوں کی موجودگی میں گلوگیر لہجے میں پورے خاندان کی تاریخ سنانا شروع کر دیں گی۔ شرمندگی اور خفت سے اس کا برا حال تھا جب اماں ڈائنگ ہال میں موجود تمام حیران نظروں

سے بے نیاز، دوپہر آنکھوں پر رکھ کر جو پھوٹ پھوٹ کر روئیں تو بے چارے ماموں شوکت خور ہو کھلا کر کھڑے ہو گئے۔

”کیا بتاؤں شوکت بھائی! میری تو قسمت ہی خراب ہے۔ ایک تو خدا نے کوئی سگا بھائی نہ دیا، ورنہ اس امجد علی کا گریبان جا کے پکڑتا اور پوچھتا کہ اس معصوم اور بے زبان بچی پر تمہیں رحم نہ آیا، ایک پہلا شوہر تھا تو وہ سیدھا سادا اور اللہ میاں کا تیل۔ اس کی وفات پر میرا نکاح کروادیا اس ظالم بد زبان اور بے رحم امجد علی سے، جس کے دو سنپو لیے بیٹوں نے میرا اور میری بچی کا جینا حرام کر دیا۔ تنگ آ کر بچی کی تعلیم ادھوری چھڑا کر یہاں لے آئی ہوں کہ تعلیم سے زیادہ عزت قیمتی شے ہے۔“

”ارے سلطانہ! تمہارا اپنا گھر ہے۔ کیا میں تمہارا بھائی نہیں ہوں؟“ شوکت ماموں کے لہجے کی اپنائیت اور مان سے اماں کے آنسوؤں میں مزید شدت پیدا ہو گئی۔

”اتنا ظالم انسان ہے یہ بھی نہ سوچا کہ میں نے اس کی پہلی بیوی کے بیٹوں کیلئے اتنی قربانیاں دیں۔ کیا تھا جو میری سگی بیٹی کیلئے بھی سگا باپ بن کر سوچتا۔ کہنے لگا کہ میرے چھوٹے بیٹے سے نکاح کر دو۔ میں کیوں دیتی اس آوارہ اور نکمے کو اپنی بیٹی۔“

کنزئی کو نہ جانے کیوں محسوس ہوا کہ سب کی نظریں ناشتہ کے بجائے اس کے دودھ پر جم گئی ہیں۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے، مگر اس سے پہلے ہی شوکت ماموں نے محبت سے لبریز لہجے میں اماں کو یاد دلایا۔

”ارے سلطانہ! تم کیوں فکر کرتی ہو یا نہیں ہے اماں کے انتقال پر جب میں حیدر آباد آیا تو ٹھیک دو دن بعد کنزئی پیدا ہوئی تھی اور میں نے اسے دیکھتے ہی کہا تھا کہ اس کا نام کنزئی ہوگا۔ ارے یہ تو میری بیٹی ہے۔ اس کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

اماں آنکھیں صاف کرتے ہوئے افسردہ لہجے میں گویا ہوئیں۔

”بھائی صاحب! آپ تو اس کے بعد ایسے کراچی گئے کہ مڑ کر خبر ہی نہ لی۔ میں تو ڈر اکلوتی تھی اور آگے سے خدا نے اولاد بھی اکلوتی دے دی۔ یہ تو اتنی بد قسمت ہے کہ باپ کی گود بھی ڈھنک سے نصیب نہ ہوئی۔ چلو نکما تھا، سیدھا سادا تھا لیکن تھا تو باپ! اپنی درکشاپ بے آتے ہوئے ایسا اچانک ٹرار کے نیچے آیا کہ دوسرا سانس بھی نہ لے سکا اور میری ماں نے تو مجھے بیوگی کے دن بھی نہ ڈھنک سے کاٹنے دیئے۔ کنزئی صرف تین سال کی تھی جب اس

منجوس امجد علی کے پلے مجھے باندھ دیا، اس دن سے ایک بل بھی سکون سے نہیں کاٹا۔“

”سلطانہ! فکر مند کیوں ہوتی ہو۔ میں ہوں نا.....!“

اماں کا افسانہ نہ جانے کب تک جاری رہتا، مگر شوکت ماموں کے ایک جملے نے بند باندھ دیا۔ تب ہی وہ ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ ماموں شوکت کی ساتھ والی کرسی پر بیٹھے ہوئے وہ اب تک قالین کے ڈیزائن کو اچھی طرح حفظ کر چکی تھی۔ جب ماموں نے اورنج جوس کا گلاس اس کے آگے رکھا، اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں اور اسی بل پانچوں سر بھی ایک دفعہ پھر اپنی اپنی پلیٹوں پہ جھک گئے۔

”آپا صالحہ نظر نہیں آرہیں.....؟“ اماں کیلئے زیادہ دیر خاموش رہنا ممکن نہیں تھا، تب ہی تجسس سے دریافت کیا۔

”وہ ناشتہ دیر سے لیتی ہیں۔“ نہ جانے کون تھا جس نے سادگی سے وضاحت کی۔

”بیٹا! تم سب سے بڑے ہو؟“ اماں کے اشتیاق بھرے لہجے پر اس کے چہرے پر ایک شرارتی سی مسکراہٹ دمک اٹھی۔ جبکہ کنزئی نے کوفت بھرے انداز میں اماں کو دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”نہیں سلطانہ! یہ علی ہے اس کا چوتھا نمبر ہے۔ سب سے بڑا ابوبکر ہے جو تمہارے سامنے بلیوشرٹ میں سنجیدگی سے ناشتہ کرنے میں مگن ہے جبکہ اداس اس لئے ہے کہ اس کی مزی بیٹے کو لے کر اپنے والدین سے ملنے انگلینڈ گئی ہوئی ہے۔“ ماموں شوکت کے دوستانہ لہجے پر سب کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”بابا! میری مسز اور بیٹا انشاء اللہ اگلے ماہ واپس بھی آرہے ہیں۔“ اس نے اطلاع دی۔

”ہاں تو سلطانہ.....! ابوبکر سے چھوٹا عمر ہے۔ یہ جو میرے ساتھ بیٹھا ہے۔ ماشاء اللہ بہت ذہین ہے، اسٹیٹ بینک میں جاب ہے اس کی۔“ شوکت ماموں کے فخریہ لہجے پر اس نے نظر اٹھا کر دیکھا، لیکن دوشرارتی آنکھیں اپنے پر جمی دیکھ کر فوراً چائے کا کپ لیوں سے لگا لیا۔

”اس سے چھوٹا عثمان ہے اور شوکت ماربل کمپنی کو وہی چلا رہا ہے اور اس سے چھوٹا علی ہے۔ سب سے زیادہ شرارتی، شوخ اور تنگ کرنے والا، لیکن میری دو فیکٹریوں کو اتنی ہی

دکھائی دیتے۔ آتے جاتے کہیں ٹاکرا ہوتا تو بہت اچھے طریقے سے خیریت دریافت کرتے۔ پھر ابو بکر عثمان، عمر اور سعد تھے بہت سنجیدہ اور ڈسینٹ، البتہ علی تھا جو آتے جاتے اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا بلکہ اس گھر میں زندگی کا احساس ہی اس کے دم سے تھا اور پھر خالہ صالحہ نہیں جو ان کی آمد پر دل سے خوش تھیں۔ سارا دن وہ اور اماں خوشگوار یادوں کو دہرائیں۔ خالہ صالحہ اپنی تنہائی کے ختم ہو جانے پر خوش تھیں۔

وہ سارا دن ”شوکت دلا“ میں بولائی بولائی پھرتی۔ حالانکہ وہ چار مرلے کے ایک بوسیدہ و بے رنگ گھر سے اس وسیع و عریض جنگلے میں آئی تھی جہاں گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی سفید اور سیاہ رنگ کی ٹائلوں والی لمبی سی روش اور دائیں بائیں بڑے بڑے لان تھے جن میں اونچے اونچے درخت، پھولوں کی بیللیں اور کھیا ریاں اور سوئمنگ پول تھا۔ گراؤنڈ فلور پر بڑا سا ڈرائنگ روم، ڈائننگ ہال اور گیٹ روم تھے۔ جبکہ فرسٹ فلور پر ٹی وی لاونج تھا جس کی سیڑھیاں ڈرائنگ روم کے وسط سے نکلتی تھیں۔ سب کے بیڈ رومز بھی فرسٹ فلور پر تھے۔

اس دن وہ اکیلی ڈائننگ ہال میں بیٹھی سلا دیکھنے چیزیں ٹیبل پر رکھے ہوئے کچھ سوچنے میں مگن تھی۔ اچانک اکتا کر اس نے ٹرے پیچھے سرکائی اور گھر کی پچھلی طرف بے محن کی طرف آگئی جہاں ایک سائیڈ پر بیچے تخت پر اماں اور صالحہ خالہ باتوں میں مگن تھیں۔ ان سے کچھ فاصلے پر لگے ہوئے درخت کے نیچے چھوٹی چھوٹی کٹوریوں میں خالہ نے باجرہ ڈال رکھا تھا جس کی وجہ سے وہاں چڑیوں کا خاصا شور تھا۔ اس نے دلچسپی سے نیلے رنگ کی چڑیا کو دیکھا۔ جو پھدک پھدک کر کٹوری کے قریب آنے والوں پر حملہ کر رہی تھی۔

سفید براق کپڑوں میں ملبوس ہلکے ہلکے سفید بالوں والی صالحہ خالہ اسے بہت باوقار اور شفیق لگتی تھیں۔ جبکہ ان کے پاس گہرے جامنی کمر کے لان کے سوٹ میں بیٹھی اماں کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑ رہی تھیں۔

”سفینہ! یہ دھیا، لیموں اور ادراک لے جا کر خانا ماں کو دے آؤ“ اسے کہنا کہ نہاری میں انہیں ڈال کر اچھی طرح تڑکا لگائے۔“

ملازمہ کو ہدایت دیتے دیتے اچانک ان کی نظر اس پر پڑی۔

”ارے کنزئی! کھڑی کیوں ہو آ جاؤ ہمارے پاس آ کر بیٹھو۔“ خالہ نے بے اختیار اسے آواز دی تو وہ کچھ جھکتے ہوئے ان کے پاس آ بیٹھی۔

ذہانت، محنت اور لگن سے چلا رہا ہے۔“

”بابا! یہ کیوں نہیں بتا رہے کہ میں نے سی اے بھی کیا ہوا ہے۔“ علی نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا تو کنزئی کے ہونٹوں پر بھی بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

”اور ہاں! وہ جو سب سے آخر میں ناراض ناراض اور حد سے زیادہ سنجیدہ، مودب اور ڈسینٹ بچہ ہے وہ میرا سب سے چھوٹا بیٹا سعد ہے اور میڈیکل کے آخری سال میں ہے۔“

”اور اس لحاظ سے بھی خوش قسمت ہے کہ مفتی شدہ ہے۔“ علی کی بات پر وہ بے اختیار جھینپ گیا۔

”ویسے بابا! ہمارے گھر کے بھی تو دستور نرالے ہیں۔ سب سے بڑے بیٹے کی شادی کر دی اور سب سے آخری بیٹے کی انجمنٹ اور ہم درمیان کے تین بے چارے، معصوم، شریف اور مشرقی لڑکے خاموش رہنے کے علاوہ کر بھی کیا سکتے ہیں۔“ علی کے چہرے پر اذہ معصومیت تھی۔

”علی! فضول مت بولو۔“ ان چاروں میں سے کسی ایک کے گھر کئے پر کنزئی نے چونک کر اسے دیکھا جو برے برے منہ بنا رہا تھا۔

”ارے آپ کی آنکھوں کا کھر گرین ہے نا.....؟“ علی کے ایک دم بولنے پر وہ گھبرا سی گئی۔ سب کی نظریں اس کے وجود پر جم گئیں۔

”رئیٹی! لودیتی ہوئی سبز آنکھیں ہیں آپ کی۔“ علی کے رواں لہجے پر وہ جھینپ گئی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ خاصا بے باک ہے۔ جو محسوس کرتا ہے بلا جھجک کہہ بھی دیتا ہے۔

”اس کے باپ کی آنکھوں کا رنگ بھی ایسا تھا۔“ پراٹھے سے بھرپور انصاف کرتے ہوئے اماں نے نقد دیا، پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد بولیں۔ ”ویسے میری بیٹی کی آنکھیں بہت روشن اور چمکدار بھی ہیں۔“ کنزئی نے گھبرا کر اماں کو دیکھا اور علی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے اپنی پلیٹ پر جھک گیا۔



کنزئی کو صرف تین دنوں میں ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس گھر کے کینوں کے پاس ایک چیز کی قلت ہے اور وہ ہے وقت۔ ان کی زندگی عجیب بھاگ دوڑ والی تھی۔ ماموں شوکت تھے تو بہت شفیق اور نرم دل، لیکن بزنس کی بھاگ دوڑ میں گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ گردش کرتے

”مجھے لگتا ہے سلطانہ! تمہاری بیٹی یہاں آ کر بہت بور ہو رہی ہے۔“  
”اچھا.....“ اماں چونکیں۔

”لو بیٹی تمہاری ہے اور تمہیں اندازہ نہیں ہے۔“

”نہیں! یہ شروع سے ہی ایسی ہے۔“ اماں کے تردید کرنے پر وہ پرتشویش انداز میں بولیں۔

”کیوں.....؟ اس عمر کی لڑکیاں تو ایسی نہیں ہوتیں۔ شوکت بھائی کے آنے جانے والوں کی لڑکیوں کو دیکھو۔ بے باک، ہنسی مسکراتی ہوئی دوسروں کو چٹکیوں میں اڑاتی ہیں۔“ انہوں نے اماں کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”بس آپا! ان کے باپ ان کے سروں پر سلامت ہیں اور ماں باپ کے آسرے پر ہی تو بچے عیش کرتے ہیں اور یہ بے چاری۔“ اماں نے بات ادھوری چھوڑ کر سر د آہ بھری۔  
”کیوں تمہارے دوسرے شوہر کا سلوک اچھا نہیں تھا کیا؟“ خالہ کے کریدنے پر اماں پھینکی سی ہنسی ہنستے ہوئے گویا ہوئیں۔

”اس بے چاری کو تو پتا ہی نہیں باپ کی شفقت کیا ہوتی ہے۔ صرف دو سال کی تھی جب سگے باپ کا انتقال ہوا۔ بے شک نظام الدین سیدھا سادا اور زمانے کی چالاکیوں سے عاری تھا لیکن ورکشاپ سے آ کر سارا سارا دن کنزئی کو گود میں اٹھائے پھرتا تھا۔ اس کی وفات کے بعد اماں تو ایک سال بھی بیٹی کو گھر نہ بٹھاسکیں اور بادھ دیا مجھے اجمد علی کے پلے جس کی بیوی دو بیٹوں کو جنم دے کر رسولی کے آپریشن میں فوت ہو گئی تھی۔ بڑا بیٹا چھ سال کا اور دوسرا چار سال کا تھا۔ دونوں بیٹوں کو جب موقع ملتا کنزئی کو خوب مارتے۔ یہ جب سہم کر میرے پاس آ جاتی تو سوتیلے باپ کو برا لگتا۔“

”تو اس کو کیا تکلیف تھی؟“ صالحہ خالہ کو غصہ آ گیا۔

”بس آپا! تکلیف اسکو یہ تھی کہ اس کی کمائی ہر ایرے غیرے پر کیوں لٹائی جا رہی ہے۔“ اماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس کا بھی دل خراب ہونے لگا۔

”آئے ہائے یہ ایرا غیر اتھوڑی تھی۔“ صالحہ خالہ کو تعجب ہوا۔

”اس کا خون تو نہیں تھی نا ساری زندگی میری کنزئی نے سہم سہم کر گزاری پھر میں نے تو ہاشل بھجوا دیا اور جب سے اس لالچی اور خود غرض انسان کو یہ معلوم ہوا ہے کہ باپ کی طرف

سے گھر اور دکان کنزئی کے حصے میں آیا ہے تب سے اس کی رال ٹپک رہی ہے۔ اپنی کریا نے کی دکان میں گھانا جو ہوا ہے۔ اب کہتا ہے کہ کنزئی کا نکاح میرے بڑے بیٹے مراد سے کر دو۔ جو کم بخت پانچ جماعت فیل نکلا، آوارہ ہے۔ ساری پنچایت اکٹھی کر رہا تھا۔ میں نے بھی بیٹی کو لیا اور ادھر آ گئی۔ خود ہی ڈھونڈتا پھرے پورے پاکستان میں ہمیں۔“

”بہت اچھا کیا سلطانہ تم نے۔ لو بھلا کہاں تمہاری سرخ و سپید گڑیا جیسی نازک سی بیٹی۔ ہاتھ لگانے سے میلی ہو جانے والی۔ میں خود شوکت بھائی سے کہوں گی کہ کنزئی کیلئے کراچی میں اپنے ملنے والوں میں کوئی رشتہ ڈھونڈ دیں۔ ہم خود اس کی شادی کریں گے یہاں۔“ انہوں نے جھک کر اس کی پیشانی چومی تو کنزئی کی آنکھوں میں نمی سی اتر آئی۔ خالہ کی بے تحاشا محبت پر دل اندر ہی اندر پکھل رہا تھا۔

”بس سلطانہ! دولت کی ہوس، قناعت کی کمی آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے۔ اور بیوگی کا دکھ مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ صرف دو سالہ رفاقت تھی میری ابراہیم کے ساتھ۔ ان کے اچانک انتقال پر میرے سسرال والوں نے ایسی آنکھیں بدلیں کہ کہیں ابراہیم کا حصہ نہ مانگ لوں تب سے بھائی کے در پر پڑی ہوں دوبارہ شادی کرنے کو من ہی نہیں چاہا۔“ کنزئی نے بے یقین آنکھوں سے خالہ صالحہ کو دیکھا جن کے چہرے پر اس وقت صدیوں کی جھلن تھی۔ اس نے فوراً نظریں ان کے چہرے سے ہٹالیں۔



”سمال کرتی ہیں پھپھو! آپ تو یوں کہہ رہی تھیں کہ ہم سمجھے کہ شاید کوئی فرسٹ ایئر یا سینڈ ایئر کی سٹوڈنٹ ہوں گی، لیکن آپ کی بیٹی صاحبہ تو اچھی خاصی قابل ہیں۔“ علی کے تہرے پر سب کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”آپ ایم بی اے میں دوبارہ ایڈمیشن کیوں نہیں لے لیتیں؟“ وہ شاید عمر تھا جس نے پہلی دفعہ اسے مخاطب کیا تھا۔ کنزئی نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”ہاں میں بھی سوچ رہی ہوں کہ ”آئی بی اے“ کا ٹیسٹ دے دوں۔“

کھانے کے بعد وہ ڈائننگ ہال سے باہر نکل رہی تھی جب علی کا حسرت آمیز لہجہ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا۔

”بابا! اگر مجھ سے چھوٹی بہن پیدائش کے فوراً بعد وفات نہ پا گئی ہوتی تو یقیناً کنزئی جتنی ہوتی، ہے نا؟“

اس نے حیرت سے مڑ کر دیکھا۔ وہ سب اسی کی طرف متوجہ تھے۔

حیرت ہے کہ ”کنزئی نظام الدین“ کی ماسٹرز کی ڈگری ان کیلئے اتنی زیادہ حیرت انگیز چیز کیوں بن رہی ہے؟ لان میں بنے سنگ مرمر کے بچ پر بیٹھتے ہوئے اس نے پریشانی سے سوچا۔

”شاید انہیں مجھ سے اتنی قابلیت کی توقع نہیں تھی۔“ وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہونے لگی۔

کچھ دیر بیٹھ کر وہ لان میں ٹہلنے لگی۔ شاید کہیں بارش ہوئی تھی، تب ہی ہوا میں نمی سی محسوس ہو رہی تھی۔ سوئمنگ پول کی سنگ مرمر کی سیڑھیوں کے پاس رک کر وہ صاف شفاف نیلے پانی کو بخور دیکھنے لگی۔ لان میں لائٹنگ کی وجہ سے ہر چیز واضح اور روشن نظر آ رہی تھی۔

”آخر اماں نے کیا سوچا ہے؟ کب تک ہم شوکت ماموں کے گھر رہیں گے؟ کنزئی بی بی! کب تک تمہاری زندگی میں مسافتیں لکھی ہیں۔ ابا کی وفات کے بعد تانوکے گھر اور وہاں سے اٹکل امجد علی کے ہاں اور اب شوکت ماموں کا گھر اللہ جانے اب کہاں ہجرت کرنا ہوگی۔“ ایک آنسو اس کی آنکھ سے ٹپک کر کہیں گم ہو گیا۔

”خاموش رہنا آپ کی ہابی ہے یا عادت.....؟“ کوئی بہت اچانک اس کے پاس آ کر بولا تھا۔ آواز میں حد درجہ سنجیدگی تھی۔

آج کافی دن کے بعد وہ سب لوگ رات کے کھانے پر اکٹھے ہوئے تھے، جس کی وجہ سے شوکت والا میں خوب ہلچل اور زندگی کا احساس ہو رہا تھا جبکہ کنزئی حسب عادت اکتائی اکتائی سی بیٹھی تھی۔ اماں اور خالہ صالحہ میں نہ جانے کون سا موضوع زیر بحث تھا۔

”بیٹے! آپ یہاں بور تو نہیں ہو رہے؟“ شوکت ماموں کے شفیق لہجے پر اس نے مسکرا کر تردید کی تو علی فوراً بول پڑا۔

”بابا! یہ جھوٹ بول رہی ہیں یہ بے زار اور اکتائی ہوئی شکل تو کچھ اور بتا رہی ہے۔“

”جی! ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ دل میں اسے ہزار صلواتیں سناتے ہوئے وہ بظاہر خوشدلی سے بولی۔

”بیٹے! آپ کالج میں ایڈمیشن کیوں نہیں لے لیتے؟ آپ کی امی بتا رہی تھیں کہ یہاں آنے سے آپ کا تعلیمی سلسلہ ادھورا رہ گیا ہے۔“ گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے انہوں نے مشورہ دیا تو کنزئی کو محسوس ہوا کہ سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔

”کون سے ایئر میں پڑھتی ہیں آپ؟“ علی کے چہرے پر اشتیاق تھا۔

”میں اکناکس میں ماسٹرز کر چکی ہوں اور ایم بی اے کا سینڈ۔“ سٹرچل رہا تھا۔ ”کنزئی کے سادہ سے لہجے پر ڈائننگ ہال میں موجود سب چہروں پر حیرت در آئی، بے یقینی اور حیرت سے بھر پور نظریں اپنے اوپر پا کر وہ شپٹا گئی۔ خود شوکت ماموں پانی پینا بھول گئے۔

”کس یونیورسٹی سے آپ نے اکناکس میں ماسٹرز کیا ہے؟“ علی نے انگلیں اس سے دریافت کیا تو وہ بھی جواباً انگلیں ہی بولی۔

”میں پنجاب یونیورسٹی کے اکناکس ڈیپارٹمنٹ کی گولڈ میڈلسٹ ہوں۔“

”ایکسپلینٹ.....“ ماموں شوکت کے توصیفی لہجے پر وہ کچھ پر اعتماد ہوئی۔

”یہ صرف میری ضرورت اور مجبوری ہے۔“ وہ جھکے سر کے ساتھ بغیر مڑے بولی۔  
”ضرورتیں اگر مجبوری بن جائیں تو جب بھی خوش دلی سے ان کو پورا کرتے ہیں درندہ زندگی مزید مشکل ہو جاتی ہے۔ متانت سے جواب دیا گیا۔

کنزئی نے سرعت سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ شاید عمر تھے جو مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ تھے۔ اس نے بوکھلا کر ادھر ادھر دیکھا، مگر پورے لان میں ان دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

”اب اس سے زیادہ مزید مشکل کیا ہو سکتی ہے؟“ اس کے طنزیہ لہجے پر عمر نے غلگی سے اسے دیکھا جو بیزار سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

”آپ کو پتا ہے کہ صبر سے زیادہ بہتر اور بہت سی بھلائیوں کو سمیٹنے والی بخشش اور کوئی نہیں۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن.....؟“ عمر نے سرعت سے اس کی بات کاٹی۔  
”کنزئی! آپ صرف ایک بات یاد رکھیں کہ حضور پاک ﷺ کا ارشاد ہے کہ ”آدنی کی خوش نصیبی یہی ہے کہ جو کچھ اللہ اس کیلئے فیصلہ کرے اس سے راضی ہو۔ اس پر قناعت کرے۔“

اس نے حیرانی سے عمر کی طرف دیکھا جو بڑے ریلیکس انداز میں اپنے ہاتھ پیٹ کی جیبوں میں ڈالے سوئمنگ پول کے پاس لگی گرل سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ اسے ہرگز بھی ان سے ایسی باتوں کی توقع نہیں تھی۔ اس سے زیادہ تعجب انگیز بات ان کا اسے ٹائم دینا تھا۔

”مشکلات سے ڈرنا نہیں چاہئے یہ تو انسان کو سنوارنے کیلئے آتی ہیں، شاہراہ حیات پر سنگت سرخ نظر آئے تو اسے ناکامی مت سمجھئے۔ چند لمحے آرام کیجئے اور سنگت سبز ہونے کا انتظار کریں مشکلات ہمیشہ نہیں رہتیں۔ یہ تو قرب خداوندی کا باعث ہوتی ہیں۔“

کنزئی ان کے انداز سے متاثر ہوئے بغیر تیزی سے بولی۔  
”عمر صاحب! ہم جس معاشرے میں ہیں وہاں درندگی بے ایمانی، سفاکی بدعنوانی اور حیوانیت عام ہے، ہم جن کی معاش میں مدد کرتے ہیں وہ ہمارا استحصال کرتے ہیں۔ ہم نئے تربیت پرواز دیتے ہیں وہ اڑتے ہوئے ہمیں اپنے پنجوں میں جھپٹ لیتے ہیں ایسے میں بندہ

خوش گمان کیسے رہے؟“  
اس کی تلخ گفتگو پر وہاں سکون ہی سکون تھا۔

”لیکن ہم بروں کے ساتھ برے تو نہیں بن سکتے۔ مکافات عمل کا انتظار کیجئے۔ زندگی

خود بھی گناہوں کی سزا دیتی ہے۔“

کنزئی استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ ”آج کل کے دور میں جب ہم کسی کی برائی کے جواب میں اچھائی کرتے ہیں تو اگلے کو احساس ہی کب ہوتا ہے۔ وہ ہمیں بے وقوف اور پاگل سمجھ کر مزید ڈراتا ہے۔ پھر ہم جیسے لوگ جو حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتے وہ اپنا گھر چھوڑ کر ادھر ادھر پناہ تلاش کرنے نکل آتے ہیں۔“

”حالات کے مطابق ہجرت کرنا بے وقوفی نہیں دانشمندی ہے۔“ عمر نے سمجھانے والے انداز میں کہا تو وہ محض کندھے اچکا کر رہ گئی۔

”آپ کہہ سکتے ہیں اس لئے کہ آپ اپنے گھر میں ہیں اور آپ نے کبھی بدترین حالات نہیں دیکھے۔“ عمر نے تاسف سے اسے دیکھا۔ جو سوئمنگ پول کے ساکت پانی پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔

”کنزئی.....!“ اس نے بے اختیار مڑ کر سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”پلیز مائنڈ مت کیجئے گا۔ آپ بنیادی طور پر بہت ذہین ہیں لیکن مجھے لگتا ہے کہ وہ ذہانت ”بنیادوں“ میں ہی رہ گئی ہے۔“

اپنی بات کہہ کر وہ رکے نہیں اور جب تک بات کنزئی کی سمجھ میں آئی وہ روشنیوں میں نہائی شوکت والا کی عمارت میں داخل ہو چکے تھے۔ وہ کافی دیر وہیں کھڑی کھولتی رہی۔ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ عراس پر ایسا طنز بھی کر سکتے ہیں۔

اگلے دو دن اس کا موڈ خاصا خراب رہا اور احتجاجاً وہ رات کے کھانے پر بھی ڈانٹنگ ہال میں نہیں گئی۔ تیسرے دن وہ اپنے اور اماں کے مشترکہ کمرے سے نکلی تو ٹی وی لائونج میں پہلے سے بیٹھے ہوئے علی نے بڑی خوش دلی سے اس کا استقبال کیا، پھر کچھ یاد آنے پر ایک الماری سے کچھ بکس نکال کر اس کی طرف بڑھائیں۔

”یہ کامرس کی بکس ہیں، آئی بی اے کے ٹیسٹ میں کام آئیں گی۔ عمر بھائی نے کہا تھا کہ آپ کو دسے دوں۔“ اس نے بے دلی سے کتابیں پکڑ کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیں اور ٹی وی پر

”رومی! جیسی تم آجایا کرو۔ کنزئی گھر میں اکیلی ہوتی ہے اسے کمپنی مل جائے گی.....“

علی کے فکر مند لہجے پر اس نے لا پرواہی سے کندھے اچکائے تھے۔

”ہائیم کہاں ہوتا ہے۔ صبح یونیورسٹی، دوپہر کوریسٹ اور شام کو آئے دن کے فنکشن اور جنہیں معلوم تو ہے می پارٹیز کی کتنی شوقین ہیں، بہر حال کوشش کروں گی وعدہ نہیں کر سکتی۔“

”یہاں کون تمہاری کمپنی کیلئے مارجا رہا ہے؟“ کنزئی نے سلگ کر سوچا۔

”اچھا یہ تو بتاؤ، عمر نے کیا سیل نمبر تبدیل کر لیا ہے؟“ وہ پھر اپنے پسندیدہ موضوع پر آچکی تھی۔

”ہاں نہیں۔“ علی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”حیرت ہے تمہیں نہیں معلوم حالانکہ عہد سے کوئی بات نہیں چھپاتا۔“ رومیلا نے بے یقین نظروں سے دیکھتے ہوئے جیکھے لہجے میں کہا تو علی کے ماتھے پر پڑنے والے بل سے کنزئی کو اس کے اندرونی موڈ کا پہلی دفعہ اندازہ ہوا۔

”میں عمر بھائی کا پرنسٹن سیکرٹری تو نہیں۔“ اس نے دودب و جواب دیا۔

”لیکن وہ تو یہ ہی کہتا ہے کہ میں دنیا کے کسی بھی کونے میں ہوں کسی اور کو بتاؤں نہ بتاؤں علی کو ضرور بتاتا ہوں۔“ رومیلا نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ کنزئی کو اس ساری صورتحال میں اپنا آپ انتہائی غیر ضروری لگا تب ہی وہ معذرت کرتے ہوئے ٹی وی لاؤنج سے باہر نکل گئی۔

”یہ کرتی کیا ہے؟“ رومیلا نے بغور اسے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا کرتی ہوگی؟“ علی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”یہی ایف اے یا بی اے کی سٹوڈنٹ ہوگی۔“ رومیلا کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بول۔

”محترمہ پنجاب یونیورسٹی کی اکناکس ڈیپارٹمنٹ کی گولڈ میڈلسٹ اور ایم بی اے ادھورا چھوڑ کر آئی بی اے میں داخلہ لینے کیلئے یہاں کراچی آئی ہیں۔“

رومیلا کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

”یہ کیا اب یہیں رہے گی؟“ علی کو رومیلا کے تاثرات اور نظریں دونوں ہی بے حد عجیب لگیں۔

گلے ٹاک شو کی طرف متوجہ ہوئی۔

”آپ فکر مت کیجئے گا۔ عمر بھائی نے خود بھی ایم بی اے اور ایم کام کیا ہوا ہے اور آپ کا یہ مناسبا بھائی بھی سی اے ہے۔ کوئی بھی مشکل ہو بلا جھجک ہم سے مدد لے سکتی ہیں۔“

کنزئی نے چونک کر علی کو دیکھا اور مسکرا دی۔

”کہاں ہے تمہارا وعدہ خلاف بھائی؟“

کوئی لڑکی عجلت میں اندر داخل ہوئی تھی۔ نیلی جینز، سفید کرتے، ٹراؤزر اور باب کرت بالوں میں نازک سی سرخ و سپید رنگ والی لڑکی کے لہجے میں خاصا استحقاق تھا۔ گلے میں دوپٹے کے نام پر چھوٹا سا اسکارف تھا۔ وسیع و عریض ٹی وی لاؤنج میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کونے میں رکھے صوفے پر بیٹھی کنزئی کو دیکھ کر وہ بری طرح ٹھٹھکی سیہ اور کاسنی استراحت کے سوٹ میں اجلی رنگت سبز آنکھیں اور مناسب سراپا ہرگز نظر انداز کر دینے والا نہیں تھا۔

”ہیلو.....!“ صوفے پر بیٹھے بیٹھے کانونیٹ زدہ لہجے میں اس نے اسے مخاطب کیا۔

کنزئی نے اسے غور سے دیکھا، نازک سے سفید انگوٹھے والی چپل میں مقید اس کے خوبصورت پاؤں اضطرابی انداز میں بل رہے تھے۔

”علی! ہوازشی؟“ (یہ کون ہیں؟) اس نے اپنی ستواں ناک بڑے سائل سے چڑھائی تھی۔

”میری کزن ہے کنزئی! بہادپور سے آئی ہے۔“

”اچھا.....؟ یہ بتاؤ کہ عمر انگلینڈ سے کب آیا؟“ وہ اسے مکمل طور پر نظر انداز کئے اپنی مطلوبہ معلومات کیلئے متجسس تھی۔ پھر علی کو یہ خیال آیا تھا۔

”کنزئی! یہ میری خالہ زاد کزن رومیلا ہیں سوشیا لوجی میں ماسٹرز کی سٹوڈنٹ اور اسٹوڈنٹ بیشنر یہاں پائی جاتی ہیں۔“

”جی نہیں، جن دنوں ”عمر“ گھر پر ہو۔“ اس نے جیکھے لہجے میں صہج کی۔

”شرم کرو۔“ علی کے غیرت دلانے پر اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔

”آفٹر آل ہی آزمائی بیسٹ فرینڈ۔“ (وہ میرا بہترین دوست ہے)

کنزئی نے ایک نظر اسے دیکھا وہ اپر کلاس کی گبڑی ہوئی اولاد کا چلتا پھرتا اشتہار لگ رہی تھی۔

حسین چھوڑ دے۔ ساری زندگی میں تمہارے سر پر نہیں رہوں گی۔ خبردار مجھے صالحہ آپا سے تنہاری کوئی شکایت نہ ملے۔“

اماں کے تنبیہی انداز پر اس نے شکایتی نظروں سے انہیں دیکھا تو وہ فوراً نظریں چرا

تھیں اس کا دل یک دم بھرا آیا۔

”اے عمر! تم ہی اس کو کچھ سمجھاؤ اور تم کیا کہہ رہے تھے کہاں اس کا ایڈمشن کروانا ہے؟ میرے ذہن سے اس سکول کا نام نکل گیا۔“ اماں نے اپنے سر پہ ہاتھ مارا جبکہ عمر کا نام سن کر وہ بدک کر اٹھی۔ وسیع و عریض کمرے کے کارنز میں پڑی رانگ چیر پر بیٹھے اخبار پڑھتے عمر کو دیکھ کر اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ ڈھیروں خفت کے ساتھ ہی اسے اماں پر بے تحاشا غصہ آیا جو عمر کی موجودگی سے باخبر ہونے کے باوجود انتہائی گھریلو باتیں کئے جا رہی تھیں۔

”یہ یہاں چھپے بیٹھے ہیں اور وہ پرکٹی وہاں علی کا سر کھا رہی ہے۔ اس کی سوچوں کا رخ ایک دم اماں سے رومیلا کی طرف مڑ گیا۔

”آپ کو ٹی وی لائونج میں رومیلا ڈھونڈ رہی ہیں؟“ وہ بے اختیار ہی کہہ بیٹھی۔

”ہاں میں نے اپنے کمرے سے اس کی گاڑی اندر آتے دیکھ لی تھی اسی لئے تو یہاں بیٹھا ہوں۔“ عمر کا جواب اس کیلئے غیر متوقع تھا تب ہی زبان سے بے اختیار نکلا۔

”چھپ کر.....!“

اماں نے اسے بری طرح گھورا جبکہ عمر بے ساختہ ہنس دیے۔

”آپ کے فارم میں لے آیا ہوں۔ آپ اسے فل کر دیں۔ اگلے ہفتے آخری ڈیٹ ہے اور تیاری بھی شروع کر دیں۔“ کروشیہ سے بیل بناتی اماں نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھائیں اور ایک دم پر جوش ہو کر بولیں۔

”بیٹا! تم کنزئی کو ایک گھنٹہ ٹیوٹن کیوں نہیں پڑھا دیتے؟“

”اماں!“ کنزئی نے احتجاجی نظروں سے انہیں دیکھا جو عمر کے مسلسل مسکرانے کو مثبت جواب سمجھ کر خوش ہو رہی تھیں۔

”میری کنزئی! ماشاء اللہ بہت ذہین اور محنتی بچی ہے تمہیں زیادہ تنگ نہیں کرے گی۔“ اماں بے حد محبت سے کہہ رہی تھی۔

”ظاہر ہے۔“ علی نے دو ٹوک انداز میں کہا تو اس کے چہرے کے کڑتے زاویے علی کی تیز نظروں سے چھپ نہیں سکے اور کچھ ہی دیر کے بعد وہ اپنی گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر جا چکی تھی۔

”تمہیں کیا ہوا ہے؟“ وہ جو بے زاری سے تخت پر بیٹھی اماں کے پاس آ کر دراز ہو گئی تو انہوں نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا حالانکہ ان کی تمام تر توجہ خالہ صالحہ کے سفید دوپٹے پر روشنیہ بنانے میں تھی۔

”اماں! ہم یہاں کب تک رہیں گے؟“ وہ بے زاری سے کہتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ اماں نے بغور اسے دیکھا اس کے پورے وجود میں ایک اضطراب سا تھا۔ ایک بے کلی تھی جو محسوس ہوتی تھی۔

”کنزئی!.....!“ اماں نے ایسی نظروں سے اسے دیکھا تھا کہ وہ گڑبڑا سی گئی۔

”کیا ہوا ہے؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟“ اماں کے لہجے میں اب حقیقتاً تشویش جھلک رہی تھی۔

”نہیں اماں! کوئی گھر میں ہوگا تو کچھ کہے گا نا۔“ اس کے کھوکھلے لہجے پر اماں کے تیزی سے کروشیا چلاتے ہاتھ ٹھہرے گئے۔

”کنزئی تیرے ساتھ مسئلہ کیا ہے بچی! وہاں بہاد پور میں تو امجد علی کے اور اس کے بیٹوں کے بولنے پر پریشان رہتی تھی اور یہاں کسی کے کچھ نہ کہنے پر اور میں تو بہت کچھ سوچے بیٹھی ہوں۔ اگلے ہفتے میری تو بہاد پور واپسی ہو جائے گی اور پھر تو کیسے رہے گی۔“

”کیا مطلب؟“ وہ بری طرح چونکی۔ ”میں کہاں رہوں گی؟ اور آپ کہاں جا رہی ہیں؟“ اس نے قدرے بے اعتباری سے اماں کا چہرہ دیکھا جو کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

”ظاہر ہے بیٹا! ایک ماہ سے اپنا گھر چھوڑے بیٹھی ہوں۔ رات امجد علی سے میری فون پر بات ہوتی تھی۔ خاصا غصے میں تھا۔ کہہ رہا تھا کہ واپس آ جاؤ ورنہ فارغ کر دوں گا۔ اب اس عمر میں دوسری دفعہ تو اپنا گھر خراب نہیں کر سکتی۔ کم بخت کہہ رہا تھا کہ خود آ جاؤ مگر نظام الدین کی نشانی کو وہیں چھوڑ کر آنا۔ میرے گھر میں فالتو لوگوں کیلئے گنجائش نہیں ہے۔“

”تو اماں! میں کہاں رہوں گی؟“ کنزئی نے بے چینی سے سوال کیا۔

”یہاں! اور کہاں؟ بھائی شوکت اور اپنی خالہ صالحہ کے پاس۔ کنزئی! اپنی بچوں جیسی



”اچھا۔“ عمر نے دلچسپی سے پوچھا تو اماں اسے یقین دلانے کیلئے اس کے مختلف واقعات بتانے لگیں۔ اسے معلوم تھا کہ اب اماں کے آگے بند باندھنا ممکن نہیں سواکتا کر پاؤں پختی کمرے سے باہر نکل گئی۔



جس دن وہ آئی بی اے کا ٹیسٹ دے کر آئی اماں اپنی ساری پیکنگ کر کے بہاولپور جانے کو تیار تھیں۔ صرف اس سے ملنے کیلئے ڈرائنگ روم میں مہبانوں کی طرح بیٹھی تھیں۔ اسے پہلے ہی قدم پر دھچکا سا لگا۔ وہ تو پچھلے ایک ہفتے سے مختلف کتابوں میں کھوئی ہوئی تھی اس لئے اسے اماں کی تیاریوں کا پتا ہی نہیں چلا۔

”اماں آپ جارہی ہیں۔“ اس کا التجائیہ انداز اماں کو ترپا گیا۔

”ہاں پتر! تیرے انتظار میں تھی۔ اپنا خیال رکھنا اور خالہ صالحہ کو زیادہ تنگ مت کرنا ہر ہفتے میں خود ہی فون کرلوں گی اور دل تھوڑا مت کرنا۔ بیٹیاں کون سا ماں باپ کے گھر سدا رہتی ہیں۔ ایک نہ ایک دن تو انہیں گھر چھوڑ کر جانا ہوتا ہے۔ میں سمجھوں گی کہ میں نے بھی تمہیں رخصت کر دیا ہے۔ اللہ تمہاری قسمت اچھی کرے (آمین)۔“ اماں کے آبدیدہ لہجے پر اس کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔

”چلیں پھو! دیر ہو رہی ہے۔“ وہ شاید عثمان تھے جنہوں نے اماں کو مخاطب کیا تو وہ زبردستی ہنس کر بولیں۔

”ایک تو تمہارے باپ نے موئے جہاز کا ٹکٹ کٹا دیا ہے۔ مجھے تو ابھی سے ہول اٹھ رہے ہیں۔“

”پھو! کیوں ہول اٹھ رہے ہیں؟“ عمر بازو پر رسٹ واج باندھتے ہوئے تیزی سے اندر داخل ہوئے۔ اس نے بے ساختہ سوچا کہ اماں کی روانگی ماموں شوکت کیلئے خصوصی اہمیت کی حامل کیسے ہوگی جو تین تین بیٹے ایئرپورٹ پر جانے کو تیار ہیں۔ ابھی ابھی تو وہ علی کے ساتھ واپس آئی تھی۔

”سلطانہ! کنزئی کیلئے پریشان مت ہونا۔ خالہ بھی ماں کی جگہ ہوتی ہے۔“ خالہ صالحہ نے بے ساختہ اس کا سر کندھے سے لگا لیا۔ کنزئی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ خالہ صالحہ کے وجود سے اٹھتی خوشبو اسے بہت اپنائیت بھری لگی تھی۔

علی کے کہنے پر وہ بھی ایئرپورٹ جانے کیلئے تیار ہو گئی۔ جہاز کی روانگی تک اماں ان تینوں سے بے نیاز اسے نصیحتیں زمانے کی اونچ نیچ اور جانے کیا کچھ سمجھاتی رہیں ان کے جانے کے بعد کنزئی کے دل کو کچھ ہونے لگا کہ وہ کراچی جیسے بھرے شہر میں بالکل تنہا ہو گئی ہے اس نے بمشکل ضبط کیا تھا۔ اب اسے اماں کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔

”کیا ہوا؟“ علی نے معصومیت سے پوچھا۔

”بس اماں کی فکر تھی کہ اتنا لمبا سفر اکیلے کیسے کریں گی؟“ آنسو پیتے ہوئے وہ بمشکل بولی تو علی کی زوردار ہنسی پر کنزئی نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

”حیرت ہے آپ رہتی کس دنیا میں ہیں؟ عثمان بھائی پھپھو کے ساتھ بہاولپور گئے ہیں۔ انہیں کچھ کام تھا تو بابا نے کہا کہ پھپھو کے ساتھ چلے جائیں۔ ویسے بھی ہم بے شک کراچی جیسے بڑے شہر میں رہ لیں لیکن ذہن ہمارے ابھی بھی روایتی ہیں۔ ہمارے گھروں میں بہنوں بیٹیوں کو اکیلے بھیجنے کا کوئی رواج نہیں۔ صالحہ خالہ کو بھی کہیں شہر سے باہر جانا ہو تو ہم میں سے کوئی نہ کوئی ساتھ ہوتا ہے۔ حیرت ہے عثمان بھائی پھپھو کے ساتھ اندر گئے اور آپ کو پتا نہیں چلا۔“ علی نے اسے حیرانی سے سر سے پاؤں تک دیکھا تو وہ بے اختیار جھینپ گئی۔

”عمر بھائی! آپ کنزئی کو گھر ڈراپ کر دیجئے گا۔ مجھے فیکٹری میں ہونے والی پانچ بجے کی میننگ اینڈ کرنا ہے۔“

کلائی پر بندھی گھڑی میں ٹائم دیکھتے ہوئے علی نے مصروف انداز میں کہا تو انہوں نے ایک لمحے کیلئے سیل فون کان سے ہٹایا اور اثبات میں سر ہلا کر اسے جانے کا اشارہ کیا۔

ایئرپورٹ کی پارکنگ میں آ کر انہوں نے اس طویل کال کا اختتام کیا تھا۔ وہ ابھی اپنی گاڑی میں بیٹھنے بھی نہی پائے تھے جب گرے کلر کی بلینڈ تیزی سے ان کے پاس آرکی کوئی بہت غلٹ میں باہر نکلا تھا۔

اپنے سامنے جھنڈا کلر کی شارٹ سلیکو لیس شرٹ اور درخشاں ٹراؤزر میں دوپٹے سے بے نیاز آنکھوں پہ قیمتی گھاسز لگائے رو میلا قدرے ناراض سی ان کے سامنے تھی۔

نہ جانے کیوں محسوس ہوا تھا کہ اسے دیکھتے ہی عمر کا چہرہ تن گیا ہے۔

”اچھا تو یہ ہے تمہاری نئی مصروفیت۔“ وہ جلتے بھنے انداز میں کنزئی کو گھورتے ہوئے

بولی۔

”لیواٹ رومی! کیا ہو گیا ہے۔ میں پچھلے دنوں کام میں خاصا مصروف تھا، بینک کے حوالے سے ایک ڈیلی کیشن جاپان سے آیا ہوا تھا۔ اور میں صبح ہی سوچ رہا تھا کہ شام کو تمہاری طرف چکر لگاؤں گا۔“ وہ پوری سنجیدگی سے صفائی دے رہے تھے کنزٹی سر جھکا کر اپنی تھیلیاں ملنے لگی۔

”اچھا! یقین تو نہیں آتا۔“ وہ بے اعتباری سے بولی۔

”کم آن رومیلا!“ عمر نے قدرے اکتا کر کہا تو وہ زبردستی مسکرائی۔

”آج بینک نہیں گئے؟“

”نہیں، پھپھو بہاد پور جاری تھیں، اس لئے۔“

کنزٹی نے حیرت سے عمر کو دیکھا۔ اسے یقین نہیں آیا کہ اس کی اماں کی وجہ سے عمر نے چھٹی کی تھی۔

”یہ نہیں گئیں؟“ اس کا ٹیکھا لہجہ اور کھوجتی نظریں کنزٹی کو حسب سابق زہر لگیں۔

”ان کا نام کنزٹی ہے اور یہ یہیں رہیں گی کراچی میں۔ اصل میں ان کا ایڈمیشن ہو رہا

ہے ایم بی اے میں۔“

”کیوں؟ شہر میں سارے گزرتے ہوئے ختم ہو گئے ہیں کیا؟“ اس کے بظاہر مذاق میں کہے گئے جملے میں چھپے طنز کو عمر سمجھا تھا کہ نہیں لیکن کنزٹی کو اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی۔

”کمال کرتی ہو۔ ہمارے اتنے بڑے گھر کی موجودگی میں کنزٹی کو کیا ضرورت پڑی

ہے کسی ہوٹل میں رہنے کی اور اس صورت میں کہ جب وہ بابا کی فرسٹ کزن کی اکلوتی بیٹی

ہیں۔“ عمر کے سرسری لہجے پر رومیلا نے گھور کر اسے دیکھا تھا، کنزٹی کو جی بھر کے کوفت ہوئی۔

وہ دونوں کو نظر انداز کر کے گاڑی کا دروازہ کھول کر دھڑلے سے بیٹھ گئی اور بے زاری سے

رست واپج پر ٹائم دیکھنے لگی رومیلا نے کھا جانے والی نظروں سے پہلے گاڑی اور بعد میں عمر کو

دیکھا، جو محض کندھے اچکا کر رہ گیا تھا۔

”تم اس ڈرائیوری سے کب فارغ ہو گئے؟“ وہ دانستہ اونچی آواز میں بولی تھی۔

”بس گھر جا کر کھانا کھاؤں گا پھر بابا نے بلایا ہے آفس شام کو فارغ ہوں۔“

”اوکے“ میں کلب میں انتظار کروں گی۔“ وہ تن فن کرتی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی تو

عمر نے آکر ڈرائیونگ سنبھال لی، پھر ہلکے پھلکے لہجے میں گویا ہوئے۔

”یہ رومیلا تھیں، ہماری مدر کی فرسٹ کزن کی بیٹی۔“

وہ بے نیازی سے گاڑی کے باہر بڑک پر آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھنے لگی۔

”آپ کی پہلی رومیلا سے ملاقات ہوئی ہے؟“

”ہاں! ایک دفعہ جب آپ کی تلاش میں چھاپے مارتی پھر رہی تھیں تو علی نے تعارف

کر دیا تھا، لیکن ابھی تک ان سے گفتگو کا شرف حاصل نہیں ہوا۔“ کنزٹی کی سمجھ میں نہیں آیا

کہ اس کے ذکر پر اس کا لہجہ تلخ کیوں ہوا تھا۔ شاید اس نے پہلے دن سے اس پر اچھا امپریشن

نہیں چھوڑا تھا۔

”آپ کو اگر رومی کا سائل برا لگا ہے تو آئی ایم سوری.....“ عمر نے معذرت کی۔

”اصل میں وہ شروع سے ہی ایسی ہے، گھر میں سب سے چھوٹی اور لاڈلی ہے اس لئے

خصوصی توجہ نے کچھ ضدی اور اکھڑ بنا دیا ہے۔“

”مجھے تو محسوس ہوا ہے کہ ان کا مزاج سوائیزے پر ہی رہتا ہے، خیر مجھے کیا۔ میں ایسے

لوگوں کی پروا نہیں کرتی جو اپنے آگے کسی کو نہیں گردانتے۔“

عمر مسکرائے اور کچھ توقف کے بعد بولے۔

”مجھے تو لگتا ہے کہ آپ کسی کی بھی پروا نہیں کرتیں۔“

کنزٹی نے فوراً نفی میں سر ہلاتے ہوئے تردید کی۔ ”جی نہیں میں اپنی اماں کی بہت

پروا کرتی ہوں۔“

”اس لئے اکثر ان سے خفا رہتی ہیں۔“ اسے جھٹکا ہی تو لگا تھا عمر کی بات پر کچھ لمحے تو

اس سے بولا ہی نہیں گیا..... پھر سنبھل کر گویا ہوئی۔

”میں اماں سے نہیں اپنے حالات سے خفا رہتی ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کے کسی بھی

دور کو انجوائے نہیں کیا۔ بچپن میں جب ماں باپ اپنے بچوں کے لاڈ اٹھاتے ہیں اماں بھی اپنی

گلی بیٹی کو کونوں کھدروں میں چھپ کر پیار کرتی تھیں۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ اگر اماں

دوسری شادی نہ کرتیں تو ہم دونوں کتنے سکون سے رہتے، لیکن اب سوچتی ہوں کہ انہوں نے

ٹھیک کیا۔ آج کل کے دور میں ایک اکیلی عورت کیسے رہ سکتی تھی۔“

عمر نے شدید حیرت سے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

انہیں ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ اپنے احساسات کو اس طرح بیان کر جائے گی ورنہ اماں کے بولنے پر اس کے کوفت زدہ تاثرات کسی سے بھی چھپے نہیں تھے۔

”پھر بھی ان حالات میں اتنا پڑھنا کم از کم میرے لئے خاصا حیران کن ہے ورنہ تکلیف دہ حالات سے گزرنے کے بعد زیادہ تر لوگ احساس کمتری میں مبتلا ہو کر دنیا کو فیس کرنے سے گھبراتے ہیں۔ ماشاء اللہ آپ میں ایسی کوئی خامی نہیں۔ رات بابا اور صالحہ بھپھو کے درمیان آپ کے متعلق بات ہو رہی تھی بابا آپ کو ایم بی اے مکمل کرنے کے بعد اپنے بزنس میں لانا چاہتے ہیں۔“

”اچھا.....؟“ اس نے بے یقینی سے عمر کو دیکھا، انہیں بھی شاید اس کی سوچ کا ادراک ہو گیا تھا تب ہی کہا۔

”میں جھوٹ نہیں کہہ رہا، آپ بابا سے پوچھ سکتی ہیں۔“ جبکہ وہ جواباً خاموش ہی رہی۔



ٹیسٹ کلیئر کرنے کے بعد اس کا آئی بی اے میں ایڈمیشن ہو گیا تھا۔ وہ خاصی مصروف ہو گئی تھی، صبح شوکت صاحب جاتے ہوئے اسے انسٹیٹیوٹ چھوڑ جاتے، جوان کے آفس کے راستے میں تھا۔ واپسی پر ڈرائیور اسے لینے آ جاتا تھا، یونیورسٹی سے آنے کے بعد وہ صالحہ خالہ کے پاس کچھ دیر بیٹھتی۔ پھر شام کو اپنی پڑھائی میں گم ہو جاتی۔ نہ جانے کیوں اسے لگتا تھا کہ ایم بی اے کرنا اس کیلئے عزت کا مسئلہ ہے۔ اس دن وہ صبح یونیورسٹی جا رہی تھی جب اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹے شوکت صاحب نے سرسری لہجے میں کہا۔

”آج واپسی پر عمر تمہیں لینے آئے گا۔ اس کے ساتھ جا کر بینک میں اپنا اکاؤنٹ کھلوا لینا تمہاری مدر نے کچھ پیسے بھجوائے ہیں۔“

کسی کتاب میں گم کزنٹی بری طرح چونکی۔ اسے اب احساس ہوا کہ یونیورسٹی میں اس کا ایڈمیشن ہونے اور کتابوں اور نوٹس وغیرہ کے تمام مراحل کیسے طے ہوئے۔ علی نے آ کر بتایا تھا کہ ایڈمیشن ہو گیا اور عمر نے ایک دن کتابوں اور نوٹس کا ایک ڈھیر ملازمہ کے ہاتھ اس تک پہنچا دیا تھا۔ اسے مزید کسی کتاب کی ضرورت پڑتی تو عمر کی لائبریری سے آسانی سے مل جاتی تھی، اسے تردد کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ خالہ صالحہ بھی اکثر پوچھتی رہتی تھیں۔

وہ یونیورسٹی میں اپنے ڈیپارٹمنٹ سے کچھ کلاس فیلوز کے ساتھ نکل رہی تھی جب اس

نے علی کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کے گروپ نے بڑی مشکوک نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”یہ علی ہے میرا بھائی!“

اس کے پر جوش انداز پر علی کے چہرے پر مسکراہٹ جبکہ باقی سارے گروپ کی امیدوں پر اس پڑ گئی۔

”بندہ ڈشنگ ہے۔“ خولہ کی سرگوشی پر کزنٹی نے گھور کر اسے دیکھا تو وہ سب اس کا موڈ دیکھ کر خاموشی سے کینٹین کی طرف بڑھ گئیں۔

”لگتا ہے خاصی دوستی ہو گئی ہے۔“ علی نے اس کے گروپ کی تعداد کو دیکھتے ہوئے توصیفی لہجے میں کہا۔

”ظاہر ہے کزنٹی نظام الدین کے نوٹس صرف اس کی فرینڈز کیلئے ہیں۔ ہر ایرے غیرے کو قوتوڑی دیتی ہوں۔ اس لئے تعداد میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔“

اس کی آخری بات پر علی بے ساختہ ہنس پڑا اور پھر بری طرح ٹھٹھک گیا۔

”ارے یہ عمر بھائی کس کے ساتھ؟“ کزنٹی نے اس کی نظروں کے تعاقب میں براؤن بینٹ اور چاکلیٹ کمر کی شرٹ پہنے آنکھوں پر گلاسز لگائے عمر کو دوسری طرف جاتے دیکھا۔ ان کے ساتھ سرخ لباس میں یقیناً رو میلا تھی۔

”اودہ یہ تو رومی ہے.....“ علی بھی ڈھیلا ہوا۔

”تم سے بڑی ہیں تو تم ان کو آپی یا باجی کیوں نہیں کہتے۔“ کزنٹی نے ٹوکا۔

”توبہ کریں توبہ میں نے مار کھانی ہے۔ ایک دفعہ کہہ بیٹھا تھا پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئیں۔ ان سے بڑی بہن سبیلہ اس سے بھی زیادہ مامند کرتی ہیں۔“ اسے ہنسی آ گئی۔ اس کا اکاؤنٹ کھل گیا تھا، علی نے پچیس ہزار جمع کر دادیے تھے۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی اور شاید علی نے بھی محسوس کر لیا تھا، تبھی دانستہ لاپرواہی سے کہا۔

”سلطانہ پھپھو نے بھجوائے ہیں۔ بابا بتا رہے تھے کہ مٹی آرڈر آیا ہے۔“

اور وہ مر کے بھی یقین نہیں کر سکتی تھی کہ اماں کے پاس اتنی رقم کہاں آ سکتی ہے، وہ تو اسے ہوش بھی بمشکل دو ہزار تک بھجوا پاتی تھیں، وہ بھی گھر کے خرچ میں سے بچا بچا کے۔

وہ گھر آئی تو رو میلائی دی لاؤنج میں بے تکلفی سے براجمان تھی اور آج موڈ بھی خاصا بہتر تھا، تب ہی اٹھ کر کزنٹی سے ہاتھ بھی ملایا، پھر پوچھنے لگی۔



اس کے فرسٹ سسٹر کا رزلٹ آ گیا تھا اس کی فرسٹ پوزیشن سب کیلئے حیرت انگیز تھی۔ شوکت صاحب نے اس کے ناں ناں کے باوجود اچھی خاصی پارٹی کا اہتمام کر لیا تھا۔ خالہ صالحہ نے اس کیلئے خصوصی طور پر سفید سوٹ جس پر سفید ہی موتیوں کا کام تھا بوتیک سے خریدا تھا۔ وہ اسے اس فنکشن میں کسی سے کم نہیں دیکھنا چاہتی تھیں۔

”تمہارے بال تو ماشاء اللہ بہت پیارے اور گھنے ہیں۔“ اس کے گھٹنوں تک آتے لمبے بال دیکھتے ہوئے انہوں نے توصیفی لہجے میں کہا تو وہ مسکرا دی۔

کپڑے بدل کر ہلکے میک اپ کے ساتھ جب وہ باہر آئی تو صالحہ خالہ نے بے ساختہ اس کی پیشانی چوم کر ”ماشاء اللہ“ کہا۔ اسے فوراً اماں یاد آ گئی تھیں۔ سلیتے سے دوپٹہ پھیلانے وہ خالہ کے ساتھ انتظامات کا جائزہ لے رہی تھی جب بلیک ڈزرسوٹ میں اندر آتے شوکت صاحب اور عمرا سے دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔

”السلام علیکم ماموں.....!“ اس نے ہڑبڑا کر سلام کیا۔

”ماشاء اللہ آج لگ رہی ہے ناں میری بیٹی۔“ انہوں نے بے ساختہ اسے ساتھ لگا کر پیار دیا تھا۔

پھر کوٹ کی جیب سے والٹ نکال کر ہزار ہزار کے کچھ نوٹ صالحہ خالہ کی طرف بڑھائے۔

”آج میری بیٹی کا صدقہ ضرور دے دینا۔ کہیں نظر نہ لگ جائے۔“ ان کے لہجے میں محبت اور شفقت کے رنگ تھے۔

”خبردار وائٹ پری! رونا نہیں۔ مسکارا خراب ہو جائے گا۔“ علی نہ جانے کدھر سے آیا تھا اس کے گھر کتنے پر وہ سارے آنسو پی کر بمشکل مسکرائی۔ عمر مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ تھے۔ کنزئی کے دیکھنے پر بھی ان کی محویت ختم نہیں ہوئی تھی ان کی سرافتمی نظریں آج نہ جانے کیوں کنزئی کو اچھی لگ رہی تھیں۔

وہ سب نگاہوں کا مرکز بنی رہی، وہیں سیاہ رنگ کی ساڑھی میں سیلیویس بلاؤز بوائے کٹ بالوں والی عقیلہ آنٹی کو سرعام اسموکنگ کرتے دیکھ کر اسے دھچکا تو لگا۔ عجیب مرد مار قسم کی خاتون تھیں۔ ان کی دونوں بیٹیاں بھی اپنے بے باک لباس اور انداز سے لوگوں کی توجہ کا محور

”کیسی جا رہی ہے آپ کی سٹڈی؟“ رومیلا کے سوال پر وہ بے ہوش ہوتے ہوئے بچی۔

”فرسٹ کلاس۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”پتا نہیں یہ کامرس بزنس اکاؤنٹس کی خشک اور بور کتابیں تم لوگ کیسے پڑھ لیتے ہو مجھے تو علی اور عمر پر حیرت ہوتی ہے میرا تو ان بھاری بھر کم کتابوں کو دیکھتے ہی بی بی ہائی ہونے لگتا ہے۔“

”بندر کیا جانے اور ک کا مزا۔“ علی نے اس کے جواب میں لقمہ دیا تو وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ کنزئی خاموشی سے اٹھ کر ڈائننگ روم میں آ گئی جہاں صالحہ خالہ خاصے خراب موڈ کے ساتھ کھانا لگو رہی تھیں۔

”خالہ! طبیعت ٹھیک ہے؟“ اس نے پیچھے سے جا کر ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر زنی سے پوچھا تو وہ ایک لمحے کو خاموش ہو گئیں اور پاس پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

”اس گھر کے تو دستور ہی نرالے ہیں۔ نہ کسی کے آنے کے اوقات ہیں نہ جانے کے“

گھر کو سرائے سمجھ رکھا ہے۔ ابوبکر کی شادی کی کہ چلو گھر میں کچھ رونق ہوگی مگر بہو صاحبہ انگلینڈ میں ماں باپ کے گھر ضد لگا کر بیٹھی ہیں ابوبکر کو انگلینڈ میں براچ کھول کر دیں رات شوکت بھائی اور ابوبکر کے درمیان خاصا جھگڑا ہوا ہے اور اب وہ تیسرے نمبر والا عثمان کہہ رہا ہے کہ سبیلہ سے شادی کرنی ہے۔ فیشن کا چلتا پھرتا نمونہ زبان دراز اور سارے جہان کی پھوپھو ہزل کی۔ عقیلہ نے اپنی بیٹیوں کو اور کچھ نہیں لڑکے پھانسنے کے طریقے ضرور سکھائے ہیں۔

دوسری بلا میرے عمر کے پیچھے لگی ہے دیدوں میں حیا ہی نہیں۔ لڑکے بھی کیا کریں جب کنوین دائیں بائیں خود پھر رہے ہیں۔“

”خالہ! یہ عقیلہ کون ہے؟“ اس نے حیرت سے دریافت کیا آج اس پر نت نئے انکشاف ہو رہے تھے۔

”علی کی ماں کی خالہ زاد بہن ہے۔ میاں نے..... طلاق دے دی تھی اس کے بھین دیکھ کر اور اب اپنی دونوں سوغاتیں میرے بھائی کے بیٹوں کے پیچھے لگا دی ہیں۔“ صالحہ خالہ کا موڈ ٹھیک ٹھاک خراب تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ رومیلا ان کو نظر انداز کئے مسلسل عمر سے جو گفتگو تھی اور آج تو عثمان اور سعد بھی گھر پہ تھے۔ وہ خاموشی سے دیکھتی رہی۔



اگلے دن وہ یونیورسٹی نہیں گئی۔ اماں کا فون آیا تھا۔ اس کی پوزیشن کا سن کر رونے لگیں تو اس کا بھی دل خراب ہو گیا۔ ہونٹوں کو بے دردی سے کچلتے ہوئے وہ بے آواز رو رہی تھی۔ جب سعد اندر آیا تھا۔ میڈیکل کی موٹی سی کتاب اٹھائے وہ بری طرح ٹھٹھکا۔

”حیرت ہے میں تو سمجھتا تھا کہ آپ بہت بہادر ہیں۔“ وہ پہلی دفعہ اس سے مخاطب ہوا تھا، کنزئی نے تیزی سے تھیلی کی پشت سے آنکھیں صاف کیں۔

”آپ کو کس نے کہا؟“ وہ بھیکے لہجے میں بولی تو اس کے بچکانہ انداز پر سعد کے چہرے پر ایک مہربان سی مسکراہٹ ٹھہر گئی۔ وہ خاصا کم گوسا تھا اور زیادہ تر ہوشل میں رہتا تھا، ایک ہی شہر میں گھر ہونے کے باوجود بھی۔

”بھئی رات ڈنر میں جو آپ نے آذر حیات کی اچھی خاصی عزت افزائی کی ہے۔ میں اور عمر بھائی کچھ فاصلے پر کھڑے خاصے لطف اندوز ہوئے اور جب علی کو بتایا تو وہ بھی خوب ہنسا۔“

”یہ موصوف کون ہیں؟“ اس کے ذہن میں آذر کا چہرہ نمودار ہوا تو تلخ لہجے میں اس نے سعد سے پوچھا، جودلچسپ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”یہ رومیلا کے بڑے بھائی اور آنٹی عقیلہ کے اکلوتے صاحبزادے ہیں۔ بزنس کیونٹی کا ایک اہم نام۔“

”سبحان اللہ! یہ سارے ہی بہن بھائی ایسے ہیں؟“ اس کے طنزیہ لہجے پر سعد ایک دفعہ پھر خوشگوار انداز میں بولا۔

”کیسے ہیں؟“

”لچر، سوڑے اور خوش فہم۔“

”اودہ مائی گاڈ! اتنی مختصر اور جامع تعریف ہرگز کسی نے بھی عقیلہ آنٹی کے خاندان کی نہیں کی۔ مزہ آ گیا۔“ اس کے ہنسنے پر کنزئی کا موڈ بھی خاصا بہتر ہو گیا، اندر آتا ہوا علی اسے ہنسا دیکھ کر حیرت سے بولا۔

”ہائیں آج عید تو نہیں اور نہ ہی تمہاری مگیتر صاحبہ کی آمد متوقع ہے۔ میرا ڈاکٹر بھائی صرف ان دو موقعوں پر مسکراتا ہے اور آج تو قیقہ لگ رہے ہیں، لگتا ہے کنزئی نے لطیفہ

بنی رہیں۔

شوکت صاحب اسے مختلف بزنس کیونٹی کے لوگوں سے ملواتے رہے تھے۔ ان کا لہجہ فخریہ اور انداز میں شفقت نمایاں تھی۔

”اور وہیں بزنس ڈنر میں پہلی دفعہ آذر حیات کی بے باک نظروں کو اپنے وجود پر جما ہوا دیکھ کر وہ کوفت کا شکار ہوئی، ماموں شوکت کا لحاظ کئے بغیر وہ اس سے خواستوار فری ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ کھانے کے دوران اسے اکیلا دیکھ کر وہ پھر وہاں چلا آیا۔“

”میں نے بھی آئی بی اے سے ایم بی اے کیا ہے۔“

”تو پھر میں کیا کروں؟“ اس نے تپ کر دل میں سوچا تھا، لیکن خاموش رہی۔

”میرا خیال ہے کہ آپ خاصی ریزروسی پر سنالٹی ہیں۔“ وہ عجیب سے انداز میں ہنسا۔

”جی میں صرف سلیکھو لوگوں سے فرینک ہوتی ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ یہ میری خامی ہے، لیکن بعض اوقات میں سوچتی ہوں کہ یہ ایک اچھی عادت بھی ہے۔“

”اودہ ویری نائس! تو آپ ان سلیکھو لوگوں میں ہمیں شامل کرنا پسند کریں گی؟“ وہ بڑے پراعتماد انداز میں اس پر نظریں جما کر بولا تھا۔

”کیوں.....؟“ اس کے سرد لہجے پر وہ بری طرح چونکا۔

”اس لئے کہ ”آذر حیات“ کا بزنس کی دنیا میں ایک نام ہے۔ لوگ میری ذہانت کی مثالیں دیتے ہیں اور ایم بی اے کے بعد جب آپ اس فیلڈ میں آئیں گی تو میرا ساتھ آپ کیلئے خاصا مہلک فل ہوگا۔“ اس کے لہجے میں قافرنمایاں تھا۔

”پہلی بات تو یہ ہے مسٹر آذر حیات! میرا اشار ہرگز ان لوگوں میں نہیں ہوگا جو آپ کی ذہانت کی مثالیں دیتے ہیں، کیونکہ مجھے اپنا راستہ بنانا بہت اچھی طرح آتا ہے، رہی دوسری بات تو اس کیلئے بھی پیشگی معذرت، کیونکہ میں دوسروں پر انحصار کر کے اپنی کامیابیوں کے مینار بنانے والی لڑکی نہیں۔“

”ایکسکیوز می!“ عمر اچانک ہی سامنے آئے تھے۔ ”آذر! تم ڈنر نہیں کر رہے اور کنزئی آپ کو پھپھو بلا رہی ہیں۔“ عمر نے اس کے تپے تپے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے اسے وہاں سے ہٹایا۔ صالحہ خالہ کے پاس پہنچنے پر اسے معلوم ہوا کہ حقیقتاً عمر نے اسے اس منظر سے غائب کیا تھا۔

سنائے ہیں۔“ اور پھر سعد کے بتانے پر وہ بھی خاصا محفوظ ہوئے تھے۔

موسم تیزی سے بدل رہا تھا۔ بہار کی آمد آدھی۔ ہر طرف پھول خوش نما رنگوں میں کھلے نظر آتے تھے۔ شوکت دلا میں آج کل اداسی ٹھہر گئی تھی۔ ابوبکر اپنی مسز کے پاس انگلینڈ شفٹ ہو گئے تھے اور اس بات کو شوکت صاحب نے دل پر لے لیا تھا۔ انہیں ہلکا سا ہارٹ ایک ہوا تھا۔

کنزنی کا تیسرا سمسٹر چل رہا تھا، لیکن وہ سب کچھ بھلائے ان کی تیار داری میں لگی تھی۔ اس دن وہ کچھ بہتر تھے، جب بلیک سوٹ میں انتہائی پرمردہ اور نڈھال سی کنزنی کو انہوں نے آہستگی سے اپنے پاس بلایا۔

”کنزنی! ادھر آؤ بیٹے میرے پاس۔“

”کیا ہوا ہے بیٹے؟“ کنزنی نے بے اختیار ان کا ہاتھ تھام لیا، اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

”ماموں پلیز ٹھیک ہو جائیں۔“

”ارے میرا بیٹا گھبرا گیا۔“ انہوں نے متوحش سی کھڑی کنزنی کو اپنے ساتھ لگایا تھا، وہ ان کے کندھے سے سر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اندر آتے عمر بے اختیار ٹھٹھک گئے، صاف پھپھو کچھ دیر پہلے ہی گھر گئی تھیں اور اس وقت کمرے میں وہ شوکت ماموں کے ساتھ تنہا تھی۔ عمر کے پیچھے کھڑے آؤر حیات نے بھی حیرت سے یہ منظر دیکھا۔

”ارے میرا بیٹا تو بہت بہادر ہے۔ وہ نالائق ابوبکر اگر باپ کو تنہا چھوڑ گیا تو کوئی بات نہیں۔ دیکھنا ہم ماموں بھانجی کیسے بزنس کو ترقی دیتے ہیں۔ مجھے اپنی بیٹی کی صلاحیتوں پر اعتبار ہے۔“ انہوں نے مدھم لہجے میں اسے دلاسا دیا تو کنزنی کی سسکیاں اور بھی تیز ہو گئیں۔

”کنزنی! پلیز خود کو سنبھالیں!“ عمر نے بے اختیار کنزنی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دلاسا دیا۔ اس نے فوراً سر اٹھایا، پھر کمرے میں داخل ہوتے آؤر کو دیکھ کر اس نے لاشعوری طور پر اپنے دوپٹے کو پھیلایا تھا۔

”اوہ مائی گاڈ! میں تو مان ہی نہیں سکتا کہ آپ اتنی ایڈوٹل بھی ہو سکتی ہیں۔“ آؤرنٹی میں سر ہلاتے ہوئے بے یقینی سے بولا۔ وہ چپ رہی۔

”عمر! تم میری بیٹی کو گھر چھوڑ کے آؤ۔ رات سے ادھر ہے۔ دیکھو کتنی کمزور ہو گئی ہے۔“

عثمان ڈاکٹر شمس سے ملنے گیا تھا، ڈرا ان سے پوچھ کر بتاؤ کہ مجھ بوڑھے کو کب رہائی دیں گے۔ اور آؤر بیٹا! آپ یہاں آ کر بیٹھو۔ اسی دوران عثمان اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر بھی تشویش اور فکر مندی کے سائے تھے۔

”عثمان! ڈاکٹر شمس سے کہو کہ باقی ٹریٹمنٹ گھر آ کر دے دیں۔ میں اگر دو دن مزید یہاں رہا تو میری بیٹی بیمار ہو جائے گی۔ کنزنی بیٹے! گاڑی ڈرائیو کرنی تو آتی ہے نا؟“

بابا کے شکفتہ لہجے پر عثمان نے چونک کر ان کے پاس بیٹھی کنزنی کو دیکھا جو ٹشو سے سرخ ناک صاف کر رہی تھی۔

”آپ آج کل یونیورسٹی کیوں نہیں جا رہیں؟“ آؤر کی پرشوق نظریں اس کے وجود پر جمی ہوئی تھیں۔

”کیوں آپ کو نہیں پتا کہ میں کس وجہ سے نہیں جا رہی؟“ اس کے طنزیہ لہجے پر وہ ڈھٹائی سے ہنس پڑا۔ عمر نے چونک کر پہلے کنزنی اور پھر آؤر کی طرف دیکھا اور اسی وقت فیصلہ کر لیا۔

”چلو کنزنی! تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔“

وہ بھی فوراً جانے کیلئے تیار ہو گئی۔ واپسی کا راستہ خاموشی سے کٹا۔ گھر پہنچ کر سامنے اماں کو دیکھ کر اس پر شادی مرگ طاری ہو گئی۔

”اماں!.....!“ اس کے منہ سے بمشکل نکلا۔ وہ بھاگ کر ان کے گلے لگ گئی جبکہ اماں بھی والہانہ انداز میں اس کا منہ چوم رہی تھیں۔

”اماں! آپ کمزور ہو گئی ہیں؟“ اس نے فکر مندی سے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا تو وہ پھیکی سی ہنس کر بولیں۔

”بس بچے! اب کمزور ہی ہوتا ہے، عمر ہی ایسی ہے تم بتاؤ تمہارا سکول کیسا جا رہا ہے؟“

”اماں سکول نہیں یونیورسٹی۔“ اس کی تصحیح پر اماں سادگی سے بولیں۔

”بیٹا! وہی میں نے تو ساری زندگی سکول کی بھی شکل نہیں دیکھی۔ مجھے کیا پتا اور میری بیٹی کا دل تو لگ گیا تھا نا؟“ وہ چہرے پر تشویش لئے اسے غور سے دیکھ رہی تھیں۔

”لودل کی کیا خوب کہی شوکت بھائی کی لاڈلی ہے، سعد اور عمر آتے جاتے اس کا حال احوال پوچھتے ہیں اور علی کے ساتھ خوب دوستی ہے اس کی۔ اور تو اور رات عثمان بھی کہہ رہا تھا

کہ پھوپھو کنزئی کو ہسپتال سے واپس بلا لیں کہیں بیمار نہ ہو جائے۔ میری بیٹی کی جان انکی ہوئی تھی بیمار ماموں میں۔“ خالہ صالحہ نے بے اختیار اس کا ماتھا چوما تھا۔

”اور عقیدہ نہیں آئی کیا؟“ اماں کے آہستگی سے پوچھنے پر خالہ صالحہ بلبللا اٹھیں۔

”ارے سلطانہ! کس کا ذکر کر دیا۔ اس کی وجہ سے تو گھر میں فساد پھیلنا ہوا ہے۔ ایک ہمارا بچہ ابو بکر ہمیں چھوڑ کر انگلینڈ چلا گیا۔ دوسرے اس کی چلتر بیٹیاں میرے بھتیجیوں کے پیچھے پڑی ہوئی ہیں۔ پتا نہیں کیا جادو کیا ہے جو عثمان کی ایک ہی رٹ ہے کہ شادی کروں گا تو سبیلہ سے شوکت بھائی تو بالکل نہیں مان رہے۔ پتا نہیں کیا بنے گا۔“

ہاتھ میں پکڑی تسبیح کو زور زور سے گھماتی خالہ صالحہ کے لہجے میں تنگی نمایاں تھی۔

”اوہ.....!“ کنزئی کو ماموں کی بیماری کی ساری وجہ سمجھ میں آ گئی۔

”وہ دوسری پڑیل جوان جہان لڑکے کے کمرے میں ٹھکی رہتی ہے میرے عمر کو اتنی عقل کہاں کہ ان کم بختوں سے بٹ سکے۔“ خالہ صالحہ کا اشارہ یقیناً رومیلا کی طرف تھا۔

”تو جوان جہان بیٹا نہ لفٹ کر دائے۔“ کنزئی کے ذہن میں تلخ سا خیال ابھرا لیکن وہ خاموش رہی۔ اماں تو دو دن رہ کر چلی گئیں، لیکن اسے اداس کر گئی تھیں۔ اس کی پڑھائی کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا تھا، اس نے مسلسل تیسرے سمسٹر میں بھی ٹاپ کیا تھا اور شوکت صاحب نے اسے زیرو میٹر سوز کی کارگفت کی تھی۔ وہ کافی دیر بے یقینی سے کار پر ہاتھ پھیر پھیر کر دیکھتی رہی۔ اسے حقیقتاً یہ تھکے بہت اچھا لگا تھا۔



اس دن وہ کیسپس سے آئی تو پورچ میں شوکت صاحب، عثمان، عمر اور علی کی گاڑیاں دیکھ کر اس نے رسٹ وایج میں ٹائم دیکھا جو دوپہر کے تین بج رہی تھی۔ اس وقت پر وہ کم ہی اکٹھے ہوئے تھے۔ وہ کچھ سوچتی ہوئی اندر آ گئی، جب ٹی وی لاؤنج میں شوکت صاحب کی تیز آواز سن کر وہ ٹھٹھک کر وہیں رک گئی۔

کنزئی کا دل بری طرح دھڑکا۔

”خبردار اگر کسی نے کنزئی کا نام بھی لیا تو“ میں نے اسے بھانجی نہیں بیٹی بنا کر اس گھر میں رکھا ہے اور اس کے تمام تر فیصلے کرنے کا حق بھی میں رکھتا ہوں۔ اس کی ماں، میرے ہاتھ میں اس کا ہاتھ تھا کر گئی تھی۔“

”لیکن بابا! آپ کنزئی سے پوچھ کر تو دیکھیں۔“ عثمان نے لجاجت سے ان سے منت کی تو ہاتھ اٹھا کر بولے۔

”میں جانتا ہوں بہت اچھی طرح کنزئی کو وہ ہر چکتی چیز کو سونا سمجھنے والی لڑکی نہیں۔“

بہت سمجھدار بچی ہے سمجھے۔“

”لیکن بابا! آذر جیسے لڑکے کو کوئی لڑکی آسانی سے نظر انداز نہیں کر سکتی۔“ وہ کمزور لہجے میں بولا۔ کنزئی کی سانسیں رکنے لگیں، سارا معاملہ اسے سمجھ میں آنے لگا تھا۔

”کیوں آذر میں کون سے ہیرے جڑے ہوئے ہیں اس کا بزنس اس کی ”محنت“ سے

کم اس کی ماں اور بہنوں کی ”محنت“ سے زیادہ چل رہا ہے۔“

”بابا! آپ الزام لگا رہے آئی اور سبیلہ لوگوں پر۔“ عثمان بھڑک اٹھا۔

”تو بیٹا یہ الزام تو بزنس کمیونٹی کا ہر بندہ لگا رہا ہے۔ تم کس کس کو روکو گے۔“ بابا نے

اسے آئینہ دکھایا تو وہ کھوکھو کے رہ گیا۔

ماموں نے ایک دم ہی اطمینان بھرا سانس لیا تھا جبکہ عمراور علی کے چہرے کے تاثرات میں بھی واضح تبدیلی آئی تھی، مگر عثمان کے چہرے پر ایک تاریک سا سایہ دوڑ گیا، وہ خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔



آج شام کو کافی دن کے بعد وہ لان میں نکلی تھی۔ ڈوبتے سورج کا منظر اسے بھی اداس کر گیا۔ اندھیرا بڑی تیزی سے پھیل رہا تھا۔ وہ جوتے اتار کر گھاس پر چلنے لگی۔ لان کے کونے میں لوہے کی باڑ کے اندر دو مورا اداسی سے ٹہل رہے تھے۔ اسے یاد آیا کہ علی پچھلے ہفتے انہی موروں کے جوڑے کا ذکر کر رہا تھا۔

”کیا ہوا اداس ہو.....؟“ عمر نہ جانے کب اس کے پیچھے آکھڑے ہوئے۔

”پتا نہیں.....“ اس نے افسردگی سے کہا۔

”آپ نے بہت اچھا کیا جو آذریات کے پرپوزل سے انکار کر دیا۔“

”اچھا.....؟ حالانکہ میرا خیال ہے کہ آپ کو ذاتی طور پر وہ فیملی خاصی پسند ہے اور آپ کا ووٹ بھی ادھر ہوگا۔“ وہ قنوطیت سے گویا ہوئی جبکہ اس کے اس انداز پر عمر بری طرح چونکے۔

”ضروری نہیں کہ آپ کا ہر خیال درست ہو۔“ وہ صاف گوئی سے بولے۔

”کیا عثمان بھائی مجھ سے ناراض ہیں؟“ بے اختیار کنزئی کے منہ سے پھسلا۔

”کیوں؟ وہ کیوں ناراض ہونے لگے؟ اپنی زندگی کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار

ہر شخص کو ہے۔ کیا عثمان نے کچھ کہا؟“

”نہیں میں نے ایسے ہی اندازہ لگایا تھا۔“ اس نے فوراً عمر کی غلط فہمی دور کی۔

”سبحان اللہ! کیا بات ہے آپ کے اندازوں کی، ویسے بائی داوے میرے بارے

میں آپ کے اندازے کیا کہتے ہیں؟“ عمر کا لہجہ گہرا اور آنکھوں میں ان کے کبے جذبے ہلکورے

لے رہے تھے، کنزئی کا دل کسی خوشگوار احساس سے دھڑک اٹھا، قدرے جھینپ کر اس نے

نظریں چرائیں۔



اگلے دن کیسپس میں عمر کو دیکھ کر وہ حیران ہوئی اور سینا روم میں سٹیج پر پروفیسرز کے

”تم سمجھا دو اپنی عقلیہ انٹی اور ان کے بیٹے آذر کو اگر وہ آرام ہے اپنی بیٹی کا رشتہ تمہیں دیتے ہیں تو ٹھیک ہے لیکن اگر وہ اس شرط پر رشتہ کریں گے کہ میں ان کے آوارہ مزاج بیٹے کو کنزئی کا رشتہ دوں گا۔ آئی ایم سوری۔ میری بھانجی فالتو نہیں ہے اور نہ ہی ان کی بیٹی سبیلہ اس قابل ہیں جو میں تمہارے رشتے کی خاطر ان کی یہ فضول شرط مان لوں۔“

اس کا دل ایک دم کسی نے مٹھی میں لیا تھا۔ وہ قصداً انجان بن کر ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوئی تھی، صاف صوفے پر انتہائی غصے میں شوکت صاحب اور ان کے ساتھ افسردہ سی صالحہ خالہ بیٹھی تھیں، ایک صوفے پر عمر، علی اور سعد تھے جبکہ دوسری طرف کے سنگل صوفے پر عثمان انتہائی اضطرابی انداز میں بیٹھا تھا، وہ سب اسے دیکھ کر بری طرح چونکے تھے۔ اس نے ایک نظر میں پورے کمرے کے سروماحول کا جائزہ لیا۔

”ادھر آؤ کنزئی بیٹی! میرے پاس.....“ شوکت صاحب کے لہجے میں واضح طور پر تبدیلی آئی تھی۔ وہ سنبھل کر ان کے پاس جا بیٹھی۔

”بیٹا! تمہیں مجھ پر بھروسہ ہے؟“

اس نے نہ سمجھنے والے انداز میں انہیں دیکھا۔

”تمہارے لئے آذریات کا پرپوزل آیا ہے۔ تمہاری کیا رائے ہے اس کے متعلق؟“

عثمان نے اضطرابی انداز میں پہلو بدلا۔ وہ خود بھی ان کے دو ٹوک انداز پر ڈر گئی۔

”ہاں بولو بیٹا! تمہاری رائے میرے لئے نہایت اہم ہے۔“ ان کے اکسانے پر وہ دھیمے مگر مضبوط لہجے میں بولی۔

”ماموں جان! میں نے آپ کو ہمیشہ اپنے باپ کی جگہ دیکھا ہی نہیں سمجھا بھی ہے۔

میرے لئے آپ کی رائے اہم ہے۔ ظاہر ہے ایک باپ اپنی بیٹی کیلئے کوئی غلط فیصلہ نہیں

کر سکتا۔“ ماموں نے فخریہ انداز سے عثمان کی طرف دیکھا۔

”آپ کی آذریات کے متعلق کیا رائے ہے۔ وہ اچھا خاصا ایجوکیڈ اور اسٹیبلش بندہ

ہے۔“ عثمان نے اب کہ خود پوچھا تھا جبکہ کمرے میں موجود تمام افراد خاموش تھے۔

”اگر ماموں کو پسند ہے تو ٹھیک ہے لیکن.....“ وہ رکی۔

”لیکن کیا.....؟“ عمر بے اختیار بولے تھے۔

”لیکن ذاتی طور پر مجھے وہ شخص پسند نہیں۔“ اس نے انک انک کر کہا۔



درمیان اسے بیٹھے دیکھ کر وہ گرتے گرتے پچی۔ بینکنگ کے حوالے سے ان کا لیکچر خاصا مفید اور اہم تھا۔

”عمر شوکت کا لیکچر ہر سال بڑا جامع اور آسان الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے۔“ خولہ نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی ساتھ بیٹھی حمنی کو بتا رہی تھی۔

”موصوف آئی بی اے کے گولڈ میڈلسٹ ہیں اور اسپیشلائزیشن کر کے آئے تھے۔ اور بہت چھوٹی عمر میں ”سٹیٹ بینک“ کے آڈٹ ڈیپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہیں اپنے مضمون پر انہیں کمائڈ حاصل ہے اور سب سے اہم بات ”ان میر ڈیٹیں“ بات کے اختتام پر حمنی کا لہجہ شرارتی ہو گیا۔ کنزلی کا بے اختیار جی چاہا کہ وہ عمر کے حوالے سے اپنا رشتہ ان کو بتائے لیکن دانستہ خاموش رہی تاہم سیمینار کے آخر میں انہیں خود بخود پتا چل گیا تھا جب عمر بڑے استحقاق سے اس کی جانب آئے اور وہ جو اپنے گروپ کے ساتھ خوش گپیوں میں مگن تھی انہیں اپنے سر پر کھڑا دیکھ کر بوکھلا کر رہ گئی جبکہ وہ بے نیازی سے پوچھ رہے تھے۔

”کنزلی! اپنی گاڑی پر آئی ہو یا بابا کے ساتھ؟“

”صبح تو بابا کے ساتھ ہی آئی تھی کیوں؟“ اس کا اعتماد بحال ہوا۔

”میں گھر ہی چل رہا ہوں چلتا ہے تو چلو کیونکہ بابا کو پتا ہے کہ میرا آج تمہارے ڈیپارٹمنٹ میں لیکچر ہے۔ وہ سمجھیں گے کہ تم میرے ساتھ جاؤ گی۔ اس لئے شاید وہ ڈرائیور نہ بھجوائیں۔“ اپنی بات مکمل کر کے انہوں نے اسے بغور دیکھا جو فیروز کی کلر کے سوٹ میں دوپٹہ سلیقے سے اوڑھے خاصی نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ اس کے آس پاس کھڑی لڑکیاں خاصی حیرانی سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔

”اب ہمیں پتا چلا کہ کنزلی کے ٹاپ کرنے کی وجہ آپ ہیں۔“ حمنی نے بڑے بے تکلفانہ انداز میں کہا تھا۔

”کیا مطلب؟“ وہ الجھ گئے۔

”ظاہر ہے آپ سٹڈی میں کنزلی کی ہیلپ کرتے ہوں گے تب ہی اس کے نوٹس اتنے جامع ہوتے ہیں۔“ عمر نے ایک نظر اس کے تپے تپے چہرے پر ڈالی اور شرارت سے بولے۔

”بھئی آپ کی کنزلی صاحبہ کسی سے نہیں پڑھتیں یہ تو خود مجھے پڑھاتی ہیں۔“

”اچھا.....!“ وہ سنب بے ساختہ ہنس دیں۔

آج تو کنزلی کا موڈ بھی خاصا بہتر تھا۔ عمر اپنے کی جاننے والے سے مل رہے تھے۔ وہ تیز قدم اٹھاتی پارکنگ کی طرف چل دی تھی جب اچانک آذر اس کے سامنے آیا تھا۔ وہ ٹھٹھک گئی۔

”آپ نے میرے پر پوزل سے انکار کیوں کیا؟“ اس کے لہجے میں عجیب سی سرد مہری تھی۔ وہ شاید عمر کی موجودگی سے بے خبر تھا۔

”کیونکہ مجھے آپ سے شادی نہیں کرنی تھی۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

”تم کیا سمجھتی ہو خود کو.....؟“ وہ تسخرانہ انداز میں بولا۔

”جو میں ہوں وہی سمجھتی ہوں۔ کم از کم آپ کی طرح اور اسٹیٹیٹ نہیں کرتی خود کو۔“ ”ٹھیک کہتی ہیں ماما کہ تم انکل شوکت کی کروڑوں کی جائیداد پر نظر رکھے ہوئے ہو۔ کوئی نہ کوئی بیٹا تو پٹے گا ہی۔ وہی مڈل کلاس لڑکیوں والی راتوں رات امیر ہونے والی سوچ۔“ اس نے سفاکی سے کہا جبکہ کنزلی اس کی بات پر تلملا اٹھی۔

”کنزلی کی ماں ایسی عورت نہیں ہے جو اپنی بیٹی کو بے ہودہ ہتھکنڈے سکھائے۔ تم کنزلی سے ڈائریکٹ بات کرنے کے بجائے گھر آ کر ہم سے بات کرو تو زیادہ بہتر ہوگا۔“ عمر کی آواز پر آذر بے اختیار کھساہٹ کا شکار ہوا تھا جبکہ کنزلی کے حلق میں آنسوؤں کا گولا چھپنے لگا۔

وہ جیسے ہی شوکت والا میں داخل ہوئے تو انہیں پورچ میں کھڑی گاڑیوں سے غیر معمولی پناہ کا احساس ہوا وہ جیسے ہی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو ٹھٹھک گئے۔ خالہ صالحہ منہ پر دوپٹہ رکھے بے آواز رو رہی تھیں۔ شوکت صاحب بھی خاموش اور نڈھال سے تھے جبکہ عثمان اور علی کی آنکھوں میں بھی رنجیدگی صاف پڑھی جا رہی تھی کنزلی کو دیکھ کر خالہ صالحہ کی سسکیاں مزید تیز ہو گئیں۔

”کیا ہوا خالہ؟“ اس کی آواز کانپ رہی تھی جبکہ خالہ اسے گلے سے لگا کر اونچی آواز میں رونے لگیں۔

”خالہ کیا ہوا ہے؟“ وہ متوحش سی ان سے پوچھ رہی تھی۔ بے اختیار شوکت صاحب نے اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور گلوگیر لہجے میں بولے۔

”سلطانہ چلی گئی تمہیں چھوڑ کر تین دن ہو گئے“ اسے فوت ہوئے اور کسی نے ہمیں بتایا ہی نہیں۔“

”کیا.....“ حیرت اور صدمے سے وہ گنگ رہ گئی۔ ابھی پندرہ دن پہلے اماں اس سے ملی تھیں اسی صوفے پر جہاں نڈھال سے شوکت صاحب بیٹھے تھے۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد وہ ہوش و حواس سے بیگانہ تھی۔



آج پورے پانچ دن کے بعد اس کی طبیعت کچھ سنبھلی تھی۔ خالہ صالحہ کو دیکھتے ہی اس کی آنکھیں برسنے لگتیں۔

”خالہ! اماں کیسے جاسکتی ہیں؟ ابھی تو میں نے ان سے جی بھر کے لاڈی بھی نہیں کئے تھے۔ ساری زندگی ان کو اپنے دوسرے شوہر کا خوف رہا۔ کبھی گھر میں مجھے کوٹھریوں میں چھپاتیں تو کبھی ہوسٹل بھجوا دیتیں۔ انہوں نے ایک بھی لمحہ سکھ کا نہیں گزارا ابھی تو میں نے جاب کر کے اپنا علیحدہ گھر لینا تھا۔ ماں کے رشتے کو محسوس کرنا تھا اور وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔“ وہ بے تحاشا رو رہی تھی۔

صالحہ خالہ نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

”سلطانہ کو شاید پتا تھا کہ اس کو چلے جانا ہے۔ تب ہی بچھلی دفعہ وہ اپنے زیورات، کچھ رقم اور گھر کے کاغذات میرے حوالے کر گئی تھی۔“

”بس کریں پھپھو! آپ اسے مزید رلا رہی ہیں۔“ عمر نے آکر بیچ میں مداخلت کی۔ جس پر کنزلی اپنے آپ کو سنبھالنے لگی۔

”ساری زندگی اماں مجھ سے جھوٹے وعدے کرتی رہیں۔ کبھی کہتی تھیں کہ ہوسٹل سے آؤ گی تو ہم ماں بنی حیدر آباد والے گھر میں ایک مہینہ اکٹھے گزاریں گے۔ کبھی کہتی تھیں میں تم سے ملنے ہوسٹل آؤں گی۔ ساری زندگی مجھے بہلا دے دیئے۔ آخری دفعہ جاتے ہوئے کہہ رہی تھیں کنزلی تمہاری اچھی سی جاب ہو جائے تو پھر میں تمہارے پاس ہمیشہ کیلئے آ جاؤں گی اور اب خاموشی سے چلی گئیں۔ کبھی نہ آنے کیلئے۔“ وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔

”بس بیٹا! اللہ اسے اگلے سفر میں آسانیاں دے۔ میں نے تو یونہی تمہارے پڑوس میں فون کیا تھا۔ سلطانہ کا فون آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا اور وہیں سے اطلاع ملی کہ اسے تو یہ دنیا

چھوڑے تین دن ہو گئے ہیں۔ پھر بھائی شوکت نے بھی فون کر کے کنفرم کیا۔ مجھے تو امجد علی پر افسوس ہو رہا ہے کہ سگی بیٹی تک کو اطلاع نہیں دی۔“

”خالہ مجھے ایک دفعہ بہاد پور جانا ہے۔“ اس نے اچانک ہی فرمائش کی تھی۔

پھر شوکت صاحب اور عمر کے ساتھ بہاد پور کے اس جانے پچانے محلے میں داخل ہوتے ہی اس کی طبیعت خراب ہونے لگی تھی۔

سبز لکڑی کے دروازے کو پار کر کے ڈیوڑھی سے صحن میں داخل ہوتے ہی اس کی آنکھیں برس پڑیں۔ سامنے برآمدے کے ایک کونے میں سرخ اینٹوں کا چولہا دہیں تھا جہاں اماں بیٹھا کرتی تھیں۔ گھر کے دونوں کمروں کے دروازے کھلے تھے۔ ایک کمرے سے میلا سا کرتا اور دھوتی پہنے اندر سے نمودار ہونے والے امجد علی کیلئے یہ مہمان غیر متوقع تھے۔ شوکت صاحب اور عمر کی شخصیت اور کھلے دروازے کے باہر کھڑی گاڑی ان کو مرعوب کرنے کیلئے کافی تھی۔ ان کا چھوٹا بیٹا بھی ہڑبڑا کر باہر نکلا۔ امجد علی کھسیا ہٹ کے مارے اپنے کندھے پر پڑے صافے سے برآمدے میں پڑی کرسیوں کو جھاڑنے لگا۔

”بس جی پتا ہی نہیں چلا سلطانہ بیگم کی موت کا رات کو بازو میں درد کی شکایت کر رہی تھی، میں نے حکیم سے پڑی لا کر کھلائی۔ آدھی رات کو بس دیکھتے ہی دیکھتے چٹ پٹ ہو گئی، ڈاکٹر کہتا ہے کہ ہارٹ ایٹک ہوا تھا۔“

وہ نڈھال قدموں سے دائیں طرف کے کھلے دروازے سے کمرے میں آ گئی، جوان کے زیر استعمال تھا۔ ان کا لوہے کا ٹریک کھول کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ سامنے ہی ان کا بزرگڑ کا سوٹ سلیقے سے تہہ کیا رکھا تھا، جو آخری دفعہ کراچی آتے ہوئے انہوں نے پہنا تھا، کونے میں اماں کی کانچ کی چوڑیاں، دنداسہ پاؤڈر اور کچھ اور استعمال کا سامان تھا، وہ روتے روتے فرش پر بیٹھ گئی اندر آتے عمر نے تاسف سے اسے دیکھا تھا۔

”کنزلی!.....!“ اس کے تنہی انداز پر اس نے بے دردی سے اپنی آنکھوں کو مسلا۔ اس تین مرلے کے گھر میں ہر طرف اماں کی خوشبو تھی۔

”نندو! مرنے والی کو تجھ سے بہت محبت تھی۔ اسے تکلیف ہو گی۔“ امجد علی کی ہمدردی پر کنزلی کا دل چاہا کہ پلٹ کر اسے جواب دے کہ جب زندگی میں اس کی تکلیف کا احساس نہیں کیا تو اب کیوں کر رہے ہو؟ لیکن وہ خاموش رہی۔

میں شوکت صاحب کی طرف دیکھا جو مسکرا رہے تھے۔

”بہت اچھا کیا بیٹا! تم نے وہ کاغذات ان کو دے دیئے۔“

”بس ماموں! انہوں نے اماں کا آخری تحفہ مجھ تک پہنچا دیا اور امانت میں خیانت نہیں کی، جس کی مجھے ان کی طرف سے توقع نہیں تھی۔ اس لئے میرا دل چاہا کہ میں انہیں کچھ زیادہ بہتر چیز دوں تاکہ وہ میری اماں کو ہمیشہ اچھے الفاظ میں یاد کریں۔“ وہ سادگی سے مسکرائی اور یہ پہلی مسکراہٹ تھی جو عمر نے اس کی ماں کی وفات کے بعد کنزئی کے چہرے پر دیکھی تھی۔

”پتا ہے ماموں! اماں کے شوہر نے پہلی دفعہ کوئی چیز اپنے ہاتھ سے اپنی مکمل رضامندی سے دی ہے، مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آ رہا۔“

”فکرمات کرو کاغذات لے کر وہ بھی ابھی تک بے یقین ہوں گے۔“ عمر نے ہلکے ہلکے لہجے میں کہا۔

”بابا! وہ جو آپ نے امجد صاحب کے گھر میں میری شادی کی بات کی تھی، اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“ عمر کے شرارتی لہجے پر ماموں شوکت بے ساختہ ہنس دیئے۔

”کون سی بات.....؟“

”کنزئی یاد کرو! واؤ نا.....؟“ عمر کے ذومعنی لہجے پر وہ بری طرح جھینپ گئی۔

”لو ایک صاحبزادے کے سر سے عشق کا بھوت اتر ا اور دوسرے پر چڑھ گیا۔“ وہ کھل کر ہنسے۔

”کیا مطلب بابا.....؟“ عمر نے مصنوعی ناراضی سے کہا۔

”بھئی وہ عثمان کی نہ ہونے والی ماڈرن ساس عقیلہ صاحبہ کو میں نے عثمان کو عاق کرنے کی دھمکی دی تو انہوں نے فوراً راستہ بدل لیا۔ آج کل سیبلہ صاحبہ ہمدانی صاحب کے امریکہ پلٹ بیٹے کے پیچھے ہیں جو ہمدانی کی کروڑوں کی جائیداد کا تنہا وارث ہے۔“

”اچھا تب ہی آپ اتنا ریلیکس ہیں۔“ عمر نے بھی اطمینان بھرا سانس لیا۔

”ہاں مزید ریلیکس تب ہوں گا جب کنزئی کی ماں کی بات کا پاس رکھوں گا، بیٹا! تمہارا اس نالائق کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ انہوں نے پلٹ کر اسے دیکھا جو پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔

برآمدے میں شوکت صاحب اور عمر خاموشی سے ہاتھ میں کولڈ ڈرنکس تھامے بیٹھے تھے۔ وہ خاموشی سے صحن میں پڑی چار پائی پر بیٹھ گئی۔ اس کی طرف دیکھ کر امجد علی بڑے خوشامدی لہجے میں بولا۔

”میں نے تو کہا تھا سلطانہ سے کہ کنزئی کا نکاح میرے بیٹے سے کر دے، گھر کی لڑکی گھر میں رہ جائے گی۔ وہ بولی کہ اس کی مگنی میں نے بچپن ہی میں کراچی میں کر دی ہے اور پھر غصے میں اسے کراچی چھوڑ آئی۔ اب کہہ آئی تو کہہ رہی تھی کہ کنزئی کا نکاح اس کے ماموں نے کہیں کر دیا ہے اور وہ بہت خوش ہے۔“

وہ تینوں ہی اس بیان پر بری طرح چونکے تھے۔

”جانے کون سے حالات تھے جن سے مجبور ہو کر اماں نے یہ جھوٹ بولا تھا۔“ وہ سوچ کر ہی اسے رونا آنے لگا۔

”ہاں! میرے بیٹے سے ہی ہوا ہے کنزئی کا نکاح، یہ جو تمہارے سامنے بیٹھا ہے اس سے۔“ شوکت صاحب کے پر اعتماد لہجے پر کنزئی کو شاک لگا۔ اس نے الجھن بھری نظروں سے انہیں دیکھا جبکہ عمر بھی خاصا پرسکون تھا۔ امجد علی اور اس کا بیٹا خاصے مرحوب انداز میں انہیں دیکھ رہے تھے۔

ان سے پوچھ کر اس نے اماں کی استعمال شدہ چیزیں ایک بیگ میں ڈال لیں۔ تھوڑی دیر بعد امجد علی نے ایک شاپر لاکر اسے پکڑا لیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”یہ دو لان کے سوٹ ہیں۔ ساتھ والی ہمسائی بتا رہی تھی کہ ایک ہفتہ پہلے اتوار بازار سے وہ اس کے ساتھ تمہارے لئے لائی تھی، لیکن زندگی نے مہلت نہیں دی۔“

وہ شاپر پکڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

گاڑی میں سامان رکھ کر وہ پلٹی اور اپنے بیگ کو کھول کر کچھ کاغذات نکالے اور امجد کی طرف بڑھا دیئے۔

”یہ اماں کے حیدر آباد والے گھر اور دکانوں کے کاغذ ہیں۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ آپ بچ کر یہ گھر ٹھیک کروا لیجئے گا یا کوئی کاروبار کر لیجئے گا۔“

امجد علی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

وہ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی اور آنکھیں صاف کرتے ہوئے اس نے پرسوج انداز

”وہی جو آپ کا ہے۔“ آہستہ سے کہہ کر اس نے سر جھکا لیا۔  
 ”کیا مطلب.....!“ عمر نے اسے بری طرح گھورا جن کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

”بیٹا! میرا خیال تو نیک ہے۔“ وہ خاصے شکفتہ لہجے میں بولے۔

”تو میں بھی تو آپ ہی کی بیٹی ہوں۔“ اس کے ڈپلومیٹک جواب پر وہ دونوں ہی بے ساختہ مسکرا دیئے۔

کنزنی نے پرسکون ہو کر گاڑی کی پشت سے ٹیک لگا لیا آنکھیں بند کرتے ہی دو آنسو پلکوں پہ آٹھ پڑے اسے لگا تھا کہ اللہ نے اس کی ماں کی عمر بھر کی ریاضت اور دعاؤں کو قبول کر لیا تھا اور جس کے صلے میں اسے ایسے گھر سے نوازا دیا جہاں بے شمار خوشیاں اس کی منتظر تھیں۔



آنکھوں کے پار چاند  
 بارش کی شدت کم ہو کر ہلکی ہلکی پھوار میں تبدیل ہونے لگی تھی برآمدے میں پڑی ایک کرسی پر بیٹھی ”انا“ صحن میں تسلسل سے گرتی بوندوں کو انہماک سے دیکھے جا رہی تھی۔ گا ہے بگا ہے وہ گردن اٹھا کر گرجتے برستے آسمان کو بھی دیکھ لیتی جہاں سیاہ بادل آج مکمل برسنے کے موڈ میں تھے..... یوں لگتا تھا جیسے آسمان سے ایک عظیم الشان، صاف شفاف پانیوں والی آبشار نے زمین کی طرف رخ کر لیا ہو۔

چھابجوں برسنے والے مینہ کا تسلسل اب ٹوٹ گیا تھا..... آم کے درخت کی ڈالیوں میں چھپی کوئل کوکنے لگی تھی۔ انا سے کچھ فاصلے پر پڑے تخت پر نیم دراز خالو جان کی بے چینی نظریں سبز لکڑی کے گیٹ پر تھیں جہاں سے ”سعدی“ نے آنا تھا، جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ خالو جان کی بے چینی اور بے قراری اب کوفت اور جھنجھلاہٹ میں بدلنے لگی تھی.....

”خاک ترقی کرنے گی آج کی نسل، کچھ احساس نہیں ہے وقت کا، جہاں کام کے لئے بھیجو، واپس آنا بھول جاتے ہیں، اب دیکھو، بر خوردار صبح سے گیا ہے اور واپسی کی کوئی خبر نہیں۔“ وہ گردن اچکا کر سبز گیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولے تھے.....

برآمدے کے کونے میں بنے چھوٹے سے کچن میں سل پر کیریوں کی چٹنی چیتتی سروری خالہ نے بے زاری سے اپنے میاں کی آواز سنی اور سر پر لئے لان کے دوپٹے سے چہرے پر آیا ہینہ صاف کرتے ہوئے وہ گرمی سے بے حال باہر نکلیں۔

”کچھ خدا کا خوف کریں میاں صاحب! ایک تو طوفانی بارش میں پرائے بچے کو آپ نے بازار بھجوا دیا، صبح سے پہلے چڑھتی آندھی اور اس کے بعد دھواں دھار بارش میں بھی اس بچے کی شرافت تھی جو آپ کے کہنے پر جن قدموں سے آیا تھا، ان ہی پر واپس لوٹ گیا۔ اپنی اولاد

مج سے بارش کے ڈر سے بے چاری کو بچوں سمیت قید کر رکھا ہے۔ ذرا ڈر بے کے اندر جھانک کر دیکھو، منہی جانیں ہیں، گرمی تو بڑے بڑوں کے ہوش اڑا رہی ہے، کہیں ان معصوموں کو کچھ ہونہ جائے.....“ سروری خالہ نے ٹرے اپنی طرف کھسکائی، بے تکلفی سے روٹی کے اوپر وال رکھی اور آرام سے کھانے لگیں۔ خالو جان نے بیزاری سے انہیں کھاتے دیکھا اور پھر گیٹ کی طرف نظر نکا دی جہاں سے ”سعدی“ نے آنا تھا۔

وہ سامنے لگے وال کلاک پر نظریں ڈال کر ایک دفعہ پھر شروع ہو چکے تھے۔ ”دنیا آگے کو جا رہی ہے اور ہمارے خاندان کے لڑکے سستی اور کابلی کے ریکارڈ توڑ رہے ہیں، نوجوان ہیں۔ میں تین گھنٹوں میں چار دفعہ بازار کے چکر لگا کے آ جاتا تھا اور ایک یہ زمانے بھر کا نکما سعدی ہے۔“ صبح دس بجے کا گیا ہوا اور اب دوپہر کے دو بج رہے ہیں.....“ خالو جان حد درجہ بے زار ہو رہے تھے.....

اتانے ڈبے کا دروازہ کھولا تو مرغیوں کی فوج بے تکلفی سے لان کی طرف بھاگ نکلی تھی۔ خالو جان اپنے غم میں ڈوبے ہوئے تھے ورنہ اس ”طوفانی دورے، پر طوفان“ ضرور کھڑا کر دیتے، انہیں اپنے ہاتھ کے لگائے ہوئے پودوں سے اپنی اکوتی، اولاد سے بھی زیادہ پیار تھا..... وہ اب دوبارہ اپنی مطلوبہ جگہ پر بیٹھ کر باہر کا نظارہ کرنے لگی۔

بارش تقریباً رُک چکی تھی بس ہلکی سی کن سن تھی۔ آسمان پر بادل اب غائب ہو چکے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوائ نے جن کی کیفیت کو خاصا کم کر دیا تھا.....

”لودیکھ لو، اس لڑکے نے اپنا موبائل بھی بند کر رکھا ہے، آئندہ ہرگز کسی کام سے نہیں سمجھوں گا اسے۔“

خالو جان نے اپنے موبائل سے شاید ”سعدی“ کا نمبر ڈائل کیا تھا.....

”لو یہ کیا سیاسی اعلان ہے، اب اس عمر میں کیا سودا سلف لینے آپ خود منڈی جائیں گے، بینک میں مل جمع کروانے بس ایک دفعہ گئے تھے آپ، اور آج تک کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ ہزار کام کر دیتا ہے یہ اپنا سعدی، آپ خواہ مخواہ اپنا خون جلا رہے ہیں۔“

اتانے حیرت سے سروری خالہ کو دیکھا وہ اپنی اکوتی نند سے جتنا خار کھاتی تھیں، اس کو اچھی طرح علم تھا اور بعض دفعہ تو وہ سعدی کو بھی جھاڑ دیتی تھیں لیکن وہ ڈھیٹ بنا ہنستا رہتا۔ ہر ڈانٹ کے بعد اتنا سمجھتی تھی کہ وہ ہرگز دوبارہ نہیں آئے گا، لیکن اگلے ہی دن وہ پھر خالو جان

پر تو بس نہیں چلتا، اور دوسروں پر زور زبردستی کرتے ہیں.....“

”وہ، دوسرا، نہیں میرا سگا، بھانجا ہے.....“ خالو جان نے چڑ کر یاد دلایا۔

”ہاں اسی کا تو ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔“ سروری خالہ نے بیزاری سے دو بدو جواب دیا اور برآمدے میں لگے بیسن پر لگے بوسیدہ شیشے کا خیال آیا تو توپوں کا رخ اتان کی طرف مڑ گیا۔

”ہزار دفعہ اس لڑکی کو کہا ہے کہ گیلیا کپڑا لے کر کبھی اس آئینے کو بھی صاف کر دے مگر اس زمانے بھر کی ست، کامل اور کام چور لڑکی کے کان پر جوں تک نہیں ریگیتی.....“

اتانے سستی سے لمبی جمائی لی اور سامنے صحن کی صرف دیکھا..... وہ مصلحتاً خاموش رہی۔

”پتا نہیں کہاں رہ گیا ہے، بندہ ایک فون کر کے خیریت کی اطلاع ہی دے دیتا.....“ خالو جان اب غصے سے بڑبڑاتے تھے..... سروری خالہ نے بھی تشویش بھری نظروں سے گرجتے برستے آسمان کو دیکھا اور فکر مندی سے بولیں۔

”آجائے گا، ٹینشن کا ہے کو لیتے ہیں..... یہ کھانا کھائیں آپ سکون سے، آپ کی پسند کی کھڑی مسوری دال اور بگھارے چاول ہیں، خدا غارت کرے واپڑا والوں کو، لگتا ہے کہ پتھر کے دور میں واپس چلے گئے ہیں۔“ سروری خالہ کھانے کی ٹرے تخت پر رکھ کر ہاتھ سے پنکھا جھلنے لگیں جبکہ خالو جان نے نظر اٹھا کر بھی ٹرے کی طرف نہیں دیکھا تھا حالانکہ وہ کھانے پینے کے خاصے شوقین تھے.....

”اب تو زندہ رہنا ہی عذاب ہو گیا، کاہے کو غریب زندہ رہیں گے، اے اتانج، روٹی“ بھانجی سب کی قیمتوں کو لگتا ہے پر لگ گئے ہی، انسان اب بھلا کیا کمائے؟ غضب خدا کا، ایسی کمر توڑ مہنگائی بھلا کہاں سنی تھی۔ آٹا، دال، سبزی، پھل سب کچھ مہنگا کر دیا گورنمنٹ نے، خدا غارت کرے ان کو، صبح سے فالسے کا شربت پینے کا دل کر رہا تھا مگر قیمت سن کر تو مانو کرنٹ ہی لگا، توبہ توبہ.....“ سروری خالہ اپنے میاں کی بے توجہی کے باوجود جب عادت اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے میں مصروف تھیں.....

اتانے بیزاری اور کوفت سے سروری خالہ کو دیکھا جو جھالروالے ہاتھ کے پتکے کو اتنی زور سے نہیں جھل رہی تھیں جتنی تیزی اور رفتار سے وہ بول رہی تھیں.....

”اے اتان! تم کون سے خیالوں میں گم ہو، اٹھ کر کٹو بیگم کے ڈر بے کا دروازہ کھول دو،“

کے لئے لائبریری سے بکس ایٹو کروا کر بڑے نازل انداز سے آتا تو انا کو ڈھونڈنے سے بھی اس کے چہرے پر کوئی ناراضی یا خفگی کا رنگ دکھائی نہ دیتا..... اور وہ جھنجھلا کر اس کے لئے چائے بنانے چل پڑتی کیونکہ اسے علم تھا کہ وہ آتے ہی خالو جان کے ساتھ کسی سیاسی یا علمی بحث میں الجھ جائے گا اور ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد ہی خالو اسے چائے بنانے کا آرڈر دے دیتے جس کے بعد سروری خالہ کے مہنگائی اور ”چائے کی پتی“ اور ”چینی“ مہنگی ہونے کے اعلانات اور بڑبڑاٹ صرف انا کو سننی پڑتی۔ اور اس کے بارے میں انہیں پتا تھا کہ وہ بے ضرری سامع ہے.....

”یہ برتن اٹھا کر کچن میں رکھ آؤ، تمہارے خالو تو آج صرف غصہ پیٹیں گے اور انتظار کھائیں گے۔“

سروری خالہ کے ہلکے پھلکے لہجے پر انا نے چونک کر انہیں دیکھا..... ان کے چہرے پر بڑی دل جلادینے والی مسکراہٹ تھی۔

”مطلب کیا ہے تمہارا؟“ خالو میدان میں اتر آئے تھے ان کا لہجہ خاصا نیکھا تھا۔

”بھئی۔ مطلب وطلب تو کچھ نہیں ہمارا، آپ بھی تو صبح سے گیٹ پر نظریں نکائے بیٹھے ہیں، لے آئے گا سعدی آپ کے صاحبزادے کا چار لائٹوں کا خط، جس کے لئے آپ پچھلے چار گھنٹوں سے خون جلا رہے ہیں، حتیٰ کہ آپ کو پتا بھی ہے کہ موصوف نے کیا لکھا ہوگا۔ وہی دو چارسی رکی باتیں، پاکستان آنے کا جھوٹا وعدہ اور بس۔“

”اپنی زبان بند رکھا کرو۔ سمجھیں۔“ خالو جان نے بڑی ناگواری سے ہاتھ اٹھا کر انہیں مزید بات کرنے سے روکا۔

”لو میں نے کون سا غلط کہا ہے.....“ سروری خالہ کے بے رحم لہجے پر انا نے خوف زدہ نظروں سے خالو جان..... کو دیکھا جو شعلہ بارنگا ہوں سے ان کو گھور رہے تھے.....

”لو آگیا سعدی!“ سروری خالہ کے طنزیہ لہجے پر خالو جان..... بے چینی سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ انا نے بھی چونک کر سبز گیٹ کی طرف دیکھا۔

سروری خالہ کی نظریں اس کی موٹر سائیکل کے اسٹینڈ پر رکھے آلو بخارے اور خوبانیوں کے شاہ پر تھیں، اکثر و بیشتر تنخواہ ملنے پر وہ ایسی مہربانیاں کرتا رہتا تھا.....

”سوری ماموں جان! میری موٹر سائیکل میں پٹرول ختم ہو گیا تھا اور اتنی بارش میں دور

دور تک کوئی پٹرول پمپ بھی نہیں تھا۔ پورے چار میل چل کر آیا ہوں۔“ وہ اتنی شرمندگی سے کہہ رہا تھا، گویا کوئی بہت بڑا جرم سرزد ہو گیا ہو۔

”گھر سے نکلتے ہوئے بندہ کم از کم پٹرول تو چیک کر لیتا ہے۔“ وہ کوفت زدہ آواز میں بولے تھے جبکہ نظریں سعدی کے شاہ پرز کا گھیراؤ کر رہی تھیں کہ مطلوبہ گوبر نایاب کہاں چھپایا ہوا ہے.....

”آئے ہائے بیٹا! یہ وضاحتیں بعد میں دے لینا۔ پہلے وہ ”محبت نامہ“ تو بڑے میاں کو دکھا دو جس کے لئے صبح سے ناشتہ اور دوپہر کا کھانا تک بھلائے بیٹھے ہیں۔“ سروری خالہ کے طنزیہ لہجے پر سعدی نے ہڑبڑا کر اپنی پینٹ کی جیب سے نیلا لفافہ نکال کر ان کی طرف بڑھایا، جسے انہوں نے بڑی بے تابی سے پکڑا اور اپنی جیب سے عینک نکال کر کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ سروری خالہ نے انتہائی ناپسندیدہ نظروں سے یہ منظر دیکھا اور تلی سے بولیں۔

”عبدالماجد صاحب! خیر سے فیصل میرا بھی اتنا ہی سگا اور اکلوتا بیٹا ہے جتنا کہ آپ کا، اس کی سوتیلی ماں نہیں ہوں میں جو، آپ اس کا خط مجھ سے چھپائے اندر گرمی میں گھسے جا رہے ہیں۔“

”لاحول ولا قوۃ، سخت بے وقوف اور بدگمان عورت ہوتی۔ میں تو اس لئے اندر جا رہا تھا کہ ”باہر“ تمہاری قینچی کی طرح چلتی زبان سکون سے خط پڑھنے نہیں دے گی، اندر اطمینان سے بیٹھ کر پڑھوں گا، اور تم رانگی کا پہاڑ بنا رہی ہو۔ ٹھیک کہتے ہیں سیانے، عورت کی عقل گھنٹوں میں ہوتی ہے۔“ خالو جان جھلا گئے تھے.....

”ممائی جان! میں آپ کے لئے خوبانیاں لے کر آیا تھا، ذرا ٹھنڈی کریں، مل کر کھاتے ہیں۔“ سعدی نے حسب معمول طوفان کے آگے بند باندھنے کے لئے سروری خالہ کی توجہ دوسری جانب مبذول کروانے کی ناکام کوشش کی۔ آگے پیچھے تو وہ بہل جاتی تھیں لیکن آج تو خالو جان خاصے بدلچاٹ ہوئے ہوئے تھے.....

”اے رہنے دو میاں! میں کون سا تمہاری خوبانیوں کے سر پر بیٹھی ہوئی تھی اپنے ماموں جان کو کھلاؤ، جو کسی آئے گئے کا لحاظ کئے بغیر شروع ہو جاتے ہیں، ساری زندگی انہوں نے پورے خاندان کے سامنے مجھے بے عزت ہی کروایا۔ تب ہی تو سارا خاندان میرے سر پر کھڑے ہو کر ناچتا ہے۔ صبح سے یوں بیٹے کے خط کے منتظر تھے کہ موسم کی خرابی کی وجہ سے

ڈاکیا نہیں آئے گا، تمہیں ڈاک خانے دوڑا دیا اور اب بھی یوں خط بغل میں دبا کر اندر چل دیئے جیسے میں فیصل کی سوتیلی ماں ہوں، ساری زندگی اس خطیلی مرد کے لئے عارت کر دی لیکن پھر بھی مجھے پیروں کی جوتی سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔“ سروری خالہ منہ پر دوپٹہ رکھ کر رونا شروع ہو چکی تھیں۔

سعدی نے بے بسی سے کھانے کے برتنوں کی ٹرے اٹھائے کھڑی ”انا“ کو دیکھا جو پریشانی سے کبھی سروری خالہ کو تو کبھی کمرے میں آرام سے خط پڑھتے ماجد خالو کو دیکھ رہی تھی۔ ”ممائی جان! دفع کریں، آپ کو پتا ہے کہ ماموں جان کی ایسی ہی عادت ہے، ذرا زبان کے تیز ہیں، بول بال کے بھول جاتے ہیں، آپ تو بہت ہمت اور مبر والی خاتون ہیں، ورنہ ماموں جان کے ساتھ کوئی کم ہمت عورت گزارا کر سکتی تھی.....“ انا نے سخت حیرانی سے اسے دیکھا جو سروری خالہ کے کندھے بہت محبت سے دباتے ہوئے شروع ہو چکا تھا اور انا کو معلوم تھا کہ ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد ممائی جان صاحبہ بھی سب کچھ بھول بھال کے اپنی مرغیوں اور پچھلے محن میں بندھی بکری کی خوراک کے بارے میں مشورے لے رہی ہوں گی۔ وہ ایسا ہی تھا منٹوں میں بے تکلف ہو کر سارے مناظر کو اپنی پسند کے مطابق ڈھال لیتا۔ کبھی کبھی تو انا کو اس پر بے تحاشا رشک آتا..... اور کبھی اس کی روزانہ آمد اسے جھنجھلاہٹ کا شکار کر دیتی لیکن اس کا کچھ فائدہ نہیں تھا۔ وہ اپنی باتیں اور اپنے جذبات و احساسات سے انجان ہی رہتا تھا۔

انا نے کچن کی کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا مطلع صاف ہو چکا تھا..... اس نے دوپہر کے کھانے کے برتن دھوئے اور سلیقے سے رکھے..... سروری خالہ کا خوشگوار موڈ اور ہنسنے کی آوازیں سن کر اس نے اب اطمینان سے مین گھول کے پکڑوں کا سامان تیار کیا اور ساتھ ہی چائے کے لئے پانی چولہے پر رکھا.....

پکڑوں کی ایک پلیٹ نکال کر اس نے دم کی ہوئی چائے کپوں میں ڈالی اور سلیقے سے ٹرے میں برتن رکھ کر باہر آئی تو ماجد خالو کچھ فاصلے پر کرسی پر بیٹھے اخبار کا مطالعہ کرنے میں مگن تھے، اسے آتا دیکھ کر مسکرائے.....

”شکر ہے گھر میں کسی کو میرے کھانے کا بھی خیال آیا، صبح سے بھوکا پیٹ بیٹھا ہوں، مجال ہے کہ کسی نے پوچھا ہو.....“

ماجد خالو کے شرارتی لہجے پر سروری خالہ نے شکایتی نظروں سے پہلے ”انا“ اور پھر ”سعدی“ کی طرف دیکھا اور خٹکی کے اظہار کے طور پر جواب دینے سے گریز کیا۔

”صبح سے خالہ تو کئی دفعہ آپ سے کھانے کا پوچھ چکی ہیں آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ بھوک نہیں ہے۔“ انا نے یونہی وضاحت دی حالانکہ اس وضاحت کی قطعاً ضرورت نہیں تھی

”اے بی بی! رہنے دو! جب بندہ منہ پر جھوٹ بول رہا ہو تو اگلا بندہ اس کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ ویسے پانچ وقت کی نمازیں پڑھتے ہیں اور جھوٹ بولتے ہوئے حیا نہیں آتی۔“ چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے وہ اس دفعہ خاموش نہیں رہ سکی تھیں۔

”انا بیٹا! تم خود بتاؤ، صبح سے اعلان ہو رہے تھے کہ آپ کی پسند کی کھڑی مسور کی دال اور بگھارے چاول پکائے ہیں اور میرے سامنے بیٹھ کر پوری پلیٹ صاف کی، بندہ اتنا بھی بھوکا اور عندیدہ نہ ہو.....“ خالو جان کا موڈ خاصا خوشگوار تھا لگتا تھا کہ بیٹے کا خط پڑھ کر طبعیت بارغ و بہار ہو چکی تھی تب ہی سروری خالہ سے چونچیں لڑائی جاری تھیں۔

اس دفعہ سروری خالہ نے جواب دینے سے گریز کیا تھا۔ وہ پکڑوں کی پلیٹ کی طرف متوجہ تھیں۔

انا نے دوسری دفعہ کے تیار پکڑے پلیٹ میں نکالے اور چولہا بند کر دیا اور اس دفعہ پلیٹ لا کر خالو جان کے سامنے رکھ دی تھی۔

”شاباش! میری بیٹی بہت محبت والی اور سعادت مند ہے، اس گھر میں اگر یہ نہ ہو تو میرا کیا ہے.....“ خالو جان کے محبت بھرے انداز پر سروری خالہ نے طنزیہ لہجے میں سعدی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”دیکھ لو اپنے ماموں کے انداز، جیسے باقی تو ان کے دشمن ہیں، بند و قیں اٹھا کر ان کے پیچھے گھومتے ہیں نا۔“

”زبان کے چلتے کا تو س تو سعدی کافی دیر سے دیکھ رہا ہے۔“

”ہاں آپ کی زبان سے تو جیسے پھول جھڑ رہے ہیں۔“

”اللہ کا شکر ہے، اہل زبان ہوں۔ اردو میں ڈاکٹرٹ کر رکھی ہے۔ ایک زمانہ مجھ سے مستفید ہوتا ہے۔ یہ تو گھر والوں نے قدر نہیں کی۔“ خالو مکمل موڈ میں تھے۔

”گھر والے پاگل جو ہوئے، آپ کے دشمن ٹھہرے، وہ کیوں کرنے لگے قدر؟“ خالہ کے طنزیہ لہجے پر انانے گھبرا کر سعدی کو دیکھا اور اسے اندازہ ہو گیا کہ اس موقع پر سیز فائر کرنا ضروری ہے.....

”ماموں جان! کیوں خالہ کو تنگ کر رہے ہیں۔ یہ بتائیں فیصل نے کیا لکھا ہے؟ کب آئے گا پاکستان؟“ سعدی کی بات پر سردری خالہ نے مشکور نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ یہ سوال تو وہ بھی کرنا چاہ رہی تھیں لیکن خالو جان بیٹے کا خط اندر کہیں چھپا آئے تھے اور تازہ ترین جھڑپ کی وجہ سے وہ ڈائریکٹ پوچھنے سے احتراز کر رہی تھیں۔ خالو جان چائے کی چمکیاں لیتے ہوئے اطمینان سے بولے تھے۔

”برخوردار کا ابھی تو کوئی پاکستان آنے کا پروگرام نہیں، البتہ کوئی سالانہ ایک ہفتے کی چھٹیاں ہو رہی ہیں اس کے لئے وہ امریکہ سے کینیڈا جانے کا ارادہ رکھتا ہے.....“

”لو یہ کیا بات ہوئی، کینیڈا میں اس کا کون بیٹھا ہے جس سے ملنے جائے گا۔ خواہ خواہ پیسوں کا زیاں۔“

سردری خالہ نے ماتھے پر آیا پسینہ پونچھا۔

”ہر وقت پیسوں کی ہی فکر کرنا، پہلے کون سا پیسے بچا کر تم نے وائٹ پولیس کھڑا کر لیا ہے جو اب مزید کرنا ہے، جو ان خون ہے، گھومنے پھرنے کو دل کر رہا ہوگا۔“ خالو جان چڑھ گئے تھے۔

”بات سنیں میری عبدالماجد صاحب! یہ میری ہی بچتیں تھیں جو یہ دس مرلے کے گھر میں بڑی شان سے بیٹھے ہیں اور میری بچتوں کی وجہ سے ہی فیصل پچھلے دو سال سے امریکہ میں بیٹھا ہوا ہے۔ ورنہ تمہارے تو پورے خاندان کو بس کھانے، پینے، گھومنے اور فضول خرچیاں کرینا ہوگا ہے، تب ہی ابھی تک کرائے کے گھر میں دھکے کھاتے پھر رہے ہیں۔“

سردری خالہ کے تلخ لہجے پر سعدی نے بے اختیار پہلو بدلاتا تھا کیونکہ یہ ڈائریکٹ اس کے خاندان کی طرف اشارہ تھا۔ انا اچھی طرح جانتی تھی کہ مباحث پھوپھو پچھلے دو سالوں سے اپنا گھر بنانے کے لئے کوششوں میں مصروف تھیں لیکن کمر توڑ مہنگائی ان کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔

”ہزار دفعہ کہا ہے کہ میرے خاندان کو بیچ میں مت لایا کرو، عجیب جاہل اور بے وقوف

عورت ہے، میں چاہوں تو تمہارے خاندان کے بھی نیچے ادھیڑ سکتا ہوں، سب کے کچے چٹھے سے اچھی طرح واقف ہوں، میری زبان نہ کھلو آؤ۔“

ماجد خالو کی غصے سے لبریز آواز سن کر اس نے گھبرا کر چائے کے خالی برتن اٹھائے اور کچن کی طرف چل پڑی۔ سردری خالہ اور ماجد خالو کی ایک دفعہ پھر جنگ شروع ہو چکی تھی۔

”تم روز روز کی اس لڑائی سے تنگ نہیں ہوتی ہو؟“ وہ پتا نہیں کب سے کچن کے دروازے میں کھڑا اسے برتن دھوتے دیکھ رہا تھا۔

”نہیں، بلکہ اگر یہ نہ لڑیں تو گھر کی خاموشی سے وحشت ہوتی ہے۔“ انا کی سنجیدہ آواز میں دی گئی وضاحت پر وہ بے ساختہ ہنسا تھا۔

”بڑی عجیب سی منطق ہے تمہاری، آج پوچھو تو میں تو اکثر سوچتا تھا کہ ماموں اور ممانی کی لڑائی سے انا تو بہت ڈسٹرب ہوتی ہوگی، لیکن آج پتا چلا ہے کہ تم لڑائی نہ ہونے لے ڈسٹرب ہوتی ہو۔ میں بتاتا ہوں ممانی جان کو۔“ اس نے بڑے خوشگوار انداز سے دھمکی دی۔

”بتا دیں، وہ یقین نہیں کریں گی۔“

”کیوں؟“ اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ انا زیادہ باتیں نہیں کرتی، اپنے کام سے کام رکھتی ہے۔“ وہ اب صافی سے ہاتھ صاف کر رہی تھی۔

”یہ تو ہے۔“ سعدی نے فوراً تائید کی، وہ ویسے بھی بہت صلح جو اور دوستانہ طبیعت کا حامل تھا۔ اسے اچانک یاد آیا۔

”تم نے ایم اے کی تیاری شروع کی یا نہیں؟ وہ جو کتابیں اور سلیبس میں تمہارے لئے لایا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ تم نے کھول کر بھی دیکھی ہوں گی۔ ہے نا؟“ سعدی کے پر اعتماد لہجے پر انانے چونک کر اسے دیکھا۔

”یہ بندہ اندازے ہنڈرڈ پرسنٹ درست لگاتا ہے۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

”آپ کو کیسے پتا چلا؟“

سعدی نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ ”اومائی گاڈ! اتنی نالاق اور ست لڑکی سے ہر بندہ کئی توقع رکھ سکتا ہے۔“ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم سارا وقت کرتی کیا ہو، گھر کے تین بندوں کا آخر کام ہی کتنا ہوتا ہے؟ اوپر سے ممانی جان خود بھی ماشاء اللہ خاصی ایکٹو خاتون ہیں بلکہ تم سے



زیادہ ایکٹو ہیں۔ ہر وقت متحرک رہتی ہیں، لیکن ان کی قسمت دیکھو، بہو سنی ست اور غمی ملی ہے۔ فیصل کے آنے سے پہلے پہلے ایم اے کر لو تو اچھا ہے.....“

سعدی کے پر خلوص مشورے پر اس کے چہرے کی رنگت ایک لمحے کو پھسکی ہوئی تھی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اپنے سامنے کھڑے بندے کو دیکھا۔ جس کے ساتھ اس کی شامائی کو پورے پانچ سال ہو گئے تھے اور وہ بہت عرصے کے بعد اس سے کچھ بے تکلف ہوئی تھی اور اس میں بھی سعدی کی کوششوں کا عمل دخل زیادہ تھا۔

”اگر نہ کروں تو؟“ وہ بولی نہیں تھی لیکن اس کے چہرے پر لکھا صاف نظر آ رہا تھا۔  
 ”بھئی۔ میں تو بہت مخلصانہ سا مشورہ دے رہا ہوں کیونکہ فیصل اسٹڈی کے معاملے میں حد درجہ کونشنس بلکہ کریزی بندہ ہے۔ میرا کلاس فیلو رہا ہے اگر ٹیسٹ میں یا ویسے میرے اس سے دو تین نمبر زیادہ آجاتے تھے تو اس کی راتوں کی نیندیں اڑ جاتی تھیں، وہ اور زیادہ محنت شروع کر دیتا تھا..... اسے نالائق اور ست لوگوں سے بہت چڑھتی ہے۔“ وہ بات کے اختتام پر کچھ شوخ ہوا۔

”پھر میں کیا کروں؟“ انا کے لہجے میں اکٹاہٹ کا تاثر تھا۔  
 ”کرنا کیا ہے؟ آرام سے ایم اے کرو، سمجھیں؟“ وہ اپنی ریٹ واچ پر نظریں دوڑاتے ہوئے ہلکے ہلکے لہجے میں بولا تھا۔

”اے سعدی! تم یہاں کھڑے ہو، میں سمجھی تھی کہ شاید چلے گئے، تہبہاری ماں کی طبیعت ٹھیک ہے؟ اس ہفتے اس نے یہاں کا چکر نہیں لگایا۔“ سردی خالہ اچانک کچن میں آن پہنچی تھیں۔ وہ جو رات کے لئے آنا گوندھ رہی تھی۔ اس نے چونک کر خالہ کے طنزیہ لہجے کو سنا جبکہ سعدی شاید ان کے طنز کو سمجھا نہیں تھا یا پھر جان بوجھ کر نظر انداز کر گیا تھا۔

”امی جان آج کل کچھ مصروف تھیں۔ ابو کا بی پی کچھ ہائی رہنے لگا ہے۔ پھر کرن اور ارم کے ایگزام بھی تو ہو رہے ہیں آج کل۔“

”اے انا! تمہیں ہزار دفعہ کہا ہے کہ صرف تین روٹیوں کا آنا گوندھا کرو۔ پرسوں بھی دو روٹیوں کا آنا بیچ گیا تھا، ساری رات بجلی غائب ہونے کی وجہ سے فریج بند رہا اور صبح خراب ہو گیا۔ کچھ پتا بھی ہے کہ گندم کس بھاؤ بک رہی ہے آج کل۔ مہنگائی نے ہر طرف آگ لگا رکھی ہے۔“ سردی خالہ نے ناگواری سے اسے ٹوکا تو اس نے پرات میں پڑا خشک آنا نکال کر

پلیٹ میں رکھ دیا۔

”اے سعدی! حمنی کے رشتے کا کچھ پتا؟ وہ جو پچھلے ہفتے لوگ دیکھنے آئے تھے، کیا کہا انہوں نے؟“ سردی خالہ کو اچانک یاد آیا تو تجسس سے پوچھا۔

”میرا خیال ہے ممائی جان! کہ وہ بات تو شاید ختم ہو گئی تھی، امی کچھ پتا تو رہی تھیں لیکن مجھے یاد نہیں.....“ اس نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے انا کو دیکھا جو بڑی مہارت سے آنا گوندھ رہی تھی۔

”آئے ہائے لوگوں کی تو بات ہی نہ کرو، ان کے تو دماغ خراب ہوئے ہوئے ہیں خاص طور پر لڑکے والوں کے، حمنی بے چاری کچھ رنگت میں بھی مار کھاتی ہے، مگر بھی اپنا نہیں، اوپر سے بھائی صاحب نے بھی وقت سے پہلے ریٹائرمنٹ لے لی، سچ پوچھو تو دنیا بہت خود غرض ہو گئی ہے۔ اب تو لڑکے کا رشتہ کرنے سے پہلے بھی لوگ کئی چیزیں دیکھتے ہیں۔“

سردی خالہ کے تلخ لہجے پر انا کے ہاتھ ایک لمحے کو ساکت ہو گئے تھے۔ اس نے فوراً مڑ کر سعدی کا تاریک چہرہ غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر بہت پھسکی سی مسکراہٹ تھی۔ جبکہ سردی خالہ اطمینان سے بے خبر فریج میں جھانک رہی تھیں۔

”خالہ بھی بعض دفعہ حد کر دیتی ہیں۔ انا نے مجھ بھلا کر سارا غصہ آٹے پر نکالا تھا۔“ اب تو حمنی کے بعد کرن اور ارم بھی بی اے کر کے فارغ ہو جائیں گی اور سچ پوچھو تو تینوں میں کوئی فرق نہیں لگتا۔ ساتھ کھڑی ہوں تو پتا ہی نہیں چلتا۔ کون بڑی ہے اور کون چھوٹی، اپنی ماں کو مشورہ دینا کہ تینوں میں سے جس کا رشتہ آئے فوراً کر دے۔ آج کل وہ دور نہیں کہ ”بڑی“ کے لئے ”چھوٹی“ کی عمر بھی نکال دی جائے.....“ لگتا تھا وہ ماجد خالو سے ہونے والی جنگ کی بھڑاس آج ادھر نکالنے کے موڈ میں تھیں۔

انا نے ایک نظر سعدی کے سپاٹ چہرے پر ڈالی اور سنک میں ہاتھ دھوتے ہوئے بولی۔  
 ”مجھے سلیپس کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کئی دن حمنی آپنی کو لے آئیے گا۔ میں ان کے ساتھ ڈسکس کر لوں گی۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ وہ بمشکل مسکرایا تھا۔ ”بلکہ حمنی آپنی تو کئی دن سے کہہ رہی تھیں کہ ماموں، ممائی اور انا سے ملنے کو بہت دل چاہ رہا ہے بلکہ مجھ سے لڑ رہی تھیں کہ تم بینک سے انہیں پلے جائے ہو، کسی دن مجھے بھی لے چلو۔“ اسے نہ جانے کیوں لگا تھا کہ انا نے صرف



”پھپھو! آپ یہ فالسے کا شربت لیں۔ خالہ بس آتی ہوں گی۔“ پچھلے تین گھنٹے میں اس نے تیسری دفعہ یہ فقرہ بولا تو صباحت پھپھو نے اپنے ازلی محبت و مردت بھرے انداز سے اسے دیکھا۔

”بیٹا! مجھے کوئی ٹینشن نہیں، میں اپنی بیٹی کے ساتھ باتیں کر رہی ہوں۔ تم آرام اور سکون سے اپنا کام نمٹاؤ۔“

”پتا نہیں خالہ کو اتنی دیر کہاں ہو گئی، مجھ سے کہہ کر گئی تھیں کہ سلیم صاحب کے ہاں انیس کے لیے جا رہی ہوں، بس آدھے گھنٹے میں آ جاؤں گی۔ خالو جان بھی آج اپنے کالج کی طرف نکل گئے وہاں شاید کوئی پرانے کوئیکس وغیرہ اکٹھے ہو رہے تھے اور جاتے جاتے کرلیوں کی فرمائش کر گئے تھے، اس لئے میں خصوصی توجہ سے بنا رہی ہوں۔“ اس نے بہت مودب انداز سے وضاحت دی تھی۔

”کوئی بات نہیں بیٹا! تم یہ کرلیوں والی ٹوکری اور قیے والی آمیزہ باہر لے آؤ۔ دونوں پھپھو، بھتیجی کل کر بناتے ہیں۔“ صباحت پھپھو کے مخصوص نرم لہجے پر وہ بے ساختہ مسکرائی اور سارا سامان باہر ان کے پاس ہی برآمدے میں لے آئی۔ اسے صباحت پھپھو کی ساری فیملی بہت اچھی لگتی تھی حالانکہ سروری خالہ ان سے بہت خار کھاتی تھیں۔

”بھائی بے چاری بھی کہاں گھر سے نکلتی ہیں، آج سوچا ہوگا کہ سارے ملنے ملانے والوں کے شکوے دور کر دوں۔ گھر سے نکلتا کہاں آسان ہوتا ہے، اب پچھلے ہفتے سے سوچ رہی تھی کہ بھائی جان کی طرف چکر لگاؤں لیکن کوئی نہ کوئی مصروفیت آڑے آ جاتی تھی۔“ وہ کرلیے میں قیے کا آمیزہ بھرتے ہوئے بڑی سادگی سے اسے بتا رہی تھیں۔ گرے کھر کا دوپٹہ ماتھے تک بڑے سلیقے سے اوڑھے اپنے باوقار سراپے کے ساتھ وہ خاصی جاذب نظر لگتی تھیں۔

”پھپھو! کرن اور ارم کو بھی ساتھ لے آئیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اسے شوخ و شرارتی جڑواں ارم اور کرن بہت اچھی لگتی تھیں۔ وہ آتے ہی پورے گھر میں ہانچل مچا دیتیں۔ سروری خالہ کی مرغیوں اور بکری کی شامت آ جاتی اور سروری خالہ کے ماتھے کے بل گہرے ہوتے جاتے۔

”بیٹا! فیصل نے کچھ آنے کا بتایا کب پاکستان آئے گا؟“ صباحت پھپھو کے سوال پر وہ

اور صرف بات کو بدلنے کے لئے اس سے کہا ہے۔

”ہاں میاں! ضرور لے آؤ، تمہارے ماموں جان بہت خوش ہوں گے بلکہ جس دن ان کا کوئی، اپنا، آیا ہو، اس دن تو ان کی زبان کی دھار دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔“ سروری خالہ نے فرخ سے سر نکال کر طثریہ انداز سے کہا۔ پھر یاد آنے پر بولیں۔

”اے انا! یہ فرخ میں صبح چار ٹھانڈا پڑے تھے اور اب ایک بھی نہیں۔۔۔۔۔“

”خالہ! صبح دو دال میں اور دو چاولوں میں بھی تو ڈالے تھے؟“ سعدی کے سامنے ایسی وضاحتیں اسے بہت کوفت میں مبتلا کرتی تھیں۔

”کیوں؟ دو ٹھانڈوں سے گزرا نہیں ہوتا تھا۔ لڑکی! تمہارا ہاتھ بہت کھلا ہے۔ کل سے کھانا میں خود بناؤں گی۔ تم تو چار دن کا راشن دو دن میں ختم کر دیتی ہو۔۔۔۔۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی تھی، اسے معلوم تھا کہ صبح تک خالہ یہ بات بھول بھال جائیں گی۔

”سعدی! تم جو خوبانیاں اور آلو بخارے لائے تھے، وہ باہر گرمی میں اب تک گل سڑ چکے ہوں گے۔“ وہ اپنے مخصوص انداز سے بولی تھیں۔

”ابھی لاتا ہوں ممائی جان!“ وہ فوراً باہر لپکا تھا۔

”دیکھ لو! اگر میں یاد نہ دلاتی تو اس نے ایسے ہی واپس لے جانا تھا، یہ تمہارے خالو کا خاندان ایک سے ایک چالاک اور چلتے لوگوں سے بھرا ہوا ہے اور یہ تو پھر صباحت کا بیٹا ہے جو میٹھی چھری ہے۔“

خالہ کا لہجہ خاصا دھیمّا تھا لیکن اتانے پھر بھی خوف زدہ نظروں سے بچنے کے دروازے کی طرف دیکھا، جہاں سے سعدی کو واپس آنا تھا۔ لیکن خیریت رہی خالہ اب فرخ کا دروازہ صافی سے صاف کرنے میں مگن تھیں اور خاموش تھیں۔

اس نے شاپر لا کر سیلف پر رکھ دیے۔ اتانے کن اکھیوں سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا، وہ کسی گہری سوچ میں گم نظر آ رہا تھا۔ شاپر وہاں رکھ کر کانٹیں۔ تھوڑی دیر بعد اس کے موٹر سائیکل اشارٹ ہونے کی آواز سن کر اس کا دل نہ جانے کیوں تاسف سے بھر گیا تھا۔ پھر رات کا کھانا کھاتے ہی عشاء کی نماز پڑھ کر وہ فوراً سونے کے لئے لیٹ گئی۔ حالانکہ سروری خالہ کا باتیں کرنے کا موڈ تھا لیکن اس کی بے توجہی محسوس کر کے وہ بھی خاموشی سے سو گئیں۔

”توبہ توبہ اتنی گرمی۔ لگتا ہے کہ سورج زمین پر ہی آن پہنچا ہے، اوپر سے کم بخت واپدا والوں کو اللہ غارت کرے، گرمی سے بے حال کر دکھا ہے..... اے صباحت! تم کب پہنچیں؟“ ان کی نظریں کمرے سے نکلتی اپنی نند پر پڑیں تو گرمی کا احساس دوگنا ہو گیا تھا.....

”بھابی! آپ گھر میں یو پی ایس کیوں نہیں لگوا لیتیں، اب تو ماشاء اللہ فیصل ہر ماہ پیسے بھجوا رہا ہے.....“ صباحت پھپھو کے خلوص دل سے دیئے گئے مشورے پر سروری خالہ کے ہاتھ کے بلوں میں اضافہ ہو گیا تھا.....

”اے رہنے دو صباحت! میرا بیٹا پردیس میں اللہ جانے کیسے خون پسینہ بہا کر روزی کما رہا ہے اور میں یہاں لٹنا شروع کر دوں؟ دفع کرو ایسے خرچ کو۔ اچھا ہے جتنی دیر بجلی جاتی ہے، بجلی کے بل تو کم آئیں گے تا، یہاں تو مہنگائی نے طوفان مچا رکھا ہے۔ ہر روز نیا خرچہ نکل آتا ہے۔ اے تم کب آئیں؟ اور بچیاں نظر نہیں آرہیں۔ گھر میں خاصا سکون ہے۔“ سروری خالہ کے طنزیہ جملے پر صباحت پھپھو نے بے اختیار پہلو بدلا تھا۔ جبکہ سروری خالہ اب بہت سکون سے انا کے ہاتھ سے بنا روح افزاء پی رہی تھیں۔

”بس کافی دنوں سے بھائی جان کو نہیں دیکھا تھا۔ طبیعت بے چین سی ہو رہی تھیں۔ صبح میں نے سعدی سے کہا کہ بینک جاتے ہوئے مجھے چھوڑ جائے۔ بچیوں کے آج کل پیپر ز ہو رہے ہیں اس لئے میں خود ہی نہیں لے کر آئی۔“

”لے آئیں بھئی، ابھی ان کے ماموں صاحب آئیں گے تو خود ہی بے چین ہو کر بھانجیوں کو لینے پہنچ جائیں گے۔“ سروری خالہ کے طنزیہ لہجے پر انا نے چونک کر صباحت پھپھو کو دیکھا جن کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

انا کا بے اختیار دل چاہا کہ وہ سروری خالہ کو وہاں سے اٹھا دے لیکن اسے معلوم تھا کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔ اس نے ایک خفگی بھری نظر سروری خالہ پر ڈالی اور ان کے ہاتھ سے خالی گلاس ذرا غصے سے پکڑا۔ خالہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ لیکن خاموش رہیں۔

باہر گیٹ کھلا تھا۔ ماجد خالو گرمی سے بے حال موٹر سائیکل گھسیٹے اندر آرہے تھے۔

”مادے میں پہنچنے ہی وہ کھل اٹھے۔“

”ارے صبا، آئی ہے۔“ ان کے اشتیاق بھرے لہجے پر خالہ کے چہرے پر ابھرنے والے ناگواری کے تاثرات خاصے نمایاں تھے۔ تب ہی وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر قدرے دھیمے

ایک لمحے کو خاموش رہ گئی..... پھر کچھ سنبھل کر بولی۔

”پتا نہیں، خالو جان بتا رہے تھے کہ اس سال تو آنے کا ارادہ نہیں ہے۔“

”تو بیٹا! کب آنے کا ارادہ ہے؟ آخر کو چار سال ہو گئے ہیں، اوپر سے بھابی نے خواہ مخواہ ضد کر کے تمہارا فیصل کے ساتھ نکاح کر دیا۔ حالانکہ بچہ مان بھی نہیں رہا تھا۔“ وہ فکر مندی سے کہہ رہی تھیں پھر جیسے لہجے میں بولیں۔ ”تمہیں فون وغیرہ تو کرتا ہے نا؟“

ایک تاریک سایہ اس کے چہرے پر دوڑ گیا، وہ نفی میں سر ہلاتے ہلاتے اثبات میں سر ہلا گئی پھپھو کے چہرے پر کچھ اطمینان کے رنگ جھلکے تھے۔

کریلے کے اوپر باندھتے ہوئے دھاگہ بری طرح الجھ گیا تھا۔ صباحت پھپھو نے آرام سے اس سے پکڑ کر اسے سلجھا دیا تھا، وہ ممنون نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

”بس بیٹا! دعا کرو کہ کرن اور ارم سے پہلے میری جمنی کا مسئلہ بھی سلجھ جائے۔ بیٹیوں کے مسئلے بہت نازک ہوتے ہیں جو رشتہ بھی آتا ہے، کرن یا ارم میں سے ایک پر ہاتھ رکھ دیتا ہے، سچ پوچھو بہت بہت دل خراب ہوتا ہے بس اللہ کی مصلحتیں ہیں وہ جانے۔“ صباحت پھپھو آج خاصے موڈ میں تھیں۔ ایک تو گھر میں کوئی اور تھا بھی نہیں اور دوسرے انا سے بہتر کوئی اور ”سامع“ انہیں مل بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ خاموشی سے سب کی باتیں سنتی جاتی، بعض دفعہ تو ارم اور کرن کو اس پر سخت حیرت ہوتی۔

”تمہاری ماں ماشاء اللہ بہت سکھڑ اور سلیقہ مند تھی۔ تمہارے باپ کی اچانک موت پر اس نے بڑی حوصلہ مندی سے اپنی اکلوتی اولاد اور گھر کو سنبھالا، لیکن بے چاری خود بھی تھوڑی عمر ہی لے کر آئی تھی۔ تمہاری شادی کا اسے بہت چاؤ تھا۔ جب بھی بھابی کے پاس آتی تو اپنی اس خواہش کا اظہار ضرور کرتی تھی۔ لیکن افسوس.....“

صباحت پھپھو کے رنجیدہ لہجے پر اس کا دل بھی دکھ سے بھر گیا تھا۔ حالانکہ ماں کی وفات کو پورے پانچ سال ہو گئے تھے لیکن اسے کل کی بات ہی لگتی تھی..... کام کرتے ہوئے اس کے ہاتھ ست ہو گئے تھے.....

پھر کریلے فرائی ہونے کے لیے رکھ کر اس نے جلدی جلدی دوسرے چولہے پر روٹیاں پکائی تھیں۔ راستہ بنا کر فارغ ہی ہوئی تھی جب سروری خالہ پسینہ سے شرابور ہانپتی کانپتی گھر پہنچی تھیں.....

لہجے میں بڑبڑاتی تھیں۔

”لو اب ہوں گے محبت کے مظاہرے۔“ اللہ جانے کون سی چاہت ہے جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی۔“ کچن کے پاس کھلی کھڑکی سے انا نے ان کا یہ جملہ بخوبی سنا تھا۔ کمرے میں جاتے جاتے انہوں نے کھڑکی سے اندر جھانکا اور سرگوشی کے انداز میں بولیں۔

”تمن چار کر لیے نکال کر فرنیچ کے نچلے خانے میں چھپا دینا، تمہارے خالو نے دیکھ لیے تو پوٹلی بنا کر بھانجیوں کے لئے بھجوا دیں گے۔ ان کو تو ویسے بھی ہر اچھی چیز کھاتے ہوئے ہڑک اٹھتی ہے کہ کسی طریقے سے اپنی بہن کے گھر بھجوا دیں۔ حالانکہ اچھا خاصا دیکھتے ہیں کہ مہنگائی نے ہر بندے کا برا حال کر رکھا ہے۔“ انا نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔ وہ خالہ کو بتاتے بتاتے رہ گئی کہ صاحت پھپھو نے کر لیے اس کے ساتھ ہی بھروائے ہیں لیکن اسے معلوم تھا کہ وہ اس بات کو بھی قطعاً اہمیت نہیں دیں گی تب ہی وہ آرام سے سلا دینا کرتی رہی۔

”کتنی دیر ہو گئی ہے صاحت کو آئے ہوئے؟“ وہ اب رازداری سے پوچھ رہی تھیں۔ انا نے چونک کر برآمدے میں دیکھا جہاں صاحت پھپھو اور ماجد خالو بڑے جوش و خروش سے باتوں میں مگن تھے۔

”چار گھنٹے تو ہو گئے ہیں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”کیا.....؟“ خالہ کو کون کر دھچکا لگا تھا۔“ اچھا پھر اتنی دیر کیا کرتی رہی؟“

”کچھ نہیں، ادھر ادھر کی باتیں اور میرے ساتھ سبزی بنواتی رہیں۔“

”فیصل کے بارے میں تو نہیں پوچھا؟“ انہوں نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھتے

ہوئے ناگواری سے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے صاف جھوٹ بولا تھا۔

”حیرت ہے۔“ خالہ کو بھی شاید یقین نہیں آیا تھا۔

”تم نے یہ تو نہیں بتایا کہ فیصل نے دو لاکھ بھجوائے ہیں۔ پلاٹ کی قسطیں اتارنے کے لئے۔“ انا نے احتجاجی نظروں سے خالہ کو دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا جبکہ خالہ اس کی خشکی کی ذرہ برابر بھی پروا کیے بغیر آرام سے کہہ رہی تھیں۔

”اچھا کیا، جو نہیں بتایا اور بتانے کی ضرورت بھی نہیں۔ اپنے خالو کو بھی مت بتانا، میں آج بک اسی سلسلے میں گئی تھی۔ فیصل نے مجھے خاص طور پر فون کر کے بتایا تھا کہ میرے

اکاؤنٹ میں اس نے پیسے بھجوائے ہیں اور میں اس کے دوست کے توسط سے کوئی پلاٹ دیکھ لوں، کہہ رہا تھا کہ ابوجی کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ وہ پھر پہلے کی طرح اپنی بہن کو اٹھا کر پکڑا دیں گے۔“

”لیکن وہ رقم تو پھپھو نے پانچ مہینے بعد ہی واپس کر دی تھی۔“ انا کے منہ سے بے اختیار پھسلا۔

”کیسے واپس کی تھی، میں ہی جانتی ہوں۔ ہر مہینے توڑ توڑ کر پیسے دیے۔ سارے پیسے ہی خراب کر دیے۔ اب آج کل حمئی کے رشتے کے لئے بھاگ دوڑ ہو رہی ہے، کوئی رشتہ مل گیا تو پھر عذاب خرچے کا ہمارے سر، تمہارے خالو تو انتہائی بدھو ہیں۔ اس صبا چالاک اور مکار کی باتوں میں آ جاتے ہیں۔“ خالہ متغیر انداز میں انتہائی دھیسے لہجے میں بول رہی تھیں۔

”خالہ! وہ سن لیں گی۔“ انا نے جیسی آواز میں انتہائی ناگواری سے کہا۔

”سنتی ہے تو سن لے، میں کون سا کسی سے ڈرتی ہوں۔“ وہ بے ساختہ بولی تھیں۔ ”پہلے فیصل پر نظریں جمائے بیٹھی تھی کہ اس کی کالی کلونی حمئی کے لیے جیسے میں اپنا بیٹا قربان کر دوں گی۔ میں اتنی پاگل تھوڑی تھی اس صاحت نے تو ساری زندگی میں میرا کلیجہ ہی جلایا، یوں آ کر میرے گھر کا سامان استعمال کرتی تھی جیسے لوٹ کا مال ہو، اور بھائی کو تو لگتا ہے کہ کچھ گھول کے پلار رکھا ہے انہیں تو ساری زندگی بہن اور بھانجیوں کے علاوہ کچھ نظر آیا ہی نہیں، ساری زندگی بیوی اور بیٹے پر فوقیت دی..... اور اب تک یہی حال ہے۔“ انہوں نے سرد آہ بھری.....

انا نے اس قدر غلط بیانی پر جھنجھلا کر انہیں دیکھا اور حسبِ عادت خاموش رہی جبکہ سروری خالہ کے چہرے کے تاثرات مزید سخت ہو گئے تھے۔ انہوں نے سعدی کو گیٹ سے اندر آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

”لو یہ صاحب بھی ٹپک پڑے۔ آدھا“ ٹیڑ“ تو یہاں دو پہر کا کھانا کھا جائے گا اور باقی ”ٹیڑ“ کے لئے ان کے ”پیارے“ ماموں جان ساتھ باندھ دیں گے۔ پتا نہیں یہ منحوس ”جو تکلیں“ کب میری جان چھوڑیں گی۔ صاحت کی ”لا لچی“ طبیعت کو دیکھتے ہوئے تو میں نے آنا فانا تمہارا نکاح فیصل سے کروایا تھا حالانکہ بچہ مان بھی نہیں رہا تھا۔ لیکن میں نے سوچا کہ ”یتیم“ بچی ہے نہ آگاہ نہ پیچھا، گھر کو گھر سمجھ گئی..... اور سچ پوچھو تو سارا خاندان میری اس نیکی

پردہ واہ کرتا ہے.....“ انا کا چہرہ ایک لمحہ کو تاریک ہوا تھا.....

”حالانکہ تمہارے خالو کا تو مکمل ارادہ اپنی بھانجی لانے کا تھا۔ میں نے بھی چڑیلوں سے جان چھڑانے کے لئے مکاری کی اور تمہارے خالو سے جھوٹ بول دیا کہ فیصل کی خواہش ہے انا کے لئے، بس یہ سن کر تمہارے خالو تو چپ کے چپ رہ گئے.....“ سروری خالہ اب کچن میں اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی، اسے اپنی کیفیت خود بھی سمجھ میں نہیں آرہی تھی.....

”السلام علیکم ممانی جان! کیا حال ہے آپ کا؟ ماموں پوچھ رہے ہیں دوپہر کا کھانا طے گا کہ نہیں؟“ سعدی نے بڑے خوشگوار انداز سے کچن میں جھانکا تھا.....

”وعلیکم، ٹھیک ہوں، مجھے کیا ہوتا ہے.....“ خالہ کے عجیب سے لٹھ مار انداز پر انا نے جبراً چہرے پر مسکراہٹ سجا کر کہا.....

”آپ چلیں، یہاں کافی گرمی ہے، خالو سے کہیں، بس دو منٹ میں کھانا لا رہی ہوں۔“ اس نے فوراً ڈونگے میں سالن نکالنا شروع کر دیا تھا۔

”جلدی بھجوا دو کھانا، ورنہ تمہارے خالو کسی کی بھی پردا کیے بغیر شروع ہو جائیں گے۔ اپنوں، کو دیکھ کر تو وہ ویسے بھی ”آپے“ سے باہر ہو جاتے ہیں۔“ خالہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بمشکل اٹھتے ہوئے بولی تھیں.....

انا نے سعدی کے پرسکون چہرے کو نظر اٹھا کر دیکھا۔ ”یہ مائنڈ کیوں نہیں کرتا؟“ وہ ایک دفعہ پھر سوچنے لگی تھی..... جبکہ وہ سامنے فلیف پر رکھے برتن اٹھا کر اس کی ہیلپ کروانے لگا.....

”بیٹا! تم کہاں جا رہی ہو، یہاں بیٹھ کر ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔“ اسے کچن میں جاتے دیکھ کر صباحت پھپھو نے ٹوکا۔

”پھپھو! مجھے بھوک نہیں ہے.....“ اس نے کسل مندی سے جواب دیا.....

”کیوں بھوک نہیں ہے؟ ادھر واپس آؤ، ذرا آئینے میں شکل دیکھو اپنی، کتنی کمزور ہو رہی ہو، جسمنی کی طرح۔“ پھپھو کے محبت بھرے لہجے پر سروری خالہ نے طنزیہ انداز میں انہیں دیکھا۔

”بھئی صبا! برا نہ مانو تو جسمنی کا مسئلہ دوسرا ہے۔ اس بچی کو تو آئے دن کے رشتے والیوں کی اٹھک بیٹھک نے بے زار کر رکھا ہے جبکہ انا کا تو ماشاء اللہ ایسا کوئی مسئلہ نہیں۔ بس آج

کچھ ناشتہ لیٹ کیا تھا، اس لئے کھانے کو دل نہیں چاہ رہا ہوگا، جاؤ انا! ذرا چولہے پر چائے کا پانی رکھو، تمہارے خالو کھانا کھاتے ہی چائے کے لئے چل جاتے ہیں۔“

صباحت پھپھو کے چہرے پر تاریک سایہ آیا تھا۔ انا نے جھنجھلا کر کچن کی طرف قدم بڑھا دیے جبکہ ماجد خالو بہت اطمینان سے کہہ رہے تھے۔

”ہماری جسمنی میں بھلا کیا کمی ہے بس آج کل لوگوں کی آنکھوں پر ”لاج“ کی پٹی بندھی ہے۔ دیکھنا کوئی نہ کوئی گوہر شناس اللہ نے اس کے لیے بھی رکھا ہوگا، ان شاء اللہ ہماری جسمنی بھی گھریا والی ہو جائے گی۔“

”ان شاء اللہ!“ صباحت پھپھو رنجیدہ لہجے میں بولی تھیں.....

”ان شاء اللہ تعالیٰ۔“ ان کے دل نے بھی بے اختیار کہا تھا.....



”اس عورت نے مجھے زندگی میں بہت جگہوں پر شرمندہ کروایا ہے۔ تمہارے شوہر کا ایکسڈنٹ ہوا اور میں چاہتے ہوئے بھی کوئی مالی امداد نہ کر سکا۔ گھر میں پہلے ہی ہنگامہ شروع ہو گیا۔ اوپر سے بیٹا بھی ماں کی ہر بات کو حرف آخر سمجھتا ہے۔ پتا نہیں اتنا پیسہ جوڑ کر کیا کریں گے۔“

انا نے چونک کر خالو کے سخت رنجیدہ چہرے کو دیکھا، وہ پہلی دفعہ اس کے سامنے ہی مباحث پھسوکوائے دل کا حال بتا رہے تھے۔۔۔۔۔

”اچھا، فیصل کا فون آئے تو مجھ سے بات کروائیے گا۔“ مباحث پھسوکوائے کچھ سوچ کر کہا۔

”رہنے دو، وہ بھی ماں کی طرح سخت بدلچا ہے۔۔۔۔۔“

خالو آج کچھ زیادہ ہی رنجیدہ تھے۔



انا کو یاد آیا کہ اسے سروری خالہ کے گھر آئے پورے پانچ سال ہو چکے تھے۔ سروری خالہ اس کی امی کی خالہ زاد بہن تھیں۔ انا کی والدہ اکلوتی تھیں اور شادی کے کچھ سال بعد میاں کی اچانک وفات ہو گئی تو انہوں نے ایک اسکول میں جاب کر کے اسے پالا تھا۔۔۔۔۔

وہ خاصی پر اعتماد، باہمت اور حوصلہ مند خاتون تھیں جبکہ انا ان کے بالکل برعکس ڈری سہمی اور اعتماد سے عاری تھی۔ اس کی دوہیاں میں صرف ایک چچا تھے جو کویت میں بیوی بچوں سمیت مقیم تھے۔ یہی وجہ تھی کہ امی نے اپنی بیماری اور روز بروز گرتی ہوئی حالت کے پیش نظر خود سروری خالہ کو فون کر کے ساری صورتحال سے آگاہ کیا اور اپنی وفات کے بعد انا کی دیکھ بھال کی التجا کی جسے سروری خالہ رو نہ کر سکیں اور اگلے ہی دن ماں بیٹی کو لینے پاک پتن پہنچ گئیں اور پھر تین ماہ بعد ہی اس کی والدہ لاہور میں سروری خالہ کے گھر ہی انتقال کر گئیں اور اس وقت وہ فرسٹ ایر کی طالبہ تھی۔۔۔۔۔

ماجد خالو کھلے دل کے بڑی مہربان شخصیت کے حامل تھے۔ وہ اسے خود کالج چھوڑنے جاتے جبکہ ان کا بیٹا فیصل ان کے بالکل برعکس کم گو اپنے کام سے کام رکھنے والا بلکہ انا کو تو حد درجہ مغرور لگتا تھا۔۔۔۔۔ اس کی اپنی ہی دنیا تھی۔۔۔۔۔ وہ دونوں دو سال ایک ہی گھر میں رہے لیکن ان دو سالوں میں بس کتنی کی دو چار دفعہ اس کی مختصر بات ہوئی تھی۔۔۔۔۔ اور پھر وہ باہر چلا

اس دن ماجد خالو کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی حالانکہ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک سوئے تھے۔ رات کے پچھلے پہر سینے میں ہلکا درد محسوس ہوا تھا اور انا نے گھبرا کر سعدی کے گھر فون کر دیا اور اسپتال پہنچنے پہنچنے خالو جان کو ہلکا سا ہارٹ ایک ہو چکا تھا۔۔۔۔۔ سروری خالہ تو بوکھلا گئی تھیں لیکن جیسے ہی خالو کی طبیعت سنبھلی، وہ اپنی سابقہ روٹین میں آ گئی تھیں۔۔۔۔۔

اس دن صبح پھسوکوائے خالو جان کا پتا کرنے اسپتال آئیں تو وہ وہیں تھی جبکہ خالہ سعدی کے ساتھ گھر گئی ہوئی تھی۔۔۔۔۔

”بھائی جان! آپ فیصل کو کہتے کہ وہ پاکستان کا چکر لگا لیتا، اتنے سال تو ہو گئے ہیں اور پھر اس بچی کی بھی رخصتی کر دیتے، کب تک یونہی بٹھائے رکھیں گے۔“ مباحث پھسوکوائے اپنائیت سے مشودہ دے رہی تھیں۔۔۔۔۔

”خالو بمشکل پھسکی سی مسکراہٹ چہرے پر لائے تھے۔۔۔۔۔“ میں نے تو بہت کہا تھا لیکن اس کی ماں نے منع کر دیا کہ خواجہ انا کر ایہ لگا کر آنے کی کیا ضرورت ہے۔“ خالو کے لہجے میں دکھ اور تاسف تھا۔

”لیس، یہ کیا بات ہوئی؟ اکلوتا بیٹا ہے اسے اپنی ذمے داریوں کا خود احساس کرنا چاہیے۔“ مباحث پھسوکوائے کی موجودگی سے بے نیاز لگ کر گئیں۔۔۔۔۔

”تمہیں پتا تو ہے سروری کا۔۔۔۔۔“ خالو استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ ”ایک ایک پیسے پر وہ جان دیتی ہے، ساری زندگی اس نے بس جوڑا ہے۔ خرچ کرتے ہوئے اسے بہت تکلیف ہوتی ہے اسے تو آج کل میری بیماری پر لگنے والے اخراجات کی بھی سخت ٹینشن ہے، اٹھتے بیٹھتے بس فیصل کو فون کر کے ہر روز کے خرچ کارونا روایا جاتا ہے۔۔۔۔۔“

”استغفر اللہ؟ بھابی بھی کبھی کبھی حد کر دیتی ہیں۔“ مباحث پھسوکوائے سا غصہ آ گیا تھا۔

کیا.....

وہ اس وقت سینکڑا ایئر کے ایگزام دے کر فارغ ہوئی تھی جب سروری خالہ نے ایک شام اچانک اسے اطلاع دی کہ کل صبح اس کا فیصل کے ساتھ نکاح ہے اور یہ کہ اس کی والدہ کی رضا مندی بھی اس میں شامل تھی اور امی کی رضا کا سن کر وہ خاموش رہ گئی اور ویسے بھی اسے کہاں بولنے کی عادت تھی..... اور اپنی اسی عادت کی وجہ سے وہ سروری خالہ کی ”پسندیدہ“ لسٹ میں شامل ہو گئی تھی.....

اس دن وہ خالو جان کے لئے نیچنی بنا کر فارغ ہوئی تھی اور ٹشن میں ڈال کر باہر نکلی تھی جب سعدی مسکراتے ہوئے گھر میں داخل ہوا..... انا نے حیرت سے اسے دیکھا..... تو وہ فوراً وضاحت دینے لگا۔

”بھئی تمہاری پڑوس والی آئی آج مجھے روک کر پوچھ رہی تھیں کہ تمہاری منگنی ٹھنی ہوئی ہے کہ نہیں؟“

”کون؟ آئی عالیہ؟“ اس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی.....

”ہاں؟“ اس نے اثبات میں سر ہلایا.....

”پھر آپ نے کیا کہا؟“ وہ بہت کم دلچسپی کا مظاہرہ کرتی تھی.....

”میں نے کہا کہ جہاں میں چاہتا تھا اس لڑکی کو بہت جلدی تھی شادی کروانے کی۔ اب پچھلے کچھ سالوں سے دل کو سمجھا رہا ہوں اگر سمجھ آگئی تو میں بھی کہیں کر لوں گا۔“ اس کے ذہنی لہجے پر انا نے الجھ کر اسے دیکھا جو دانش منین کے آگے کھڑا تھا منہ دھو رہا تھا۔

”آپ کہاں چاہتے تھے؟“ بے ساختہ ہی اس کے منہ سے پھسل گیا تھا۔ گھبرا کر فوراً تار سے تولیہ اتارنے لگی۔

”تمہیں نہیں معلوم؟“ تولیہ پکڑتے ہوئے اس نے بہت گہری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ انا کے دل کی دھڑکن ایک لمحے کو رک سی گئی۔ جبکہ وہ لا پرواہی سے اب منہ صاف کر رہا تھا.....

”خالہ کب آئیں گی اسپتال سے؟“ اس نے صاف بات بدلی تھی اس کے بے ساختہ نظریں چرانے پر سعدی نے ٹھنڈی آہ بھری.....

”اب ماموں کو کھانا دینے جاؤں گا تو داپسی پر ممانی کو لیتا آؤں گا۔ شام کو امی ان کے

پاس رہیں گی۔“

”آپ کی امی بہت نائس اور مخلص خاتون ہیں اللہ ان کو بہت اجر دے گا۔“ انا کے سادہ لہجے پر سعدی نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بہت کم کسی کے بارے میں کوئی تبصرہ کرتی تھی۔

”تھینک یو!“ وہ خلوص سے مسکرایا۔ ”امی کو اصل میں اپنے اکلوتے بڑے بھائی سے محبت بھی تو بہت ہے ناں.....“

”ہاں لیکن آج کل کے دور میں لوگ کہاں محبتوں کی قدر کرتے ہیں وہ ہر جذبے کے پیچھے کسی ”مقصد“ کو ڈھونڈنا شروع کر دیتے ہیں.....“

وہ آج لمحہ لمحہ اس کو چونکا رہی تھی۔

”ہاں۔ تم ٹھیک کہتی ہو لیکن میری تھیوری تھوڑی مختلف ہے، میرے خیال میں انسان جب بے غرض ہو کر کسی سے محبت کرتا ہے تو پھر وہ ”صلے“ کی توقع انسانوں سے نہیں رکھتا اور اللہ نیتوں کا پھل ضرور دیتا ہے۔ انسانوں سے توقع رکھنا تو بہت بڑی بے وقوفی ہے.....“

اس نے بہت غور سے سعدی کو دیکھا جو کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے بہت سنجیدگی سے اس کی طرف متوجہ تھا۔

”توقع کے بیج کو کسی کھاد یا پانی کی ضرورت تھوڑی ہوتی ہے۔ یہ خود بخود تعلق کی زمین پر پھوٹ پڑتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے تناور درخت بن جاتا ہے.....“

وہ پھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”ظاہر ہے توقعات بھی اپنوں سے ہی ہوتی ہیں۔

انسان راہ چلتے لوگوں سے تھوڑی توقعات لگاتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو اپنوں اور غیروں میں فرق ہی کیسے معلوم ہو۔“

”خیر ہے آج بہت فلسفہ بول رہی ہو، کہیں فیصل نے تو کچھ نہیں کہہ دیا۔“ اس نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے چھیڑا۔

”اونہہ! وہ ستمبر ایسے انداز میں ہنسی۔“ اس کے پاس اتنا وقت کہاں وہ تو ڈالروں کی دنیا میں اپنے ایک ایک لمحے کو کیش کر داتا ہے رشتے ناتے اس کیلئے ثانوی چیزیں ہیں۔“

”انا!“ سعدی نے بغور دیکھا۔

”کیا ہوا ہے؟ اتنی ہرٹ کیوں ہو؟“

”کچھ نہیں!“ وہ کچن کی طرف بڑھ گئی، ٹشن اسے پکارتے ہوئے وہ بہت عام لہجے میں

پوچھ رہی تھی۔

”خالو جان کب تک اسپتال سے گھر شفٹ ہو جائیں گے۔“

”ان شاء اللہ کل۔“ سعدی نے یقین بھرے لہجے میں کہا۔ وہ دونوں چلتے چلتے اس کی بایک کے پاس آگئے تھے۔ آم کے کھنے درخت پر بیٹھی کوئل بہت زور سے بولی تھی۔

”اس دفعہ ماشاء اللہ آم خاصے لگے ہیں، کسی دن صفایا کریں گے۔“ سعدی نے توصیفی نظروں سے درخت کو دیکھتے ہوئے شرارتی لہجے میں کہا۔

”ادنبہ، اس کی امید نہ رکھیں، یہ درخت پر لگے لگے گل سڑ جائیں گے لیکن سردی خالہ کسی کو دینے کا حوصلہ نہیں کریں گی۔“

”خیر ہے، آج تو تم دکھی اور مظلوم بہوؤں کی طرح اپنی ظالم ساس کیخلاف گلے شکوے کر رہی ہو، مجھے لگتا ہے کہ نمناںی جان نے کچھ کہہ دیا ہے اور کچھ زیادہ ہی شدید کہا ہے ورنہ چھوٹی موٹی چیزوں پر اپنے تاثرات کو بیان کرنا تو تم ویسے ہی مناسب نہیں سمجھیں۔“ وہ بایک پر بیٹھ چکا تھا۔

”ہاں! بس مجھے دکھ ہوا ہے کہ خالو جان اتنے زیادہ بیمار ہیں اور خالہ اور فیصل اس وقت سے صرف خرچ ہونے والے پیسوں کا حساب کتاب کر کے ہلکان ہوئے جا رہے ہیں۔“ اس کے صاف گو لہجے پر سعدی ہکا بکا رہ گیا اسے ہرگز اس سے اس درجہ صاف گوئی کی توقع نہیں تھی۔ پھر سنبھل کر گویا ہوا۔

”ڈونٹ وری۔ ان چیزوں کی ٹینشن مت لیا کرو، ماموں جان ان چیزوں کے عادی ہیں۔ ویسے زیادتی تو آج میرے ساتھ بھی ہوئی ہے۔“

سعدی کی شرارتی نظروں پر وہ ابھی..... اور سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”بھئی۔ میں نے آج جلدی میں صبح ناشتہ بھی نہیں کیا تھا، بریک میں اسپتال کھانا پہنچانا تھا، اس لئے یہاں آ گیا۔ تم نے بھی کھانے کا نہ پوچھا، میرے تو کچھ صبح سے ستارے گردش میں ہیں۔“ وہ بایک کو کلک لگا کر تیز رفتاری سے نکل چکا تھا۔ گیٹ کے پاس کھڑی انا کا دل خفت اور شرمندی کے احساس سے بھر گیا تھا۔ وہ خود کو کستی ہوئی ست روی سے اندر کی طرف آگئی تھی۔



خالو جان کو گھر آئے تیسرا دن تھا۔

پاکش کے بعد موسم خاصا سہانا ہو گیا تھا۔ وہ آم کے درخت کے پاس کرسی بچھائے آرام سے نیم دراز اخبار پڑھنے میں مصروف تھے جب وہ انہیں چائے کا کپ پکڑانے آئی تو انہوں نے سنجیدگی سے اسے خالی پڑی کرسی پر بیٹھنے کا حکم دیا۔

”میں نے آج سعدی کو بلایا ہے۔ وہ بس آنے والا ہوگا، اس کے ساتھ اردو بازار جاؤ اور ایم اے کی کتابیں لے کر آؤ، اگلے مہینے داخلہ بھجواؤ اور پھر زدو۔“

”جی!!!!“ انا نے الجھن بھرے انداز سے ماجد خالو کو دیکھا جو حد درجہ سنجیدہ تھے۔

”وقت کا کچھ بھروسہ نہیں ہے۔ پتا نہیں کل کون سا وقت انسان کا منتظر بیٹھا ہو، آج کل کے دور میں بی اے کی کوئی وقعت نہیں اور دنیا بہت خود غرض ہے۔ کوئی ڈگری پاس ہوگی تو کم از کم اپنے پیروں پر تو کھڑی ہو جاؤ گی یہ پانچ ہزار اپنے پاس رکھو اور اپنی خالہ کو بتانے کی ضرورت نہیں۔“ انہوں نے پیسے اس کی طرف بڑھائے تو اس نے جھپکتے ہوئے لے لیے۔

”میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، اللہ بخشے تمہاری ماں بہت نیک عورت تھی۔ اس نے اپنے کچھ زیورات امانتاً تمہاری خالہ کے پاس رکھوائے تھے۔ یقیناً تمہیں اس کا علم نہیں ہوگا اور تمہاری خالہ کی فطرت سے میں بخوبی واقف ہوں، اس نے بھی تمہاری ماں کے مرنے کے بعد بھاپ نہیں نکالی ہوگی۔ بہر حال میری مخالفت کے باوجود اس عورت نے وہ زیور تمہاری اجازت کے بغیر بیچے اور فیصل کو باہر بھجوا دیا اور اب میرے بارہا کہنے کے باوجود وہ قرض اتارنے پر راضی نہیں۔ تم میرے لیے بیٹیوں کی طرح ہو، اس لیے اگر مجھے کچھ ہو جائے تو میں بتا رہا ہوں۔ قیامت کے دن اس خیانت کا ذمہ دار مجھے مت ٹھہرانا۔ میرا خدا گواہ ہے کہ میں نے ہر ممکن اس کو منع کیا تھا۔ بینک میں کچھ پیسے ہیں جو میں نے تمہارے نام جمع کر دائے ہیں۔“

خالو بہت دکھ اور تاسف بھرے لہجے میں بول رہے تھے، انا کون کر شدید شاک لگا تھا۔ وہ حقیقت میں لاعلم تھی۔

وہ پھکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”کوئی بات نہیں خالو جان! مجھے زیورات وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میرے لیے ان کی اہمیت اس حد تک ہے کہ وہ میری ماں کے تھے۔“



اس لیے شاید میں ان کو بہت سنبھال کر رکھتی.....

وہ بھی جبراً مسکرائے۔ ”بس بیٹا اللہ تمہاری قسمت بہت اچھی کرے، لوسعدی آ گیا۔ اس کے ساتھ چلی جانا۔“

انہوں نے چونک کر گیسٹ کی طرف دیکھا جہاں سے سعدی اپنی بایک اندر لا رہا تھا۔ وہ فوراً اسے سلام کر کے اندر چلی گئی تھی جلدی سے کپڑے تبدیل کیے اور نکلتی کر کے اپنی بلیو کڑی چادر لے کر باہر آگئی تھی.....

”سعدی! چائے پیئیں گے آپ.....“

”نہیں، دیر ہو جائے گی۔“ وہ بازو پر بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہاں، ہاں جاؤ، واپسی پر چائے، کھانا سب کچھ کھا لیا۔“ خالو جان کے غلت بھرے انداز پر ان کے ساتھ سعدی نے بھی چونک کر انہیں دیکھا اور پھر وہ کندھے اچکا کر اپنی بایک کی طرف بڑھ گیا.....

بازار میں انہیں صرف ڈیڑھ گھنٹہ لگا تھا۔ وہ اسے اپنے کسی دوست کی دکان پر لے آیا تھا اور سلیپس لے کر خود ہی کتابیں نکال نکال کر کاؤنٹر پر ڈھیر لگا جا رہا تھا..... واپسی پر وہ اپنی سوچوں میں گم تھی اور اسے پتا ہی نہیں چلا، چونکی تو اس وقت جب وہ اپنے گھر کے دروازے پر بایک روک چکا تھا.....

وہ مسکراتے ہوئے وضاحت دے رہا تھا۔ ”حمنی! آپ کی کافی دنوں سے کہہ رہی تھیں کہ انا سے ملنے کو دل چاہ رہا ہے اور آج تو میں انہیں خصوصی طور پر بتا کر گیا تھا کہ تمہیں لے کر آؤں گا.....“

”لیکن! میں نے تو خالہ جان کو بتایا نہیں۔“ وہ ہلکی سی پریشان ہوئی۔

”ڈونٹ وری۔ ماموں جان بتا دیں گے.....“ وہ گھر کے اندر داخل ہو چکا تھا.....

”ارے انا باجی آئی ہیں، ہرا۔“ صحن میں کھڑی کرن نے اسے دیکھتے ہی نعرہ لگایا اور چھلانگ مار کر اس کے گلے لگ گئی تھی۔

”قسم سے ہم لوگ تو آپ سے ملنے کو ترس گئے تھے۔ پورے ایک مہینے سے تو امتحانوں کا عذاب سر پر مسلط تھا۔ اسی کہیں بھی آنے جانے نہیں دے رہی تھیں۔ اوپر سے آپ بھی تو کبھی سال میں ایک دفعہ گھر سے نکلتی ہیں۔ یقین کریں، مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے آپ کو

دیکھ کر.....“ وہ اس کا ہاتھ پکڑے محبت اور اپنائیت سے کہہ رہی تھی۔ انا اس کی معصومیت پر مسکرا دی۔

پھر صباحت پھوپھو، حمنی، ارم اور پھوپھا چان کی ڈھیر ساری محبت اور گرم جوشی پر وہ بار بار شرمندہ ہوتی رہی۔ وہ بار بار صفا کی دے رہی تھی کہ کہیں آنے جانے کے معاملے میں وہ خود چور ہے ورنہ خالہ تو اسے منع نہیں کرتیں۔

کھانا کھا کر وہ حمنی کے کمرے میں کچھ دیر آرام کے لیے لیٹی تھی۔ ارم اور کرم دونوں کچن میں چائے بنانے میں مگن تھیں جبکہ صباحت پھوپھو اور حمنی ظہر کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ اس نے یونہی بیڈ کی سائڈ پر بڑی پروین شا کر کی کتاب اٹھالی.....

درمیان میں سے چند غزلیں پڑھتے پڑھتے..... اس نے پہلا صفحہ کھولا اور پہلے صفحے پر لکھی تحریر پڑھ کر اسے دھچکا لگا۔ وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔ آنکھوں کے سامنے لکھی تحریر اس کا منہ چڑا رہی تھی..... یہ کتاب حمنی باجی کو ان کی برتھ ڈے پر گفٹ ملی تھی۔ حمنی کے لیے.....!

”جو میری زندگی کی پہلی اور آخری خواہش ہے۔ جسے دیکھ کر مجھے زندگی خوب صورت لگتی ہے.....“

تمہارا فیصل

انا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، اس نے فوراً ہی کتاب بند کر دی تھی۔ اس کے حواس قابو میں نہیں آرہے تھے۔ فیصل کا سپاٹ چہرہ اور روکھا لہجہ اس کے ذہن کے درپچوں پر روشن تھا..... اس کی بیزاری کے پیچھے چھپی داستان کا سرا ہاتھ لگ گیا تھا۔

”بھئی انا! تم کہیں بورتو نہیں ہو رہیں یہ ارم اور کرن کہاں لگ گئیں۔“ حمنی آپنی باہر سے بولتی اندر آ رہی تھیں، اس کا چہرہ دیکھ کر وہ ٹھنک گئیں۔

”ارے تمہیں کیا ہوا؟ کتنا پسینہ آ رہا ہے..... طبیعت ٹھیک ہے؟“ انہوں نے آگے بڑھ کر انتہائی محبت سے اس کے ماتھے کو چھوا.....

”جج..... جی۔ طبیعت ٹھیک ہے بس کچھ گرمی لگ رہی ہے.....“ اس نے بوکھلا کر وضاحت دی تو حمنی آپنی نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ جبکہ وہ غیر محسوس طور پر کتاب اپنے نیکے کے نیچے کر چکی تھی اور اب دوپٹے سے اپنا چہرہ صاف کر رہی تھی۔

”انا بابی! آج میرے ہاتھ کی فرسٹ کلاس چائے پیس اور دادیں، قسم سے کبھی کبھی تو مجھے خود حیرت ہوتی ہے کہ آخر میں اتنی اچھی چائے بنا کیسے لیتی ہوں؟“ کرن چائے کے گم ٹرے میں رکھے ہنستے ہوئے اندر داخل ہوئی تھی۔

”اللہ معافی دے، ایک تو گرمی اور اوپر سے جھوٹ..... توبہ توبہ.....“ ارم نے دہائی دی اور پھر حسنی بابی کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”حسنی آپ! آپ کی کوئی رعنا آئی ہوئی ہیں۔ امی کے پاس بیٹھی آپ کو یاد کر رہی ہیں۔“

ارم کی اطلاع پر وہ فوراً انھیں اور کمرے سے نکل گئیں جبکہ کرن اس کی چائے کا کپ پکڑاتے ہوئے ایک دفعہ پھر شروع ہو چکی تھی۔

”قسم سے انا بابی! آج آپ کو دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے بلکہ ہمارا بس چلتا تو آپ کو ہمیشہ کیلئے یہیں رکھ لیتے لیکن سروری ممانی جان نے بالکل ظالم سماج کا کردار ادا کیا اور دو دودل توڑ دیئے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ چونکی جبکہ کرن اپنے بچکانہ پن سے پھر شروع ہو چکی تھی۔

”ہماری امی اور سچ پوچھیں تو سعدی بھائی کی بہت خواہش تھی اور اوپر سے فیصل بھائی اپنی حسنی بابی.....“ وہ بولتے بولتے ایک دم رکی۔ ارم کی تسمی نظروں سے اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

”ارے انا بابی! آپ چائے پیس، اسے ”بونگیاں“ مارنے کی بہت بری اور فضول عادت ہے ایسے ہی فضول اور بے ٹکا بولتی ہے.....“ ارم نے فوراً بات کو سنبھالنا چاہا۔

”ہاں مجھے معلوم ہے، فیصل نے ایک دفعہ بتایا تھا کہ وہ حسنی میں انٹرسٹڈ ہیں۔“ اس نے صاف جھوٹ بولا تھا جبکہ دونوں بہنوں کے چہرے کارنگ تیزی سے اڑا تھا۔

”نہیں، نہیں یہ تو بہت پہلے کی بات ہے اور پھر ممانی تو ایسا ہرگز نہیں کر سکتی تھیں، اس لئے تو فیصل بھائی فوراً باہر چلے گئے اور اب تو وہ بھول بھال بھی گئے، کبھی رابطہ ہی نہیں کیا.....“

ارم نے فوراً صفائی دی جبکہ انا ششدر تھی۔ اس نے بغور دونوں بہنوں کو دیکھا جو نظریں چرا رہی تھیں۔

”اور اب تو رات جو حسنی آپ کی کو دیکھنے آئے تھے، انہوں نے پسند بھی کر لیا۔ اب ہماری

طرف سے فائل ہونا باقی ہے۔ ان شاء اللہ ہماری حسنی آپ کی شادی ہو جائے گی۔“ ارم نے اس سے زیادہ خود کو تسلی دی تھی۔

”ان شاء اللہ!“ انا کے پر غلوں لہجے پر دونوں بہنیں چونکی تھیں۔

شام کو جب وہ سعدی کے ساتھ گھر پہنچی تو سروری خالہ کا موڈ خاصا خراب تھا۔ وہ کچن میں برتن دھوتے ہوئے مسلسل بڑا بڑا رہی تھیں۔ انا نے چادر اتاری اور کچن میں ان کی مدد کے لیے پہنچ گئی۔ ابھی آنا گوندھنے کے لیے اس نے پرات اٹھائی ہی تھی کہ خالہ نے اس کے ہاتھ سے پرات زور سے پھینچ دی۔

”رہنے دو بی بی! میں خود کر لوں گی۔ جب سارا دن بوڑھے خالہ اور خالو کا خیال نہیں کیا تو اب بھی یہ چونچلے کرنے کی ضرورت نہیں..... بھلا کنواری لڑکیوں کا اتنے اتنے کھنٹے باہر رہنے کا کیا کام، ہمارے زمانے میں تو لڑکیوں میں شرم و حیا اور بھجک ہوتی تھی۔ مجال ہے بزرگوں کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر قدم رکھا ہو..... اب تو لحاظ ہی ختم ہو گیا ہے، میرے فیصل کو یہ باتیں بالکل پسند نہیں.....“

خالہ آج بالکل بے لحاظ تھیں۔ کچھ صباحت کے نام سے وہ ویسے ہی چڑتی تھیں، انہیں تو جب سے گھر آ کر اس کے جانے کا معلوم ہوا تھا گویا پتنگ لگے ہوئے تھے۔

وہ خاموشی سے کچن سے نکل آئی تھی۔ فیصل کی پسند ناپسند کے بارے میں انہوں نے پہلی دفعہ یوں بباگ دہل کہا تھا اور انا کو بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ آ کر اپنے کمرے میں لیٹ گئی۔ دل تو ویسے بھی بوجھل تھا، آنسوؤں نے بھی بے جاوت کر دی۔ خاموشی سے اس کا تکیہ بھینکا رہا۔ رات کے کھانے پر خالو جان اسے آدازیں دیتے رہے تھے لیکن وہ ڈھیٹ بنی لیٹی رہی۔ رات ساڑھے دس بجے خالہ بے دھڑک اس کا دروازہ کھول کر کمرے میں آ گئی تھیں۔

”فیصل کا فون ہے، تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔“

خالہ کے سپاٹ لہجے پر وہ بری طرح چونکی جبکہ خالہ یہ اطلاع کر کے رکی نہیں تھیں..... وہ سستی اور بے زاری سے چپل پاؤں میں ڈال کر باہر برآمدے میں آئی جبکہ خالہ پچھلے صحن میں جا چکی تھیں۔

”ہیلو.....!“ وہ بیزار سی بولی تھی۔

”تم آج امی کی اجازت کے بغیر صباحت پھوپھو کے گھر کیوں گئی تھیں؟“ انا جیسے

”مطلب کیا ہے تمہارا؟ کیا بکواس کر رہی ہو؟ کون سا میدان اور کیسا میدان؟ یہ کون سی خرافات تمہارے دماغ میں بھردی گئی ہیں۔ ان ہی فضول باتوں سے امی ڈرتی تھیں تب ہی تمہیں جانے نہیں دیتی تھیں۔“ وہ تمللا کر رہ گیا تھا۔ چپ چاپ، کم گو اور دبوسی انا کا یہ روپ اس کے لیے ناقابل یقین تھا۔

”کوئی نہ کوئی بات تو تھی ناں؟“ انا تو آج آتش فشاں بنی ہوئی تھی، دوپہر سے اسے اپنی ذات کے پر نچے اڑتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

وہ بہت تیز و تند لہجے میں بولا۔ ”کوئی بات نہیں تھی۔ میری بچپن کی بے وقوفی تھی، جذباتیت تھی۔ وہ بے وقوف لڑکی پتا نہیں کون کون سے خواب آنکھوں میں سجا بیٹھی، ورنہ اس سے شادی کر کے مجھے ملنا ہی کیا تھا؟ کنویں کا مینڈک بن کر رہ جاتا..... اوپر سے معاشی لحاظ سے اس کا خاندان خاصا کمزور، میں کہاں کہاں ان کی مدد کرتا، نا بابا نا..... میں اتنا بے وقوف نہیں تھا تب ہی باہر کا چانس بنا تو فوراً یہاں چلا آیا۔“

”تو مجھ سے شادی کر کے آپ کو کیا ملنا تھا؟“ وہ چونک کر سپاٹ لہجے میں بولی۔  
 ”کم از کم میرے بوڑھے ماں باپ کے پاس تو رہو گی اور پھر بھاگ بھاگ کر میکے جانے والا بھی کوئی سلسلہ نہیں۔“ وہ روانی میں بول رہا تھا..... انا کو زبردست دھچکا لگا تھا۔ وہ بہت اونچائی سے نیچے گری تھی۔  
 اس نے خاموشی سے ریسپور کرڈل پر رکھ دیا تھا۔ اسی لمحے ماجد خالو کمرے سے نکلے، ان کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔

انا نے گلہ آمیز نظروں سے انہیں دیکھا۔ اسے نہ جانے کیوں لگا تھا جیسے خالو نے اندر رکھے ایکسٹرا ٹیلی فون سیٹ سے ان کی گفتگو کا کوئی نہ کوئی حصہ ضرور سنا ہے۔

”بیٹا! مجھے اندر سے جائے نماز لا دو.....“ انہوں نے بے اختیار نظریں چرائی تھیں۔ وہ بھٹک قدم اٹھاتی اندر داخل ہوئی اور الماری سے جائے نماز نکال کر باہر آئی تو خالو کسی گہری سوج میں گم تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر کچھی چار پائی پر لیٹی سروری خالہ گہری نیند میں مدہوش تھیں۔

وہ خاموشی سے خالہ کے پاس خالی چار پائی پر لیٹ گئی۔ حلق میں کانٹے اگ آئے تھے، اسے یوں لگا تھا جیسے وہ ویران صحرا میں بالکل اکیلی کھڑی ہو..... دل آج اچانک بغاوت پر اتر

خواب سے ہڑبڑا کر جاگتی تھی.....  
 ”جب تمہیں معلوم ہے کہ امی ایسی باتوں کو سخت نا پسند کرتی ہیں پھر تم ایسی حرکتیں کیوں کر رہی ہو؟“

وہ سخت غصے میں تھا۔ لگتا تھا کہ خالہ نے اچھی خاصی برین واشنگ کی تھی۔ وہ ہمت اور الفاظ دونوں جمع کر کے بولی۔

”پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے آپ کی صباحت پھوپھو کے گھر جانے کا قطعاً شوق نہیں۔ آپ کے والد محترم نے کہا تھا اور کم از کم میں ان کو منع نہیں کر سکتی۔ آپ مجھے بتادیں کہ مجھے اس گھر میں آپ کے والد صاحب کے مطابق چلنا ہے یا والدہ کے؟“  
 دوسری طرف تو اس تلخ لہجے پر گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔ اس کی بات اور لہجہ دونوں ہی غیر متوقع تھے۔

”اچھا! ابو نے کہا تھا.....“ وہ تھوڑا سا سنبھل کر بولا تھا۔ اب لہجے سے سختی اور درشتی کا عنصر بھی غائب تھا۔

”جی ہاں، ورنہ مجھے سپر سپاٹوں کا کوئی شوق نہیں۔“  
 وہ رکھائی سے بولی۔

”خیر کیا حال تھا صباحت پھوپھو کا؟“ وہ فوراً گھبرا کے بولا تھا۔

”ٹھیک تھیں، سب آپ کا پوچھ رہے تھے.....“

اس نے بہت چپھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اچھا، کون، کون؟“ اس کا انداز خاصا عجیب تھا.....

”سوائے جمنی آپنی کے سب ہی نے پوچھا تھا۔“

اس کا انداز بھی خاصا جتنا ہوا تھا۔

”اور جمنی کا کہیں رشتہ وغیرہ فائل ہوا.....؟“ وہ پہلی دفعہ اس سے فون پر بات کر رہا تھا

اور سوائے اس کی ذات کے، سب کے بارے میں اسے فکر تھی۔ انا کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی

نے اس کے ہاتھ پر دھکتا ہوا انگارہ رکھ دیا ہو.....

”آپ کو کیوں ٹینشن ہے؟ آپ تو میدان چھوڑ کے بھاگ گئے تھے۔“ اس نے گویا

فیصل کے سر پر بم پھوڑا تھا..... وہ بوکھلا گیا.....

اس کے قدم ڈھیلے پڑ گئے بے زاری سے اس نے کیتلی میں چائے کے لیے پانی رکھا اور چائے کپ میں ڈال کر وہیں بیٹھ کر پینے لگی۔

”ہزار دفعہ مع کیا ہے کہ صبح صبح نہار منہ صرف خالی چائے نہیں پیتے، اور کچھ نہیں چھوٹا سا پراٹھا یا روٹی ہی بنا لیا کرو، فرنیج میں کباب پڑے ہیں۔ اندوں کا اسٹاک جوں کا توں ہے، کون سا کسی چیز کی کمی ہے۔“ خالہ کے محبت بھرے انداز پر وہ چونکی اور اگلے ہی لمحے کندھے جھٹک کر دوبارہ خاموشی سے چائے پینے لگی۔

”کیا کہہ رہی تھیں تمہاری صباحت پھوپھو کل؟“ ان کے تجسس بھرے لہجے پر میٹھی چائے ایک دم کڑوی محسوس ہونے لگی تھی۔ مہربان انداز کے پیچھے ”کچھ جاننے“ کی کھوج سمجھ میں آگئی تھی۔

”پتا نہیں، مجھ سے تو کوئی خاص بات نہیں کی بلکہ میرے جاتے ہی وہ پھوپھا کو لے کر کسی سے ملنے چلی گئی تھیں، میں تو آگئی وہ پتا نہیں کب آئی ہوں گی۔“ اس کی اطلاع پر خالہ کے چہرے پر اطمینان کے رنگ نمودار ہوئے تھے۔

”اچھا؟ گئی کہاں تھی؟ کچھ نہ کچھ تو بتا کر گئی ہوگی؟“  
تجسس ابھی بھی برقرار تھا۔

”شاید حمئی آپنی کے کسی رشتے وغیرہ کا مسئلہ تھا۔“

”اچھا.....؟“ ان کے کان کھڑے ہوئے۔ ”کہاں کر رہی ہے؟ کیا کرتا ہے لڑکا؟“

کتنے بہن بھائی ہیں؟“ خالہ کے بے چین لہجے پر وہ بے زاری سے بولی۔

”میں نے پوچھا نہیں، آپ کو پتا تو ہے۔ میں ان باتوں میں دلچسپی نہیں لیتی۔ وہ کچھ ذکر تو کر رہی تھیں کہ لڑکا اکلوتا ہے اور انگلینڈ میں ہوتا ہے، باقی میں نے دھیان نہیں دیا۔“

”ایک تو تم بھی بدھو اور بے وقوف ہو، تمہاری عمر کی لڑکیاں چلتا پرزہ ہوتی ہیں اور ایک تم ہو کہ کچھ خبر نہیں۔ پتا نہیں کیا بنے گا تمہارا۔“ ادھوری معلومات سن کر انہیں خاصی مایوسی ہوئی تھی۔ جبکہ وہ اطمینان سے چائے کے برتن دھونے لگی۔

”لڑکا اکلوتا، اور انگلینڈ میں۔ اتنا اچھا رشتہ کیسے اس کا لی کلونی کو مل گیا۔ صباحت کے تو پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے ہوں گے۔“ وہ بلند آواز میں بڑبڑائی تھیں جبکہ پیشانی شکنوں سے پر تھی۔

آیا تھا۔ اپنی محبت سے لبریز ماں کا چہرہ ذہن میں آتے ہی اس کی آنکھیں بھر گئیں۔ وہ اکلونی ہونے کی وجہ سے کافی لاڈلی تھی اور امی تو ایک لمحے کو بھی اسے آنکھوں سے ادھیل ہونے نہیں دیتی تھیں۔ باپ کا بس ہلکا سا چہرہ اسے یاد تھا..... یا پھر خالد چاچو کا مہربان انداز، وہ کویت جانے سے پہلے اس سے ملنے آئے تھے اور اسے نہ جانے کیوں انہیں دیکھ کر اپنے باپ کی یاد بے تحاشا آئی تھی۔ وہ عید وغیرہ پر اسے فون کر لیتے تھے در نہ خاصی مصروف زندگی تھی ان کی، اور پھر شمینہ چچی جو خاصی ریزرو اور کم گوی تھیں۔ مختصر سا اس کا حال و احوال پوچھ کر فون چچا کو پکڑا دیتیں۔

”کاش چچا مجھے بھی اپنے ساتھ کویت لے جاتے.....“

اس نے پہلی دفعہ خاموش شکوہ کیا تھا۔ بے چینی سے تو کروٹ بدلی اچانک اس کی نظر کچھ فاصلے پر چار پائی پر بیٹھے ماجد خالو پر پڑی، وہ پچھلے تین گھنٹے سے ایک ہی پوزیشن میں کسی گہری سوچ میں گم بیٹھے تھے۔ گود میں رکھے نیچے پر دونوں کہنیوں کو مضبوطی سے جمائے ہاتھوں کے پیالے میں ان کا چہرہ خاصے گہرے تفکر کی غمازی کر رہا تھا۔ چاند کی روشنی میں وہ خاصے پر اسرار لگ رہے تھے۔ انا کو ایک دم سے کچھ ڈر محسوس ہوا۔ وہ فوراً بازو آنکھوں پر رکھ کر زبردستی سونے کی کوشش کرنے لگی لیکن ساری رات وہ کروٹیں بدلتی رہی۔ ہر بار چونک کر خالو کو دیکھتی لیکن وہ ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے تھے انہیں دیکھتے دیکھتے اس کی نہ جانے کب آنکھ لگ گئی۔

”انا! ٹھو بیٹا! دس بجے رہے ہیں۔“ خالو کی آواز پر اس کی آنکھ فوراً کھل گئی۔

”دس بج گئے؟ اتنی دیر؟ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔“ وہ جلد جلدی بال سینے لگی۔

”سورج سر پر آ گیا ہے لیکن ناشتے کا کچھ پتا ہی نہیں۔“ خالہ سردی نے اس کی متورم

آنکھوں اور ان میں نظر آتے سرخ ڈوروں کو غور سے دیکھ کر نسبتاً نرم لہجے میں کہا۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“ انہوں نے انا کو جاچتی نظروں سے دیکھا۔

”ہاں۔ ٹھیک ہوں۔“ وہ خالہ کی ثنوتی نظروں سے خائف ہو کر فوراً کچن میں گھس گئی

لیکن خالہ کی اونچی آواز میں دی گئی اطلاع پر وہ چونک گئی۔

”میں ناشتہ کر چکی ہوں، خالو تمہارے تمہیں اٹھا کر پتا نہیں کہاں نکل گئے۔ بس اپنے

لئے ناشتہ بنانا.....“

لہجہ میں پوچھا۔  
 ”کہیں نہیں۔“ انہوں نے صاف ٹالا تھا۔ وہ ابھی بھی کسی سوچ میں گم تھے۔ ان کی بات سن کر خالہ کے دل کو پچھلے لگے تھے۔

”نہیں بتانا تو نہ بتائیں! مگر اس عمر میں جھوٹ نہ بولیں۔ پچھلے ایک گھنٹے سے اندر گھسے ہوئے ہیں۔“

خالو نے ایک سرو اور لالعلق سی نظر ان پر ڈالی اور اخبار اٹھالیا۔  
 ”میں دیواروں سے باتیں نہیں کر رہی۔“ وہ تمللا کر بولیں۔  
 ”اطلاع کا شکریہ۔“ وہ پھر اخبار میں گم ہو گئے۔

”ساری زندگی اسی طرح میرا کلیجہ جلایا ہے۔ یہ میرا ہی حوصلہ تھا جو آپ کے ساتھ گزارہ کر گئی۔ اگر ہوتی کوئی دوسری تو دن میں تارے دکھا دیتی۔“  
 خالہ بول رہی تھیں جبکہ خالو انہیں مکمل نظر انداز کیے اب کچن کی طرف منہ کر کے بلند آواز میں پوچھ رہے تھے۔

”انا بیٹا! آج دوپہر کا کھانا بھی ملے گا کہ نہیں؟“

خالہ نے سلگ کر دوپٹہ منہ پر رکھا لیا تھا۔ وہ اب اچھی خاصی ناراض ہو چکی تھیں۔ جبکہ خالوان کو لٹ کر وائے بغیر ایک ایک نوالے پر انا کی تعریف کر رہے تھے۔ وہ خاصی رغبت سے کھا رہے تھے۔

شام کو خالہ چادر اٹھا کر اپنا غم ہلکا کرنے پڑوس میں چلی گئی تھیں اور وہ خالو کی فرمائش پر چائے بنا کر ان کے پاس پہنچی تو انہوں نے بہت عجیب سوال اس سے کیا۔

”انا بیٹا! تم میرے لیے کیا سوچتی ہو؟“

”کیا مطلب خالو جان؟“ وہ بری طرح چونکی۔

”میرا مطلب ہے بیٹا! تمہاری زندگی میں میری کیا حیثیت ہے؟“

اس نے حیرت سے خالو کا چہرہ دیکھا جو کسوٹی، کسوٹی کھیلنے کے موڈ میں تھے۔ ”آپ میرے لیے باپ کی جگہ پر ہیں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”تو کیا کوئی باپ اپنی بیٹی کے لیے غلط فیصلہ کر سکتا ہے جانتے بوجھتے؟“ وہ نہ جانے کون سا طمینان چاہ رہے تھے۔

”وہ تو مجھے پتا نہیں، خیر دوپہر میں کیا بنے گا؟“ اس نے لا پرواہی سے بات ٹالنا چاہی۔  
 ”جو مرضی پکالو، میرا تو کلیجہ جل رہا ہے۔“ وہ گھٹنوں پر دباؤ ڈال کر اٹھیں۔  
 ”ہاں گری بھی تو بہت ہے۔“ انا سخی سے مسکرا دی۔

”پتا نہیں لوگوں کی قسمتیں کیسے اچھی ہو جاتی ہیں اور اتنی مبینی اور گھنی ہے صباحت، ایک دفعہ بھی مجھے بیٹی کے سرال جانے کا نہیں کہا، لے گئی ہوگی اپنے بھائی کو، ان کو بتائے بغیر تو سانس بھی نہیں لیتی۔ عجیب لیلیٰ مجنوں والی محبت ہے بہن بھائی میں، اب بھی مجھے یقین ہے وہیں حاضری دینے گئے ہوں گے۔“ خالہ جی بھر کے بدگمان ہو رہی تھیں، ان کا موڈ خاصا خراب ہو چکا تھا۔

وہ برتن دھو کر کچن صاف کر کے باہر نکلی اور دل لگا کر گھر کی تفصیلی صفائی کی جبکہ خالہ آم کے بیڑ کے نیچے پچھی چار پائی پر دوپٹے سے سر باندھے جانے کن زہریلی سوچوں میں گم لٹی ہوئی تھیں۔ اس نے صفائی کر کے فریج سے جھنڈیاں نکالیں اور کاٹنے لگی۔ وہ کھانا بنا چکی تھی جب خالو واپس آئے۔ وہ بھی خاموش تھے۔

آتے ہی وہ کمرے میں گھس گئے تھے اور ٹیلی فون گود میں رکھے دھڑا دھڑا، نمبر ملائے جارہے تھے۔ انا نے ایک دو دفعہ جھانک کر دیکھا لیکن وہ ریسپور کان سے لگائے۔ بہت دھیمی آواز میں انتہائی سنجیدہ لہجے کے ساتھ مصروف تھے۔  
 خالہ انتہائی کسل مندی اور طبیعت کے بوجھل پن کے ساتھ دو تین دفعہ خود بھی دیکھ کر جا چکی تھیں۔

”جاؤ، اپنے خالو سے کہو کہ کھانا کھالیں۔ آج کیا ٹیلی فون کے سر ہانے بیٹھے رہنے کا ارادہ ہے، پہلے ہی بلوں نے مت مار رکھی ہے۔ اوپر سے ان کو بھی کالیں کرنے کا شوق ہے۔“  
 خالہ کے طنزیہ لہجے پر اس نے ایک دفعہ پھر کمرے میں جھکا ٹکا۔ خالو بہت بے چینی سے کسی سے کہہ رہے تھے۔

”پھر تم اگلے ہفتے آرہے ہونا؟“

دوسری طرف سے نہ جانے کون سی یقین دہانی کروائی گئی تھی جسے سن کر خالو خامے مطمئن ہو گئے تھے۔

”کہاں کالوں پر کالیں ملائے جارہے تھے آپ؟“ خالہ نے انہیں دیکھتے ہی ناراض

”نہیں۔“ اس نے پر اعتماد انداز سے جواب دیا۔

”تو میں تمہارے لیے کوئی فیصلہ کروں تو تمہیں منظور ہوگا؟“

خالو کے محبت بھرے انداز پر وہ چونک گئی تھی اور پھر کچھ سنبھل کر بولی۔ ”ہاں مجھے منظور ہوگا۔“

”سوچ لو.....“ وہ بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

”یہ تو خالو جان! پھر باپ اور بیٹی کے رشتے پر شک کرنے والی بات ہے۔“ اس کے پر اعتماد لہجے پر وہ بے ساختہ مسکرا دیے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بڑے شفقت بھرے انداز میں بولے۔

”بس پھر اطمینان رکھو، میں تمہارے لیے کوئی غلط فیصلہ نہیں کروں گا، کیونکہ میں خود غرض نہیں۔“

انا بڑی طرح چونکی۔ اس کا دل بڑی رفتار سے دھڑکا تھا اور شریانوں میں خون چار گنا ہو کر دوڑنے لگا تھا لیکن وہ کوئی اور سوال کرنے کی جرات نہیں کر سکی تھی۔



”فیصل نے اچانک ہی اسے طلاق کے کاغذات بھجوا دیے تھے اور ساتھ میں اپنی برٹش بیوی کے ساتھ شادی کی تصاویر بھی.....“

وہ اور خالہ بھٹی بھٹی آنکھوں سے کاغذات کو دیکھتی رہ گئیں۔

”یہ کیا بکواس ہے، فیصل کا دماغ ٹھیک ہے، اس کی عقل کیا گھاس چرنے لگی ہوئی ہے، پاگل کتے نے کاٹ لیا ہے کیا اسے؟“ خالہ اپنا ضبط کھوپچکی تھیں۔

”کچھ عقل سے تم بھی کام لو۔“ خالو نے ملاستی نظروں سے انہیں دیکھا۔ وہ خلاف توقع خاصے پرسکون تھے۔

جبکہ انا بہت بلندی سے نیچے گری تھی۔ وہ خاموشی سے دونوں میاں بیوی کو دیکھے جا رہی تھی۔ جبکہ خالہ کی آواز مارے طیش کے کپکپا رہی تھی۔

”مجھے نمبر ملا کر دیں اس بے غیرت کا، اتنا بڑا فیصلہ ماں سے پوچھے بغیر آخر اس نے کرنے کی جرات کیسے کی؟ یہ اتنا خود مختار کب سے ہو گیا؟ ماں باپ کا بڑھا پارول دیا۔ کیا وہ فرنگن ہمیں بڑھا پے میں سنبھالے گی؟ ہائے ہائے فیصل! تجھے اللہ پوچھے، میرے کیلچے پہ ہاتھ ڈال دیا تو نے۔“ وہ بلند آواز میں رو رہی تھیں۔

اسی لمحے صباحت پھوپھو اور سعدی گھر میں داخل ہوئے تھے۔ وہ دونوں ہکا بکا انداز سے اندر کا منظر دیکھ رہے تھے۔ صباحت پھوپھو لپک کر خالہ کے پاس پہنچی تھیں۔

”خیریت تو ہے بھائی! آخر ہوا کیا ہے؟“

سروری خالہ ساری رنجشیں بھلائے ان کے سینے سے لگی دھواں دھار روئے لگیں۔ انا نے بے زاری سے یہ منظر دیکھا تھا۔ وہ بمشکل اٹھی اور اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر لیٹ گئی۔ نگہ اس نے اپنی آنکھوں پر رکھ لیا تھا۔ خالہ کے بین کرنے کی آوازیں اندر آرہی تھیں۔

اس نے انگلیاں اپنے کانوں میں گھسالی تھیں۔ وہ کچھ بھی سننا نہیں چاہتی تھی۔ اسے لیٹے ہوئے کئی گھنٹے ہو گئے تھے۔ جب دھیرے سے دروازہ کھلا اور کسی نے کمرے کی ساری لائیں جلا دی تھیں۔

”بے وقوف ہو گئی ہو اشو، یہ سوگ بعد میں منالینا۔ ویسے بھی وہ سیلفش بندہ اس قابل نہیں ہے کہ کوئی اچھی لڑکی اس کے لیے اپنا قیمتی وقت ضائع کرے۔“

سعدی پر غلوص لہجے میں کہتے ہوئے کرسی گھسیٹ کر اس کے پٹنگ کے پاس لے آیا تھا۔

اس نے فوراً تکیہ ہٹایا اور سپاٹ لہجے میں کہا۔

”مجھے قطعاً کوئی دکھ یا افسوس نہیں ہے۔ لیکن یہ افسوس ضرور رہے گا کہ ایسا قدم مجھے خود بہت پہلے اٹھالینا چاہئے تھا۔ مجھے تو خالہ سے ہمدردی ہے۔“ وہ بالوں کو جوڑے میں لپیٹتے ہوئے اٹھ بیٹھی تھی۔ دوپٹہ پھیلا کر ملے لیا تھا۔

سعدی نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ وہاں واقعی کسی دکھ اور ملال کے رنگ نہ پا کر وہ خاصاً مطمئن ہو گیا تھا۔

”مممانی جان کی تم فکر نہ کرو، ان کی فیصل سے فون پر بات ہو چکی ہے اور جب سے فیصل نے انہیں بتایا ہے کہ اس کی بیوی کروڑوں کے ایک سپراسٹور کی اکلوتی مالک ہے، خالہ کا دکھ آدھا کم ہو چکا ہے۔“ سعدی کے طنزیہ لہجے پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر دوڑ گئی تھی۔

”ہاں۔ کچھ لوگوں کے دکھ واقعی پیسوں سے کم ہو جاتے ہیں۔“

اناکے تلخ لہجے پر وہ ایک دم چپ سا ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اٹھ کر واش روم میں چلی گئی تھی۔ پورے پانچ منٹ بعد وہ ہاتھ منہ دھو کر باہر آئی تو سعدی نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ وہ کوئی بھی رنگ اس کے چہرے پر باوجود کوشش کے نہ تلاش کر سکا تھا۔

”خالو جان کیا کر رہے ہیں؟“ وہ تو لیے سے منہ پونچھتے ہوئے عام سے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

”ماموں ذرا باہر نکلے ہیں، امی اور مممانی جان صحن میں ہیں۔ میں چائے بنا کر لایا تھا، سوچا کہ اکٹھے مل کر پیتے ہیں۔“ اس نے سائینڈ ٹیبل سے کپ اٹھا کر اسے پکڑا یا اور اس نے

ازام سے پکڑ بھی لیا۔

”اور تم نے ایم اے کی کتابیں اور سلیپس دیکھا؟“ وہ بہت دوستانہ انداز سے پوچھ رہا تھا۔

”ہاں دیکھا تھا، لیکن کچھ چیزیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں، سوچا تھا کہ کسی دن حمینی آپ کی ساتھ ڈسکس کروں گی۔“ وہ چائے کا کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے بولی تھی، گرم چائے نے اس کے لبوں کو جلا دیا تھا۔

”اگر ڈسکس کرنا ہے تو فوراً کر لو کیونکہ اگلے ماہ حمینی آپ کی شادی ہے، پھر تمہیں مجھ سے فیض یاب ہونا پڑے گا۔۔۔۔۔“

”رینی! اے حقیقتاً خاصی خوشی ہوئی تھی ”کب؟“ وہ بہت بے چینی سے بولی تھی۔۔۔۔۔

”بھئی۔ بتایا تو ہے کہ اگلے ماہ۔۔۔۔۔!“ وہ مسکرایا۔۔۔۔۔

”اگلے ماہ کی کوئی ڈیٹ بھی تو ہوگی۔۔۔۔۔“ وہ جھنجھلائی۔۔۔۔۔

”چوبیس۔“ اس نے بھی فوراً جواب دیا۔۔۔۔۔

چائے پی کر وہ سعدی کے ہمراہ باہر نکلی تو صباحت پھپھو اور سروری خالہ نے بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھا، کوفت اور بیزاری نے اس پر اچانک حملہ کر دیا تھا۔ تب ہی وہ جھنجھلا کر کچن میں چلی گئی اور بے سبب برتن اٹھا اٹھا کر رکھنے لگی۔ چائے کے میلے برتن دھوئے اور سلیب صاف کی اور رات کے کھانے کی تیاری کرنے لگی۔ سعدی اور پھپھو تو کھانا کھاتے ہی فوراً چلے گئے تھے جبکہ خالو جان کا دور دور تک کوئی پتا نہیں تھا۔۔۔۔۔ وہ سارے کاموں سے فراغت پا کر باہر نکلی تو اسے محسوس ہوا کہ خالہ جان اس سے نظریں چرا رہی تھیں۔۔۔۔۔ وہ خاموشی سے اپنے بستر پر لیٹ گئی۔۔۔۔۔

اسے اپنا آپ بہت خالی خالی محسوس ہو رہا تھا۔ اب کیا ہوگا؟ یہ ایسا سوال تھا جس کے متعلق وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔۔۔۔۔ لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی یہ سوال بار بار اس کے ذہن میں ابھر رہا تھا۔۔۔۔۔ اور اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

خالو جان رات تقریباً پونے بارہ بجے واپس آئے تھے۔۔۔۔۔ وہ خاصے تھکے تھکے سے تھے، وہ کھانا گرم کر کے ان کے لیے لائی تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بیٹھنے کو کہا۔۔۔۔۔

”بیٹا! مجھ سے اکیلے کھانا نہیں کھایا جائے گا، اگر تم ساتھ شامل ہوگی تو ٹھیک ہے ورنہ

پھراٹھا کر لے جاؤ.....“ وہ دو ٹوک انداز میں بولے تھے۔

”خالو جان!“ اس نے احتجاجی نظروں سے انہیں دیکھا۔ وہ دل میں اترنے کا فن جانتے تھے پھر خاموشی سے اٹھ کر ایک اور پلیٹ اٹھالائی اور بے دلی سے لقمے توڑنے لگی۔

”تمہاری خالہ نے کھانا کھایا ہے؟“ انہوں نے سرسری انداز سے پوچھا۔

”جی!“ اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”بیٹا ہوگی تو زحمت، لیکن کیا ایک کپ چائے مل جائے گی؟“

خالو جان کے التجائیہ لہجے پر فوراً سر ہلاتے ہوئے اٹھی..... اور پندرہ منٹ بعد وہ دو کپ لیے باہر تھی..... ٹھنڈی ہوا نے موسم خاصا خوشگوار کر دیا تھا..... اور چاند کی روشنی میں لائٹ جلانے کی ضرورت قطعاً محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے گہری نیند سوئی خالہ کو رشک بھری نظروں سے دیکھا.....

”خالو جان! آپ کے پاس خالد چچا کا نمبر ہوگا۔“ وہ ان کے پاس بیٹھ کر کچھ جھجکتے ہوئے بولی..... خالو بری طرح چوٹے.....

”ہاں ہے، لیکن کیوں؟“

”میں ان سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ ایک دم کسی نتیجے پر پہنچ گئی تھی.....

”تم یہاں سے جانا چاہتی ہو؟“ ان کے سو فیصد درست اندازے پر اس نے سر ہلا کر تائید کی۔ وہ پھینکی سی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر بولے۔

”میں جانتا تھا تمہارا اب یہی فیصلہ ہوگا۔“

وہ دانستہ خاموش رہی.....

”انا! ایک ہفتہ پہلے میں نے تم سے بات کی تھی اور کہا تھا کہ اگر میں تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ کروں تو تمہیں اعتراض تو نہیں ہوگا..... تمہیں یاد ہے؟“ وہ بہت سنبھل کر گویا ہوئے۔

”جی!“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا لیکن ساتھ ہی اس نے خوف زدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ کسی اور جذباتی فیصلے کی سمیٹ نہیں چڑھنا چاہتی تھی۔

خالو نے چائے کا خالی کپ ٹرے میں رکھا اور اس کو بغور دیکھا۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ فیصل نے ایک سال پہلے سے شادی کر رکھی تھی؟“

”جی!“ وہ بری طرح چوکی اور الجھن بھرے انداز سے انہیں دیکھا جو کوئی اور نیا

اشکاف کرنے جا رہے تھے.....

”اور یہ کہ یہ بات اس کی ماں کو پچھلے ایک سال سے ہی پتا تھی.....“

شریانوں میں بھاگتا خون پل میں منجمد ہو گیا..... وہ کوئی سوال کرنے کے قابل نہیں رہی تھی، پھٹی پھٹی نظروں سے انہیں دیکھتی رہی..... وہ خالہ کے صبح والے ڈرامے کو سمجھنے سے قاصر تھی۔

”فیصل کی ماں نے صرف اور صرف میرے سامنے سچا ہونے کے لیے صبح وہ داویلا کیا تھا تاکہ میں اسے کوئی الزام نہ دے سکوں.....“ وہ انتہائی شرمندہ لہجے میں بول رہے تھے.....

”مجھے ایک مہینہ پہلے تمہارے چچا نے فون پر فیصل کی شادی کی اطلاع دی تھی، وہ کویت سے کسی کام سے امریکہ گئے تھے اور جاتے ہوئے مجھ سے اس کا ایڈریس اور فون نمبر لے کر گئے تھے۔ تو اسے سر پرانز دینے کے چکر میں بغیر بتائے گئے اور آگے ان کے لیے فیصل کی بیوی سر پرانز بن کر کھڑی تھی۔ تب انہوں نے مجھے فوراً اطلاع دی اور میں نے فیصل کو جواب طلبی کے لیے فون کیا اور کہا کہ وہ تمہیں فوراً فارغ کر دے۔ لیکن وہ خود غرض ماں کا خود غرض بیٹا تھا جس کی رگوں میں خود غرضی خون کی طرح دوڑ رہی ہے۔ وہ صرف اور صرف ہماری تنہائی کی وجہ سے تمہیں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اور پاکستان آنے کا بھی اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا.....“

میری ناراضی پر اس نے صاف صاف کہا کہ اس شادی کی اطلاع اس نے اپنی ماں کو دے دی تھی اور ماں نے ہی کہا تھا کہ اپنے باپ اور انا کو اس کی بھنک تھی نہ پڑنے دیتا۔“ وہ دل گرفتگی سے بول رہے تھے.....

”لیکن پھر میں نے صاف صاف دو ٹوک انداز میں اس سے کہا کہ انا کو تمہاری شادی کی اطلاع نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وہ تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ فیصل اسے چھوڑ کر کہیں بھی شادی کر سکتا ہے۔ اور میرے منہ سے یہ بات سن کر وہ کئی لمحے تک بول ہی نہیں سکا۔“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

انا کی سانسیں بحال ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ اس نے تشکر بھری نظروں سے انہیں دیکھا۔ ”وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی اسے بھی ٹھکرا سکتا ہے۔ اس کی مردانگی کے لیے یہ



فردانی نہیں لیکن پیار، محبت اور اپنائیت وافر ہے۔“  
انہیں بولتے بولتے احساس ہوا کہ وہ بالکل چپ ہے۔۔۔۔۔ انہوں نے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”انا!“ ان کے لہجے میں خوف اور اندیشے تھے۔۔۔۔۔ ”کیا تمہیں میرا فیصلہ پسند نہیں آیا؟“ انہوں نے خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھا۔  
”نہیں خالو جان!“

”پھر؟“  
”بس کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ وہ صاف گوئی سے بولی تھی۔۔۔۔۔ ”لیکن مجھے ایک چیز کا اطمینان ہے کہ کوئی باپ جان بوجھ کر اپنی بیٹی کے لیے غلط فیصلہ نہیں کر سکتا اور مجھے آپ پر بھر پور اعتماد ہے۔۔۔۔۔“

”اوہ!“ خالو جان نے ایک لمبی سانس لی اور شفقت بھرے انداز سے اس کا سر سہلایا۔  
وہ اب خاصے مطمئن تھے۔۔۔۔۔

جبکہ اپنے بستر پر لیٹتے ہوئے اس نے سوچا کہ خدا کبھی کبھی اس طرح بھی دل پسند منزلیں سامنے لے آتا ہے کہ بندہ بے یقینی سے بس دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔۔۔۔۔ وہ آسمان پر موجود روشن چاند کو دیکھتے ہوئے مسکرائی۔۔۔۔۔ اسے نہ جانے کیوں یقین تھا کہ ایک روشن راہ اس کی منتظر ہے۔۔۔۔۔ اور فیصلوں کے درست ہونے کو اتنا ہی کافی ہے کہ انسان کا دل ہلکا پھلکا اور پرسکون ہو جاتا ہے اور انا کو آج سے پہلے اپنا دل اتنا ہلکا پھلکا کبھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ اس نے اطمینان سے آنکھیں موند لی تھیں، چاند بھی اسے دیکھ کر اس لمحے مسکرایا تھا۔



بہت بڑی چوٹ تھی۔ وہ ایسی اسٹیج پر تھا جہاں وہ تمہیں چھوڑتا تب بھی اس کے لیے ذلت والی بات تھی اور اگر ساتھ رکھتا تو اس سے بھی بڑھ کر ذلت والی بات ہوتی۔ تب اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا انا کہیں اور انٹرنیٹڈ ہے؟“

”پھر؟“ انا نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”میں نے کہا کہ دونوں طرف پسندیدگی کا عنصر برابر ہے۔۔۔۔۔“

انا نے بے یقینی سے خالو جان کو دیکھا جو فیاضی سے مسکرا رہے تھے۔ اسے ایک ٹھنڈی لہر اپنے اندر اترتی محسوس ہوئی۔

”آپ نے کیا کہا؟“ وہ بے تاب سے بولی تھی۔

”پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں میرا فیصلہ منظور ہو گا ناں؟ تم مجھے اس چیز کا اختیار دے چکی تھیں۔“

اس نے سخت خوف زدہ نظروں سے انہیں دیکھا وہ خاصے مطمئن اور بالکل خوش دکھائی دے رہے تھے۔۔۔۔۔

”یقین کرو، اس فیصلے پر بہت سارے لوگوں کی خوشی کا دار و مدار ہے۔ تمہاری صباحت پھپھوکی تو شروع سے خواہش تھی اور مجھے بھی اندازہ تھا کہ یہ سعدی بھاگ بھاگ کر یہاں کے چکر کیوں لگاتا ہے اور بچیاں بھی یہی چاہتی تھیں لیکن اس کے باوجود میں نے تمہاری پھپھو اور سعدی سے خود دوبارہ پوچھا۔ وہ تو احساس تشکر سے کافی دیر تک بول ہی نہ سکے۔۔۔۔۔ میں نے بھی کہہ دیا کہ اب ڈبل رشتہ ہو جائے گا۔ میں ماموں ہی نہیں بلکہ سر بھی بن جاؤں گا اور میرے لیے پہلے ”انا“ اور اس کے بعد باقی لوگ ہوں گے۔۔۔۔۔“

وہ خاصے مطمئن لہجے میں بول رہے تھے۔۔۔۔۔

”میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ میری بیٹی ”قدر“ کرنے والے لوگوں کے گھر میں جائے حالانکہ میری یہ خواہش بھی تھی کہ تم اسی گھر میں رہو۔ لیکن بیٹا! میں کیا کروں میں سب کچھ ہو سکتا ہوں لیکن خود غرض نہیں۔ میں کسی کی زندگی کو اپنی خود غرضی کی بجھٹ نہیں چڑھا سکتا۔۔۔۔۔“  
انا بے یقینی سے انہیں دیکھے جا رہی تھی۔۔۔۔۔

”یقین کرو، بچیوں کو جب پتا چلا۔ انہوں نے گھر میں ہنگامہ مچا دیا۔ تمہاری پھپھو نے فوراً شکرانے کے نفل پڑھے۔ وہ بہت نرم دل، مخلص اور نیک خاتون ہے۔ اس گھر میں پیسے کی

”میڈم ”خدیجہ نور“ نے۔“ کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے ملازم نے انتہائی مصروف انداز میں جواب دیا اور میٹکوفیک کے لئے آم چھیلنے لگا جبکہ وہ دونوں اس کے جواب پر حیران رہ گئے۔

”بھئی! یہ کون ذات شریف ہیں؟“ ولید نے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہراتے ہوئے حیرات سے پوچھا تو ملازم نے سخت بے زاری سے ناک پر بیٹھی مکھی اڑائی۔

”وہ اسی ڈیپارٹمنٹ میں پڑھاتی ہیں“ سامنے ان کا دفتر ہے، باقی معلومات آپ ان سے جا کر لے سکتے ہیں۔“ وہ انتہائی بد مزاجی سے بولا تھا۔

”لگتا ہے کہ کوئی اپنی خوبصورت پر سنالٹی اور ڈریسنگ سے متاثر ہو گیا ہے۔ یاد نہیں صبح مہرین کہہ رہی تھی کہ آپ میرا ایڈمیشن کروانے جارہے ہیں یا کوئی دیرمہ آئینڈ کرنے۔“

”جناب مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں۔ کبھی آتش جوان ہوتا تھا، اب مابعد دولت دو اور آپ ایک عدد بیٹے کے والد بزرگوار ہیں۔“ ولید چڑ کو بولا۔

وہ دونوں باتیں کرتے کرتے میڈم خدیجہ نور کے آفس کے سامنے آن کھڑے ہوئے تھے۔

”یار! یہ خدیجہ نور.....؟“ دونوں کے ذہن میں یک لخت جھماکا ہوا اور حیرت کی زیادتی سے منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور دونوں کے منہ سے اکٹھے ہی نکلا۔

”اوہ مائی گاڈ یہ خدیجہ نور یعنی چھوٹی دنیا۔“

دونوں آنکھیں پھاڑ کر آفس کے باہر لگی نیم پلیٹ کو دیکھ رہے تھے۔

”بدلتا ہے رنگ آسمان کیسے کیسے۔“ سب سے پہلے ولید ہی اپنے حواسوں میں آکر بولا تھا۔

کاشف نے آنکھ کے اشارے سے پوچھا۔ ”تو پھر ملنا ہے کیا؟“

”ہاں“ کیوں نہیں۔ ولید نے لا پرواہی سے کندھے اچکائے۔ ”ابھی ابھی اس کا نمک کھایا ہے، اسے حلال بھی تو کرنا ہے۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ وہ کالی سی، موٹی سی، چھوٹی سی خدیجہ نور یونیورسٹی میں لیکچرار لگ گئی۔ یاد نہیں کہ عام اور معمولی سے کپڑوں اور جوگرز میں یہ پورے کیپس میں کیسے پھدکتی پھرتی تھی اور ہم کتنا مذاق اڑاتے تھے۔“ ولید نے یاد دلایا۔

”ہاں یار! سن حادثات زمانہ ہیں۔“ کاشف ہنسا اور مزید گویا ہوا۔ ”اب یہ چنچلی

## زندگی خوبصورت ہے

”آپ کا بل ادا ہو چکا ہے۔“

اکناکس ڈیپارٹمنٹ کی اس چھوٹی سی کینٹین کے ملازم کے منہ سے نکلنے والے الفاظ نے کاشف بٹ کو اچانک حیران کر دیا تھا۔

اس نے اپنے پاس کھڑے ولید کو حیرت سے دیکھا تو جواباً اس نے بھی کندھے اچکا کر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا کیونکہ وہ بھی صبح سے ہر لمحہ اس کے ساتھ ہی تھا۔

بینک چوک سے کامرس ڈیپارٹمنٹ اور وہاں سے پھر دوبارہ بینک کے دو تین چکروں نے ان دونوں کو بخل خوار ہو کر اس چھوٹی سی ٹک شاپ پر ریفریٹمنٹ لینے پر مجبور کر دیا تھا اور ٹھنڈی کولڈ ڈرنکس کے ساتھ گرم گرم سینڈوچ کھاتے ہوئے دونوں کا موضوع گفتگو کاشف کی چھوٹی بہن مہرین کا اکناکس ڈیپارٹمنٹ میں ایڈمیشن تھا۔ جس کی بی اے میں پرستش کم ہونے کی وجہ سے ”سلف فنانس“ پر اہلائی کرنا ان کی مجبور بن گیا تھا۔ ابھی بھی سارے مراحل طے کرنے کے بعد وہ دونوں تھک ہار کر اس ”ٹک شاپ“ پر آن کھڑے ہوئے تھے۔

کولڈ ڈرنکس اور چکن تنک سینڈوچ کے بعد جب کاشف نے بل منگوایا تو ملازم کی بات نے ان دونوں کو ہکا بکا کر دیا کہ پورے آٹھ سال کے بعد کیپس میں ان دونوں کا کون واقف کار نکل آیا۔ حالانکہ اس یونیورسٹی سے ان دونوں نے آٹھ سال پہلے اکناکس میں ہی ایم اے کیا تھا لیکن کیپس میں یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد ان کا آنا جانا کم بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا اور آج بھی ایک طویل عرصے کے بعد وہ دونوں آئے تھے۔

”ہمارا بل کس نے پے کیا ہے؟“ آخر کار ولید رحمانی نے وہ سوال کر ہی لیا جو اسے سب سے پہلے ملازم سے کرنا چاہیے تھا۔

پروگرام بند کرو اور اپنی کلاس فیلو ”چھوٹی دنیا“ اودھ سوری میڈم خدیجہ کو بھی سلامی دے کر آؤ۔“ کاشف نے اسے آگے دھکیلا تو وہ اسے گھورتے ہوئے آفس کا دورازہ ناک کرنے لگا۔

”استغفر اللہ۔ اتنا برا وقت بھی ہم پر آتا تھا کہ اب اس موٹی کے آفس میں اجازت لے کر جانا پڑتا ہے۔“ ولید دھیمی آواز میں بڑبڑایا اور اندر سے آواز سن کر دونوں محتاط انداز میں داخل ہوئے۔

”آفس کی بڑی سی میز کے پیچھے قمیض پر سفید دوپٹہ اوڑھے، ناک پر مخصوص عینک چڑھائے خدیجہ کی شخصیت میں چھپا وقار اور سنجیدگی دونوں نے پہلی نظر میں ہی محسوس کر لی تھی۔ وہ ہاتھ میں پکڑی اسائنمنٹ میز پر رکھ کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ انہیں بیٹھنے کا اشارہ کر رہی تھی۔

یہ وہ خدیجہ نور تو نہیں تھی جو اپنے لا پرواہ چلیے اور فریبی مائل سراپے کے ساتھ جو گرز پینے پورے ڈیپارٹمنٹ میں ادھر ادھر گھومتی نظر آتی تھی نوٹس کے چکر میں۔

یہ وہ خدیجہ نور بھی نہیں تھی جس کی چپٹی ناک پر پڑی عینک پر سب کلاس فیلوز مذاق میں فقرے کتے اور وہ خوش دلی سے ہنستی رہتی۔

یہ وہ خدیجہ نور بھی نہیں تھی جو مدد رٹریا بنی ہر کسی کی مدد کو تیار اور اکثر پروفیسرز کی فیورٹ اسٹوڈنٹ تھی لیکن کاشف بٹ اور ولید کا گروپ اسے گھاس بھی نہیں ڈالتا تھا۔

”کیسے ہیں آپ لوگ؟“ اس نے ہاتھ میں پکڑا قیمتی قلم بھی میز پر رکھ دیا تھا اور اب سادہ سی مسکراہٹ کے ساتھ ان کا حال احوال پوچھ رہی تھی۔ دونوں مرعوب انداز میں صرف سر ہی ہلا کر رہ گئے۔

”میں کلاس لے کر نکلی تو آپ لوگ ”نک شاپ“ پر کھڑے ریفریشنٹ لے رہے تھے۔ میرے بے شمار اسٹوڈنٹس آس پاس تھے اس لیے میں نے مخاطب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“ وہ بہت بادقار انداز میں بول رہی تھی اسی وجہ سے کاشف نے بھی ریزرو انداز سے پوچھا۔

”کب ہوئی آپ کی جاب یہاں؟“ وہ اپنے چہرے سے عینک اتار کر ٹٹو سے صاف کرتے ہوئے سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

”مجھے تو یہاں پورے پانچ سال ہو گئے ہیں ڈیپارٹمنٹ نے سیٹس ایڈوانس کی تھیں۔ مجھے ذاکر صاحب نے کہا کہ ایلانی کر دو۔ وہ چونکہ میرے تھیس کے سپروائزر بھی تھے۔“ اس لیے ان کی بات میں ٹال نہیں سکی۔ بس اللہ کی رحمت سے میری سلیکشن ہو گئی، حالانکہ مجھے قطعاً امید نہیں تھی۔“

اس کی صاف گوئی پر وہ دونوں بے ساختہ مسکرائے تھے۔ ”ہاں، ہم لوگوں کا بھی کافی سالوں سے یہاں کا چکر نہیں لگا۔ ایم اے کے بعد بس غم روزگار نے ادھر ادھر دیکھنے کی مہلت ہی نہ دی۔ تم نے تو شاید ”ایم فل“ میں بھی ایڈمیشن لیا تھا؟“ ولید اپنے ازلی بے تکلف لہجے میں بولا تھا۔

”ہاں، میری دوسری پوزیشن تھی ایم فل میں۔“

اس نے ایک اور انکشاف کیا تھا۔

”یا اللہ! میں تو آج بے ہوش ہو جاؤں گا۔“ ولید شرارتی لہجے میں کہہ رہا تھا، وہ اس انداز پر بے ساختہ مسکرائی تھی۔

”آپ کو یاد ہے کہ میں ”مائیکرو اکنامکس“ سے کتنی پڑتی تھی۔“ اس نے یاد دلایا۔

”جی جناب! اور تم نے اس کے نوٹسوں کیلئے عام مغل کو بھاری بھر کم ٹریٹ کا لالچ بھی دیا تھا اور تب جا کر عامر کمپنہ مانا تھا۔“ ولید کے یاد دلانے پر وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

”مجھے تو یہ بھی یاد ہے کہ ریسپشن پر تم نے پہلی دفعہ جو گرز کے بجائے نازک سی ہیل کا جوتا پہنا تھا اور جو بیڑھیاں اترتے ہوئے ٹوٹ گیا تھا اور تم دھواں دھار روئی تھی کہ گھر کیسے جاؤں گی، تب وہ ہمارا پیچارہ سی آفر از جنجو عہ اور سارہ جتنی دونوں تمہارا جوتا لے کر اپنی گاڑی میں مرمت کروانے گئے تھے۔“ کاشف نے شوخ لہجے میں ماضی کی یادوں کو زندہ کیا۔

”اور پھر کچھ عرصے کے بعد فراز اور سارہ کی منگنی ہو گئی تھی اور فراز بیاہک دہل کہتا تھا کہ یہ صرف اور صرف خدیجہ نور کے جوتے کی برکت ہے جس نے ہم دونوں کو موقع فراہم کیا اور اس وقت راستے میں پہلی دفعہ فراز نے سارہ سے محبت کا اظہار کیا تھا۔“

”بہت خوبصورت اور یادگار دن تھے وہ.....“ خدیجہ نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔

”ہاں اس میں تو کوئی شک نہیں۔“ وہ دونوں بھرپور انداز میں مسکرائے تھے۔

اس کے بعد یونیورسٹی کے یادگار واقعات اور کبھی فراموش نہ کی جانے والی باتوں کا جو

کئی کئی منٹ ہوتے بن کر اگلے بندے کی شکل دیکھتے رہتے ہو۔“ ولید کے طنزیہ لہجے پر کاشف کے چہرے کی رنگت ایک لمحے کو پھینکی ہوئی تھی پھر وہ زبردستی مسکراتے ہوئے بولا۔

”ہاں یار! تم ٹھیک کہتے ہو! اس ایک لڑکی نے صرف مجھے ہی نہیں میرے پورے گھر کو ڈسٹرب کر کے رکھ دیا ہے۔ امی بالکل خاموش ہو گئی ہیں۔ ڈیڑی زیادہ وقت آفس میں رہتے ہیں اور فرزام کو مہرین اور ثمرین سنبھالتے ہلکان ہو جاتی ہیں اور جوج پوچھو تو اتنے ٹینس ماحول میں میرا قضا گھر جانے کو دل نہیں کرتا۔“

ولید نے ہمدردی سے اپنے جگر کی دوست کو دیکھا جو تین سالوں میں بالکل بدل کر رہ گیا تھا۔

”دفع کر دیار! اس خود غرض اور مفاد پرست لڑکی کو۔ زندگی ایک لڑکی پر ختم نہیں ہو جاتی اور اٹکل اور آئی کو بھی کہو کہ اس کا سوگ منانا ختم کریں اور فرزام کے ساتھ نارمل سلوک کریں۔ زیادہ توجہ بھی بعض اوقات بچوں کو اپنا رمل کر دیتی ہے.....“ ولید نے خلوص سے مشورہ دیا۔

”یار! کس منہ سے انہیں مشورہ دوں! تمہیں پتا تو ہے کہ عروج سے شادی میں نے سارے خاندان سے مخالفت مول لے کر کی تھی۔ امی ابو تو آخری لمحے تک نہیں مان رہے تھے لیکن میرے دماغ پر عشق کا بھوت سوار تھا اور بعض دفعہ جب اولاد والدین کے تجربات سے فائدہ نہیں اٹھاتی تو خسارہ ہی اس کے حصے میں آتا ہے۔“ کاشف کا اضطراب اس کے لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا۔

وہ دونوں آہستہ آہستہ بینک چوک تک پہنچ گئے تھے۔ ولید نے بہت غور سے اپنے دوست کا چہرہ دیکھا جس کے لہجے سے تھکن عیاں تھی جبکہ پیشانی شکنوں سے پر تھی۔

”کہاں ہوتی ہے عروج آج کل؟“

”دوئی۔“ کاشف کا لہجہ اس کے ذکر پر خود بخود رکھ سا ہو گیا۔

”پلی ٹی وی پر ہی اس کی جاب ہے نا؟“ ولید نے بھی سوچتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں! اب محترمہ دوسرے چینل پر جلوہ گر ہوتی ہیں۔“ کاشف کی اطلاع پر وہ ٹھنکا۔

”اوہ..... دئی میں کس کے پاس ہے بھائی تو اس کا انگلیڈ میں ہوتا ہے نا؟“

”بھئی! اس کو کئی کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، وہ پر اعتماد اور خوش قرار

لاحمد و دلسلہ شروع ہوا تو دو گھنٹے کے بعد فاطمہ نامی کسی اسٹوڈنٹ کے آنے پر ہی منقطع ہوا۔ خدیجہ نور بہت سنجیدگی سے اب اس اسٹوڈنٹ کی اسائنمنٹ کی طرف متوجہ تھی جبکہ ان دونوں نے بھی وہاں سے اٹھنے کی اجازت مانگی خدیجہ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مہرین کے ایڈمیشن کے سلسلہ میں بھرپور کوشش کرے گی۔



”یار ولید! کبھی کبھی مجھے تمہاری صلاحیتوں پر سخت رشک آتا ہے۔“ کاشف نے خدیجہ نور کے دفتر سے نکلنے ہی تو صوفی لہجے میں کہا تو ولید نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”کیوں! میں کون سا امریکہ کے صدارتی انتخاب میں کھڑا ہو گیا ہوں یا میں نے میں کاریں پھلانگنے کا عالمی ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔“ ولید اپنے ازلی لا پو والہجے میں بولا تھا جبکہ وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

”پھر بھی یار! میں نے مانا کہ خدیجہ نور اپنی کلاس فیلو تھی اور جسے ہم نے کبھی گھاس نہیں ڈالی تھی بلکہ کلاس کے کسی بھی لڑکے نے اسے اہمیت نہیں دی، الٹا ہم اس کا مذاق ہی اڑاتے تھے لیکن اس خدیجہ نور اور اس خدیجہ نور میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ تو انتہائی سنجیدہ ڈسینٹ اور باوقاری ہو گئی ہے اور میں تو کم از کم جرات نہیں کر سکا کہ تمہاری طرح اسے تم کر کے بات کر سکوں۔“ کاشف نے اپنے دل کی بات بتائی تو ولید قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

”بچی بات بتاؤں! ڈر تو مجھے بھی لگا تھا لیکن میں نے سوچا کہ ”ولید ارشد“ یہ موقع اچھا ہے، اگر ”چھوٹی دنیا“ کو ہماری مرغوبیت کا پتا چل گیا تو کہیں پہاڑ پر ہی نہ چڑھ جائے اور ہماری بچی مہرین کے ایڈمیشن کے چانسز خاصے کم ہیں۔ چلو خدیجہ نور کو مکھن لگاؤ، کہیں تو کام آئے گی۔ دیکھا، وہ کس طرح یقین دلا رہی تھی کہ آپ کا کام ہو جائے گا۔“ ولید نے اس کی نقل اتاری تو کاشف نے ایک جھانپڑا سے رسید کیا۔

”بہت کمینے ہوتے، وہ تو جب ”تم تم“ کر کے شروع ہوئے تو میں نے سوچا کہ لو بیٹا! اب اسے جھاڑ پڑے گی لیکن خیریت رہی..... اور میں نے تو اسی ڈر سے اسے زیادہ مخاطب نہیں کیا۔“ کاشف نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اچھا تب ہی تم گونگے کا گڑ کھائے بیٹھے تھے۔ قسم سے کاشف! تمہاری تو عروج بھابھی نے مت مار کر رکھ دی ہے۔ اچھے خاصے کونفیڈنٹ اور حاضر جواب ہوتے تھے اور اب

لگ جاتا تھا۔ کاشف اور ولید کی کوشی کی درمیانی دیوار مشترک تھی۔ ولید کی اکلوتی بہن صنوبیہ اور شمرین دونوں کلاس فیلو تھیں۔ ولید لوگ تین بھائی اور ایک بہن جبکہ کاشف صرف ایک بھائی اور دو بہنیں تھیں اور دونوں گھرانوں کی آپس میں خاصی بے تکلفی تھی اور دن رات کا آنا جانا تھا۔ کاشف اور ولید کی شادیاں بھی تین مہینے کے وقفے سے ہوئی تھیں۔ ولید کی مسرتا خاصی زندہ دل، شوخ اور دوستانہ مزاج کی حامل تھیں اور ان کی مہرین کے ساتھ بنتی بھی خوب تھی۔

”اور سناؤ مہر! تمہاری ”میڈم چھوٹی دینا“ کا کیا حال ہے؟“ ولید نے پوچھا۔ مہرین نے حیرانی سے دونوں کو دیکھا۔

”کون سی میڈم چھوٹی دینا؟“ وہ لمحے بھر کو سوچ میں پڑ گئی۔

”شرم کرو اس کی استاد کا اس کے سامنے الٹا نام لے رہے ہو۔ حالانکہ اس بے چاری نے مہرین کو خاصا گائیڈ کیا اور وقتاً فوقتاً ہمارا حال احوال بھی پوچھتی رہتی ہے۔“ کاشف کی بات پر مہرین بے ساختہ بولی۔

”آپ میڈم خدیجہ نور کی بات کر رہی ہیں؟“

”یس آف کورس۔“ ولید کی تائید پر مہرین کو خاصا صدمہ ہوا تھا۔

”بہت بری بات ہے ولید بھائی! آپ ہماری اتنی زبردست میم کا ایسا نام رکھ رہے ہیں۔“

”لو میں نے کب رکھا ہے پوری کلاس اسے یہی کہتی تھی۔“ ولید نے فوراً صفائی دی۔

”آپ کو پتا ہے کہ پورے ڈیپارٹمنٹ میں اسٹوڈنٹس میڈم خدیجہ نور کے دیوانے ہیں، ان کا وہ آف ٹیچنگ بہت شان دار ہے اور اتنی پولاٹ اور کوآپریٹو ہیں کہ کسی کو بھی کوئی مسئلہ ہوتا ہے تو بے دھڑک میم کے آفس میں پہنچ جاتا ہے۔ ان کی پرسنالٹی میں بہت گریس ہے۔“ مہرین سخت متاثر تھی جبکہ ولید اسے کسی خاطر میں لائے بغیر شرارتی لہجے میں بولا تھا۔

”ذرا اپنے بھائی سے پوچھو یہ تمہاری میم کتنی بوگی ہوتی تھی۔ ہونٹوں کی طرح منہ کھول کر بات کرتی تھی اور ”مڈرٹریا“ بننے کے چکروں میں ادھر ادھر جو گرز پہن کر پھدکتی پھرتی تھی۔ کالے، پیلے، نیلے، رنگ کے کپڑے پہنتی تھی، ہم لوگ تو بہت ہنستے تھے اس پر۔۔۔۔۔“

”کاشف بھائی پلیز! آپ ولید بھائی کو منع کریں، مجھے سخت غصہ آ رہا ہے۔ آپ لوگوں کو اللہ نے اگر کچھ ڈھنگ کی پرسنالٹی دے دی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ دوسروں کا مذاق

ہے۔ عورتوں کی آزادی کی علم بردار..... اس کو کسی کے سہارے کی ضرورت نہیں۔“ عادت کے مطابق کاشف نے اضطرابی انداز میں انگلیاں بالوں میں پھیریں، ایک اذیت پسندی مسکراہٹ اس کے لبوں پر بچی ہوئی تھی۔

”یار! چھوڑو یہ فضول ٹاپک۔ یاد ہے ایک دفعہ ہم نے بینک چوک کے سامنے والی اس سڑک پر کرکٹ کھیلی تھی اور عمر چھوچھو ندر نے ہٹ لگائی تو گیند اڑتی ہوئی ”وآس چانسلر“ کی گاڑی کا شیشہ توڑ گئی اور پھر ہم سب کے کیسے ہاتھ پیر پھولے تھے اور سکیورٹی والے پاگلوں کی طرح ہمارے پیچھے بھاگے تھے لیکن ایک بھی لڑکا ان کے قابو میں نہیں آیا تھا۔“ ولید نے دانستہ موضوع تبدیل کرتے ہوئے کاشف کی توجہ دوسری جانب مرکوز کروائی، اب دونوں وہ واقعہ یاد کر کے ہنس رہے تھے۔

”چلو ولید میاں! کینے میں چائے کا ایک ایک کپ پیئیں۔“ کاشف نے اچانک فرمائش کی تو گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے ولید رک گیا اور اگلے دو منٹوں میں وہ دونوں کینے ٹیریا میں بیٹھے چائے پیتے ہوئے ایک دفعہ پھر خدیجہ نور پر تبصرہ کر رہے تھے۔



اس دن ولید آفس سے سیدھا کاشف کی طرف چلا آیا تھا۔

شام کی چائے کے لئے سب ہی لان میں اکٹھے تھے۔ موسم خاصا بدل چکا تھا اور ہواؤں میں ٹھنڈک سی محسوس ہوتی تھی۔ وہ دونوں بزنس کے کسی پروجیکٹ میں الجھے ہوئے تھے جب مہرین چائے کی ٹرے لیے سیدھی وہیں چلی آئی تو ولید کو اسے دیکھتے ہی یاد آیا۔

”ہاں بھی مہر! کیا بنا تمہارے ایڈمیشن کا!“

مہرین نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا اور کمر پر ہاتھ رکھ کر مصنوعی خفگی سے بولی۔

”توبہ ہے ولید بھائی! ہماری کلاسز شروع ہوئے بھی بیس دن ہو چکے ہیں اور آپ کو آج یاد آ رہا ہے۔“

”ریٹلی۔“ ولید نے خوشگوار حیرت سے اسے دیکھا۔

”جی جناب! آپ کو اپنی بیگم کے رشتہ داروں سے فرصت ملے تو تب نا!“

مہرین نے اسے چھیڑا۔ وہ پچھلے دنوں اپنی سالی کی شادی میں خاصا مصروف تھا ورنہ کاشف کا بیسٹ فرینڈ اور پڑوسی ہونے کی حیثیت سے بھی ہر دوسرے تیسرے دن اس کا چکر

اڑاتے پھریں اور ہم اسٹوڈنٹس نے کبھی میڈیم خدیجہ کی ظاہری شکل و صورت کو نہیں دیکھا، ان کی ”نیچر“ اتنی سوٹ اور پیاری ہے کہ شکل و صورت کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا، ورنہ میم حوریہ بھی تو ہیں۔ دیکھنے میں جتنی اسٹائلش اور خوبصورت اور طبیعت ان کی انتہائی بد مزاج اور مغرور.....“ مہرین سخت جذباتی ہو رہی تھی۔

”بھی خدا جب حسن دیتا ہے تو نزاکت آہی جاتی ہے۔ اب تمہاری میم حوریہ پر خرقہ سوٹ بھی کرتا ہوگا اور وہ بے چاری ”چھوٹی دنیا“ کس بل بوتے پر خرقہ کرے؟“ ولید نے اسے پھر جھپٹا، اس کی اور مہرین کی نوک جھونک اکثر چلتی رہتی تھی۔

”ایسے حسن اور خوبصورتی کا اچار ڈالنا ہے جو دوسروں کا بھی دماغ خراب کر کے رکھ دے۔ جب زبان کے آگے ”خندق“ ہو تو وہی خوبصورت چہرہ انتہائی بد صورت لگنے لگتا ہے اور ہمارے تو گھر کی مثال ہے.....“

مہرین کے تلخ لہجے پر کاشف کے چہرے کا رنگ اڑا تھا۔ ولید نے بھی بوکھلا کر بے ساختہ کاشف کو دیکھا تھا جو چائے کے خالی کپ میں بلا ارادہ چچہ ہلائے جا رہا تھا جبکہ مہرین کو احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ وہ بے ساختگی میں اپنے بھائی کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ بیٹھی تھی۔

اسی وقت ثمرین چار سالہ فرزام کو اٹھائے لان میں چلی آئی۔ وہ اس کی گود میں بلک رہا تھا۔ سب کی توجہ اس کی طرف ہو گئی تھی۔ کاشف نے بے اختیار کھڑے ہو کر بیٹے کو گود میں لیا تھا۔

”کیا ہوا میری جان کو؟“ کاشف کے دل کو کچھ ہورہا تھا۔

”ہونا کیا ہے بھائی!“ ثمرین جو کہ فوراً تھ اری کی اسٹوڈنٹ تھی، خاصی بے زاری سے بولی تھی۔ ”امی نے اسے ٹی وی پر کارٹون لگا کر بٹھایا ہوا تھا۔ پتا نہیں کب ریموٹ سے اس نے چینل تبدیل کر لیا اور بھائی عروج کو پروگرام کرتے دیکھ کر تب سے رو رہا ہے کہ ماما کے پاس جانا ہے۔“ ثمرین کی بات پر سب کو جھٹکا لگا تھا۔

”ہزار دفعہ امی سے کہا ہے کہ کیبل ختم کروادیں، نہ وہ منہوس چہرہ اسے نظر آئے گا اور نہ یہ ضد کرے گا۔“

کاشف نہ جانے کیوں بھڑک اٹھا تھا۔ حالانکہ اس طرح ضبط کھونا اس کا کبھی شیوہ نہیں رہا تھا لیکن فرزام کی خدی طبیعت اور مسلسل بخار کی وجہ سے اس کی برداشت کبھی کبھی ختم

ہو جاتی تھی۔

”ٹیک اسٹ ایزی یار!“ ولید نے آگے بڑھ کر روتے ہوئے فرزام کو زبردستی اس سے لیا جبکہ دونوں بہنیں دم بخود اپنے نرم مزاج بھائی کو دیکھ رہی تھیں۔

”اودہ میرا یار! اتنا بڑا ہو کر روتا ہے۔ بھئی میں تو اپنے شیر بیٹے کو لینے آیا تھا۔ ہنی اور سنی کہہ رہے تھے کہ سوز دواٹر پارک جانا ہے لیکن اب میں سوچ رہا ہوں کہ آپ کو یہیں چھوڑ جاؤں اور سنی اور ہنی کو لے جاؤں۔“ ولید کے دوستانہ انداز پر فرزام کے رونے میں ایک دم کمی آگئی تھی۔

”بس فائیو تک گنوں گا، اگر آپ چپ نہیں کریں گے تو پھر میں آپ کے پاپا، ثمرین آنی، مہرین آنی آپ کی حتا آئی سب چلے جائیں گے جبکہ آپ دادو کے پاس گھر پہ رہیں گے۔ کیوں بھی ثمرین۔“ ولید کے محبت بھر لہجے پر فرزام ایک دم خاموش ہو گیا تھا لیکن اس کے پھولے پھولے گالوں پر رے کے آنسو دیکھ کر کاشف کے دل پر بے بسی کا حملہ ہوا تھا۔

”ادھر آؤ جانو اپنے پاپا کے پاس، آپ تو بیٹا نا تیرے ہو، اتنے بڑے ہو کر روتے تھوڑی ہیں۔“ کاشف نے زبردستی مسکراتے ہوئے اسے اپنے بازوؤں میں لے کر بے ساختہ پیار کیا تھا اور یہ توجہ تھا کہ بیٹے میں اس کی جان تھی، حالانکہ عروج اتنی جلدی بچے کے حق میں نہیں تھی۔ اس کو ڈرتا تھا کہ اس کا فکر خراب ہو جائے گا لیکن کاشف نے اس معاملے میں اس کی ایک نہیں سنی تھی اور یہی وجہ تھی کہ فرزام کی پیدائش پر وہ خاصی بے زار اور چڑچڑی سی ہو گئی تھی اور اتنے چھوٹے بچے سے اس کی لاطعلقی بعض اوقات کاشف کو سخت دکھ دیتی تھی۔ فرزام زیادہ تر دادی اور مسمھیوں کی گود میں رہا تھا۔

”چلو بیٹا مہر و آنی آپ کو چھینج کر وادیں گی۔ اس کے بعد میرا بیٹا ولید چاچو کے ساتھ سوز دواٹر پارک جائے گا، آئس کریم کھائے گا۔“ کاشف نے اسے بہلایا۔

”پاپا! سلائیڈ بھی.....“ فرزام کے ناراض لہجے میں کی گئی فرمائش پر سب کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”ہاں ہاں بیٹا! کیوں نہیں۔“ کاشف نے اسے تسلی دی جبکہ مہرین اسے اٹھا کر اندر لے گئی تھی اور ثمرین اس کے پیچھے۔

”یار! ایسے کب تک چلے گا؟“ یہ فرزام تو بہت زیادہ حساس بچہ ہے۔ حالانکہ عروج بھائی

کی حدوں سے آگے نکل گئی ہے۔ شہرت اور نام کمانے کا نشہ اس کے دماغ پر سوار ہو گیا ہے، اس لیے دنیا کو تماشا دکھانے سے اچھا ہے کوئی بہتر فیصلہ کر لو۔“ کاشف نے سنجیدگی سے بتایا۔  
”اور میں نے تب ہی اس سے کہا کہ اگر دوئی والا جھیل جوائن کرنے کے بجائے پاکستان میں ہی کام کرو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن وہ بضد تھی کہ مجھے بھی اپنے والدین کو چھوڑ کر دوئی شفٹ ہو جانا چاہئے جبکہ آفرین ہے میرے امی ابو پر۔ انہوں نے تب بھی کہا کہ تم دوئی چلے جاؤ اپنا گھر بچا لو لیکن یار! میرے ضمیر نے مجھے اجازت نہیں دی۔ میں اتنی بڑی قربانی اس خود غرض لڑکی کیلئے دوں جو صرف اپنی ذات کے بارے میں سوچتی ہے۔“

”اور فرزام کے بارے میں انہوں نے کچھ نہیں سوچا؟“ ولید نے حیرت سے پوچھا۔  
”اس نے مجھے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ صرف تمہاری خواہش پر تمہارا بیٹا دنیا میں آیا ہے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں اپنا کیریئر بنانا چاہتی ہوں اور سات مہینے ہونے کو ہیں ایک دفعہ بھی اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ البتہ فرزام کے نانا اکثر چکر لگاتے ہیں۔ بے چارے خاصے شرمندہ ہیں۔“ کاشف نے بے حدستے ہوئے انداز میں کہا تو ولید اسے دیکھ کر رہ گیا۔



امی ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھیں، انہیں ہلکا سا ہارٹ ایک ہوا تھا۔ انہوں نے اکلوتے بیٹے کا گھر اجڑنے کا صدمہ دل پہ لے لیا تھا اور اندر ہی اندر کڑھتی رہتی تھیں عرصے کی گھٹن اور دکھ ہارٹ ایک کی صورت میں ظاہر ہوا تھا۔

کاشف کا فیکٹری سے آنے کے بعد زیادہ ٹائم ہاسپٹل میں ہی گزر رہا تھا۔ اس کے آنے کے بعد ابو جی فیکٹری کیلئے نکل پڑتے۔

اس دن وہ مطلوبہ میڈیسن لے کر امی کے پرائیویٹ روم کی طرف آیا تو کھلے دروازے سے مہرین کے ساتھ خدیجہ نور کو دیکھ اسے بڑی خوشگوار حیرت ہوئی۔ بلیک سوٹ کے ساتھ پھولوں والا اسکارف سلیقے سے لیے وہ بڑا روم سے امی کا ہاتھ پکڑے ان کی طبیعت پوچھ رہی تھی۔

”دیکھیں بھائی! کون آیا ہے۔ میں ابھی امی کو بتا رہی تھی کہ میری میم بھائی کی کلاس فیلو بھی ہیں اور مجھے اسی وجہ سے خصوصی توجہ دیتی ہیں۔“ مہرین کے لہجے سے بے حد خوشی جھلک رہی تھی۔

نے کبھی اسے زیادہ ٹائم نہیں دیا لیکن اگر یہی حال رہا تو وہ ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب رہے گا۔“ ولید نے جاچکتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا جبکہ وہ فوراً نظریں چرا گیا تھا۔

”یار! اس معاملے میں بے بس ہوں۔ بے شک وہ اسے ٹائم نہیں دیتی تھی لیکن آتے جاتے ہیلو ہائے تو کر لیتی تھی۔ کبھی کبھار گود میں بھی اٹھا لیتی تھی اور جہاں بلڈریلیشن ہو بندہ نہ چاہتے ہوئے بھی کبھی کبھار متوجہ ہو ہی جاتا ہے۔ حالانکہ چار سالوں میں اس نے بمشکل چار دفعہ ہی اسے پیار کیا ہو گا لیکن چچو تو اپنی فطرت سے مجبور ہو کر ماں کی طرف ہی لپکے گا!“

کاشف کے دل گرفتہ انداز پر ولید نے تائید میں سر ہلایا۔

”بہر حال ایک بات تو طے ہے کہ عروج بھائی نے نقصان کا سودا کیا ہے۔ مجھے ان سے اس بے وقوفی کی امید نہیں تھی اور تم نے بھی ان کی جاب کے ساتھ نہ چاہتے ہوئے بھی کپرومانز کر لیا تھا پھر سسرال والوں کی طرف سے بھی کوئی روک ٹوک نہیں تھی پھر صرف ”دوئی“ میں جاب کرنے کی ضد کے آگے گھر ہی برباد کر لیا۔ صحیح کہا ہے سیانوں نے عورت جب ضد پر اتر آئے تو اپنا بڑے سے بڑا نقصان بھی برداشت کر لیتی ہے۔“

”یار ولید! سارے حالات تمہارے سامنے ہیں مجھے ٹی وی پر اس کی جاب سخت ناپسند تھی لیکن اس کا شوق اور ضد دیکھ کر ہتھیار ڈال دیے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ٹی وی پر کام کرنے والی گھر نہیں بساتیں، اب تمہاری بڑی سالی بھی تو جھیل سے وابستہ ہے۔ سارا گھر سنبھالا ہوا ہے ماشاء اللہ۔ دونوں بچوں کو بھرپور ٹائم دیتی ہے لیکن عروج پر تو گھر کی کوئی ذمہ داری بھی نہیں تھی پھر بھی اسے گھر کا ماحول گھٹا گھٹا اور بیک ورڈ لگتا تھا۔ میں نے فرزام کی خاطر پورے چار سال اس کی ہر ضد مانی کہ شاید اسے عقل آجائے مگر میرے کپرومانز کو اس نے میری کمزوری سمجھ لیا۔“ ایک استہزاءیہ مسکراہٹ نے کاشف کے چہرے کا احاطہ کر لیا تھا۔

”تمہارے سر صاحب تو اچھے خاصے سمجھ دار انسان ہیں۔ انہوں نے بیوی کے انتقال کے بعد اپنے دونوں بچوں کو ماں سے بڑھ کر پیار دیا۔ انہوں نے بیٹی کو نہیں سمجھایا؟“

”یار! ساری دنیا نے سمجھایا تھا۔ تم تو ان دنوں ہالینڈ گئے ہوئے تھے ورنہ دیکھتے۔ میرے سر صاحب بے چارے شریف آدمی۔ بس مجھے کول ڈاؤن ہونے کا مشورہ دیتے رہے اور جب عروج نے ظلع کیلئے عدالت میں کیس کر دیا تو انہوں نے کہا تھا کہ بیٹا! یہ سمجھنے سمجھانے

”فی الحال تو تم دونوں ٹانگوں کے ساتھ امی کے پاس جاؤ وہ اکیلی پریشان ہو رہی ہوں  
 گی۔ میں آنٹی کے ساتھ گپ شپ لگا کر آتی ہوں۔“ خدیجہ نے اسے کمرے سے نکالنا چاہا  
 جبکہ اس کا شائد جانے کا دل نہیں کر رہا تھا، جب ہی آرام سے بولی۔

”ڈونٹ دری۔ میں سمیرا جیسی باتونی نرس کو وہاں کھڑا کر کے آئی ہوں۔ اسے اپنے  
 سرال والوں کے دکھڑے رونے کا خاصا شوق ہے۔ آپ دو گھنٹے بعد بھی جائیں گی تو وہ  
 بڑے جوش و خروش سے اس موضوع پر اٹھار خیال کر رہی ہوگی۔“

کاشف نے بڑی دلچسپی سے اس شرارتی سی ڈاکٹر کو غور سے دیکھا جو اپنی بہن کے  
 برعکس دہلی پتلی اسماٹ اور گوری رنگت کے ساتھ خاصے تھیکے نقوش کی حامل تھی۔  
 ”ٹھیک ہے اگر بیٹھنا ہے تو بالکل خاموشی سے بیٹھنا، ورنہ تم بھی کون سا تیسرا سے کم  
 ہو۔“ خدیجہ نے بہت محبت سے اسے ڈانٹا تھا۔

”کچھ خدا کا خوف کریں آپ! میں نے کب سمیرا کی طرح اپنی سرال کی چغلیاں کی  
 ہیں۔ اللہ صحت اور زندگی دے میری ساس کو، وہ تو میری سگی ماں سے زیادہ مجھ سے پیار کرتی  
 ہیں۔“

کاشف کی امی نے مسکراتے ہوئے دونوں بہنوں کی نوک جھونک دیکھی۔  
 ”ہاں تو وہ بے چاری بہت ”مبّر“ والی خاتون ہیں، ورنہ تم جیسی باتونی لڑکی کو برداشت  
 کرنا کون سا آسان کام ہے۔“ خدیجہ نے اسے چھیڑا۔  
 ”دیکھیں آنٹی! یہ آپ کی کتنی غلط بات کر رہی ہیں۔“

اس نے امی کا ہاتھ پکڑ کر فوراً اپنائیت بھرے انداز سے شکایت لگائی۔

”بہت بری بات ہے خدیجہ؟“ امی نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ خوش ہو گئی۔ کاشف  
 نے ان سب کو گپ شپ میں مصروف دیکھا تو امی کی رپورٹس لینے کیلئے لب کی طرف نکل گیا۔  
 جب وہ آدھے گھنٹے بعد واپس آیا تو ولید کو کمرے کے باہر دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

”بھئی تم کب پہنچے اور یہاں کاریڈور میں کیا کر رہے ہو؟“

”بھئی انقلابات زمانہ پر حیران ہو رہا ہوں“ ذرا اندر جا کر ”چھوٹی دنیا“ کی بہن ڈاکٹر  
 اسماء کو دیکھ، کیا پتلی پتنگ اور خوبصورت لڑکی ہے۔ مجھے تو سن کر دھچکا لگا۔ میں نے تو فوراً پوچھ  
 لیا کہ کیا دونوں سگی بہنیں ہو؟“

”کیسی ہیں آپ؟“ اس نے دو انیاں سائیڈ پر رکھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔  
 ”اللہ کا شکر ہے وہ جس حال میں جیسا رکھے۔ میری والدہ ہائی شوگر کی مریض ہیں۔  
 پچھلے دنوں واش روم میں سلب ہو جانے کی وجہ سے گھٹنے پر چوٹ لگ گئی۔ یہ آپ کے ساتھ  
 والے روم میں کل سے ایڈمٹ ہیں۔ ویسے تو چھوٹی بہن اسماء بھی ہاسپٹل میں ڈاکٹر ہے لیکن  
 میری والدہ مجھ سے خصوصی ایجنج ہیں اس وجہ سے میں یونیورسٹی سے چھٹیاں لے کر ہر وقت ان  
 کے پاس ہوتی ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے مہرین سے اچانک ملاقات ہوئی تو آپ کی امی کا ہاتھ  
 چلا۔“ وہ تفصیل سے بتا رہی تھی۔

”اللہ آپ کی والدہ کو صحت دے۔“ کاشف نے خلوص دل سے کہا۔ اسی وقت ڈاکٹر  
 اسماء نے کمرے میں جھانکا تھا وہ خاصی خوش مزاج اور بے تکلف سی لگ رہی تھی۔

”آپ! آپ یہاں بیٹھی ہوئی ہیں جبکہ میں نے پورے ہاسپٹل میں اعلان کروا دیا ہے  
 کہ میری آپ کی کو ڈھونڈنے والے کو گلو کوڑ کو پڑا پینکٹ انعام میں ملے گا۔ سارا اسٹاف آپ کی  
 تلاش میں ہے۔“ وہ خاصے شرارتی انداز سے بولی تھی۔

”ادھر آؤ ذرا اعلان تو بعد میں کروانا، پہلے ذرا سنو۔ آٹنی شکایت کر رہی ہیں کہ اس  
 ہاسپٹل کا اسٹاف بالکل ذمہ دار نہیں ہے۔ کئی کئی گھنٹے کوئی اندر جھانکنا نہیں ہے۔“ خدیجہ نے  
 مصنوعی غصے سے کہا تو وہ فوراً اندر داخل ہو گئی۔

”خدا کا خوف کریں آپ! ذرا آہستہ بولیں، سرجن خالد نے سن لیا تو سب کے سامنے  
 جھاڑ دیں گے۔ کیا واقعی آنٹی آپ کو شکایت ہے؟“ وہ بڑی اپنائیت سے پوچھ رہی تھی، اس  
 کے فکر مند لہجے پر سب کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”ارے نہیں بیٹا! ویسے ہی مذاق کر رہی ہے بہن، ورنہ ماشاء اللہ سارے ہی محنتی بچے  
 ہیں اور مجھے تو بالکل نہیں پتا تھا کہ اتنی پیاری بچی میری بیٹی کی استاد کی بہن ہے۔“ امی کی تسلی پر  
 ڈاکٹر اسماء کے چہرے کی رونق بحال ہوئی۔

”توبہ ہے آپ! آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔ میں بھی حیران ہو رہی تھی کہ ان پرائیورٹ  
 رومز میں تو خاص طور پر سب اکیٹورہتے ہیں اور اوپر سے اگر سرجن خالد جیسے سخت مزاج  
 بندے کی مگرانی ہو تو دل کرتا ہے کہ بندہ ایک ہی ٹانگ پر کھڑا رہے۔“ وہ خاصے شرارتی انداز  
 میں بول رہی تھی۔



”پھر.....؟“ وہ ابرو اچکا کر بولا۔

”ڈاکٹر اسماء نے فوراً کہا۔“ آف کورس“ آپ کو کوئی شک؟“ دل تو چاہ رہا تھا کہ کہوں ”شک“ نہیں پکا یقین ہے لیکن اسی وقت تمہاری حنا بھابی نے مجھے گھور کر دیکھا اور میں فون کرنے کے بہانے باہر نکل آیا، ورنہ میری گستاخ نظریں بار بار ڈاکٹر اسماء کی شفاف جلد پر پھسل رہی تھیں اور تمہیں تو پتا ہے کہ مجھے کسی ڈاکٹر سے شادی کرنے کا کتنا شوق تھا۔“ وہ لہجہ میں حسرت سمو کر بولا تھا۔

”اور آپ کو شاید اندر کسی نے نہیں بتایا کہ ڈاکٹر اسماء نہ صرف شادی شدہ بلکہ ایک بچے کی والدہ بھی ہیں۔“ کاشف نے ہاتھ میں پکڑا فائل کا فولڈر اس کے سر پر مارا۔

”اوہ..... نہیں یار.....!“ ولید کو خاصا صدمہ ہوا تھا۔

”بہت کمینے اور خبیث ہوتم.....“ وہ بے ساختہ مسکرایا تھا۔

اور پھر جتنے دن امی ہسپتال میں رہیں، دونوں بہنیں صبح و شام ان کا حال احوال پوچھنے کیلئے ضرور چکر لگاتی تھیں۔ کاشف نے محسوس کیا تھا کہ اس کی امی خدیجہ کے ساتھ نہ جانے کن کن باتوں میں مصروف رہیں اور اس کی آمد پر کھل اٹھتی تھیں۔ دو چار دفعہ کاشف بھی مہرین کے ساتھ خدیجہ کی امی کی عیادت کر آیا تھا۔ وہ بھی خاصی مہربان خاتون تھیں۔ اسماء مکمل طور پر اپنی والدہ پر جبکہ خدیجہ اور ان کا بھائی ابو بکر اپنے والد پر تھے۔ جن کا انتقال ان کے بچپن میں ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر اسماء کا بیٹا بھی چار سال کا تھا اور وہ بھی ماں کی طرح فوراً بے تکلف ہو جاتا تھا۔ ایک دفعہ وہ فرزام کی موجودگی میں آیا اور اسے منٹوں میں اپنا دوست بنا گیا تھا۔ حالانکہ فرزام ماں کے جانے کے بعد خاصا حساس اور یزور سا ہو گیا تھا اور بہت کم کسی سے بے تکلف ہوتا تھا۔

اس دن ڈاکٹر اسماء امی کو چیک کرنے آئی تو فرزام نے جھجکتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”آئی! آج آپ سعد کو لے کر نہیں آئیں؟“

کمرے میں موجود کاشف نے چونک کر اپنے بیٹے کو دیکھا جو آج چھٹی کی وجہ سے زبردستی ہسپتال آ گیا تھا۔

”ارے میری جان! آپ سعد کا ویت کر رہے تھے آپ مجھے کہہ دیتے تو میں اسے لے آتی۔“ ڈاکٹر اسماء نے بے اختیار اسے پیار کیا تھا۔

”اس نے مجھ سے پراس کیا تھا کہ وہ اپنے گھر رکھے اپنے ”برڈز“ مجھے دکھانے لے کر

جائے گا۔“

فرزام کے شکوے پر کاشف نے بڑی خوشگوار حیرت سے اپنے بیٹے کو دیکھا۔

”ریتی.....؟ اس نے مجھے تو بتایا نہیں۔ آپ یوں کرنا“ ابھی لٹچ بریک میں دادو اور پاپا

سے پوچھ کر میرے ساتھ چلنا اور گھر میں ”برڈز“ بھی دیکھ لینا اور واپسی پر ہم سعد کی نانو کا کچ

بھی لے آئیں گے۔“ ڈاکٹر اسماء کے محبت بھرے انداز پر فرزام کے چہرے پر بڑی بے

ساختہ خوشی کی لہر دوڑی تھی۔

”پاپا! میں آنٹی کے ساتھ چلا جاؤں؟“ وہ خاصا بے چین ہو گیا تھا۔

”ہاں جانو! چلے جاؤ لیکن آنٹی کو تنگ نہیں کرنا۔“

کاشف کی نصیحت پر اس نے بڑے مدبرانہ انداز میں سر ہلایا تھا۔

اور پھر دو گھنٹے کے بعد جب وہ واپس آیا تو خاصا خوش تھا اور بہت جوش و خروش سے اپنی دادو کو سعد کے گھر کا احوال سنارہا تھا۔



امی ہسپتال سے گھر شفٹ ہو گئی تھیں اور فرزام کی پانچویں سالگرہ پر مہرین نے میڈم خدیجہ کی ساری فیملی کو انوائٹ کر رکھا تھا۔ ہر سال فرزام کی سالگرہ خاصے اہتمام کے ساتھ منائی جاتی تھی اور وہ اس لیے بھی زیادہ خوش ہوتا تھا کیونکہ اس دن اس کی ماما بھی گھر پر ہوتی تھیں مگر عروج کے جانے کے بعد یہ پہلی سالگرہ تھی اس لیے سب ہی گھر والے حساس ہو رہے تھے۔ مہرین، شمرین نے فرزام کے سارے کلاس فیلوز کو گھر پر بلا رکھا تھا۔ پورے ڈرائنگ روم کو اپیشل ڈیکوریٹ کیا گیا تھا اور یہ خالعتا مہرین اور شمرین کی محنت تھی۔

”ارے یہ کیا ڈاکٹر اسماء کو بھی انوائٹ کیا ہے؟“

لان میں کھڑے کاشف نے مہرین سے آہستگی سے پوچھا جبکہ ڈاکٹر اسماء بلیک ساؤمی میں خاصی اٹریکٹو لگ رہی تھی اور اس وقت سعد کا ہاتھ تھامے ادھر ہی آ رہی تھی۔

”جی جناب! آپ کے بیٹے کی خصوصی فرمائش پر۔“ مہرین نے شوخی سے جواب دیا۔

”بھئی! یہ بہن بھائی کس کے خلاف کھڑے ہو کر سازش کر رہے ہیں۔“ اسماء نے آتے

عیا ان کو چھیڑا تو دونوں مسکرا دیے۔

والدہ اور مہرین، شمرین کے ساتھ چائے پینے میں مصروف تھیں۔ مہرین اپنی میم خدیجہ کو لے کر کچن میں گئی تو وہ بھی ان کے ساتھ آن بیٹھا۔ ہسپتال میں قیام کے دوران امی کے اس فیملی کے ساتھ خاصے خوشگوار تعلقات بن چکے تھے جس کا اندازہ ان کے لہجے سے بخوبی ہو رہا تھا۔ مہرین نے آج فرزام کے دوستوں کے علاوہ بس انہی کی فیملی اور ولید کی فیملی کو بلارکھا تھا۔ حنا بھابی تو فوراً چلی گئی تھیں لیکن ان کے دونوں بیٹے وہیں تھے۔ ولید نے اپنی ایک اہم میٹنگ کی وجہ سے آنے سے معذرت کر لی تھی۔

”بھئی، اسماء اور آپ کے بیٹے کا گھر تو بس گیا۔ اب آپ خدیجہ کیلئے بھی کچھ سوچیں۔“ امی کے پر خلوص لہجے پر خدیجہ کی والدہ کے چہرے پر ایک تاریک ساسا یہ لہرایا تھا۔

”بس بہن! کس ماں کا دل نہیں چاہتا اور مجھے تو خدیجہ عزیز بھی بہت ہے۔ میری اس بیٹی نے اپنے دونوں بہن بھائیوں کیلئے بہت قربانیاں دی ہیں۔ ایک تو بڑی تھی، باپ کی اچانک ڈسٹھ کے بعد اس نے ایک بیٹے کی طرح اپنی ذمہ داری نبھائی تھی۔ اسماء کو ڈاکٹر بنایا، اپنے بھائی کو CA کروایا۔ اللہ میری بیٹی کی قسمت بہت اچھی کرے۔ اور لوگوں کو عقل سلیم دے جو سیرت کے بجائے صورت کی طرف بھاگتے ہیں۔“ خدیجہ کی والدہ کے دکھی لہجے پر کاشف نے بے اختیار نظریں چرائی تھیں۔ اس کا شمار بھی تو انہی لوگوں میں ہوتا تھا جو ٹھوکر کھا کر سنبھلتے تھے۔

”بھئی آپ کی خدیجہ میں کیا کمی ہے۔ پڑھی لکھی ہے، سلیقہ مند، ذمہ دار اور خاصی رکھ رکھاؤ والی بچی ہے اور یقین کریں مجھے آپ کی دونوں بچیاں ہی پیاری ہیں لیکن جو بات خدیجہ میں ہے وہ اسماء میں نہیں۔ بہت حساس اور دوسروں کا خیال رکھنے والی بچی ہے۔“ کاشف کی والدہ نے مسکرا کر کہا۔

”بس بہن دعا کیا کریں مجھے اپنی اس بچی کی بہت فکر ہے، دونوں چھوٹے بہن بھائیوں کے گھر بس گئے۔ اللہ میری اس بچی کو بھی قدر کرنے والے لوگ دے۔“ خدیجہ کی والدہ کے لہجے میں اس کیلئے محبت ہی محبت تھی۔

”اللہ بہتر کرے گا“ آپ پریشان نہ ہوں۔“ امی نے انہیں تسلی دی۔

اسی وقت ڈاکٹر اسماء اور خدیجہ گرما گرم پکڑوں اور امی چٹنی ٹرے میں رکھے ادھر آئیں تو کاشف نے دونوں بہنوں کو غور سے دیکھا، وہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھیں لیکن خلوص

”بھئی، ہم سوچ رہے تھے کہ اگر سعد کے پاپا بھی ساتھ ہوتے تو کتنا خوبصورت اور مکمل کپل لگتا۔“

مہرین نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ مصنوعی آہ بھرتے ہوئے بولی۔

”ہماری ایسی قسمت کہاں، کبھی کبھی تو دل کرتا ہے کہ میں خود ہی مریض بن کر ان کے ہسپتال میں ایڈمٹ ہو جاؤں، وہ اتنے بڑی ہیں۔ بیوی کے لئے ٹائم نکالیں یا نہ نکالیں لیکن مریض کے لئے ضرور نکال لیں گے۔“

”بھئی آپ جیسی خوبصورت بیوی کیلئے اگر کسی شوہر کے پاس ٹائم نہیں تو پھر ہم جیسوں کو تو کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔“ مہرین محبت اور اپنائیت سے ان کا ہاتھ پکڑے اندر لے جاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

سارے مہمان آچکے تھے۔ فرزام آج خاصا خوش اور چمک رہا تھا لیکن کیک کاٹتے وقت اس نے عجیب سی ضد پکڑ لی۔

”میری ماما کو لائیں، سب بچوں کی ماما کی کیک کاٹی ہیں۔“

ماحول ایک دم تناؤ کا شکار ہو گیا تھا۔ ایک چبھنے والی خاموشی نے سارے منظر کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

کاشف جتنا فرزام کو بہلا رہا تھا، وہ اتنی ہی ضد کر رہا تھا پھر تھوڑی دیر میں تو وہ باقاعدہ پاؤں پیٹنے لگا تھا۔

”ارے میری جان! سارے بچے کیا کہیں گے فرزام اتنا بڑا ہو کر روتا ہے۔ بری بات ہے بیٹے جن بچوں کی ماما جاب کیلئے دور ہوتی ہیں، ان کی دادو کیک کھواتی ہیں۔“ خدیجہ نے آگے بڑھ کر اسے گود میں اٹھا کر پیار کیا تو اس کا موڈ کچھ بہتر ہوا۔

”بھئی فرزام کی دادو کہاں ہیں، ٹنٹ بلاؤ پھر کیک کاٹ کر مزے مزے کی چیزیں کھائیں گے۔ جلدی کریں، مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔“ خدیجہ کے شور مچانے پر فرزام کی توجہ دوسری جانب مبذول ہوئی تھی اور اب وہ چھری کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

تالیوں کی گونج میں کیک کٹ گیا تھا اور فرزام اب اپنے دوستوں کے ساتھ خاصا خوش باش کیک کھانے میں مصروف تھا۔

کاشف بچوں کو کہنی دے کر ڈیڑھ دو گھنٹے کے بعد نکلا تو امی، خدیجہ اور ڈاکٹر اسماء کی

اور محبت کی فراوانی دونوں کے چہروں میں یکساں تھیں۔

”قسم سے آنٹی! مجھے آپ کی بہو کی عقل پر افسوس ہو رہا ہے۔ اتنا اچھا گھر اور اتنے محبت کرنے والے لوگ چھوڑ کر محض شہرت اور کیریئر کیلئے اپنا گھر اجاڑ دینا قطعاً دانش مندی نہیں۔“ ڈاکٹر اسماء اپنی والدہ کی گھوریوں کی پروا کیے بغیر بے دھڑک اپنی رائے کا اظہار کر رہی تھی۔

امی کے چہرے پر ایک پھمکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔  
”ہمیں تو لگتا ہے بیٹا! ہماری ہی محبت میں کمی رہ گئی ہوگی کہیں۔“ امی کا لہجہ رنج میں ڈوبا ہوا تھا۔

”چھوڑیں آنٹی! سارا دن ہاسپٹل میں بھانت بھانت کے لوگوں سے ملنا ہوتا ہے اب تو ایک نظر چہرہ دیکھ کر ہی انداز ہو جاتا ہے کیا مرض ہوگا؟ مجھے اندازہ ہوا ہے کہ آپ کی محبت اور مروت کو محترمہ نے آپ لوگوں کی کمزوری سمجھ لیا ہوگا۔“  
”اسماء.....!“ خدیجہ نے تنبیہی لہجے میں اسے پکارا۔

”بھئی آپنی! میں تو سچ بات کہوں گی، آپ اور امی مجھے گھوریں مت۔“ ڈاکٹر اسماء کی صاف گوئی پر کاشف اپنی بے ساختہ مسکراہٹ کو نہ روک سکا۔ وہ واقعی بڑی صاف گو اور لگی لپٹی رکھے بغیر بات کرنے کی عادی تھی۔

”بہت ہی بد قسمت اور بے وقوف لڑکی تھی لیکن ایک بات تو ماننے والی ہے کہ خوبصورت بے تحاشا ہے اور اسے اس چیز کا احساس بھی ضرورت سے زیادہ ہوگا۔ بعض اوقات ”احساس برتری“ بھی انسان کو لے ڈیتا ہے۔“ اسماء کے سو فیصد درست اندازے پر کاشف اور اس کی والدہ نے سر ہلا کر تائید کی تھی۔

”بس بیٹا قسمت کے کھیل ہیں۔“ امی کے چہرے پر رنج اور غم کے سائے پھیل گئے تھے۔

”بہن! کوئی گنجائش وغیرہ نہیں نکلتی کیا؟“ خدیجہ کی والدہ نے جھجکتے ہوئی پوچھا تو اس سے زیادہ سننا کاشف کی برداشت سے باہر تھا، تب ہی وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

”امی! میں ذرا فرزام کے دوستوں کو ڈراپ کر آؤں، کوئی چیز تو نہیں منگووانی؟“  
”نہیں بیٹا!“ امی نے اپنے بیٹے کا اداس چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے کہا جبکہ وہ فوراً چل

پڑا تھا۔ وہ پھر خدیجہ کی والدہ کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”نہیں بہن! کوئی گنجائش تب نکلتی ہے جب وہ کوئی راستہ چھوڑتی۔ کاشف نے تو بہت کوشش کی کہ مصالحت کی راہ نکل آئے مگر اس نے عدالت سے خلع لے لیا۔“

”اوہ.....“ خدیجہ کی والدہ کو گہرے تاسف نے گھیر لیا تھا۔ کتنے سارے لمحے اس تکلیف وہ خاموشی میں سرک گئے، وہ سب اب خاموشی سے چائے پینے میں مصروف ہو گئیں۔  
”بہر حال آنٹی! اسی کا نام زندگی ہے۔“ ڈاکٹر اسماء گہرا سانس لے کر بولی۔ ”لیکن زندگی اس طرح نہیں گزرتی جیسے کاشف بھائی گزار رہے ہیں۔ وہ کچھ لمحوں کے توقف کے بعد سنجیدگی سے گویا ہوئی تو کاشف کی والدہ نے بے ساختہ چونک کر اسے دیکھا۔ ان کے دل میں کسک سی جاگی۔ یہ تو وہ بھی جانتی تھیں کہ جس طرح کی روکھی پھمکی زندگی ان کا بیٹا گزار رہا تھا۔

”میں جانتی ہوں بیٹا!“ ان کی آنکھیں جھللا اٹھیں۔ ”بہت سمجھاتی ہوں بیٹا! کہ کچھ اپنے لیے سوچو، یہ پہاڑ جیسی زندگی اکیلے کیسے کاٹو گے مگر وہ سنتا ہی نہیں۔ صاف کہہ دیتا ہے کہ امی اب کسی پر بھروسہ کرنے کو دل ہی نہیں کرتا۔ بہت کچھ دیکھ لیا ہے زندگی میں اور اب تو بس میری زندگی کا محور فرزام ہی ہے۔“  
وہ گلو کیر لہجے میں بولی تھیں۔

”کیا ہو گیا ہے اسماء تمہیں.....؟“ خدیجہ نے ناراض نظروں سے بہن کو دیکھا۔ ”آنٹی چھوڑیں اسے! آپ خواہنا وہ اپنا دل برا کر رہی ہیں۔ ابھی اس حادثے کو وقت ہی کتنا گزرا ہے اور کاشف اچھا خاصا سمجھ دار ہے۔ ابھی اسے سنہلے تو دیں۔ اس اسماء کی بچی کو وقت بے وقت مفت مشورے دینے کی عادت ہے۔ آپ اس کی باتوں پر رنجیدہ مت ہوں۔“

خدیجہ کو اسماء کی دوسروں کی ”ذاتیات“ میں گھسنے کی عادت سخت ناپسند تھی تب ہی اس نے ایک دفعہ پھر تنبیہی نظروں سے اسماء کو دیکھا جو بہن کی خفگی پر بوکھلا گئی تھی۔

”آئی ایم سوری انٹی! میرا مقصد آپ کی دل آزاری نہیں تھا۔“ وہ ہٹھا کر بولی۔  
”مجھے معلوم ہے بیٹا!“ وہ تھل سے گویا ہوئیں۔

”میں تو آج صبح سے ہی اپنے بچے کیلئے پریشان تھی۔ بات بے بات دل عجیب سے انداز میں دھڑک رہا ہے اللہ خیر کرے ایک ہی تو میرا بیٹا ہے اور وہ بھی اتنی سی عمر میں اتنے

”میں الحمد للہ بالکل ٹھیک ہوں، عاطف کے ساتھ پچھلے دنوں دوہنی میں تھی، ابھی ہم لوگوں کا ٹرانسفر دوبارہ پاکستان ہوا ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بتا رہی تھی اور پھر اچانک کچھ یاد آنے پر بولی۔

”اور فرزام کیسا ہے؟ میری دوہنی میں عروج سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے بالکل بھی اچھا نہیں کیا، وہ بہت بدل گئی ہے۔ میں نے اور عاطف نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ ایک تکلیف وہ خاموشی کا وقفہ ان دونوں کے درمیان آیا تھا۔ خدیجہ کو اپنی پوزیشن وہاں بہت آکورد لگ رہی تھی۔

”بس اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ ایک پھینکی اور زبردستی کی مسکراہٹ نے کاشف کا احاطہ کیا تھا۔

”کچھ بھی ہے لیکن عروج اس قدر خود غرض اور خود پرست ہوگی، مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ حالانکہ ہم نے چھ سال کالج اور یونیورسٹی میں اکٹھے گزارے۔ میں اور عاطف خصوصی طور پر اسے سمجھانے گئے تھے لیکن وہیں پتا چلا کہ کوئی پروڈیوسر اس میں انٹرسٹڈ ہے اور اب وہ دونوں عن قریب شادی کرنے والے ہیں۔“

غصہ، خجالت اور دکھ سب کچھ اس کے لہجے سے جھلک رہا تھا۔

”حرا پلیز..... شاپ دس ٹاپک.....“ کاشف کے سخت اور بیزار لہجے پر وہ بری طرح شرمندہ ہوئی اور تب ہی اس کی نظر بالکل خاموش کھڑی خدیجہ پر پڑی تو خجالت کا ایک شدید حملہ دوبارہ اس پر ہوا۔

”اوہ آئی ایم سوری“ میں نے آپ کو نہیں دیکھا۔ آپ شاید.....“

وہ بری طرح کنفیوز ہوئی اور سوالیہ نظروں سے کاشف کی طرف دیکھا جس کا موڈ خاصا خراب ہو چکا تھا۔

”یہ خدیجہ ہیں۔“

”السلام علیکم۔ کیسی ہیں آپ؟“ وہ بوکھلا کر اس طرف متوجہ ہوئی۔

”علیکم السلام۔“ اس نے بھی سنجیدگی سے جواب دیا اور کاؤنٹر پر پڑے تین چار ڈبوں میں سے دو اٹھا کر کاشف کی طرف تائیدی نظروں سے دیکھا۔

”کیا خیال ہے یہ ٹھیک رہیں گے؟“

بڑے مسکوں میں الجھ گیا ہے، کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کیا کروں؟“ ٹھنڈی اور تھکی ہوئی گہری سانس میں انہوں نے اپنی ہار کا اعتراف کیا۔

”اللہ بہتر کرے گا بہن! بس صبر کریں اور دعا کریں۔“ خدیجہ کی والدہ کافی دیر بعد بولی تھیں۔

”میرا خیال ہے امی! اب ہمیں چلنا چاہئے۔“

خدیجہ نے سوالیہ انداز سے ماں کو دیکھا تو انہوں نے بھی فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔



وہ بچوں کی اس خوبصورت شاپ پر ڈھیروں ورائٹی دیکھ کر حیران ہو رہی تھی کہ کون سی چیز لے اور کون سی چھوڑ دے۔ اس کی کولیک کے ہاں جڑواں بچے ہوئے تھے اور اس نے بچوں کے حقیقی کی تقریب میں تقریباً سب ہی شاف کو مدعو کر رکھا تھا۔ خدیجہ کا جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن اپنی کولیک کے اصرار بھرے انداز پر وہ مروتا جانے کے لئے راضی ہوئی گئی تھی اور اب مسئلہ اسے گفٹ دینے کا تھا۔

”کیا ہوا خدیجہ! کس سوچ میں گم ہیں؟ کون سا مسئلہ درپیش آ گیا؟“ کاشف فرزام کیلئے کپڑے لینے آیا تھا، اس کی نظر ایک کونے میں کھڑی خدیجہ پر پڑی تو وہ اپنی شاپنگ ادھوی چھوڑ کر وہاں چلا آیا۔

”بس کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کیا لوں۔“

”نو پرابلم۔ آپ بے بی کی عمر بتائیں، ابھی مسئلہ کا حل نکال لیتے ہیں۔“ چند لمحے بعد کاشف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔“ وہ بری طرح شرمندہ ہوئی۔

”السلام علیکم کاشف بھائی! آپ یہاں کیسے اور فرزام کیسا ہے؟ بہت عرصے کے بعد آپ کو دیکھا، قسم سے بہت خوشی ہو رہی ہے۔“ خدیجہ نے چونک کر اپنے سامنے کھڑی اسٹالس سی لڑکی کو دیکھا جو ایک سال کے بچے کو پر ام میں ڈالے حد درجہ اعتماد اور لاپرواہی سے کاشف سے مخاطب تھی۔

”اوہ حرا! کیسی ہیں آپ اور عاطف بھائی کیسے ہیں؟“ کاشف نے بھی جواباً گرم جوشی کا مظاہرہ کیا اور ہاتھ میں پکڑا گفٹ پیک شوکیس پر رکھ دیا۔

کر رہے ہیں لیکن آپ اکثر پرسکون حالت میں ہوتی ہیں، آخر اس درجہ مطمئن زندگی کا راز کیا ہے؟“ وہ مصنوعی سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

”راز تو کوئی نہیں ہے۔“ وہ مسکرائی۔ ”بس کم بولنا اور زیادہ سوچنا اور اللہ پر کامل ایمان کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کی فضا سے۔ انسان بے بس ہے اور اسی کی رضا میں راضی ہونے سے خود بخود انسان پرسکون ہو جاتا ہے۔“ خدیجہ نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا تو کاشف نے اپنے سامنے کھڑی گرے قمیض، سفید شلوار اور سفید دوپٹے میں ملبوس اس پر وقار اور سنجیدگی کی لڑکی کو غور سے دیکھا جو انتہائی عام شکل و صورت کی حامل ہونے کے باوجود اپنے اندر کچھ خاص رکھتی تھی اور وہ شاید اس کے چہرے کا سکون اور سادگی ہی تھی۔

”ہاں اس میں تو واقعی کوئی شک نہیں۔“ ولید نے کھلے دل سے اعتراف کیا۔

”اچھا میں چلتی ہوں۔“ خدیجہ نے اجازت چاہی۔

”آئیں آپ کو اچھا سانچ کر دیتے ہیں۔“ ولید کی پر خلوص پیشکش پر وہ مسکرائی۔

”نوٹھینکس۔“ لٹچ میں اپنی والدہ کے ساتھ ہی کرتی ہوں۔ ان شاء اللہ پھر بہت جلد ملاقات ہوگی۔“ خدیجہ نے الوداعی کلمات کہتے ہوئے اجازت چاہی تو وہ دونوں سر ہلا کر رہ گئے۔ جیسے ہی وہ اپنی گرے قمیض میں بیٹھی اور گاڑی اشارت کی، ولید نے بے تکلفی سے ایک جھانپڑ کاشف کے کندھے پر مارا۔

”نہ تو چھوٹی دنیا کے ساتھ کن چکروں میں پھر رہا ہے آج کل؟“

”خبردار دوبارہ اسے“ چھوٹی دنیا“ مت کہنا۔“

کاشف کے سنجیدہ انداز میں ٹوکنے پر ولید نے کھوجتی نظروں سے اس کا پوسٹ مارٹم کیا۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک ہے۔ کہیں تو اس“ چھوٹی دنیا“ کو اپنی دنیا میں تولانے کا نہیں سوچ رہا۔“ ولید ابھی بھی غیر سنجیدہ تھا۔

”تمہارا دماغ ٹھیک ہے۔ میں تو ویسے ہی بات کر رہا تھا، وہ بہت سنجیدہ اور سلجھی ہوئی طبیعت کی لڑکی ہے۔ ہمیں زیب نہیں دیتا کہ اسے ان القابات سے نوازیں۔ پھر ظاہری خوبصورتی کا جادو بعض اوقات کتنا تباہ کن ہوتا ہے، اس کا تجربہ مجھے بخوبی ہو چکا ہے۔ بس مجھے ذاتی طور پر اچھا نہیں لگتا کہ ہم اس چیز کے لئے بندے کا مذاق اڑائیں جس میں سراسر اس کا

”ہوں۔“ اس نے سر کو خفیف سی جنبش دی۔

لمحے بھر میں حرا کے چہرے پر خوشی کے تاثرات پھیلے تھے اور وہ ایک دفعہ پھر سوچے سمجھے بغیر شروع ہو چکی تھی۔

”بہت بہت مبارک ہو کاشف بھائی! کب کی آپ نے شادی؟ بلکہ بہت اچھا کیا بڑا مناسب اور بروقت فیصلہ کیا آپ نے اور شکر ہے کہ اس دفعہ آپ نے لائف پارٹنر کے انتخاب میں پہلی والی غلطی نہیں کی۔ اللہ آپ دونوں کو بہت خوش رکھے۔“ وہ دونوں بری طرح شٹا گئے تھے۔

خدیجہ کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا جبکہ کاشف بھی منہ کھولے اس کی نان شاپ چلتی زبان کو دیکھ رہا تھا جس کے آگے کوئی اسپید بریکر نہیں تھا۔

”میں اب چلتی ہوں، عاطف باہر گاڑی میں انتظار کر رہے ہیں اور کاشف بھائی ہمارا گھر پہلے والا ہی ہے۔ پلیز آپ اپنی مسز اور فرزام کے ساتھ ضرور چکر لگائیے گا، بیٹ آف لک۔“ وہ ان دونوں کو ہکا بکا چھوڑ کر اپنے بچے کی پر ام لیے تیزی سے شاپ سے باہر نکل گئی۔

اس کے باہر نکلتے ہی کاشف خفت سے بولا۔ ”آئی ایم سوری خدیجہ!“

”یہ محترمہ عروج کی خاصی قریبی دوست تھیں اور اسی کی طرح عقل سے پیدل۔ آپ پلیز محسوس مت کیجئے گا۔“ وہ نہ جانے کیوں شرمندہ ہو رہا تھا۔

”اٹس اوکے۔“ ڈونٹ وری۔ زندگی میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ آپ کیوں ٹینشن لے رہے ہیں۔“ وہ سادگی سے کہہ رہی تھی۔ کاشف نے غور سے اس کا صاف شفاف، بے ریا چہرہ دیکھا اور پھر مطمئن ہو کر کندھے اچکائے۔

”میرا خیال ہے آپ کا مسئلہ حل ہو چکا ہے اب چلنا چاہیے۔ آپ کے پاس گاڑی ہے کہ نہیں؟ اگر نہیں تو میں ڈراپ کر سکتا ہوں!“ چند لمحے بعد کاشف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نوٹھینک یو۔ میرے پاس گاڑی ہے۔“ پارکنگ کے نہ جانے کون سے کونے سے ولید نکل کر اچانک سامنے آ گیا تھا۔

”استغفر اللہ۔“ وہ جھنجھلا ہی گیا۔

”ہیلو میم! آپ کیسی ہیں؟ ان کے چہرے کے تاثرات تو ان کی ولی کیفیت کو عیاں

”ٹی وی کے اندر ہی گھس جاؤ۔“ کاشف نے اخبار کے کالم والا صفحہ اٹھاتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھا لیکن مہرین کے جواب نے اسے چونکا دیا۔  
”امی تو خدیجہ میم کی والدہ کو لے کر آٹنی جمال کے گھر گئی ہیں۔“  
”کیوں؟“ اس نے تعجب سے پوچھا۔

”بھئی آپ کی والدہ صاحبہ نے آج کل رشتے کرنے اور کرانے کا کام سٹارٹ کر رکھا ہے۔“ بابا کے شگفتہ لہجے پر اسے خاصی حیرت ہوئی کیونکہ اس کی والدہ قطعاً سوشل نہیں تھیں۔  
وہ انتہائی کم گو اور اپنے کام سے کام رکھنے والی خاتون تھیں۔  
”یہ امی کو کیا سوچھی؟“ اس کے منہ سے بھی بے اختیار نکلا تھا۔

مہرین اس کے تعجب پر ذرا سانس لی۔ ”آپ کو پتا تو ہے کہ امی کتنی حساس ہیں۔ میم خدیجہ کی والدہ نے ان سے اپنی فکر مندی کا اظہار کیا تھا وہ تو کہہ کر بھول گئیں لیکن امی کو یاد رہا۔ پرسوں آٹنی جمال آراء آئیں، انہوں نے اپنے ملایشیا والے بیٹے کی بڑھتی ہوئی عمر اور رشتہ نہ ہونے کا ذکر کیا۔ امی نے جھٹ سے میم خدیجہ کی والدہ کو فون کر دیا اور اسی سلسلے میں ان کو لے کر گئی ہیں۔“ مہرین نے تفصیل سے جواب دیا۔  
”چلو اچھی بات ہے اللہ تمہاری میم کی قسمت اچھی کرے۔“ اس نے پر خلوص لہجے میں دعا دی۔

”آمین۔“ مہرین کے منہ سے بھی بے ساختہ نکلا۔

”بھئی شمرین! کوئی ناشتہ داشتہ ملے گا کہ آج صرف کوکنگ شو پر گزارا کرنا ہوگا۔“ کاشف کے ہلکے پھلکے لہجے پر وہ ایک لمحے کیلئے گڑبڑائی اور پھر خوش دلی سے مسکراتے ہوئے اٹھی۔

”ہاں ہاں بھائی کیوں نہیں۔ یہ اپنا پرنس فرزام اٹھائیں ابھی؟“

”نہیں رات پھر اسے ٹیبل پر ہو گیا۔ ذرا اسے بھی میرے بیڈروم میں دیکھ آؤ۔“ کاشف کو اچانک یاد آیا۔ شمرین سر ہلاتے ہوئے اس کے بیڈروم کی طرف بڑھ گئی اور ٹھیک دو منٹ کے بعد وہ گھبرائی ہوئی واپس آئی، اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”بھائی ذرا فرزام کو دیکھیں وہ نیند میں بیڈ سے گر گیا ہے اور بیڈ کا کونہ اس کے سر پر لگا ہے۔ بہت خون نکل رہا ہے۔“

کوئی اختیار نہیں۔“

”ہاں شہزادے! بات تو‘ تو سولہ آنے درست کر رہا ہے۔ بعض دفعہ انسان کو واقعی ہاں نہیں چلتا کہ وہ چند لمحے کی انجوائے منٹ کے لئے خدا کی تخلیق کردہ چیز میں نقص نکال رہا ہے بس آج سے عزت ماب میڈم ”خدیجہ نور“ کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کرے گا۔“  
وہ بات کرتے کرتے پھر غیر سنجیدہ ہوا تو کاشف نے ایک زوردار مکاس کی کمر میں رسید کیا اور وہ جو ذہنی طور پر اس حملے کیلئے تیار نہیں تھا، لڑھک کر چند قدم آگے ہلے جا لگا۔  
”بہت خبیث ہوتم.....“ وہ اپنا ماتھا اور کمر سہلاتے ہوئے اسے کوسنے لگا جو کہ اب بے تکلفی سے قہقہے لگانے میں مگن تھا۔



آج اتوار تھا اور صبح ہی سے بارش ہو رہی تھی، فرزام کو رات سے ہلکا ہلکا بخار تھا۔ کاشف نے اٹھ کر کمرے کا اے سی بند کیا اور لمبی جمائی لیتے ہوئے کھڑکی کا پردہ ہٹایا۔ سامنے لان کا منظر دیکھ کر وہ مبہوت سا رہ گیا۔ ہلکی ہلکی بارش نے سارا سرسبز لان اور پودے نکھار کر رکھ دیئے تھے۔ درختوں کے پتوں پر گرے بارش کے قطرے بالکل موتیوں کی طرح لگ رہے تھے۔  
اس کے کمرے کی کھڑکی کے پاس لگے نیم کے درخت کی ایک شاخ پر بیٹھی سبز رنگ کی بھیگی ہوئی چڑیا نے خوف زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا، وہ شاید خفی تھی اگر فرزام اس کو دیکھ لیتا تو ضرور اسے پکڑنے کیلئے بھاگتا۔ چڑیا کے ساتھ ہی اس کا دھیان اپنے بیٹے کی طرف گیا۔ دن کے ساڑھے بارہ ہو رہے تھے لیکن وہ خلاف معمول سو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا بیڈ کے پاس آرکا اور بڑے پیار سے اپنے بیٹے کے اوپر پڑا ہوا براؤن کمبل ہٹایا۔ کاشف نے بے ساختہ اپنے بیٹے کے ماتھے پر پیار کیا۔

وہ ابھی تک دو ایویں کے زیر اثر گہری نیند میں تھا۔ کاشف نے اسے اٹھانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور فریش ہو کر کامن روم میں آ گیا۔

مہرین ڈھیر ساری جھنجھڑیوں کے ساتھ نبرد آزما جبکہ شمرین ٹی وی پر آنے والے کسی کوکنگ شو کو انتہائی توجہ سے دیکھ رہی تھی۔ سنگل صوفے پر بابا صبح کا اخبار پڑھ رہے تھے اور ان کے سامنے ہی ناشتے کے خالی برتن پڑے ہوئے تھے..... اسے آتا دیکھ کر شمرین نے ٹی وی کی آواز آہستہ کی اور خود اسکرین کے بالکل پاس جا کر بیٹھ گئی۔

محبت تھی۔

”بس قسمت کے معاملے میں مارکھا گیا میرا بیٹا!“

والدہ کے دکھی لہجے پر وہ پہلو بدل کر رہ گیا۔ خدیجہ نے ٹھنڈے اسکوئش کے گلاس ابھی ابھی میز پر لا کر رکھے تھے۔

”آئی! میری نوڈلز بن گئیں؟“ فرزام نے اچانک پوچھا تھا کاشف نے چونک کر اپنے بیٹے کو دیکھا جو کہ بہت کم فرمائش کرتا تھا۔

”جی میری جان! بس ٹھنڈی ہو جائیں پھر آپ کھالیجے گا اور امی! آپ کیلئے دلیہ بھی بنا دیا ہے۔ جب بھوک محسوس ہو تو مجھے بتا دیجیے گا۔“ خدیجہ کے لہجے میں حد درجہ محبت تھی اور انداز میں ذمہ داری، کاشف نے بہت غور سے اس کا جائزہ لیا تھا جو کہ خالصتاً گھریلو حلقے میں بہت سادہ اور عام سی لگ رہی تھی۔

فرزام جیسے ہی کھانے سے فارغ ہوا کاشف اٹھ کھڑا ہوا۔ امی نے بھی اس کی پیروی کی۔

”امی! کیا ہوا؟ کیا کوئی مسئلہ ہو گیا ہے؟“ گاڑی مین روڈ پر لاتے ہی کاشف نے بنجیدگی سے پوچھا تو وہ ٹھنڈی آہ بھر کر رنجیدہ لہجے میں بولیں۔

”مسئلہ کیا ہوتا ہے؟“ پٹیاں بھی کبھی مسئلہ بنی ہیں۔ بس ان کی قسمت سے ڈر لگتا ہے۔ اب خدا جانے خدیجہ جیسی ٹھنڈے مزاج کی سلجھی ہوئی بچی کی قسمت میں خدا نے کیا لکھا ہے اچھی بھلی پڑھی لکھی سمجھ دار ہے، جمال آرا کو نہ جانے اپنے بیٹے کے لئے کون سی حور چاہئے۔ صاف انکار کر دیا، مجھے تو حد درجہ شرمندی ہوئی اسی وجہ سے تو آج معذرت کرنے آئی تھی۔ کچھ بھی تھا یہ رشتہ آیا تو میرے ہی توسط سے تھا نا“

”اوہ..... سوسیڈ.....“ کاشف کو حقیقتاً افسوس ہوا اور پھر کچھ یاد آنے پر بولا۔ ”آپ یہ رشتہ لے جانے سے پہلے مجھ سے تو مشورہ کر لیتیں۔ میں آئی جمال آرا کے بیٹے کی طبیعت اور خیالات سے اچھی طرح واقف ہوں، وہ بہت حسن پرست طبیعت کا مالک ہے۔“

”تمہاری طرح۔“ امی کے بلا ارادہ اور بے ساختہ جملے پر اس پر ڈھیروں پانی پڑ گیا۔ وہ خفت سے بولا۔

”امی! مجھے اپنی غلطی کا بے حد احساس ہے اور اس کا خمیازہ بھی مجھے ہی بھگتنا ہے۔ آپ

”کیا.....؟“ بابا اور کاشف دونوں ہی گھبرا کر اٹھے تھے۔ بیڈروم میں پہنچتے ہی سب کے ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔ فرزام کی حالت خاصی خراب تھی۔ کاشف نے تیزی سے اسے اٹھایا اور باہر گاڑی کی طرف دوڑ لگائی۔ دو گھنٹے کے بعد ان سب کی واپسی ہوئی تھی۔ فرزام ابھی بھی رو رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر سفید پٹی کی ہوئی تھی اور کاشف حد درجہ بنجیدہ تھا۔



سفید رنگ کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔

اس نے ذرا سادہ کیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ سامنے پورچ میں گرے کلش کھڑی تھی جبکہ گیٹ پر کوئی چوکیدار یا ملازم نہیں تھا۔ اس نے جھجکتے ہوئے گاڑی وہیں کھڑی کی۔ وہ چند قدم آگے بڑھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا اور پھر جیب سے سیل نکال کر امی کا نمبر ڈائل کیا جو کہ آج دوپہر سے فرزام کو لے کر خدیجہ کے گھر آئی ہوئی تھیں۔ اسماء کے بیٹے سعد نے خصوصی طور پر فون کر کے فرزام کو انوائٹ کیا تھا اور وہ آفس میں تھا جب امی نے فون کر کے اس سے کہا کہ واپسی پر انہیں پک کر لے، وہ پہلی دفعہ ان کے گھر گیا تھا۔

بوگن ویلیا کی بیلوں سے ڈھکا ہوا یہ چھوٹا سا بنگلہ کافی آرٹسٹک سے انداز میں بنا ہوا تھا۔ لان پر خاصی محنت کی گئی تھی۔ ترتیب میں پودے اور کھیلے رکھے ہوئے تھے۔ وہ سٹائٹ نظروں سے دیکھتا اندر آیا تھا۔ داخلی دروازے کی تیل دے کر وہ انتظار میں تھا۔ اندر سے فرزام اور سعد کے ہنسنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

”السلام علیکم۔ آپ.....؟“ پنک کلر کے لان کے سادہ اور گھریلو سے حیلے میں خدیجہ کے چہرے پر بڑی خوشگوار مسکراہٹ پھیلی تھی۔ کاشف نے بھی اسے پہلی دفعہ اس حیلے میں دیکھا تھا۔

وہ اس کی ہمراہی میں اندر آیا تو امی کو بے تکلفی سے کارپٹ پر بیٹھے دیکھ کر اسے خاصی حیرت ہوئی تھی۔ وہ دونوں خواتین اسے آتے دیکھ کر بری طرح چونکیں۔

”ارے تم آگئے! میرا تو خیال تھا کہ ڈرائیور کو بھیجا دو گے۔“ امی بے ساختہ بولی تھیں۔ ”کمال کرتی ہیں والدہ آپ! جب آپ نے مجھ سے کہا تھا تو مجھے ہی آتا تھا۔“ اس نے فوراً وضاحت دی اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ فرزام اسے دیکھتے ہی آکر چٹ گیا تھا۔

”ماشاء اللہ بہت فرماں بردار بچہ ہے۔“ خدیجہ کی والدہ کے لہجے میں حد درجہ ستائش اور

رمضان المبارک کے بابرکت مہینے کا آغاز ہو چکا تھا۔ سارا ماحول بہت پاکیزہ اور نورانی محسوس ہوتا تھا۔ آج کل کاشف پر کام کا کافی لوڈ تھا۔ وہ پندرہ دن کمپنی کے کام کے سلسلے میں دہائی گیا تو وہیں دو چار ملنے والوں سے عروج کی دوسری شادی کا سن کر شاکڈ رہ گیا اور انہی لوگوں سے معلوم ہوا کہ وہ خاصی خوشگوار زودا جی زندگی بسر کر رہی ہے اور اپنے سابقہ شادی کے تجربے پر خاصی شرمندہ بھی ہے اور اکثر لوگوں کے سامنے وہ بباگ دہل اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی اور بے وقوفی قرار دے چکی ہے۔

وہ گنگ سارہ گیا تھا۔ کیا واقعتاً اس کا ساتھ عروج کیلئے تکلیف دہ تھا؟

وہ جتنے دن دوبائی میں رہا، ساری ساری رات بے چینی سے کروٹیں بدلتا۔ آفس میں کام کرتے ہوئے بھی عجیب تنگ سوچیں اس کے دماغ کا حاطہ کر لیتیں۔ وہ چاہتے ہوئے بھی کام پر اپنی توجہ مرکوز نہیں کر پا رہا تھا۔

اس کا شدت سے دل چاہتا تھا کہ اس خود غرض لڑکی کے سامنے جا کھڑا ہو اور اس سے پوچھے کہ کیا تم واقعی اس قدر بے حس ہو کہ تمہیں ایک بھی وہ لمحہ یاد نہیں جو تم نے میرے ساتھ اچھا گزارا ہوا؟

شرمندگی، غصہ اور دکھ ایک دوسرے پر غالب آرہے تھے۔ ماضی، ذات کا وہ حصہ تھا جسے وہ چاہتے ہوئے بھی عروج کی طرح ایک لمحے میں نہیں بھلا سکتا تھا۔ اس نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ جس لڑکی کو وہ اتنی چاہ سے اور سارے زمانے سے لڑکر اپنی عزت بنا کر اپنے گھر میں لا رہا ہے، وہ اسے یوں تماشا بنا کر رکھ دے گی۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ وہ حد درجہ حسن پرست اور خوبصورتی کے پیچھے لپکنے والا بندہ تھا۔

اس کا اپنا مقولہ تھا۔ ”کہ جو چیز دیکھنے میں ہی اچھی نہ لگے وہ دل کو کیا خاک اچھی لگے گی۔“

جبکہ اس کے اکثر دوست اسے سمجھاتے۔

”ظاہری حسن دکھا دے اور دائمی حسن جو انسان کے باطن میں چھپا ہوتا ہے وہ زندگی کو

خوبصورت بناتا ہے۔“

لیکن وہ اور ولید اپنے خیالات پر ڈٹے رہتے۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں کوئی بھی چیز خریدتے ہوئے کوالٹی کے بجائے اس کی ظاہری خوبصورتی کو ترجیح دیتے۔ اوپر سے اللہ نے

کیوں مجھے یہ بار بار یاد دلا کر شرمندہ کرتی ہیں۔“

”بیٹا! میرا مقصد ہرگز تمہیں شرمندہ کرنا نہیں تھا۔ بس تمہیں دیکھ کر افسوس ہوتا ہے تو مزہ سے نکل جاتا ہے۔ فرزام کو دیکھ کر دل کڑھتا ہے۔“

”وہ تو کسی بھی بچے کے حق میں نہیں تھی، جب یہ خواہش میری تھی تو اصل ذمہ داری کو نبھاؤں گا بھی میں ہی اور جانتا ہوں کہ عروج سے شادی سراسر میری ذاتی خواہش اور خدا کا نتیجہ ہے۔ آپ لوگوں نے مجھے بارہا اس سے شادی کرنے سے منع کرتے ہوئے میرے سامنے اور بھی پر پوزل رکھتے تھے لیکن اس وقت میرے حواس پر صرف ایک ہی چیز سوار تھی اور اس بات کے گواہ آپ سب لوگ ہیں کہ میں نے اپنی برداشت سے بھی زیادہ اس کو برداشت کیا لیکن جب اس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ میرے ساتھ ایک منٹ بھی مزید نہیں رہنا چاہتی تو بتائیں میں کیا کرتا؟“ اس کی جھنجھلاہٹ اب بے بسی میں بدل رہی تھی۔

”بیٹا! میں تمہیں کب کہہ رہی ہوں۔“ وہ رنجیدہ لہجے میں دوبارہ وضاحت دینے لگیں۔ ”بس تمہیں یوں اکیلے دیکھ کر بھی طبیعت خراب ہوتی ہے۔ زندگی میں اچھے لوگوں کی کمی تھوڑی ہے۔ تم شادی کے نام سے ایسے بدکتے ہو جیسے کسی نے بم پھوڑ دیا ہو۔ چلو کوئی بہتر فیصلہ کرلو۔“

”امی! مجھے بہتر فیصلے کرنے نہیں آتے۔“ گاڑی اپنے گھر کی سڑک پر ڈالتے ہوئے وہ حد درجہ مایوس لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”تو بیٹا! ہم پر اور خدا پر چھوڑ دو لیکن اپنا نہ سہی فرزام کا سوچو۔“

”امی! ڈر لگتا ہے کہ کہیں کسی اور چکر میں نہ پھنس جاؤں۔ پہلے ہی میرا معصوم بچہ صرف ماں سے محروم ہے اور پھر کہیں باپ سے بھی نہ ہاتھ دھو بیٹھے۔“

”بیٹا! خیر کا کلمہ منہ سے نکالو اور مثبت انداز میں سوچو۔ اللہ بہتر کرے گا۔“ امی نے دل میں کراہتے لاڈلے اور اکلوتے بیٹے کو دیکھا تھا جواب زبردستی مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”امی! کوئی بہتر چیز نظر آئے تو بہتر سوچوں گا نا!“

گاڑی کو لاک کر کے اس نے فرزام کو اٹھایا اور ڈرائنگ روم کی طرف قدم برہائے۔

امی جہاں کھڑی تھیں، وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔



بے زاری سے سر کو خفیف سی جنبش دی۔

”لیکن امی! کچھ جوڑ بھی تو بنتا ہو، ان کو نظر نہیں آرہا۔“ مہرین کی بات میں ڈھکا چھپا سا گلہ تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو امی بھی چپ ہو گئیں۔

”بھئی سیدھی سی بات ہے، ہم کیا کہہ سکتے ہیں ان کی اولاد ہے۔“ امی نے ہاتھ میں پکڑی چھری پلیٹ میں رکھی۔

”کیا ہو گیا ہے تمہاری میم خدیجہ اور ان کی والدہ کو؟“ کاشف نے اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھا۔

”شادی کر رہی ہیں ان کی والدہ۔“ مہرین کے لہجے میں طنز زیادہ تھا کہ غصہ وہ اندازہ نہیں کر پایا۔

”یہ تو اچھی بات ہے۔“ وہ لمحے بھر کور کا اور خلوص دل سے کہا۔

”ہونہہ پچاس سال کے بابے کے ساتھ۔ دو بیٹے ہیں شادی شدہ اور بال بچے دار جبکہ بیگم کا انتقال ہے۔“ کاشف کو اندازہ ہو گیا کہ مہرین کو غصہ اس بے جوڑ شادی پر آرہا تھا۔

”ہیں واقعی امی.....؟“ اس نے حیرت سے ماں کی طرف دیکھا جن کا آج کل خدیجہ کی والدہ کے ساتھ میل جول کافی زیادہ بڑھ گیا تھا۔

”ہاں بیٹا! میں نے تو بہت سمجھایا تھا مگر بیماری نے ان کو خاصا دہی بنا دیا ہے۔“ امی نے دھیمے لہجے میں وضاحت دی تو وہ فوراً بولا۔

”بہر حال یہ کوئی مناسب جوڑ نہیں لگ رہا خدیجہ کی کیا رائے ہے؟“ کاشف کے لہجے میں خاصی حیرانی تھیں۔

”بھئی وہ تو سیدھی سادی شریف لڑکی ہے بس ماں کی رضا کے آگے سر جھکا دیا۔“

”اچھا.....؟“ کاشف نے تعجب بھری نظروں سے اپنی حساسی ماں اور بہن کو دیکھا۔

”جب اس کو اعتراض نہیں ہے تو آپ دونوں کیوں اپنا دل جلا رہی ہیں۔“

”حد کرتے ہیں بھائی آپ!“ مہرین نے شکایتی نظروں سے بھائی کو دیکھا۔ ”میم خدیجہ نے کیسپس میں مجھے ہمیشہ چھوٹی بہنوں کی طرح ٹریٹ کیا ہے، میرے ہر چھوٹے بڑے مسئلے کو سمجھایا ہے وہ اتنی پر خلوص اور کیئرنگ ہیں کہ میرا دل ان کے ساتھ ہونے والی اس زیادتی پر کڑھ رہا ہے۔“

شکل و صورت بھی ٹھیک ٹھاک دے رکھی تھی اور کچھ ڈرینگ کا بھی سلیقہ تھا اور سب سے بڑھ کر کھلا پیسہ تھا۔ چنانچہ ان کے رہن سہن کا شائل اور نٹ نئے گاڑیوں کے ماڈل، مہنگے اور نفیس کپڑے، سن گلاسز اور ہر چیز میں خوبصورتی کے معیار کو مد نظر رکھا جاتا۔ ان کے یونیورسٹی کے گروپ میں بھی ایسے ہی لڑکے اور لڑکیوں کی تعداد نمایاں تھی اور عروج کے حسن کے چرچے تو پوری سوشل سائنسز کی فیکلٹی میں تھے۔ اسے دیکھتے ہی کاشف نے اسے اپنی زندگی کا ہم سفر بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور عروج سے دوستی کرنے کے لیے اسے جتنے پاؤں پیلنے پڑے یہ بات وہ اور ولید ہی جانتے تھے۔ عروج کو اپنی دلکشی کا بھرپور احساس تھا، تب ہی اکناکس کے خوبرو، ہینڈسم کاشف کو اپنے پیچھے آتا دیکھ کر اس کا غرہ آسمانوں کو چھونے لگتا تھا۔

اور پھر کاشف کی حد درجہ اور روز بروز بڑھتی ہوئی پسندیدگی کو دیکھتے ہوئے آخر کار عروج نے اپنے گھسنے ٹیک ہی دیے تھے لیکن وہ قدم قدم پر اسے یہ احسان جتنا نہیں بھولتی تھی کہ بہت اثر و رسوخ والے خاندانوں سے اس کے درجنوں کے حساب سے رشتے آئے تھے اور اس کی خود پرستی اور حد درجہ ضدی طبیعت کی وجہ سے کاشف کو شادی کے فوراً بعد ہی احساس ہو گیا تھا کہ اس نے کتنی بڑی غلطی کر لی ہے لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی طرف سے اس رشتے کو نبھانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن یکطرفہ مفاہمت کا نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہئے تھا۔

کم گو تو وہ کافی عرصے سے تھا لیکن دوستی سے آنے کے بعد تو اسے چپ ہی لگ گئی تھی۔ بیٹھے بیٹھے وہ ایک دم پریشان ہو جاتا اور اس کی اضطرابی کیفیت کسی سے بھی چھپی ہوئی نہیں تھی۔

اس دن ایک سو اسی روزہ تھا۔ جب وہ گھر آیا تو افطاری کی تیاری کرتی مہرین، امی کے ساتھ کسی بحث میں مگن تھی۔

کاشف نے تشویش بھری نظروں سے رنجیدہ رنجیدہ سی والدہ کو پالک کاٹتے ہوئے دیکھا جبکہ مہرین زور سے بولتی ہوئی اب غصے میں آچکی تھی۔ سو آواز بھی انچی ہو رہی تھی۔

”مجھے میم خدیجہ کی والدہ سے اس قدر بے حسی کی توقع نہیں تھی۔“ وہ باقاعدہ ناراض تھی۔

”بھئی ان کی بیٹی ہے وہ بہتر جانتی ہیں، میں نے مناسب لفظوں میں روکنے کی کوشش تو کی لیکن ان پر تو فرض ادا کرنے کی دھن سوار ہے۔ اب بتاؤ کوئی ان کو کیا سمجھائے؟“ امی نے

حالانکہ میرے اس فیصلے پر میرے دوست احباب حیران پریشان رہ گئے تھے کہ میں ہر چیز پر کپڑا مارتا کر سکتا تھا لیکن خوبصورتی پر ہرگز نہیں اور عروج جس کی چھ ماہ بعد ہی اپنے دوسرے شوہر سے علیحدگی ہوئی تھی، وہ بھی خصوصی طور پر فرزام سے ملنے کے بہانے میری شریک حیات کو دیکھنے آئی تھی اور اسے فرزام نے کوئی خاص لفٹ نہیں کراوائی تھی، وہ بھی میرے گھر میں راج کرتی ”خدیجہ نور“ کو دیکھ کر ششدر رہ گئی تھی۔

لیکن وہ یہ بھی جان گئی تھی کہ یہ انتہائی عام سے خدو خال رکھنے والی عام سی لڑکی میری زندگی میں اتنی ”خاص“ اہمیت رکھتی ہے کہ جس نے محبت، خلوص اور نیک نیتی سے فرزام تک کو اپنا گرویدہ بنا کر میرے دل میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اہمیت اور جگہ بنالی ہے اور سب سے بڑی بات کہ جب میں اس کو دیکھتا ہوں تو مجھے زندگی بہت خوبصورت لگتی ہے۔



”اچھا..... بتاؤ میں کیا مدد کر سکتا ہوں اس سلسلے میں؟“ کاشف نے بات ختم کرنے کیلئے اسے ٹالا تو وہ بے دھڑک بولی۔

”مانڈمٹ کیجئے گا بھائی! ایک فیصلہ آپ نے کیا تھا، ایک ہمیں کرنے دیں اور مجھے خدا کی ذات پر بھروسہ اور اعتماد ہے کہ وہ ہماری نیت کا پھل ہمیں ضرور دے گا۔“

”کیا مطلب؟“ وہ بری طرح الجھا۔

”آپ میم خدیجہ سے شادی کر لیں۔“ مہرین کے سادہ سے انداز پر وہ بری طرح اچھلا۔

اس نے سخت ناراض نظروں سے اس کو دیکھا تو وہ گھبرا کر بولی۔

”بھائی! وہ بہت خوبصورت دل کی مالک ہے۔“

”امی! دیکھیں اسے.....“ اس نے شکایتی لہجے میں کہا جبکہ پالک دوبارہ کاٹتی والد نے پرسکون انداز میں کہا۔ ”اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے کاشف؟“

”امی! آپ بھی.....“ کاشف کی نگاہ ابھی تک ماں کے چہرے پر لپکی ہوئی تھی جیسے یقین نہ آ رہا ہو۔



یہ میری زندگی میں آنے والی صحیح معنوں میں خوبصورت اور حسین چوتھی عید ہے، ابھی ابھی میں فرزام اور شہرام کو عیدی دے کر اوپر اپنے بیڈروم میں آیا ہوں۔ میری لاڈلی اور سمجھ دار بیگم جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے لیے خصوصی تحفہ ہے، وہ اس وقت میری فرمائش پر حلیم بنانے میں مگن ہے۔ مہرین اور مہرین کی شادی کے بعد سارا گھر اس نے انتہائی سمجھ داری سے سنبھالا ہوا ہے۔

”جی جناب! میں نے امی اور بہنوں کا مشورہ مان کر دوسری شادی کر لی تھی اور اس وقت میں انتہائی بھرپور اور خوشگوار زندگی گزار رہا ہوں کیونکہ میں نے اس اصول کو پالیا تھا۔ کہ ظاہری حسن اکثر جھوٹا اور عارضی بھی ہو سکتا ہے جبکہ باطنی حسن پائیدار ہوتا ہے اور خوبصورت اور حساس دل رکھنے والے کیئرنگ لوگ اپنے سے وابستہ لوگوں کی زندگیوں کو بھی آسان بنا دیتے ہیں جیسے کہ میری بیگم نے میری زندگی میں آسائیاں بکھیر دی ہیں اور میرے آشیانے میں شہرام کی صورت میں ایک اور پھول بھی کھلا دیا ہے۔“

”مٹھر جا! کم بخت گونگلو! تجھے اللہ کرے ہیضہ ہو جائے۔“  
 ”تیرے دانتوں میں کیڑا لگے۔“  
 ”تو موبائل میں پانچ سو کا کارڈ ڈلوائے وہ خالی نکلے۔“  
 ”سرکافلی کے ٹیسٹ میں فیل ہو جائے۔“

ریٹک روشن کوریڈور میں بھاگتے ہوئے عورتوں کی طرح بددعاؤں پر اتر آیا تھا اور اس کی آخری بددعا تھوڑی سی ردوبدل کے ساتھ اسی وقت پوری ہو گئی؛ جب گونگلو کوریڈور سے مڑتے ہوئے سرکافلی سے بری طرح ٹکرایا۔

”لا حول ولا قوۃ“ کیا جنگلی بھینسے کی طرح بھاگتے پھر رہے ہو؟“ سرکافلی اپنے سر کو بری طرح سہلاتے ہوئے غصے سے بولے..... کوریڈور میں بکھری ان کی کتابیں اور نوٹس ہری مرچ نے جلدی جلدی اٹھا کر دیئے اور نمبر بڑھانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا.....  
 ”تھینک یو! تم ایک اچھی لڑکی ہو۔“ پروفیسر کافلی غصے میں بھی اخلاقیات نہیں بھولے تھے اور ان کے منہ سے تعریفی کلمات سن کر لال سرخ ہوتی ہری مرچ کو گونگلو نے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔

سرکافلی نے کتابیں ہاتھ میں پکڑتے ہی غصے اور ناگواری سے گونگلو اور ریٹک روشن کو دیکھا۔ ریٹک کی بے چین نظریں گونگلو کے ہاتھ میں پکڑے کاغذ پر تھیں؛ وہ اچک اچک کر اسے لینے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ پروفیسر کافلی نے ہاتھ بڑھا کر گونگلو سے کاغذ چھینا اور وہیں کھڑے کھڑے دونوں کی شان میں جو کلمات کہے وہ ساری پریولیس اور فاسٹل نے اپنے گناہ گارکانوں سے خود سنے.....

سرکافلی وہ اشتعال انگیز پرچہ بطور ثبوت ہاتھ میں پکڑے کلاس روم میں داخل ہوئے تھے؛ پوری کلاس کے لئے اپنی مسکراہٹوں کو چھپانا انتہائی دشوار ہو رہا تھا۔

ہری مرچ اپنے سبز رنگ کے بڑے بڑے پھولوں والے پرنٹ کے سوٹ میں بڑے فخر سے کلاس روم میں داخل ہوئی تھی؛ جبکہ ریٹک روشن اور گونگلو کے چہرے کے سارے فیوز اڑے ہوئے تھے۔

پروفیسر کافلی نے اپنی آنکھوں پر لگی عینک کو اتار کر شرٹ کی ایک جیب میں رکھا؛ جبکہ دھری جیب سے دوسرا چشمہ نکال کر پہلے ٹشو پیپر سے صاف کیا اور پھر آنکھوں پر لگا کر گونگلو

یہ بازی کس نے ہاری ہے

پریولیس کا عبدالرزاق عرف ”گونگلو“ ہاتھ میں ایک پرچہ لہراتا ہوا آندھی اور طوفان کی طرح بھاگتا ہوا کلاس روم کی طرف آ رہا تھا۔

اور راستے میں کوریڈور مڑتے ہی وہ شائستہ عرف ہری مرچ سے بری طرح ٹکرایا؛ ہری مرچ کے منہ سے نکلنے والی چیخ نے بہت سارے اسٹوڈنٹس کو مڑ کر دیکھنے پر مجبور کر دیا..... ہری مرچ کی ننھی ننھی سی سرخ ناک جو نزلے کی وجہ سے اکثر سرخ رہتی تھی اور اس پر دھرا غصہ جس کی وجہ سے اسے ہری مرچ کا خطاب ملا تھا..... اس وقت بھی غصے اور اشتعال سے سرخ ہو چکی تھی۔

”منجوس گونگلو! کیا اندھے ہو گئے ہو؟“

”آنکھوں میں موتیا اتر آیا ہے کیا؟“

”اور یہ کیا“ سائڈ“ کی طرح میرے سامنے ”دیوار چین“ بن کر کھڑے ہو گئے ہو پیچھے مرد.....“ ہری مرچ کا غصہ کسی طور کم ہونے کو نہیں آ رہا تھا..... کوئی اور وقت ہوتا تو گونگلو اس اینٹ کا جواب پتھر سے دیتا؛ لیکن اس وقت اس کا سارا ادھیان سیڑھیوں کی طرف تھا؛ جہاں ریٹک روشن اپنی لمبی لمبی ٹانگوں کے ساتھ بھاگتا ہوا انتہائی خوف ناک تاثرات کے ساتھ ادھر ہی آ رہا تھا۔

نام تو ریٹک روشن کا اصل میں نعیم چوہدری تھا؛ مگر اپنے کمزور جسم بے تحاشا لمبے قد اور موٹی موٹی آنکھوں کی وجہ سے اسے پوری کلاس نے ریٹک روشن کا نام دے رکھا تھا۔

گونگلو اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر ایک دفعہ پھر خوف زدہ ہو کر بھاگا تھا؛ اس کی تمام تر توجہ ہاتھ میں پکڑے کاغذ کی طرف تھی۔

سے برآمد شدہ پرچہ اونچی آواز میں پڑھنا شروع کر دیا۔

پرچہ مشاہدات کل نمبر 33، وقت لامحدود، کامیابی کے نمبر 100۔

نوٹ: کمرہ امتحان میں غیر ضروری مواد مثلاً پینسل، قلم، دوات لے جانے کی اجازت نہیں، البتہ بندوق، ریوالور اور پستول کے ساتھ نقل لے جاسکتے ہیں۔

سوال نمبر 1: بے وقتوں سے کیا مراد ہے؟ تجربات کی مدہم روشنی میں وضاحت کریں۔

سوال نمبر 2: کشش شکل سے کیا مراد ہے؟ اپنی شکل آئینے میں دیکھ کر وضاحت کریں۔

سوال نمبر 3: سرکالپی کے فضول اور بورلیکچر کے دوران طلبہ و طالبات کے ذہن پر

پڑنے والے برے اثرات پر جامع اور مفصل نوٹ لکھیں۔

سوال نمبر 4: میڈم عمارہ کی تنخواہ اور ان کے جدید فیشن کے اخراجات کا موازنہ کریں۔

سوال نمبر 5: آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا کس نے دیکھا؟ دوستوں سے پوچھ کر

بتائیں۔

سوال نمبر 6: لڑکے اور لڑکیوں کی کمیونیکیشن بڑھانے میں موبائل فون کے کردار پر روشنی

ڈالیں۔

سوال نمبر 7: سگریٹ نوشی کے فوائد پر تفصیل سے نوٹ لکھیں۔

”یہ کیا ہے؟“ سرکالپی نے غصے سے پرچہ فضا میں لہرایا اور تنبیہی نظروں سے گونگو کی

طرف دیکھا جس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔

”سرا! یہ میرا نہیں ہے، میں نے تو ریتیک اودہ سوری نعیم سے چھینا ہے۔“ گونگو نے اپنے

سر سے فوراً ہلا اتار کر نعیم کے سر ڈالی جس نے انتہائی خوف زدہ نظروں سے سرکالپی کے

اشتعال انگیز چہرے کو دیکھا تھا۔

”سرا! یقین کریں مجھے تو خود اس کے بارے میں کچھ علم نہیں، میں نے تو یہ دیوار پر لگا ہوا

دیکھا تھا۔“

ریتیک روشن کے بھونڈے جواز پر کلاس میں زوردار قہقہے بلند ہوئے تھے..... وہ جھل سا

ہو گیا.....

”تو یہ اس پرچے کے نیچے دستخط اس دیوار نے خود کر دیئے ہوں گے.....؟“ سرکالپی

کے طنز یہ لہجے پر ریتیک روشن کے چہرے پر تشویش کے رنگ نمایاں ہوئے تھے۔

”آپ ذرا میرے کمرے میں تشریف لائیں، باقی حال احوال آپ سے وہیں ہوگا۔“

سرکالپی کے درشت الفاظ نے اس کی جان نکال دی تھی۔

”جی سرا!“ اس کی بمشکل آواز نکلی۔

اور ٹھیک بیس منٹ اور پندرہ سیکنڈ کے بعد جب وہ سرکالپی کے دفتر سے نکلا تو پوری

کلاس نے دیکھا تھا، ریتیک روشن کا منہ سرخ اور ناگوں میں سے آدھی جان تو نکل چکی تھی.....

اس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ کر آدھی کلاس کو تو اس سے خود بخود ہمدردی ہو گئی تھی۔

”یار! کیا کہا۔“ ساجد درانی عرف سرکاری انے نے اپنے جگری یار کو خفت زدہ چہرے

کے ساتھ آتے دیکھ کر پوچھا۔

”کچھ نہیں، بس اباجی کو فون کر کے میرے کارنامے پر روشنی ڈالی ہے، اسائنمنٹ میں صفر

نمبر دیا ہے اور کلاس میں ایک ہفتے تک اپنی شکل نہ دکھانے کا حکم جاری کیا ہے۔“ ریتیک روشن

نے اداس اور غمگین لہجے میں مختصر بتایا.....

”لو بیس منٹ تک وہ یہی باتیں کرتے رہے؟“ سرکاری انے کو یقین نہیں آیا تھا۔

”تو اور کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟“ ریتیک ایک دم اشتعال میں آ گیا تھا۔

”نہیں پارا! میں تو مذاق کر رہا تھا۔“ سرکاری انے نے اپنی سبز عینک اتار کر اس پر

پھونک ماری اور نعیم کے گھیرے سے صاف کرنے لگا۔ سرکاری انے کا ناسٹل اسے اپنی مشہور

زمانہ بزرگ کے شیشوں والی عینک کی وجہ سے ملا تھا جسے لگا کر وہ لڑکیوں کو تارتا تھا۔

”یہ کم بخت گونگو کہاں ہے؟ میں اس کا منہ توڑ دوں گا..... اللہ کرے اس موٹے کی

شادی ہری مرج کے ساتھ ہو جائے.....“ ریتیک کی دھمکیوں اور بددعاؤں پر ہری مرج نے

اجتہاداً چیخ ماری تو ریتیک کو اپنی غلطی کا احساس ہوا لیکن اس وقت تک کافی دیر ہو چکی تھی ہری

مرج غصے میں اس کی شکایت کرنے پاؤں بٹختی ہوئی سرکالپی کے آفس کی طرف چل پڑی تھی۔

ریتیک کے چہرے کا رنگ ایک دم اڑا تھا..... اور باقی کلاس کے لوگوں کا اوپر کا سانس

اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا..... اس موقع پر مدرٹریا یعنی شگفتہ بانو نے عقل مندی دکھائی اور

بھاگ کر ہری مرج کا راستہ روکا تو ریتیک کے چہرے پر کچھ سکون کے تاثرات نمودار ہوئے۔

”آخر میرا کیا تصور ہے جو میری اس موٹے بھینسے کے ساتھ شادی ہو۔“ ہری مرج

پاؤں پٹخ کر احتجاج کر رہی تھی۔

مصروف تھا۔

”تمہیں کیا تکلیف ہے اگر بلال بھائی میرا ہاتھ دیکھ رہے ہیں دو منٹ سکون سے نہیں بیٹھ سکتیں فوراً ہی ٹرٹر شروع کر دیتی ہو۔“ طوبیٰ بھی بھڑک اٹھی تھی۔

”مجھے کیوں تکلیف ہونے لگی، لیکن اگر لو میرج کی لائن نہیں ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور۔ اتنی مشکل سے تو بلال بھائی ہاتھ لگے ہیں اور تم سوڑھے کی طرح چٹ کر بیٹھ گئی ہو۔“ ہری مرچ حسب عادت بھڑک اٹھی تھی۔

بلال بھائی کے ساتھ جڑ کر بیٹھ جاؤ اور دکھا لو اپنا چھٹا تک بھر ہاتھ جس میں صرف ڈیڑھ لائن ہے اور باقی صاف اور چٹا جیسے تمہارا دماغ، طوبیٰ نے خونخوار نظروں سے اسے دیکھ کر حساب برابر کیا۔

”لڑکیو! پہلے یہ لڑنا بند کرو بھائی، بھائی کی گردان بھی ختم کرو ورنہ میں سب کی قسمیں پھیر دوں گا۔ حد ہو گئی پچھلے ایک گھنٹے سے چاروں کی پسند کی شادی کروا چکا ہوں اگر ایک آدھ کی نہیں ہو رہی تو وہ بندہ صبر کر لے مگر ہماری قوم میں صبر کہاں؟“

بلال بھائی کے مصنوعی خفگی بھرے لہجے کو کسی نے بھی اہمیت نہیں دی..... اور اسی افراقی میں گونگو بالکل شائستہ کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گیا تھا اور شائستہ عرف ہری مرچ کو اس کا قطعاً احساس نہیں تھا، ورنہ اب تک وہ اچھل کر دور جا بیٹھتی۔

”بلال بھائی! آپ پہلے مجھے بتائیں کہ میری شادی خاندان میں ہے یا خاندان سے باہر۔“ گونگو نے اپنا ہاتھ ہری مرچ کے ہاتھ کے بالکل اوپر رکھ دیا تھا۔

”تمہارے ہاتھ میں شادی کی لکیر ہی نہیں ہے اپنا منہ ہاتھ پیچھے کرو۔“ ہری مرچ کو اس نامعقول حرکت پر غصہ آ گیا تھا، بہت مشکل سے تو طوبیٰ کو وہاں سے اٹھایا تھا۔

”بندے کی اگر شکل اچھی نہ ہو تو وہ بات اچھی کر لے میری سہیوال والی پھپی زبیدہ کا رشتہ لے کر پچھلے چار روز سے ہمارے گھر دھرتا مارے بیٹھی ہے..... اور تم کہتی ہو کہ لائن نہیں۔“ گونگو نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

”تمہاری پھپی کا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟ یا پھر اس کی سوتیلی بیٹی ہے کوئی؟“ ہری مرچ نے سراسر چڑایا۔

”میری پھپی کا دماغ خراب نہیں، بلکہ تمہارا دماغ خراب ہے جو ایسی بہکی باتیں کر

”ہاں خود تو جیسے حسینہ عالم ہے نا، بد مزاج ہری مرچ۔“ سرکاری انے نے بھی اپنا غصہ نکالا، مگر نسبتاً سرگوشی میں۔

”بکواس بند کر، وہ پہلے ہی پہاڑی پر چڑھی ہوئی ہے۔“ ریتک روشن نے جھنجھلا کر اسے کوسا۔

”کوئی بات نہیں مدرٹریا، معاملہ سیٹ کر لے گی۔“ سرکاری انے کو گفتہ بانو کی صلاحیتوں پر مکمل بھروسہ تھا، کیونکہ وہ خاصی حساس دل کی، دوستانہ مزاج کی حامل لڑکی تھی اور ہر کسی کی پریشانی میں اس سے زیادہ پریشان ہونے کی وجہ سے پوری کلاس نے اس کا نام ہی مدرٹریا رکھ دیا تھا۔

”یار! ویسے سرنے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا، جو کہنا تھا خود کہہ لیتے، اب اباجی کے ہاتھوں کون مجھے بچائے گا۔ وہ تو پہلے ہی کہتے ہیں دفع مار پڑھائی کو اور.....“ نعیم عرف ریتک روشن کو اباجی کی متوقع بے عزتی کے خوف نے پریشان کر رکھا تھا۔

”ویسے یار! کہتے تو تم ٹھیک ہو، تمہارے اباجی بے عزتی بھی تو ”رج“ کے کرتے ہیں، یاد ہے جب ہمارا ”چناب“ سے ٹرپ لیٹ ہو گیا تھا۔ تمہارے اباجی نے ساری بس کے سامنے تمہیں ناقابل بیان گالیاں دی تھیں..... اور سرتوریہ کا بھی لحاظ نہیں کیا تھا۔“ ساجد عرف سرکاری انے نے یاد دلایا تو نعیم کا چہرہ خاصا خفت زدہ ہو گیا۔

”بس یار! وہ تو بے بے کی وجہ سے اب پریشان ہو گئے تھے میں ہوں بھی تو اکلوتا تھوڑا ٹائم اوپر نیچے ہو جائے تو ابے اور بے بے دونوں کا بی پی ڈاؤن ہونے لگتا ہے۔“

نعیم نے گھبرا کر فوراً مصفا دی۔ پوری کلاس کی اب اس واقعے سے دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔ اس لئے سب ادھر ادھر ہو گئے تھے۔

”بلال بھائی! کیا واقعی میرے ہاتھ میں لو میرج کی لائن نہیں ہے؟“ طوبیٰ کو نہ جانے کیوں یقین نہیں آ رہا تھا، اس نے انتہائی رنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

”جب کوئی ایسی لائن نہیں ہے تو کیا اب بلال بھائی خود بتا دیں؟ اب پیچھے کر دو ہاتھ۔ صبح سے دکھا رہی ہو۔ اب ہمیں بھی موقع دو ورنہ بریک ٹائم ختم ہو جائے گا۔“ ہری مرچ کو نہ جانے کیوں پھر غصہ آ گیا تھا، اس وقت ان کا سارا گروپ ”سوشل سائنسز“ ڈیپارٹمنٹ کے سامنے بنے ہوئے لان میں میٹھا فائل ایئر کے ”بلال رضا“ کو ہاتھ دکھانے کے شغل میں

”سمر کس سے؟“ رینک روشن نے خاصا معقول سوال کیا۔

”اسی سے..... جس سے یہ سب سے زیادہ لڑتا ہوگا۔“ بلال نے دھاکہ کیا۔  
 ”کیا؟“ سب کی نظریں ہری مرج کی طرف منتقل ہو گئیں جو اپنی عینک اتار کر دوپٹے کے پلو سے اس کا شیشہ رگڑنے میں مصروف تھی۔  
 ”تم مس ورلڈ جو ہوئیں۔“ گونگلو نے طنز کیا۔

”اپنا منہ بند رکھا کرو مونے آلو گول گول۔“ ہری مرج نے بھڑک کر جواب دیا۔  
 ایک دفعہ پھر ایک نئے دنگل کا آغاز ہو چکا تھا..... جبکہ بلال نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور وہاں سے کھسک گیا جبکہ باقی ساری کلاس گونگلو اور ہری مرج کی صلح کروانے میں لگ گئی۔

”مجھے یقین ہے کہ ”سرکاری انا“ اپنے ڈیپارٹمنٹ کا الیکشن اپنی ”عینک“ کی وجہ سے ہارا ہے اور یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے تب ہی کلاس کی چار لڑکیوں کے علاوہ سب نے اپنے ووٹ کن کھجورے کو دیئے۔“ جیدے فلاسفر نے ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ کی کینٹین پر بیٹھ کر اپنا ماہرانہ تبصرہ پیش کیا۔

اس وقت ان کا سات لوگوں پر مشتمل گروپ خاصا رنجیدہ اور افسردہ افسوس کے لئے کینٹین پر جمع تھا..... اس گروپ میں تین لڑکیاں شگفتہ بانو عرف مدرثریا، شائستہ عرف ہری مرج اور طوبی عرف توبہ توبہ اور لڑکوں میں عبدالرزاق عرف گونگلو، نعیم عرف رینک روشن، ساجد عرف سرکاری انا اور جاوید عرف جیدا فلاسفر شامل تھے۔

”میں نے اس کم بخت کو کہا تھا کہ کلاس CR کے الیکشن سے ایک ہفتہ پہلے یہ منخوس عینک اپنے موٹے موٹے ڈیلوں پر چڑھانا چھوڑ دے مخالف گروپ کی ذکیہ کو ویسے بھی یہ خوش فہمی ہے کہ ساجد اس عینک سے ہمیشہ اس کو دیکھتا ہے اور کن کھجورے کی تو ویسے بھی ذکیہ کے اوپر نظر تھی اس نے تو لڑکیوں میں اس عینک کے خلاف ایسا پروپیگنڈا کیا کہ لڑکیاں ساری کی ساری بدنجن ہو گئیں اور نتیجہ تم لوگوں کے سامنے ہے، ہم یہ الیکشن ہار گئے۔“ نعیم چوہدری نے جلتے کئے انداز میں کہا۔

”اچھا اچھا بس کرو اب تم لوگ تو اس بے چارے کو ”شریکوں“ کی طرح طعنے نہ دو وہ پہلے ہی بہت پریشان ہے۔“

رہی ہو اور اپنی عینک صاف کرو تا کہ تمہیں واضح نظر آنے لگے.....“ گونگلو کون سا کسی سے کم تھا۔

اس لڑائی کا سب سے زیادہ فائدہ سرکاری انا نے اٹھایا وہ ہاتھ دکھانے میں مصروف تھا..... جبکہ شائستہ اور عبدالرزاق اب ہاتھ دیکھنا بھول کر ایک دوسرے پر بمباری کرنے میں مصروف ہو چکے تھے۔

”اوائے نجوی کی اولاد! پریولیس کے بے وقوفوں کو گولی مارو اور کلاس میں آ جاؤ میڈم عمارہ ”میڈیا کمیونیکیشن“ کی کلاس لینے آ رہی ہیں۔“ فائل کے کسی اسٹوڈنٹ نے سیکنڈ فلور سے لٹک کر بلال کو اطلاع دی تو وہ فوراً اپنا مشغلہ ادھورا چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”یار! ٹھہر جاؤ میڈم عمارہ جتنی لمبی جیل پہن کر اور جتنی نزاکت کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتی ہیں وہ اگلے پندرہ منٹ میں ہی کلاس روم میں پہنچیں گی، تم میرا ہاتھ تو مکمل دیکھ جاؤ۔“ گونگلو نے بازو پکڑ کر بلال کو دوبارہ بٹھایا۔

”یار! مجھے جانے دو۔ میڈم کو تو ویسے ہی آج کل مجھ پر بہت غصہ آتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان کی پارکنگ میں کھڑی گاڑی کے ٹائروں کی ہوا میں نکالتا ہوں۔“ بلال نے اپنا دکھڑا بیان کیا۔

”دفع کر میڈم کی مہینچر گاڑی کو میرا ہاتھ دیکھ لئے ورنہ آج میڈم کی گاڑی کو پتھر کر کے ٹائروں پر تہارا نام اور رول نمبر لکھ دوں گا۔“ گونگلو نے دھمکی دی۔

”اوائے تم! موٹے اپنے سینئر کو دھمکی دے رہے ہو۔ بلال کو ابھی ابھی اپنے سینئر ہونے کا احساس ہوا تھا۔“

”او نہیں یار! ویسے ہی مذاق کر رہا تھا۔“ گونگلو نے اسے غصے میں دیکھ کر فوراً پینتیر بدلا تو بلال نے بھی بادل نخواستہ اس کا ہاتھ پکڑا اور بے زاری سے دیکھنا شروع کر دیا۔

”عبدالرزاق عرف گونگلو! تمہارے ہاتھ میں اچانک محبت کی لائن ہے جیسے لوگ اچانک لمیریا سے ٹائی فائیڈ بخار میں مبتلا ہو جاتے ہیں ویسے ہی تیری قسمت میں ایک دھواں دھار محبت لکھ دی گئی ہے۔“

بلال کے انکشاف پر گونگلو کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور وہ اپنے ہاتھ کو ایسے دیکھنے لگا جیسے اس ہاتھ میں محبت کا چہرہ بھی دکھائی دے رہا ہو.....

لیکن جیسا اس لئے اس چوری کا لوٹس نہیں لے سکا کیونکہ وہ سوچنے میں مصروف تھا جبکہ ہری مرچ نے اسے تنبیہی نظروں سے دیکھا مگر وہ کندھے اچکا کر پورا کباب منہ میں رکھ چکا تھا۔  
 ”یہ کوئی خاموش محبت بھی ہو سکتی ہے۔“ جیدے نے اچانک انکشاف کیا، ساجد کی آنکھیں سوداٹ کے بلب کی طرح روشن ہو گئیں۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی بوتل بے دھیانی میں گونگلو کو پکڑا دی۔

”کیا واقعی؟“ ساجد بے چینی سے ہاتھ ملتے ہوئے بولا تھا۔ اس کے چہرے پر تجسس کے سارے رنگ تھے۔

”یہ کسی کی غلطی بھی ہو سکتی ہے؟“ طوبی نے جتانے والے انداز میں کہا۔

”تم بھی ڈھنگ کی بات نہ کرنا۔“ ساجد کو طوبی کا تجزیہ ہرگز پسند نہیں آیا تھا۔

”کہیں میمونہ ہاشمی نے تو اسے دوٹ نہیں دیا۔ وہ پچھلے کئی دنوں سے ہمارے سرکاری

انے کو بڑی میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔“ ریتیک روشن نے ایک نیا انکشاف کیا۔

”دفعہ دوز وہ ہی میرے لئے رہ گئی ہے تو اس نے مجھ سے ریسرچ کے ایک دو لیکچر

مانگے تھے اور میں نے دینے کا وعدہ مروت میں کر لیا تھا۔ اسی لئے اس کے کرخت چہرے پر

نری کے آثار ہیں، ورنہ یہی میمونہ ہاشمی ہے جس کے ساتھ نکرانے کی وجہ سے پوری کلاس نے

مجھے سرکاری انے کا ٹائل دے دیا تھا۔“ ساجد نے برامان کر جواب دیا۔

”جناب یہ ٹائل تمہیں صرف میمونہ سے نکرانے پر نہیں بلکہ اس کے بعد نورین اور پھر

میڈم عمارہ سے نکرانے کے بعد ملا تھا.....“ گونگلو نے اس کی بوتل کا آخری گھونٹ بھی پیٹے

ہوئے یاد دلایا.....

”بکواس بند کرو بہت کہینے ہو تم، میری ساری بوتل ڈکار گئے.....“ ساجد کو اچانک

احساس ہوا۔

”اور میرا کباب کہاں گیا؟“ جیدے کو بھی اچانک خیال آیا۔

”میری بریانی؟“ ساجد چلایا۔

”سب کچھ اس موٹے جنگلی کے پیٹ میں جو عنقریب پھٹ جائے گا۔“ ہری مرچ نے

جل کر کہا۔

”جتنے والے کا منہ کالا۔“ گونگلو نے تہقہ لگا کر اسے مزید چڑایا۔

گھٹتہ کو ہی سب سے پہلے اس کا خیال آیا تھا جبکہ ساجد درانی اپنی مشہور زمانہ عینک کو گور میں رکھے خاصا دکھی دکھی سا بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے آگے رکھی بریانی کی پلیٹ جوں کی توں پڑی تھی اور وہ ”گونگلو“ کی نظروں کی زد میں تھی۔

”شرم کرو گونگلو! وہ بے چارہ پہلے ہی الیکشن ہار گیا ہے اور اوپر سے تم اس کی بریانی کی پلیٹ پر بھی ہاتھ صاف کر رہے ہو تمہارا پیٹ تو مجھے کنواں لگتا ہے جو کبھی نہیں بھر سکتا۔“

ہری مرچ نے عبدالرزاق کو بری طرح لتاڑا تھا جو اپنی پلیٹ صاف کر کے ان کو باتوں میں مصروف دیکھ کر اب سرکاری انے کی پلیٹ پر حملہ کر چکا تھا۔

”تو تمہیں کیا تکلیف ہے؟ اتنا ہی دکھ ہو رہا ہے تو اپنی پلیٹ دے دو جب وہ کھانی نہیں رہا تو رزق کی بے حرمتی ضرور کرنا ہے کسی کے پیٹ میں ہی چلا جائے۔“ عبدالرزاق نے تیز تیز کھاتے ہوئے جواب دیا۔

”ہاں ہر دفعہ وہ پیٹ تمہارا ہی ہوتا ہے۔“ ہری مرچ نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا جس کی نظریں اب ریتیک روشن کی ٹھنڈی بوتل پر تھیں اور وہ اب پھر موقع کی تاک میں تھا۔

”یارا میں تو سخت حیران ہوں کہ مجھے لڑکیوں کی سائیڈ سے چوتھا دوٹ کس نے دیا؟“ ساجد نے کچھ بے چینی ہو کر پوچھا۔ بظاہر اس کا لہجہ خاصا افسردہ لیکن انداز سے تجسس و خوشی صاف عیاں تھی۔

”ہاں یار! یہ تو سوچنے کی بات ہے۔“ وہ سب بری طرح چونکے۔ گونگلو نے بھی کھانا چھوڑ دیا تھا۔

”دیکھو نا ہماری کلاس میں صرف پندرہ لڑکیاں ہیں جن میں سے تین ہمارے گروپ میں جبکہ سات مخالف گروپ میں اور باقی پانچ لڑکیوں نے اپنی علیحدہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائی ہوئی ہے اور اپنے گروپ کی تین کے علاوہ مخالف گروپ سے تو کسی دوٹ کی ہرگز توقع نہیں جبکہ ”پاکیزہ بہنوں“ والا گروپ تو ویسے ہی ان تمام لڑکیوں کے خلاف ہے جو لڑکوں کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی ہیں پھر آخر سرکاری انے کو چوتھا دوٹ کس نے دیا؟“ جیدے فلاسفر نے اپنی عینک اتارتے ہوئے خاصے الجھن آمیز لہجے میں پوچھا۔

”ہاں یار! بات تو واقعی سوچنے والی ہے۔“ گونگلو نے دوبارہ رغبت سے کھانا شروع کر دیا تھا اور اب کے اس نے اپنی بائیں سائیڈ پر بیٹھے جیدے کی پلیٹ سے کباب بھی اٹھا لیا تھا

”چلو دنگل ایک دفعہ پھر شروع۔“ طوبیٰ نے بد مزاجی میں کہا۔

”یار! میرا مسئلہ تو حل کرو آخر مجھے چوتھا ووٹ کس نے دیا؟“ سرکاری انا کی لڑائی پر جھنجھلا کر بولا تھا۔

”لعنت بھیجو چوتھے ووٹ پر تم کون سا اس ووٹ کی وجہ سے جیت گئے ہو۔“ ریتک روشن نے چڑ کر جواب دیا، وہ بھی ہری مرچ اور گونگو کی لڑائی کی وجہ سے سخت بے زار ہو رہا تھا۔



اس دن وہ سب پریولیس کی ڈیٹ شیٹ دیکھ کر بنانے والے کو بلند آواز میں لان میں بیٹھے کوس رہے تھے..... جس نے ریسرچ کے پیپر میں صرف ایک چھٹی دی تھی۔

”مجھے معلوم تھا کہ سر کاظمی اپنا ساڑا کہیں نہ کہیں ضرور نکالیں گے۔“ ریتک روشن کو ڈیٹ شیٹ کے پیچھے سراسر سر کاظمی کا انتقامی رویہ نظر آ رہا تھا۔

”نہیں یار! میڈم عمارہ نے یقیناً کوئی دشمنی نکالی ہے.....“ جیدے نے فوراً اپنا خیال ظاہر کیا۔

”جبکہ میرا خیال ہے کہ سر تنویر کا ہاتھ ہے اس میں یا وہ نہیں کہ کرکٹ کے میچ میں جب وہ پریولیس کے ہاتھوں پہلی بال پر آؤٹ ہو گئے تھے تب کتنی دھمکیاں دے رہے تھے۔“ سرکاری انے کو یاد آیا۔

”ہاں کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو لیکن یہ گونگو کو کیا ہوا۔ یہ کیسے فٹ بال کی طرح لڑھکتا ہوا بھاگا آ رہا ہے۔“

ہری مرچ نے سب کی توجہ بیڑھیوں کی طرف دلائی، جہاں گونگو سرخ چہرے کے ساتھ انتہائی جوش و خروش سے بھاگا آ رہا تھا۔

”اللہ خیر کرے یوں لگ رہا ہے جیسے پوری بلڈنگ میں زلزلہ آ گیا ہو۔“ طوبیٰ ناگواری سے بولی۔

”مجھے لگتا ہے کہ عبدالرزاق کے پاس کوئی بمبائٹک نیوز ہے اس کی یہ حالت اسی وقت ہوتی ہے۔“ شگفتہ بانو نے سنجیدگی سے کہا ویسے بھی وہ ان کے گروپ کی واحد ممبر تھی جو سب کو ان کے اصل ناموں سے پکارتی تھی۔

ہری مرچ نے نوٹس بنانے بند کر دیئے اور ناگواری سے سامنے گھاس پر گرے گونگو کو دیکھا جس کا ایک ہاتھ فضا میں بلند تھا اور اس ہاتھ میں سنہرا جھلملاتا ہوا کوئی کارڈ تھا.....

”اوائے عدنان سمجھ! یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے جسے تبرک کی طرح تو نے اٹھا رکھا ہے۔“ جیدے فلاسفر نے اونچی آواز میں پوچھا۔

”میرے ہاتھ میں ایٹم بم ہے خبردار کوئی پاس نہ آئے۔“ گونگو نے اپنا سانس بحال کرتے ہوئے انکشاف کیا۔

”ارے ڈرامے بند کر چارلی چپلن کی اولاد..... اور اپنا پیٹ ہولا کر ورنہ پھٹ جائے گا۔“ ساجد نے ہنستے ہوئے اسے چڑایا۔

”بیٹا جو خبر میرے پاس ہے اس کو سن کر تم سب کے دماغ کے فیوز اڑ جائیں گے۔“ گونگو نے ان کے تجسس کو مزید ابھارا۔

”کیوں فاطمہ بھٹو نے لاڑکانہ سے تمہیں ایکشن جتوانے کا تو اعلان نہیں کر دیا؟“ ریتک روشن کی طنزیہ نظروں پر گونگو نے ہاتھ میں پکڑا کارڈ لہرایا۔

”کم بختو! اسے دیکھ کر تم سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔“

”کہیں پرائم منسٹر ہاؤس والوں نے باورچی کی خدمات کے لئے تو تجھے کال نہیں کر لیا؟“ ساجد نے اسے ایک دفعہ پھر چڑایا۔

”یہ تو بہت معمولی خبریں ہیں، شریکوں نے ایک دفعہ پھر میدان مار لیا کم بختو! اور تم میں سے کوئی بھی کام کا نہیں، سارے کے سارے ایک نمبر کے چغہ ہو۔“ گونگو کے طنزیہ لہجے پر وہ سب چونک گئے۔

”اب منہ سے کچھ پھوٹو گے بھی کہ نہیں؟“ ہری مرچ کا پارہ ہائی ہو گیا۔

”کن کھجورا ایک دفعہ پھر بازی جیت گیا، ہم سب کے لئے ڈوب کے مرنے کا مقام ہے۔“ گونگو کی ادھوری بات پر سب نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

”آخر ہوا کیا ہے؟“ مدرٹریا نے اطمینان بھرے لہجے میں پوچھا تو گونگو کے چہرے پر ایک چڑا دینے والی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”تم سب ایک نمبر کے نکلے کے نکلے رہے اور وہ کن کھجورا میدان مار گیا۔“ گونگو نے مہر دہائی دی تو ریتک روشن نے بے ارادہ اٹھ کر اس کی موٹی گردن پکڑ لی۔



”کن بھجور تو بعد میں میدان مارے گا“ البتہ گونگلو تو آج میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔“  
 نعیم کے خطرناک ارادے دیکھ کر گونگلو فوراً بولا۔

”اوائے نازن کی اولاد میری گردن چھوڑ۔ یہ دیکھ کن بھجورے کی شادی کا کارڈ؟“

”کیا مظہر بھٹی کی شادی؟“ مدرثریہا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”کس کے ساتھ؟“ وہ سب اکٹھے بولے تھے۔

”فائل ایئر کی مس ایشریہ رائے یعنی ماثرہ صدیق کے ساتھ۔“

”کیا.....؟“ سب کو باجماعت شاک لگا تھا۔ ہری مرج اپنے نوٹس چھپانا بھول گئی جبکہ طوبی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور جیدے فلاسفر کے پاس بیٹھی ہوئی موٹی تازی بلی ساتھ پڑی پلیٹ سے چکن پیس اٹھا کر بھاگ گئی۔ لان میں چاروں طرف ان کی کتابیں اور نوٹس بکھرے ہوئے تھے اور وہ سب اب شدید شاک میں ایک دوسرے کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

”ہے ناں شاکنگ نیوز۔“ گونگلو نے فخریہ انداز سے سب کی طرف دیکھا۔

”لو یہ کیسے ہو سکتا ہے اس ایشریہ رائے میرا مطلب ہے ماثرہ کا قد پانچ فٹ سات انچ اور کن بھجور بمشکل پانچ فٹ چھ انچ کا ہوگا۔“ طوبی نے اعتراض کیا۔

”طوبی تمہاری عقل دیکھ کر بس توبہ توبہ کرنے کو دل کرتا ہے۔ بھی کس کتاب میں لکھا ہے کہ اپنے سے ایک انچ بڑی لڑکی سے شادی نہیں ہو سکتی۔“ گونگلو نے اسے چڑایا۔

”یہ تو واقعی حیرت انگیز خبر ہے..... اور کیا کن بھجورے نے یہ کارڈ ہمارے گروپ کے لئے دیا ہے۔“ جیدے فلاسفر نے ناک سے کبھی اڑاتے ہوئے پوچھا۔

”جی نہیں جناب! یہ کارڈ تو اس بھی منحوس نے پاکیزہ بہنوں کے گروپ کو دیا ہے اور ساری کلاس انوائیٹ ہے سوائے ہمارے۔“

”کیا.....؟ بھٹی کا دماغ ٹھیک ہے پہلے فائل ایئر کی لڑکی سے ہماری ناک کے نیچے عشق لڑایا اور لڑکی بھی اتنی لمبی جسے سراٹھا کر دیکھنا پڑتا ہے اوپر سے ہمارے معزز گروپ کو شادی میں انوائیٹ نہیں کیا لگتا ہے بھٹی آداب دشمنی سے ناواقف ہے۔“ ساجد کو سخت غصہ آ رہا تھا۔

”تو تم بھی اپنی شادی پر اسے نہ بلانا۔“ طوبی نے جھٹ مشورہ دیا۔

”ہونہہ! اس سے شادی کرے گا کون؟“ گونگلو نے مذاق اڑایا۔

”بکواس بند کر ہمارا خاندان تو لڑکیوں سے بھرا پڑا ہے تو اپنی فکر کر، موٹے عدنان سچ۔“ ساجد بری طرح چڑ گیا تھا۔

”ہاں خاندان کی بے چاری مظلوم لڑکیاں ہی ایسے نمونوں کے لئے قربانی دیتی ہیں۔“ گونگلو نے شادی کے کارڈ سے ہوا جھپٹتے ہوئے اسے مزید چڑایا۔

”تم میری فکر چھوڑ دو اور یہ سوچو کہ پندرہ دن بعد ہونے والے امتحان میں تمہیں پاس کیسے ہوتا ہے کیونکہ شائستہ نے اس دفعہ پہلے ہی اعلان کر دیا ہے کہ وہ اپنے نوٹس کسی کو نہیں دے گی۔“ ساجد نے بھی اسے طنزیہ نظروں سے دیکھا۔

”بھی امتحانوں کی کس خال کو پروا ہے۔ ابھی پورے پندرہ دن پڑے ہیں کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ ہماری بھی مدد کر دے گا۔ ابھی تو یہ سوچو کہ کن بھجورے نے جو ہمیں شادی پر نہ بلا کر ہماری بے عزتی کی ہے اس کا بدلہ کیسے لیا جائے۔“ گونگلو نے لا پروا انداز سے کہتے ہوئے کتابوں کا تکیہ بنایا اور لان کی گھاس پر لیٹ گیا۔

”ویسے یارا! بھٹی نے ہمارا سر فخر سے بلند کر دیا، اب ہم فائل کے سامنے سرتان کر چلیں گے آخر کو ہم لڑکے والے ہیں اور وہ لڑکی والے۔“ جیدے فلاسفر نے ایک اور نکتہ نکالا۔

”ہاں بے گانی شادی میں عبداللہ دیوانہ! ریتک روشن نے مذاق اڑایا۔“  
 ”ویسے یارا! بھٹی زیادتی کر گیا ہمارے ساتھ ایک تو کلاس کے انکیشن میں ہمیں ہرایا اور

اوپر سے اپنے ولیمہ کا زردہ بھی نہ کھلایا، بہت ہی کمینہ نکلا مظہر بھٹی عرف کن بھجور۔“

”اپنی بکواس بند کر، بھٹی اپنی ایشریہ کے ساتھ ادھر لان میں ہی آ رہا ہے۔“ ساجد نے گونگلو کا منہ بند کر دیا اور وہ چونک کر اٹھ بیٹھا اور حیرت سے بھٹی اور ماثرہ کو دیکھنے لگا جو کہ ہری مرج اور مدرثریہا کو اپنی شادی کے کارڈ بڑے خوشگوار موڈ میں دے رہے تھے ماثرہ کا نام اس کے لیے قد اور دبلے پتلے جسم کی وجہ سے پریولس نے ایشریہ رائے رکھا ہوا تھا۔

اور پھر سارے گروپ کو انفرادی طور پر شادی کے کارڈ دے کر وہ دونوں گئے تو پورا گروپ بھٹی اور ایشریہ رائے کی اعلیٰ ظرفی کے گن گانے لگا۔ جن جن کے بھٹی کی خوبیاں یاد کی گئیں اور اس خوشی میں گونگلو نے سب کو سمو سے کھلائے کیونکہ ولیمہ کے کھانے کا سوچ کر وہ ابھی سے خوش ہو رہا تھا۔

میں ماسٹرز کرنے کے بعد کوئی آپ کو تمنہ نہیں مل جائے گا..... ہم لڑکیوں کی زندگی کا واحد کام ہانڈی چلانا کر کے بچے پالنا ہے..... اور سب سے مشکل کام شادی کرنا ہے جسے ہمارے معاشرے کے لوگوں نے سخت مشکل بنا دیا ہے۔ یہ ایم اے کی ڈگری تو مل جائے گی مجھے اس کے بعد کے سالوں کی فکر ہے جب لڑکوں کی مائیں ہمیں ”اورواج“ کا میڈل پہنا کر رنجیکٹ کر دیا کریں گی..... اور تم بھی خود کو بدلو یہ موٹا چشمہ اتار کر لینز لگواؤ اپنی اسکن کی طرف توجہ دو اور یہ رضائیوں والے پرنٹ پہننا چھوڑ دو۔ آج کل پڑھاؤ فلاسفر ٹائپ لڑکیوں کا کوئی اسکوپ نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تمہاری والدہ کو بھی میری والدہ کی طرح اپنی جوان ہوتی بیٹیوں کو دیکھ دیکھ کر ڈپریشن ہونے لگے۔“

طوبی کے تلخ لہجے پر شائستہ کے چہرے کی رنگت ایک دم پھیکی ہوئی تھی وہ زبردستی مسکرائی اور خواہ مخواہ اپنا چشمہ اتار کر ٹشو سے صاف کرنا شروع کر دیا۔

”فارگا ڈسک! طوبی! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“ شگفتہ نے اپنے سنجیدہ لہجے میں مسکرا کر کہا۔ ”دماغ خراب ہو گیا ہے میرا کیسپس سے گھر جاؤں تو میری ماں کے ڈپریشن میں کہے گئے جملے مجھے ساری رات سونے نہیں دیتے۔ اگر ہم پانچ بہنوں میں سے کسی کی بھی شادی یا منگنی نہیں ہوئی تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے یا! مائیں تو بول بال کے اپنا کھار س کر لیتی ہیں ہم کہاں جائیں ہر روز کوئی نہ کوئی خاتون آ کر رنجیکٹ کر کے چلی جاتی ہے بہت اذیت کا احساس ہوتا ہے۔“

طوبی دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ شائستہ اور شگفتہ نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا وہ لائبریری کے ایک سنان گوشے میں بیٹھی تھیں اس لئے کوئی بھی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

وہ دونوں زبردستی اسے اٹھا کر گرلز کے کاسن روم میں لے آئی تھیں۔ جہاں اچھی طرح رو لینے کے بعد طوبی کے دل کا غبار خاصا ہلکا ہو گیا تھا۔ وہ دونوں اس کا منہ دھلوا کر باہر آئیں تو معلوم ہوا فٹ بال کا میچ کھیل کر دونوں ٹیمیں واپس آ چکی ہیں۔

ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر گونگو کو منہ بنائے آتا دیکھ کر شائستہ اور شگفتہ نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ گونگو کے پیچھے رینک روشن اور سرکاری انا تھے اور سب سے پیچھے فلاسفر فائل ایئر کے کسی لڑکے سے بحث کرتا ہوا آ رہا تھا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سب ہری پیلی نیلی کالی لڑکیوں کی دھڑا دھڑ مٹگنیاں ہوتی جاری ہیں اور ہمیں کوئی پوچھتا ہی نہیں کہ لگتا ہے لوگ اندھے ہو گئے ہیں۔“

طوبی کو آج صبح سے بس ایک ہی غم کھائے جا رہا تھا کہ اگر میمونہ ہاشمی کی انجمن ہو سکتی ہے تو اس کی کیوں نہیں حالانکہ اس کا رنگ اچھا خاصا گورا اور قد بھی ٹھیک ٹھاک لبا تھا۔

”یاد رکھ کر دے اللہ کے کام ہیں۔ جب وقت آئے گا ہو جائے گی۔“ شگفتہ نے اسے تسلی دی۔ اس وقت وہ تینوں اکٹھی لائبریری میں تھیں شائستہ دھڑا دھڑ نوٹس بنا رہی تھی جبکہ لڑکے آج فٹ بال کا میچ کھیلنے عمر ہال کے پاس بنے گراؤنڈ میں گئے ہوئے تھے۔

”پتا نہیں کب وقت آئے گا“ بلکہ مجھے تو لگتا ہے کہ آ کر گزر بھی گیا کتنا شوق تھا کہ میں بھی ڈیپارٹمنٹ میں شرماتے شرماتے مضائی لے کر آؤں۔ مگر مجھے لگتا ہے کہ یہ حسرت حسرت ہی رہے گی۔“ طوبی کا دکھ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔

”اللہ خیر رکھے کیوں اتنی مایوس ہو رہی ہو۔“ شگفتہ نے پر خلوص لہجے میں اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنی پرکشش چہرے والی دوست کو غور سے دیکھا۔

”قسم سے مجھے میمونہ ہاشمی پر صبح بہت غصہ آ رہا تھا۔ بہت اترا اترا کے پوری کلاس کی لڑکیوں کو اپنی منگنی کا قصہ سنارہی تھی حالانکہ اس کا منگیتر تو تصویروں میں اچھا خاصا لگ رہا ہے۔ پتا نہیں اسے اس مغرور لیلیٰ میں کیا نظر آ گیا.....؟“ طوبی کے لہجے میں دکھ سا اترا آیا تھا۔

”بہت بری بات طوبی! ایسے نہیں کہتے۔“ شگفتہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”اور کیا یا! اوپر سے اللہ نے قد کے معاملے میں بھی خود کفیل کر دیا۔ اب بتاؤ کہ لڑکیوں کا بھلا پانچ فٹ چھ انچ قد اچھا لگتا ہے کیا؟“ طوبی پر آج قنوطیت کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ ”فضول باتیں بند کرو اور آرام سے پبلک ریلیشن کے نوٹس بناؤ دماغ ایک دم سیٹ ہو جائے گا۔“

شائستہ نے حیرتی سے قلم چلاتے ہوئے خلاف معمول نرم لہجے میں مشورہ دیا جو طوبی کو ہرگز پسند نہیں آیا تھا تب ہی وہ ترخ کر بولی تھی۔

”محترمہ شائستہ صاحبہ! ان کتابوں اور نوٹوں کی دنیا سے نکل آئیے“ ماس کمیونیکیشن

بیدار کر دیا تھا۔

”آؤ مدد رٹو! ہم لوگ ہری مرج والے پکوڑوں کا آرڈر دے کر آئیں اس موسم میں پکوڑے کھانے کا اپنا ہی سواہ ہے۔“ گونگو نے چٹارہ بھرا جبکہ وہ دونوں سامنے روش پر چلتے طوبی اور نعیم کو دیکھنے میں مصروف رہی تھیں۔ ”کیا دیکھ رہی ہو۔“ شگفتہ نے اس کا کندھا ہلا کر متوجہ کیا۔

”یار! میں سوچ رہی ہوں کہ دونوں لمبے لمبے کتنے اچھے لگ رہے ہیں ناں۔“ شائستہ کے سرگوشی نما انداز پر گونگو نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

”غیبت کرنے والے کا انجام قرآن پاک اور حدیث میں پڑھ لینا۔“

”تمہیں کیا تکلیف ہے میں تمہاری بات تھوڑی کر رہی ہوں۔“ شائستہ نے چڑ کر جواب دیا۔

”دیکھ تو میری طرف ہی رہی تھیں۔“ گونگو نے بھی غصے سے جواب دیا۔

”عبدالرزاق! شائستہ تمہارے متعلق بات نہیں کر رہی تھی ہماری اپنی بات تھی۔“ شگفتہ کے سلبجے ہوئے انداز پر عبدالرزاق کو کچھ اطمینان ہوا تھا ورنہ وہ یہی سمجھا تھا کہ شائستہ نے اسی کے متعلق سرگوشی میں بات کی ہے۔

وہ لوگ پکوڑوں کا آرڈر دے کر آئے تو اچھی خاصی بارش شروع ہو چکی تھی۔ سادوں کے ہریالے چھینٹنے نے موسم خاصا دل ربا بنا دیا تھا۔..... بزرے کی مہک اور تراوٹ فضاؤں کی تازگی اور دلکشی کو محسوس کرنے کے لئے کئی مچلے کلاسز چھوڑ کر لان میں نکل آئے تھے۔ تراشیدہ گھاس پر موسم کے تغیرات سے بے نیاز اور بے پروا لڑکوں نے ایک طوفان مچا رکھا تھا۔

بارش خوب زور زور سے برس رہی تھی۔ آسمان سے ایک عظیم الشان صاف و شفاف پانیوں والی آبشار پوری قوت سے برس رہی تھی۔

”افوہ آج گھر کیسے پہنچیں گے۔“ طوبی نے خوف زدہ نظروں سے دھواں دھار گر جتے بادلوں کو دیکھا جہاں ہوائیں فراٹے بھر رہی تھیں۔

”کوئی بات نہیں آج میں اپنے ابا جی کی پھلچر گاڑی پر چھوڑ آؤں گا۔“

”ہیک روشن یعنی نعیم کی مہربانیاں آج عروج پر تھیں۔“ شگفتہ نے اپنی مسکراہٹ کو

”خدا کے واسطے عبدالرزاق! آج یہ مت کہنا کہ ہم لوگ پھر ہار گئے۔“ شگفتہ نے خوشگوار لہجے میں اسے دیکھتے ہی چھیڑا۔

”جی نہیں آج فائل ایئر ہماری وجہ سے جیت گئی۔“ گونگو نے ڈھٹائی سے اطلاع دی۔

”ویسے اب تو ڈوب کے مرجانے کا مقام ہے۔“ ہری مرج نے طنز کیا۔

”بسم اللہ کرو تمہارے لئے تو چلو بھر ہی کافی ہوگا۔“ گونگو نے جوابا وار کیا۔

”اوئے یہ اس کو کیا ہوا.....؟“ ریتک روشن نے حیرانی سے پوچھا۔

”تم لوگوں کی ہار کی اطلاع اس سے برداشت نہیں ہوئی جب سے اطلاع ملی ہے تب سے محترمہ رو رہی ہیں۔“ ہری مرج کے شرارتی لہجے کو ریتک روشن نہیں سمجھ سکا تھا۔

”پاگل ہو گئی ہو کیا؟ کھیل میں ہار جیت تو ہوتی رہتی ہے اس میں رونے سے کیا حاصل؟ قسم سے طوبی تم واقعی بہت اسٹوپڈ لڑکی ہو دیکھ لینا اگلی دفعہ ہم پوری محنت سے کھیلیں گے۔“

”اور پھر ہاریں گے۔“ گونگو نے بے ساختہ بات کاٹی تو طوبی اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اس کی سرخ روئی روئی آنکھوں میں نمودار ہونے والی چمک نے اس کے چہرے کی دلکشی کو ایک دم بڑھا دیا تھا۔

ریتک روشن نے بڑی خوشگوار حیرت سے اپنے سامنے میرون کمر کے سوٹ میں کھڑی طوبی کو دیکھا جو اس سے اسے بہت اپنی اپنی سی لگی تھی۔

”آؤ طوبی! تمہیں اپنی ہار کی خوشی میں آؤں کریم کھلا کر لاؤں۔“ ریتک روشن کے الفاظ اور لہجہ دونوں ہی معنی خیز تھے۔ ہری مرج نے آنکھیں پھاڑ کر سامنے کھڑے نعیم کو دیکھا جس کے چہرے پر بہت انوکھے اور خوب صورت رنگ تھے۔

”ہاں ہاں طوبی! جاؤ جاؤ اور ہمارے لئے پیک کروا کے لے آنا۔“ شگفتہ نے بھی شاید نعیم کی آنکھوں میں پھیلنے والی خوشگوار حیرت کو پڑھ لیا تھا۔

موسم ایک دم بدل گیا تھا۔..... بادل تو صبح سے چھائے ہوئے تھے اور اب مہین مہین سی پھوار برسنے لگی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی شفاف بوندوں نے ایک سکون آور کیف آگئیں سا احساس

”تم تو اچھی خاصی معقول لڑکی ہو جبکہ ڈیپارٹمنٹ میں پتا نہیں کیوں بی اماں بن کے آ جاتی ہو۔“ گونگو کے لئے اپنی زبان پر قابو رکھنا خاصا مشکل کام تھا۔

”میں وہاں پڑھنے آتی ہوں، ماڈلنگ کرنے نہیں..... اور نوپس میں تم بھی کچھ کم موٹے لگ رہے ہو ورنہ ڈیپارٹمنٹ میں توفٹ بال بن کر آ جاتے ہو۔“ شائستہ نے بھی حساب برابر کیا۔

”یعنی کہ دوسرے لفظوں میں آج میں بھی اچھا لگ رہا ہوں۔“ اس نے قہقہہ لگایا تو وہ جھینپ کر رہ گئی۔

”یہ ساجد کینہ آج پھر اپنی سبز عینک لگا کر آ گیا ہے۔“ اس کی نظر سرکاری انے پر پڑی جو آج اچھا خاصا جھج کے آیا تھا اور اس وقت فائل ایئر کی رضوانہ کو پکڑے نہ جانے کون سے قصے سنا رہا تھا۔

”پٹھان بچہ ہے، کسی سے ڈرتا تھوڑی ہے۔“ گونگو نے مذاق اڑایا۔

”خیر ہے آج تم کھانے کے ٹائم پر کھانا کیوں نہیں کھا رہے؟“ شائستہ کو حیرت ہوئی۔

”ساری بھوک ہی اڑ گئی آج تو جنتاب!“

گونگو کی ذومعنی نظروں اور لہجے نے شائستہ کو بوکھلا دیا تھا، تب ہی وہ شگفتہ اور طوبی کو دیکھتے ہی تیر کی طرح ان تک پہنچی اور پھر سارے فنکشن میں وہ گونگو کے بدلے ہوئے انداز دیکھ کر اسے دل ہی دل میں کوئی رہی..... جو آج حقیقت میں کھانا، کھانا بھول گیا تھا۔



پریولیس کے سالانہ ایگزام نے سب طلباء کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا اور ہر کوئی اپنے ٹیکچرز اور نوٹسوں کے پیچھے بھاگا پھر رہا تھا۔ ایک عجیب طرح کی افراتفری کی کیفیت پورے کیمپس پر چھائی ہوئی تھی، ہر کوئی مصروف اور مگن تھا..... لائبریری میں اسٹوڈنٹس کی تعداد میں ایک دم اضافہ ہو گیا تھا۔

ایگزام سے پانچ دن پہلے عبدالرزاق عرف گونگو کے والد صاحب کے اچانک انتقال کی خبر سب پر بجلی بن کر گری تھی۔

وہ سب لوگ کیمپس سے مختلف گاڑیوں میں عبدالرزاق کے گھر پہنچے تو وہاں پہنچ کر سب کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ دو کنال کے خوب صورت بنگلے کے اندر کھڑی گاڑیوں کی طویل لائنیں

چھپانے کے لئے فوراً پکڑا اٹھا کر منہ میں ڈالا جبکہ گونگو بارش کو بھلائے مکمل طور پر پکڑوں کی پلیٹ کو صاف کرنے میں مصروف تھا۔

اگلے دن رات کو ہالی ڈے ان میں مظہر بھٹی اور مائرہ صدیق کا ولیمہ تھا اور صبح کیمپس میں حاضری نہ ہونے کے برابر تھی..... جس کی وجہ سے سز کاظمی نے رات کو فنکشن میں آنے والے اسٹوڈنٹس کی وہیں باجماعت کلاس لی تھی..... اور ہر کوئی منہ چھپاتا پھر رہا تھا۔

”اوہ مائی گاڈ! یہ ہری مرچ ہے؟“ جیدے فلاسفر کے منہ سے نکلنے والے حیرت آمیز فقرے نے سب کو چونکا دیا۔

”امیزنگ!“ طوبی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”واؤ زبردست!“ نعیم نے بھی کھلے دل سے سراہا۔

بروسٹ کے ساتھ بھرپور انصاف کرتا عبدالرزاق حقیقتاً نوالہ منہ میں ڈالنا بھول گیا تھا.....

ریڈ کلر کی چڑی کے سوٹ میں اپنے گھنے سیاہ بال جو کہ کیمپس میں ہمیشہ تیل سے بیکے رہتے تھے اس وقت شیمو کر کے کھلے چھوڑے ہوئے تھے۔ سوٹ کے ساتھ ہم رنگ جیولری پہنے لائٹ سے میک اپ اور بلیو لینز میں ہری مرچ کسی طور نہیں پہچانی جا رہی تھی۔

وہ شگفتہ کے ساتھ خاصی لیٹ شادی کے فنکشن میں پہنچی تھی اور اب حیران نظروں سے ادھر ادھر اپنے گروپ کی تلاش میں دیکھ رہی تھی۔

”دش گریت یار! آج تو تم ہری کے بجائے سرخ مرچ لگ رہی ہو۔“ گونگو کے توصیفی لہجے پر ایک لمحے کو وہ ہلش کر گئی، گونگو نے بہت دلچسپی سے یہ منظر دیکھا۔

”قسم سے شائستہ! آج تو تم کسی طور بھی پہچانی نہیں جا رہی ہو، بہت کیوٹ لگ رہی ہو۔“ طوبی نے اسے گلے لگاتے ہوئے خلوص دل سے کہا.....

”تھینک یو! تم بھی بہت نائس لگ رہی ہو۔“ اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

”لیکن آج کا دن حقیقتاً تمہارا دن ہے۔“ طوبی نے سچے دل سے حقیقت بیان کی۔

”ریئلی؟“ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

”حیرت ہے ہری مرچ کو ہنسنا بھی آتا ہے۔ آج تو انکشافات کا دن ہے۔“ گونگو نے جیدے فلاسفر کے کان میں سرگوشی کی..... تو وہ صرف مسکرا کر رہ گیا۔

”جینک یو‘ تم اسی اسٹائل میں اچھی لگتی ہو مجھے تو وہم ہونے لگا تھا کہ میں شاید کسی اور لڑکی سے بات کر رہا ہوں۔“ عبدالرزاق نے اسے چڑایا اور وہ حسب عادت چڑ بھی گئی۔

”بھئی یہ ناک کٹ ہی جائے تو اچھی ہے جو ہر وقت بہتی رہتی ہے۔“ عبدالرزاق کے شرارتی لہجے پر اس نے جھنجھلا کر پاؤں زمین پر پٹختے اور پوائنٹ کی طرف بڑھ گئی جبکہ وہ اسے روکتا ہی رہ گیا۔



”اگر ہر تین مہینے کے بعد ایگزام ہو جائیں تو تم تو اچھے خاصے اسماٹ ہو جاؤ گے۔“  
 نعیم نے تنقیدی نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے برگر اور پتھپی کا آرڈر دیا۔

”ہاں اب تم گونگو نہیں کر پلے لگتے ہو۔“ جاوید فلاسفر نے چھیڑا۔

”آئینہ ٹوٹ جائے گا، بس کرو بے جان چیزوں پر اتنا ظلم نہیں کرتے۔“ شائستہ نے طنز کیا۔

”کیوں مجھے کیا ہوا ہے؟ اچھی خاصی تو ہوں میں۔“ وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر لڑکا انداز میں

گفتہ شائستہ طوبی، جاوید اور نعیم حیران نظروں سے اس کے وسیع و عریض بنگلے کو دیکھ کر اور وہاں موجود لوگوں سے ان کی فیکٹریوں کی تفصیل سن کر سخت حیران تھے۔ سب کا ہی خیال تھا کہ اپنے آپ میں مست، لاپرواہ، سا عبدالرزاق ان جیسی ٹڈل کلاس سے تعلق رکھتا ہوگا..... لیکن اس کے انداز اور طرز گفتگو سے انہیں کبھی اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ شہر کی جانی بیچانی فیمل سے تعلق رکھتا ہے۔

وہ سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو جانے کے لئے پوائنٹ کی طرف نکلے تو ایک دم شائستہ نے عبدالرزاق کو روک کر ایک لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔

”تھینک یو سوچ!“ وہ زبردستی مسکرایا۔

”فارواٹ؟“ شائستہ نے ناک چڑھائی۔

”کنا اگلے سال بھی دوگی.....؟“ وہ شرارتی لہجے میں بولا۔

”سہیل گجر پر تو مجھے شک ہے کہ وہ کتاب میں اپنی پینڈو منگیت کی تصویر رکھ کر دیکھتا رہتا تھا جبکہ میڈم بھی کوئی خاص اسٹوڈنٹ نہیں، ہر وقت اونٹ کی طرح گردن اٹھا کر دائیں بائیں دیکھتی رہتی ہے۔ یونیورسٹی میں ہونے والے ہر سامنے پر سب سے پہلے پہنچنا گویا اس کا اخلاقی اور قانونی حق ہے مجھے تو لگتا ہے کہ اس کے پیروں میں پیسے لگے ہوئے ہیں۔“ نعیم نے بیڑی سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”نہیں یارا! لڑکی وہ ذہین ہے ایک دفعہ M.B.A ایگزیکٹو ہال کے سیمینار میں اسے بولتے سنا تھا، خاصا تاج تھا اس کے پاس۔“ جیدے نے توصیفی لہجے میں کہا۔  
 ”ادھر ادھر سے چوری کر کے اکٹھا کر لیا ہوگا۔“ نعیم کو یقین نہیں آیا تھا۔  
 ”بھئی چھوڑا دے، یہ بتاؤ کہ زلٹ کب تک آ رہا ہے۔ میرا ”رپورٹنگ“ کا پیچرا اچھا نہیں ہوا مجھے اس کی سخت ٹینشن ہے۔“ شگفتہ نے بات ختم کرنے کے لئے توجہ دوسری جانب مبذول کروادی۔

”سنا تو یہی ہے کہ اگلے ہفتے آ رہا ہے۔“ جیدے کی اطلاع پر شگفتہ کے چہرے کا رنگ اڑا تھا۔

”میری تو یقیناً کوئی نہ کوئی سبلی ضرور ہوگی۔“ عبدالرزاق کو بھی اپنی فکر پڑ گئی۔  
 ”اللہ بہتر کرے گا نالاقتوا“ شائستہ نے سب کو تسلی دی۔ خود اس کا دل بھی اندر سے ڈر رہا تھا۔



اگلے ہفتے دو حیران کن خبریں پورے ڈیپارٹمنٹ میں گردش کر رہی تھیں، پوری کلاس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔  
 گونگو نے ڈاکس بجا بجا کر خوشی کا اظہار کیا تھا، سب کے چہروں پر بڑی خوشگوار حیرت تھی۔

پہلی خبر طوبی اور نعیم چوہدری یعنی رینک روشن کی منگنی۔

اور دوسرا دھماکہ شائستہ عرف ہری مرچ کا پورے ڈیپارٹمنٹ میں ٹاپ کرنا تھا۔ دوسری پوزیشن سرکاری انے یعنی ساجد درانی نے اور تیسری جیدا فلاسفر لے گیا تھا، ہر کوئی محو حیرت تھا، مخالف گروپ نے انگلیاں دانتوں میں داب لی تھیں۔ سارے پروفیسرز رک رک کر پورے

گویا ہوئی۔  
 ”تو کیوں مجھ میں کیڑے پڑے ہوئے ہیں کیا؟“ عبدالرزاق نے بھی کھا جانے والے لہجے میں کہا۔

”لو شروع ہو گئے پھر اگر ان کی شادی ہو جائے تو سارا دن گھر میں برتن ہی ٹوٹا کریں۔“ طوبی نے بیزار لہجے میں کہا اور سامنے پڑی ٹرے سے برگر اٹھا کر کھانا شروع کر دیا۔

”میرا دماغ خراب ہے جو میں اس گونگو سے شادی کروں۔“ شائستہ پانخ سے بولی۔  
 ”ہاں تو میری آنکھیں خراب ہیں جو اس ہری مرچ سے شادی کروں۔“ عبدالرزاق نے تریخ کر جواب دیا۔

”اور جاؤ جاؤ خوش قسمت ہوگا جو میرا لائف پارٹنر بنے گا۔“  
 ”کیوں شادی کے بعد تم کیا گونگی بن جاؤ گی؟“ عبدالرزاق نے ناک سے کھی اڑائی۔

”نہیں تم بہرے ہو جاؤ گے.....“ اس نے غصے میں برگر اٹھا کر کھانا شروع کر دیا۔  
 ”یعنی کہ تم مجھ سے شادی کے لئے راضی ہو۔“ عبدالرزاق نے دلچسپ نظروں سے اسے دیکھا۔

”دفع ہو جاؤ مجھے کوئی شوق نہیں۔“  
 ”لیکن مجھے تو ہے۔“ وہ آہستہ سے بڑبڑایا اور اس کی بڑبڑاہٹ سوائے شائستہ کے سب ہی نے سنی تھی اور اپنی اپنی مسکراہٹیں چھپانے کے لئے گردنیں نیچی کر لیں۔  
 ”مجھے لگتا ہے کہ اس دفعہ پوزیشن بھی مخالف گروپ لے جائے گا۔“ جیدے فلاسفر نے نیا شوشہ چھوڑا۔

”تمہارے منہ میں خاک، کبھی اچھی بات بھی کر لیا کرو۔“ ساجد کو اس پیش گوئی پر غصہ ہی تو آ گیا تھا۔

”یار! سہیل کی بات ہے ہمارے گروپ میں سات لوگ جبکہ ان لوگوں کا گروپ تیرہ لوگوں پر مشتمل ہے اور ان میں سہیل گجر تو ہر وقت کتابوں میں سر دیے رکھتا تھا اور میڈم نے سارا سال سب سے زیادہ کتابیں ایٹھ کرواتی ہیں۔“ جیدے نے ماہرانہ تجزیہ پیش کیا۔

گروپ کو مبارکباد دے رہے تھے۔

گوگلگو نے خلاف توقع پاس ہو جانے کی خوشی میں پورے ڈیپارٹمنٹ کو فوراً ٹریٹ دے دی تھی۔ اس وقت پوری کلاس میں ہنگامہ برپا تھا۔

”یقین کر دو آج کلیجے میں ٹھنڈ پڑ گئی، ایکشن میں ہارنے کا دکھ آج ختم ہوا ہے۔“ ساجد نے سرشار لہجے میں اپنے گروپ کو مخاطب کیا۔

”یار اس مرتبہ مخالف گروپ کی شکلوں کو دیکھ کر تو مجھے سواد ہی آ گیا۔“ گوگلگو نے کینے لہجے میں ہنستے ہوئے کہا۔

”دشمن مرے تے خوشی نہ کریئے، بچا دی مر جانا۔“ ہری مرچ نے جھٹنے کی اوٹ سے گوگلگو کو دیکھتے ہوئے انتہائی متانت سے کہا اور ویسے بھی بقول گوگلگو کے ہری مرچ پوزیشن کے بعد خواہ مخواہ سو رہنے کے چکر میں کم سے کم بول رہی ہے۔

”ویسے شائستہ! تم سچے ایک بات پوچھو؟“ گوگلگو نے انتہائی شوق سے کہا۔

”ہاں کہو۔“ اس نے ناک چڑھائی۔

”کیا جب تم بازار جاتی ہو تو کپڑوں کی دکان پر جا کر ان سے یہی کہتی ہو کہ جتنے ہرے رنگ کے سوٹ ہیں وہ لے آؤ۔“ گوگلگو نے شرارت سے نچلاب دبا یا تو شائستہ نے قدرے برا ماننے ہوئے اسے گھورا جبکہ طوٹی ہنستے ہوئے کہنے لگی۔

”اصل میں گرین کلر شائستہ کا فیورٹ کلر ہے، اوپر سے اس کے ابا جی کی بھی کینٹ میں کپڑوں کی شاپ ہے، اس لئے اس کی تو موچیں ہی موچیں ہیں۔“

”ریٹلی؟“ گوگلگو کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

”ویسے یار! دفع کرو ان کپڑوں والی خالص زنانہ گفتگو کو! میں تو ابھی تک حیران ہوں کہ پہلی تینوں پوزیشنز ہمارے گروپ کی کیسے آ گئیں؟ ہم نے تو سارا سال کبھی میچ میں تو کبھی ایکشن میں ہارنے کا سوگ مناتے ہوئے گزارا تھا۔ یقین کرو ان پوزیشنز کی وجہ سے ہماری تو بلے بلے ہو گئی۔ ہر جگہ بڑا دی آئی پی پروٹوکول مل رہا ہے آج کل، قسم سے شائستہ اور ساجد تم نے ہمارا سرخسر سے بلند کر دیا۔“

زیادہ روشن خاصا جذباتی ہوا تھا، اس وقت ان کا گروپ کئین پر سمو سے اور پکڑے اڑانے میں مصروف تھا۔

”ویسے آپس کی بات ہے شائستہ! کیا تمہیں اپنے ٹاپ کرنے کی امید تھی؟“ گوگلگو نے ایک دفعہ پھر شرارت سے پوچھا۔

”بالکل، مجھے پوری امید تھی۔“ ہری مرچ نے انکشاف کر کے سب کو ہکا بکا کر دیا تھا۔

”وہ کیسے؟“

”مجھے پتا تھا کہ ان سب نکلوں میں، میں پھر بھی کچھ نہ کچھ تو بہتر ہوں اور ویسے بھی ساری کلاس نے ایک دوسرے کے نوٹس نوٹو اسٹیٹ کروائے ہوئے تھے جبکہ میری اپنی خالص محنت تھی اور پھر میرے پیچہ زبھی خاصے شاندار ہوئے تھے۔ مجھے اپنی محنت اور اللہ کی رحمت پر مکمل یقین تھا.....“ شائستہ ان سب کے پر جوش چہروں کو دیکھ کر بڑی متانت کے ساتھ گویا ہوئی تھی..... اس کے لہجے میں حد درجہ اعتماد تھا۔

”ہاں یہ تو ہے، اللہ تعالیٰ کسی کی محنت کو ریا گان نہیں کرتے۔“ شگفتہ نے بھی تائید کی۔

”بھئی یہ باتیں تو ساری زندگی ہوتی رہیں گی، پہلے یہ بتاؤ کہ شائستہ ساجد اور جیدا ہم لوگوں کو خصوصی ٹریٹ کہاں دے رہے ہیں؟“ گوگلگو نے سب کی توجہ ایک اہم ایٹو کی طرف مبذول کروائی۔

”یہیں کیسپس میں اور کہاں؟“ جیدا جو کافی دیر سے خاموش تھا پہلی دفعہ بولا تھا۔

”ہرگز نہیں، ہم لوگ کیسپس کی کینٹین کی فضول چیزیں کھا کھا کر بے زار ہو چکے ہیں، اس لئے ہماری طرف سے جواب ہے۔ ہم لوگ ہالی ڈے ان اور شیرٹن سے کم پر بالکل کچھ دما تر نہیں کریں گے۔“ گوگلگو نے صاف جواب دے دیا تھا۔

”جناب ہمارے ابا جی کی تمہارے ابا جی کی طرح فیکٹریاں نہیں چل رہیں، اس لئے ہماری اوقات کے مطابق بات کر دیجئے۔“ جیدا نے مصنوعی غصے سے کہا۔

”میں تمہاری اوقات سے بہت اچھی طرح واقف ہوں، جیدا فلاسفر! زیادہ ٹرٹر کرنے کی ضرورت نہیں، تم تین لوگ مل کر آسانی سے دے سکتے ہو، کوئی کمی بیشی ہوئی تو ہم چندہ اکٹھا کر لیں گے۔“ گوگلگو نے مسئلے کا حل چٹکی بجاتے ہوئے نکال لیا تھا۔

جیدا فلاسفر نے گود میں رکھی خلیل جبران کی کتاب اٹھا کر زور سے میز پر پٹختی اور بولا۔

”مفحوس تو اس چندے سے اپنا ولیمہ کروا لینا، ابھی ہمارے حالات اتنے بھی ماڑے

سہی یونیورسٹی میں آؤ گے تو میں اسی ڈیپارٹمنٹ میں لیکچر دے رہا ہوں گا۔“ چیدے فلاسفر نے اپنے ارادوں پر روشنی ڈالی۔

”اور میں تمہارے اسٹوڈنٹس کو تمہارے کروتوت بتاؤں گا۔“ ریتک روشن نے شرارتی لہجے میں دھمکی دی۔

”اور میں تمہاری لمبی لمبی ٹانگیں انہی اسٹوڈنٹس سے تڑواؤں گا۔“ چیدے فلاسفر نے بھی ہنستے ہوئے حساب برابر کیا۔

”اور ہری مرچ تمہارے کیا ارادے ہیں؟“ گونگلو نے چکن رائس کی پہاڑی اپنی پلیٹ میں بناتے ہوئے سبز رنگ کے سوٹ میں چپ چپ سی شائستہ کو چھیڑا۔

”ہا نہیں۔“ اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔

”اچھا.....!“ اس نے حیرت سے سنجیدہ سی شائستہ کو دیکھا۔ ”ویسے تم لوگوں نے غور نہیں کیا یہ اپنی شائستہ نے جب سے پارٹ ون میں ٹاپ کیا ہے تب سے یہ کچھ سنجیدہ اور سوہری ہو گئی ہے اور اس نے اپنی زبان کا استعمال بھی خاصا کم کم کر دیا ہے۔“

”تمہیں آخر تکلیف کیا ہے؟“ شائستہ نے چچہ اٹھا کر پلیٹ میں چٹا اور خوشخوار آنکھوں سے عبدالرزاق یعنی گونگلو کو دیکھا۔

”تم آخر پہلے کی طرح بولتی کیوں نہیں ہو.....؟“ وہ جھنجھلا کر بولا۔

”آخر تمہیں مسئلہ کیا ہے؟ میں بولوں یا نہ بولوں؟“ وہ زچ ہوئی۔

ہونہ ہو یہ سب محبت کی علامات ہیں پہلے تو مجھے صرف شک تھا اور اب یقین ہو گیا ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی واردات ہو گئی ہے۔“

گونگلو کے سنجیدہ لہجے پر سب نے غور سے شائستہ کی طرف دیکھا جو اتنی ساری نظروں سے خائف ہو کر اب رشین سلاد اپنی پلیٹ میں ڈالنے لگی تھی۔

”عبدالرزاق! کیوں تم اس بے چاری کو تنگ کر رہے ہو۔“ شگفتہ نے اس کی سائیڈ لی۔

”یہ بے چاری نہیں پوری گمنی ہے۔“ وہ نہ جانے کیوں جھنجھلا رہا تھا۔ شگفتہ نے اس

کے کوفت زدہ چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ اس کی بے چینی کو سمجھنے سے قاصر تھی۔

فہیم نے بھی معنی خیز نظروں سے طوبی کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی بات کی.....

نہیں ہوئے کہ دو چار لوگوں کو شخصوانہ سکیں اور یہ جو دونوں معنی کروا کے اب معصوم بن کر بیٹھے ہوئے ہیں یہ کسی کو نظر نہیں آ رہے۔ جنہوں نے تم سب کی ناک کے نیچے عیش لڑایا اور کانوں کان خبر بھی نہ ہونے دی ان سے تو پہلے ٹریٹ لو۔“ چیدے فلاسفر کی توپوں کا رخ طوبی اور فہیم کی طرف تھا۔ وہ دونوں ہڑبڑا کر سنبھل کے بیٹھ گئے۔

”ہائیں ہائیں یہ ہم لوگ تمہیں کہاں سے یاد آ گئے۔“ فہیم نے مصنوعی غصے سے پوچھا۔ جبکہ طوبی کے چہرے پر سرخی پھیل گئی تھی۔ وہ خفت زدہ انداز سے اپنے بیگ کی زپ سے کھینچنے لگی۔

”ابھی تو سارے کھاتے کھلیں گے جناب! ہم ذرا فارغ ہو جائیں۔“ چیدے فلاسفر نے دھمکی دی۔

”فلاسفر! جانے دے یار! یہ غریب لوگ جہاں کہتے ہیں ہم ٹریٹ دے دیتے ہیں بلکہ ہم نہیں بل صرف میں دوں گا۔“ ساجد درانی عرف سرکاری اسنے کے شاہانہ اسٹائل پر چیدے فلاسفر کے چہرے پر اطمینان کے رنگ بڑی تیزی سے پھیلے تھے۔

”میں تو پہلے دن سے کہتا ہوں کہ پٹھان بڑے غیرت مند ہوتے ہیں۔“ گونگلو نے کھلے دل سے سراہا تو سب اس کھن پر بے ساختہ ہنس پڑے۔

اس دن وہ کافی دن کے بعد ہالی ڈے ان میں اکٹھے ہوئے تھے جہاں ٹیبل پہلے سے ریز روشدہ تھی۔ فائل ایئر کی کلاسز کے دوران ہی طوبی اور فہیم کی شادی کا شوشہ بلند ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی ساجد کی اپنی چچا زاد کے ساتھ معنی ہو گئی تھی..... وہ ذریعہ اسماعیل خان کا رہنے والا تھا اور اپنے ایم اے کے سلسلے میں ہوٹل میں مقیم تھا..... جبکہ چیدہ فلاسفر ادا کاڑھ سے تعلق رکھتا تھا۔

”یار! دن کیسے تیزی سے گزرتے جا رہے ہیں ابھی کل کی بات لگتی ہے جب ہم لوگوں نے پریولس میں داخلہ لیا تھا اور اب چند روز میں فائل ایئر بھی مکمل ہو جائے گا۔“ فہیم بہت سنجیدہ اور اداس لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”ہاں وقت بہت غالم ہے کسی کا انتظار نہیں کرتا یہ گزرے ہوئے دن بہت یاد آئیں گے۔“ گونگلو کے چہرے پر بھی اداسی کے رنگ نمایاں تھے۔

”میں تو ہائیر اسٹڈیز کے لئے انگلینڈ چلا جاؤں گا اور آج سے کچھ سال بعد جب تم لوگ



”اور تم سادہ تمہارے مستقبل کے کیا ارادے ہیں؟“ نعیم کے ذمہ لہجے پر عبدالرزاق بری طرح چونکا اور ٹٹو سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”بڑے بھیا واپس امریکہ جانے کے لئے پرتول رہے ہیں ان کی امریکن بیوی نے وہاں شور مچا رکھا ہے جبکہ اماں آج کل میری شادی کے لئے حد درجہ سنجیدہ ہیں زور و شور سے لڑکی کی تلاش جاری ہے۔“

”اوہ!“ نعیم اور طوبی نے فکر مندی سے شائستہ کی طرف دیکھا جس کے حلق میں نوالہ پھنس گیا تھا اور وہ بری طرح کھانسی رہی تھی۔

”دھیان سے یار!“ شگفتہ نے فوراً اس کی کمر کو سہلاتے ہوئے پانی کا گلاس بڑھایا جسے گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے وہ خاصی سنبھل گئی تھی۔

عبدالرزاق نے بہت فکر مندی اور محویت سے اسے دیکھا جس کی ناک سرخ ہو رہی تھی..... اور اب وہ خفت زدہ انداز سے پلیٹ کے اندر صرف چچہ ہلا رہی تھی۔

”بھئی لڑکی تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے بس دائیں بائیں سے کوئی بھی دیکھ لو۔“ جاوید فلاسفر کے حد درجہ سنجیدہ انداز پر سب چونک گئے۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ عبدالرزاق نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”بھئی مطلب و مطلب کا تو مجھے پتا نہیں بے شمار اچھی لڑکیاں ہیں تم خود کسی ایک آدھ کا نام لے کر اپنی اماں کا مسئلہ حل کر دو اور ان باقی لڑکیوں کی خلاصی کرواؤ جو بے چاری روزانہ رجسٹرکٹ ہونے کا عذاب سہہ رہی ہوں گی۔“ نعیم نے سنجیدگی سے کہا تو وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

”اور سب کان کھول کر سن لیں خبردار ہمارا ولیمہ اینڈ کئے بغیر کسی نے یہ شہر چھوڑا چاہے آندھی آئے یا طوفان، نعیم چوہدری کا ولیمہ کوئی بھی نہیں چھوڑے گا دوسرے شہر کے لوگوں کو دس دس سوہن حلوے کے ڈبے فری طور گفت ہوں گے۔“

”میرا خیال ہے کہ تمہارا اپنے ولیمہ پر اپنے ابا سے جوتے کھانے کا ارادہ ہے۔“ عبدالرزاق نے ہنستے ہوئے اس کے ابا جان کی کنجوسی کی طرف توجہ مبذول کروائی تو سب ہنس پڑے۔

کھانے کے بعد نعیم نے اپنی گاڑی میں طوبی، جاوید اور ساجد کو بٹھایا جبکہ عبدالرزاق کی گاڑی میں شگفتہ اور شائستہ تھیں۔

”رزاق بھائی پہلے شگفتہ کو ڈراپ کر دیجئے گا۔“ طوبی نے جاتے جاتے اسے چھیڑا تو وہ چونک اٹھا جبکہ شائستہ نے حیرانی سے دوسری گاڑی میں خوش و خرم بیٹھی طوبی کو دیکھا جو مسلسل مسکرا رہی تھی۔

”اس کو کیا ہوا؟ کون سا زعفران کا کھیت دیکھ لیا اس نے؟“ شائستہ نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر رزاق اور شگفتہ کی طرف متوجہ ہوئی جو نہ جانے کس بحث میں الجھے ہوئے تھے۔

شگفتہ کا گھر آنے تک وہ دونوں کی بے معنی سی بحث کو خاموشی سے سنتی رہی حتیٰ کہ عبدالرزاق نے اسے بھی شامل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ دانستہ خاموش رہی۔ اسے نہ جانے کیوں آج کل کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا وہ خود بھی اپنی طبیعت کے اس رخ کو سمجھنے سے قاصر تھی اور بعض دفعہ تو وہ خود حد درجہ جھنجھلا جاتی.....

”بھئی کن سوچوں میں گم ہو اگلی سیٹ پر آ جاؤ میں تمہارا ڈرائیور تھوڑی ہوں۔“ عبدالرزاق نے گاڑی ایک دم روک دی تھی۔ گاڑی رکی تو اس نے چونک کر دیکھا شگفتہ نہ جانے کب اتر گئی تھی اور وہ اپنے خیالوں میں اس قدر گم تھی کہ اسے اس کے اترنے کی بھی خبر نہیں ہوئی۔

”ارے شگفتہ کہاں گئی؟“ اگلی سائیڈ کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے بوکھلاہٹ سے پوچھا۔

”ماشاء اللہ!“ عبدالرزاق نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”بھئی شائستہ بول! آج تو فیصلہ ہو کر رہے گا کہ آخر تمہارے حواسوں کو ہوا کیا ہے؟“ شگفتہ بی بی آپ کے سامنے اپنے گھر کے گیٹ پر اتریں بلکہ تمہیں بھی خدا حافظ کہا..... اور تم پوچھ رہی ہو کہ آخر وہ گئی کہاں؟ تم یہ بتاؤ کہ تمہاری عقل کہاں گئی ہے؟“ وہ آج اس کی طبیعت درست کرنے کے موڈ میں تھا۔

”سوری مجھے پتا نہیں چلا۔“ اس کے خفت زدہ لہجے پر عبدالرزاق نے بے ہوش ہونے کی ایکٹنگ کی۔

”سوری! اور وہ بھی تمہارے منہ سے اوہ مائی گاڈ! تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“ عبدالرزاق کو سخت تعجب ہوا تھا۔

”تمہارے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے؟ کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو؟ میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟“ وہ ایک دم جذباتی ہو کر پھٹ پڑی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ دونوں ہاتھ چہرے پر رکھے دھواں دھار رو رہی تھی۔ عبدالرزاق کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

”او! بے وقوف لڑکی یہ کیا فضول حرکت ہے؟“ عبدالرزاق نے اسے کندھے سے پکڑ کر رخ اپنی طرف موڑا۔

”بلبلی شائستہ میں تو مذاق کر رہا تھا۔“ وہ فوراً وضاحتیں دینے لگا۔ ”یقیناً کروتم مجھے ہمیشہ لڑتی جھگڑتی اور دبدو جواب دیتی ہوئی اچھی لگتی ہو۔ یہ چپ چپ اور خاموش سی شائستہ کو تو ہری مرج کہنے کو بھی دل نہیں کرتا۔“ اس کی بے چارگی میں دی گئی وضاحت کو سن کر شائستہ کے چہرے پر ایک دم مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ رونما ختم کر چکی تھی..... اور خفگی آمیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

”تم بھی تو اتنے امارت ہو گئے ہو کہ کونگلو کہنے کو بھی دل نہیں کرتا۔“

وہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا اور پھر شرارت آمیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”میری شادی کی خبر سن کر تمہارے گلے میں پھندا کیوں لگا تھا؟“

”کیا.....؟“ وہ بلند آواز میں چیخی۔ ”منہ دھو کے رکھو اپنا“ وہ تو میں نے چاول زیادہ منہ میں ڈال لئے تھے ورنہ مجھے کیا مسئلہ ہے؟“

”اچھا؟ تمہیں کوئی مسئلہ نہیں تھا تو پھر تم نے اپنے خفیہ نوٹس مجھے کیوں دیئے؟“

”وہ تو تمہارے ابا کا انتقال ہو گیا تھا اس لئے.....“ اس نے جھنجھلاہٹ سے کہا۔

”اچھا؟ یہ بات ہے تو پھر ایگزام کے دوران ہماری کلاس فیلو عافیہ کی امی کا بھی تو

انتقال ہوا تھا تم نے اسے کیوں نہیں دیئے؟“

”وہ تو.....“ وہ بری طرح گڑبڑا گئی۔

”ہاں ناناؤ! اب بولتی کیوں چپ ہو گئی۔“ وہ اسے زچ کر رہا تھا۔

”شٹ اپ! تم اس قابل نہیں تھے کہ تمہاری مدد کی جاتی، خواہو امیری انسانی ہمدردی کو

غلط رنگ دے رہے ہو۔ تم تو ہمارے گروپ کے تھے اسی لئے میں نے تمہاری مدد کر دی اور تم خواہو خوش فہمی میں مبتلا ہو رہے ہو۔“

وہ نظریں چرا کر وضاحتیں دیتی عبدالرزاق کو بہت پیاری لگی تھی۔

اس نے گہری آنکھوں سے اسے دیکھا اور معنی خیز لہجے میں کہا۔

”اب تو کچھ نہیں ہو سکتا اسی خوش فہمی کے زیر اثر میں نے اپنی والدہ سے کہہ دیا تھا کہ ادھر ادھر لڑکیاں دیکھنا بند کریں۔ ایک ”ہری مرج“ جیسی لڑکی مجھے پسند ہے، بس اسے فائل کریں، لیکن خبردار شادی کے بعد میں اس منحوس ”ہرے رنگ“ کو ہرگز نہیں پہننے دوں گا۔“

”تو پھر میں بھی تمہیں ندیدے لوگوں کی طرح ٹھونس ٹھونس کر کھانے نہیں دوں گی۔“ وہ تیزی سے بولی اور عبدالرزاق کے بے ساختہ قہقہے پر اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ غلط بول گئی ہے..... تبھی خفت زدہ انداز سے انگلیاں مروڑنے لگی.....

”اس کا مطلب ہے کہ تمہیں یہ رشتہ منظور ہے؟“ وہ شوخ ہوا۔

”میں نے یہ کب کہا؟“ وہ بوکھلائی۔

”دیکھو مکرو نہیں ورنہ میں اپنی والدہ کی پسند کی ہوئی لڑکی فائل کر دوں گا۔“ اس نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی۔

”اور میں تمہاری جان نکال دوں گی۔“ وہ بے ساختہ بولی تھی۔

عبدالرزاق کے بلند آواز میں لگائے قہقہے اور پر شوق نظروں نے شائستہ کو بری طرح پزل کر دیا تھا۔ شرم اور حیاء کے طے جلے رنگ اس کے چہرے پر پھیلے بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔ لیکن وہ مطمئن انداز سے سامنے موجود صاف اور روشن سرک کو دیکھ رہی تھی، اسے نہ جانے کیوں لگ رہا تھا کہ زندگی اس کے لئے بہت سے رنگ اور خوشیاں سیٹھے اس کی منتظر ہے۔



کے حواسوں پر سوار تھا اور اس کی روم میٹ لمبھ تو اس ٹیٹ کی تیاری کے لئے اپنے تایا کے گھر  
مٹی ہوئی تھی جو خود بھی بہت اچھے ڈاکٹر تھے جبکہ راولپنڈی میں اس کے کوئی ایسے رشتے دار  
نہیں تھے۔ اس لئے وہ ہر ویک اینڈ پر ہوٹل میں ہی رہنے کو ترجیح دیتی تھی، ویسے بھی یہ اس کا  
راولپنڈی میڈیکل کالج میں آخری سال تھا۔

وہ اس دن بھی اپنا مخصوص بڑا سا گجس پر ”لیو“ اشارہ کرنا نشان بنا ہوا تھا، اس  
میں کافی منہ تک بھرے ہوئے ہوٹل کے لان میں اپنے مخصوص پسندیدہ کونے میں براجمان  
تھی، جب خلاف توقع بابا کی کال آئی۔ ان کی بات نے اس کا دماغ بھک کر کے اڑا دیا تھا۔  
وہ بہت غلت میں اسے کہہ رہے تھے۔

”دریشہ! ایک گھنٹے تک تمہیں میرا اسٹوڈنٹ ایجنٹ پک کرنے آئے گا، اپنا بیگ تیار کر  
لو تمہیں دس پندرہ دن کے لئے کہیں جانا ہے۔“

”لیکن بابا! میں دس پندرہ دن کے لئے کالج سے کیسے چھٹی کروں گی؟ پھر پروفیسر جمال  
آج کل ٹیٹ لے رہے ہیں۔“ وہ بڑی سرعت کے ساتھ ان کو بتا رہی تھی۔

”میری پروفیسر جمال سے بات ہو چکی ہے، انہیں کوئی اعتراض نہیں۔“ انہوں نے ایک  
اور ہم اس پر گرایا تھا۔ ”دیکھو دریشہ مجھے کچھ دن کے لئے کہیں جانا ہے، کہاں؟ اور کدھر؟ اس  
کے جوابات میں فوری نہیں دے سکتا۔“ وہ مزید کہہ رہے تھے۔

”مجھے معلوم ہے کہ میری بیٹی بہت سمجھدار ہے، وہ ان فضول سوالات میں نہیں پڑے گی،  
میں کسی اور دن آپ سے تفصیل سے بات کروں گا۔“ وہ بابا کی بات پر حواس باختہ ہو کر سامنے  
پڑے کافی کے خالی گک کو دیکھنے لگی، سارے الفاظ بھک کر کے اس کے دماغ سے اڑ گئے تھے،  
اوپر سے انہوں نے تازہ تازہ ”سمجھداری“ کا تمغہ پہنایا تھا، اس لئے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی  
خاموش ہو گئی، ورنہ دماغ میں تو مختلف سوالوں نے اودھم مچا رکھا تھا۔

”میری بات سن رہی ہیں نا دریشہ آپ؟“ ہمیشہ ٹھہر ٹھہر کر بات کرنے والے بابا  
آج بہت تیزی سے بول رہے تھے اور یہی بات دریشہ کے لئے پریشانی کا باعث بن رہی  
تھی۔

”جی جی بابا۔۔۔۔۔“ اس نے فوراً بولکھلا کر جواب دیا اور پھر کچھ یاد آنے پر بولی۔ ”آخر  
جانا کہاں ہے۔۔۔۔۔؟“

## ”موسم گل حیراں ہے“

”رات کی تیرگی میں الماس اور شہتوت کے درختوں میں گہری سیاہ کولتار والی سڑک پر  
سرخی رنگ کی ہنڈا سوک گاڑی بہت سرعت سے دوڑتی جا رہی تھی۔ اس نے گاڑی کی کھڑکی  
سے آسمان پر ستاروں کے جھرمٹ کو دیکھا جو ان کے ساتھ ہی محو سفر تھا، جبکہ راستے میں آنے  
والے شہروں پر گہری ہوتی رات ایک سحر کی مانند طاری ہو چکی تھی۔ وہ آج نہ چاہتے ہوئے بھی  
اس کے سحر میں گرفتار نہیں ہو سکتی تھی۔ اس وقت آسمان پر جتنے ستارے تھے اس سے زیادہ وہم  
اور اندیشے اس کے ذہن کے آسمان پر پوری آب و تاب کے ساتھ دمک رہے تھے۔“

وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بظاہر ٹیک لگائے انتہائی پرسکون تھی، لیکن اس کے اندر پریشانی  
کا سمندر ٹھانٹیں مار رہا تھا۔ اگلی سیٹ پر بیٹھا بلیو جینز کے ساتھ سفید گھریلو سی ٹی شرٹ میں  
ملبوس شخص اس کے لئے بالکل انجان تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش اس کو کچھ کچھ شناسا سے تو  
لگتے تھے لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اس نے اسے پہلے کہاں دیکھا ہے۔

اسی لمحے اس نے بیک مرر سے اسے دیکھا، دریشہ نے گڑبڑا کر اپنی آنکھیں دانستہ باہر  
کے مناظر پر مرکوز کر لی تھیں لیکن ایک لمحے میں دریشہ نے اس کے چہرے پر پھیلی خاموشی اور  
گہری سوچ کی پرچھائیوں کو پڑھا تھا۔ چہرے پڑھنا ویسے بھی اس کا مرغوب مشغلہ تھا۔ گاڑی  
میں وہ دونوں ہی تھے اس لئے بڑی بوجھل سی خاموشی پر پھیلائے ان کے درمیان گھس کر بیٹھی  
ہوئی تھی۔

گاڑی بہت تیزی سے اپنی منزل کی طرف گامزن تھی۔ دریشہ ایک دفعہ پھر اپنی سوچوں  
میں غلطان تھی۔ ابھی کچھ گھنٹے پہلے وہ کافی کا ایک بڑا سا گلاس پاس رکھے اپنی میڈیکل کی کسی  
کتاب میں گم تھی۔ پروفیسر جمال احمد نے کل ٹیٹ لیتا تھا اور وہ ٹیٹ بری طرح سے اس

کر دیا، کیونکہ اسے خود علم نہیں تھا کہ آخر جانا کہاں ہے؟

شاور لے کر وہ اپنے بالوں میں برش کر رہی تھی جب چوکیدار نے اسے باہر کسی مہمان کے آنے کی اطلاع دی تھی۔ اپنے دونوں بیگ اس نے چوکیدار کے ہاتھ بھجوا دیئے تھے اور خود اپنا ہینڈ بیگ کندھے پر ڈال کر وہ باہر نکلی تو اس وقت شام کے چھ بج رہے تھے۔ گیٹ کے پاس بنے وزینگ روم میں بیٹھا شخص اسے دیکھ کر چونک اٹھا تھا۔

”آپ وریشہ سکندر ہیں ناں.....؟“ وہ انتہائی اعتماد سے اس سے مخاطب تھا۔ وریشہ نے ایک نظر میں دیکھ لیا تھا کہ وہ خاصا دراز قد تھا اس کا جسم خاصا مضبوط اور رنگت بھی سفید تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی محسوس کی جانے والی کشش تھی۔ اس کی شخصیت کا نمایاں وصف اس کی خود اعتمادی اور بے نیازی تھی۔ اس وقت وہ دونوں بازو سینے پر باندھے بہت اطمینان سے اس کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔

”آپ اجتاج ہیں.....“ اس نے اپنی تسلی کے لئے پوچھا، ورنہ مد مقابل کا انداز ہی اسے بتانے کو کافی تھا کہ وہ اسے اچھی طرح پہچانتا ہے۔

”جی مجھے اجتاج ہاشمی کہتے ہیں، مجھے سرنے بھیجا ہے.....“ اس نے انتہائی مختصر انداز میں بتایا۔

”اٹس او کے.....!“ وہ زبردستی مسکرائی..... ”کیا لیں گے آپ؟ چائے یا کولڈ ڈرنک.....؟“ اس نے ایک اچھے میزبان کے طور پر رسماً ہی پوچھا تھا ورنہ اسے معلوم تھا کہ وہ اس صورت حال میں کیا جواب دے گا۔

”نو تھینکس.....! ہم لیٹ ہو جائیں گے، ویسے بھی کافی لمبا سفر ہے.....“ اس کا لہجہ دوڑک اور کسی بھی قسم کی گنجائش سے عاری تھا۔ وریشہ نے بھی کندھے اچکائے اور مزید اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ اب اس کے بیگ اٹھا کر گاڑی میں رکھ رہا تھا۔ وریشہ نے دیکھا وہاں پہلے سے ہی ایک لیڈر کا بیگ پڑا تھا۔ وہ شاید خود بھی کہیں سے سفر کر کے آیا تھا۔ اس کی گاڑی پر بڑی گرد سے وریشہ نے اندازہ لگایا تھا۔ وہ اس کے لئے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول چکا تھا۔ اس کے لبوں سے بے اختیار ایک پرسکون سی سانس خارج ہوئی تھی، وہ خود بھی آگے بیٹھنا نہیں چاہ رہی تھی۔ وہ ابھی بیٹھی ہی تھی کہ سیل فون پر بابا کی کال آ گئی۔ اس کی دل کی دھڑکنوں میں ایک دم ہی ارتعاش برپا ہوا تھا۔ اس نے بے تابی سے کال اٹینڈ کی۔

”بس وہ جہاں بھی لے کر جائے آپ چلی جانا.....“ بابا کا جواب اسے انتہائی سہل لگا تھا۔ پہلی دفعہ وریشہ کو بابا کی ذہنی حالت پر شک ہوا تھا۔ تبھی تو وہ انتہائی فکر مند سی رہی تھی۔

”بابا! آپ ٹھیک تو ہیں ناں.....؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں بیٹا، بس کچھ دن کے لئے ملک سے باہر جا رہا ہوں، اس لئے ہو سکتا ہے کہ میری آپ سے بات بھی نہ ہو سکے، اس لئے پریشان نہیں ہونا.....“ وہ حد درجہ اسے مطمئن کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

”کہاں؟ کس ملک میں؟“ وہ کچھ اور پریشان ہوئی۔

”بیٹا میں نے کہا تھا ناں کہ زیادہ سوال نہیں کرنے.....“ وریشہ کو صاف محسوس ہوا تھا کہ بابا بری طرح جھنجھلائے تھے۔ ان کی جھنجھلاہٹ نے اسے بری طرح خفت میں مبتلا کر دیا تھا۔

”آئی ایم سوری بابا۔“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکی تھی۔

”اجتاج آنے والا ہی ہوگا، تم اپنے ڈاکومنٹس اور سب ضروری کاغذات رکھ لینا اور کتا میں بھی۔“ وہ انتہائی غیر متوازن آواز میں اسے کہہ رہے تھے۔ ”اور ہاں یاد رکھنا پریشانیوں اور مسائل ہماری زندگی کا حصہ ضرور ہوتے ہیں، لیکن پوری زندگی نہیں ہوتے، ان کے ساتھ ہی زیست بسر کرنا پڑتی ہے۔ اس لئے ان کو ذہن پر سوار نہیں کرنا.....“ وہ پتا نہیں اسے کیا سمجھانا چاہ رہے تھے، جبکہ وریشہ کو ان کی بے ربط گفتگو اور زیادہ پریشان کر رہی تھی وہ ایک دم ہی تناؤ کا شکار ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور پوچھتی بابا اختتامی الفاظ کہہ کر اس کی خدا حافظ سے بغیر فون بند کر چکے تھے۔

اپنی چیزیں اٹھا کر وہ کمرے میں آئی تو پریشانی کے ساتھ ساتھ کوفت اور بے زاری بھی اس کا دامن پکڑ کر اس کے وجود میں سرایت کر چکی تھی۔ انتہائی جھنجھلاہٹ کے ساتھ اس نے اپنے بیگ میں پکڑے ٹھونے تھے۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کیا رکھ چکی ہے، البتہ دوسرے بیگ میں کتابیں، نوٹس اور مختلف جرنلز اس نے بہت دھیان سے اور توجہ سے رکھے تھے۔ اپنے سارے ڈاکومنٹس رکھنے کی تک اسے سمجھ تو نہیں آئی تھی، لیکن بابا کی بات اس نے کبھی نالی نہیں تھی۔ اس لئے اس نے سارے کاغذات خاموشی سے رکھ لئے تھے، اپنی پیکنگ کے دوران اس کا دل چاہا کہ وہ اپنی روم میٹ کو اپنے جانے کا بتا دے لیکن پھر کچھ سوچ کر اپنا ارادہ ملتوی

دوسری طرف بابا اس کے سلام کا جواب دیئے بغیر بہت بے چینی سے بولے تھے۔  
 ”ابہاج آگیا.....؟“  
 ”جی بابا.....!“ وہ جی بھر کر بد مزہ ہوئی۔

”اوکے میری بات کر دو! اس سے.....“ وہ اب کے ذرا اطمینان سے بولے تھے جبکہ وریشہ کو نہ جانے کیوں غصہ آگیا تھا تبھی اس نے خاموشی سے سیل فون اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔ ”بابا بات کرنا چاہتے ہیں۔“ اس کے حیرت زدہ چہرے کو دیکھتے ہوئے اس نے فوراً وضاحت دی۔ وہ سیل فون لے کر قدرے فاصلے پر چلا گیا تھا۔ وریشہ نے دیکھا کہ وہ بس سر ہلا رہا تھا۔ دوسری طرف بابا کی بات شاید لمبی ہو گئی تھی۔ اسے اس وقت سخت دھچکا لگا جب اس نے بات کر کے فون بند کر دیا تھا۔ بابا نے اس سے بات نہیں کی تھی۔ اب یہ بات گھنٹوں اس کا دل جلانے کو کافی تھی اور وہ تو ویسے ہی پورے خاندان میں حد درجہ حساس مشہور تھی۔ وہ کچھ بھی بولے بغیر ڈرائیونگ شروع کر چکا تھا۔ جیسے جیسے باہر اندھیرا پھیل رہا تھا ویسے ویسے وریشہ کے اندر ایک کثیف سی مایوسی پھیلتی جا رہی تھی۔ اس نے انتہائی بے دلی سے سیٹ کی پشت کے ساتھ ٹیک لگا لی تھی۔

اگلی سیٹ پر بیٹھا بندہ عادتاً کم گو تھا کہ کسی مصلحت کی وجہ سے خاموش تھا وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر تھی۔ سفر شروع ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا تھا لیکن وہ مسلسل خاموشی اور سکون کے ساتھ ڈرائیونگ کر رہا تھا جیسے اس سے زیادہ اہم کام دنیا میں کوئی نہ ہو۔

”ہم لوگ کہاں جا رہے ہیں.....؟“ اس نے بمشکل دل پر جبر کر کے اس کو مخاطب کر ہی لیا تھا۔ دوسری طرف سے استفہامیہ لہجہ اس کی سماعت سے نکرایا۔

”آپ کو پروفیسر صاحب نے بتایا نہیں.....؟“ اس کے لہجے میں حیرت تھی یا سادگی وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔ وہ اب بھی پورے دھیان سے ڈرائیونگ کرنے میں مگن تھا۔ اس کی خاموشی وریشہ کو خفت میں مبتلا کر رہی تھی۔

”ظاہر ہے نہیں بتایا تو آپ سے پوچھ رہی ہوں.....“ اس نے بھی ڈھٹائی کی حد کر دی تھی۔

”ابھی ان کی دوبارہ کال آئے گی تو پوچھ لیجئے گا.....“ اس نے احتیاط سے موڑ کاٹتے ہوئے شائستہ انداز میں کہا۔

”بابا کے سارے اسٹوڈنٹ ہی عجیب سے روکھے اور فلاسفر ٹائپ ہیں ایک بھی کام کا نہیں.....“ اسے اچانک بیٹھے بیٹھے ارسلہ کا بے لاگ تبصرہ یاد آیا تھا۔ ارسلہ کی بات سے اس کی اچانک یاد بھی بے وقت آئی تھی وہ اس کی اکلوتی بہن تھی اور شادی کے بعد اپنے میاں کے ساتھ جاپان میں مقیم تھی۔

”کتنی کمینہ ہے ارسلہ کتنے دنوں سے مجھے کال تک نہیں کی۔“ اسے بیٹھے ہوئے ایک اور دکھ یاد آیا تھا۔ دل میں خود ترسی کے جذبات اٹھ اٹھ کر آ رہے تھے۔ اچانک اگلی سیٹ پر بیٹھا بندہ بولا تھا۔

”آپ کا میڈیکل کا کون سا سال ہے.....؟“ وہ جو اپنی سوچوں میں مگن تھی اس کی بات پر بے اختیار چونکی۔

”آپ کو کس نے بتایا کہ میں میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہوں.....“ اس نے انتہائی بے شکا سوال کیا تھا۔

”ظاہر ہے میں نے آپ کو راولپنڈی کالج سے پک کیا ہے اور وہاں میڈیکل کی ہی تعلیم دی جاتی ہے۔“ اس نے جتایا نہیں تھا لیکن وہ بری طرح شرمندہ تو ہوئی اسی لئے دانستہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ”کیوں آپ کو پروفیسر صاحب نے بتایا نہیں؟“ اس کے دانستہ جتاتے ہوئے لہجے پر ایک مبہم سی مسکراہٹ ابہاج کے چہرے پر دوڑی تھی۔ وہ بیک مرر سے اسے دیکھ کر کہہ رہا تھا۔

”میں نے پوچھا نہیں، ورنہ وہ بتا دیتے.....“ اس کا انداز اور لہجہ خاصا مہذب تھا۔ وہ اب کہ ٹھیک ٹھاک شرمندہ ہوئی تھی۔ اس لئے خاموش رہی۔ ابہاج نے بھی اپنی ساری توجہ ڈرائیونگ کی طرف مبذول کر لی تھی اس نے دوبارہ نہیں پوچھا تھا۔ گاڑی موٹروے پر پوری قوت سے بھاگ رہی تھی۔ اتنی ہی تیزی سے مختلف یادیں اور مناظر وریشہ کے ذہن کے پردے پر دوڑ رہے تھے۔ اسے آج ارسلہ بری طرح یاد آ رہی تھی۔ وہ اس سے دو سال بڑی تھی لیکن دونوں میں کمال کی انڈر اسٹینڈنگ اور محبت تھی۔ سی ایس ایس (CSS) کے بعد وہ فارن آفیسر کی حیثیت سے جاپان میں تعینات تھی اس سے پہلے کچھ عرصہ اس نے اٹلی میں بھی گزارا تھا۔ وہ حدود درجہ ذہین و فطین اور ادور کو فیڈنٹ لڑکی تھی۔ ماما اور بابا اس کا تعارف بہت فخر اور محبت سے کرواتے تھے۔ ویسے تو دونوں بیٹیاں ہی ان کو عزیز تھیں لیکن شوخ و چنچل

حاضر دماغ اور باتونی سی ارسلہ ہر جگہ پر نمایاں ہوتی تھی۔ اس کے مقابلے میں وریشہ حد درجہ کم گوتہائی پسند اور اپنے آپ میں گمن رہنے والی تھی حالانکہ ذہانت میں وہ بھی ارسلہ سے کم نہ تھی، لیکن وہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بننے سے گھبراتی تھی۔ اس لئے ارسلہ کے مقابلے میں لوگ اس کی طرف کم ہی متوجہ ہوتے تھے۔

”ارسلہ ہر چیز میں اپنے باپ کا پرتو ہے جبکہ وریشہ میری کاپی ہے.....“ اسے ماما کی بات اچانک ہی یاد آئی تھی۔ ماما کی شخصیت حد درجہ سحر انگیز تھی۔ وہ ٹھنڈے مزاج کی بہت مضبوط اور متاثر کن انداز بیان کی حامل خاتون تھیں۔ وریشہ کو کبھی بھی نہیں لگا تھا کہ وہ ماما کی کاپی ہے۔ اسے ہمیشہ لگتا تھا کہ ماما بس اس کا دل خوش کرنے کے لئے ایسا کہتی ہیں۔ ماما نے نفسیات میں امریکہ سے پی ایچ ڈی کی تھی اور وہ یونیورسٹی میں اپنے شعبہ کی ہیڈ بھی رہی تھیں۔ ان میں اور بابا میں کمال کی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔

گاڑی چلتے چلتے رکی تھی۔ وہ ایک دم ہی ہوش کی دنیا میں آئی تو دیکھا۔ وہ پیچھے مڑ کر اسی کو دیکھ رہا تھا۔ ”سوری میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا“ یہ بھیرہ کا شاپ ہے اور یہاں کافی اچھے ہوٹل ہیں اور مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے.....“ وہ خاصا طویل جملہ بولا تھا۔

”لیکن مجھے تو بھوک نہیں ہے.....“ وہ بے ساختہ بولی تھی، لیکن اس کے چہرے پر پھینکنے والی مسکراہٹ سے اسے اپنی بات کے بے نکتے ہونے کا احساس ہوا تھا۔

”اٹس اوکے“ اگر آپ کو بھوک نہیں تو کوئی بات نہیں، لیکن یقین مانیں میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ صبح ہی لاہور پہنچا تھا اور وہیں سے سیدھا راولپنڈی آ گیا.....“ وہ انتہائی سادہ انداز میں بتا رہا تھا۔

”اوہ آپ لاہور میں بابا سے مل کر آ رہے ہیں.....“ وہ ایک دم بے چین ہوئی۔

”جی ہاں.....!“ وہ اس کے بے صبرے پن پر مسکرایا۔ ”اگر آپ اجازت دیں تو ہم کھانا کھالیں، کیونکہ سفر کافی لمبا ہے.....“

”اوہ ہاں ضرور.....!“ آج وریشہ کے صرف شرمندہ ہونے کا دن تھا۔ اسے کافی دیر سے اس بات کا احساس ہوا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا تو وریشہ نے غور سے دیکھا، وہ اچھا خاصا دروازہ قدر اور وجیہ شخصیت کا حامل تھا۔ اس نے باہر نکلتے ہی اس کی سائیز کا دروازہ کھولا تو وہ چونک کر باہر نکلی۔ ٹھنڈی ہوا کا غم جھونکا اس کے چہرے سے کرایا۔ ”لگتا ہے کہ قریب ہی

کہیں بارش ہو رہی ہے.....“ وہ بلند آواز میں بولا تھا۔

”ہاں اسی لئے موسم خاصا خوشگوار ہے.....“ وریشہ نے اس کی بات کا جواب دیا۔ ٹھنڈی ہوا اس کے بالوں سے اٹکھلیاں کر رہی تھی۔ وریشہ کو پہلی دفعہ احساس ہوا کہ اس نے شادور لینے کے بعد بال ایسے ہی کھول رکھے تھے جواب اسے الجھن میں مبتلا کر رہے تھے۔ وہ بیک سے ہیر بیئڈ نکال کر قدرے لا پرواہی سے بالوں میں ڈال رہی تھی۔

”آپ کے بال بالکل میڈم شائستہ کی طرح لمبے اور گھنے ہیں.....“ وہ بلا ارادہ ہی بولا تھا۔ اس کے سخت حیرت زدہ چہرے پر وہ پہلی دفعہ بری طرح چل ہوا تھا۔

”آئی ایم سوری“ اصل میں آپ کے نقوش میم کے ساتھ بہت ملتے ہیں اور پہلی نظر میں دیکھنے سے ہی احساس ہوتا ہے کہ آپ ان کی بیٹی ہیں.....“ وہ اب بلا ضرورت وضاحت دے رہا تھا۔

”آپ نے میری ماما کو دیکھ رکھا ہے.....؟“ ایک بے ساختہ سی خوشی کا احساس اس کے چہرے سے جھلکا تھا۔ وہ بالوں میں ہیر بیئڈ ڈالنا بھول گئی تھی۔ اب پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھی۔

اجتاج نے پہلی دفعہ اس کو غور سے دیکھا، اس کے چہرے پر بلا کی جاذبیت اور مصومیت تھی، بے ریا پرکشش آنکھیں، انتہائی متناسب جسم اور چہرے کے خدوخال خاصے پرکشش تھے۔ ڈارک گرین لمبی ایئر لائن قمیض کے ساتھ میرون چوڑی دار پاجامے اور میرون ہی دوپٹے میں اس کی رنگت دک رہی تھی۔ اس کے چہرے کی رنگت میں سنہری پن جھلکتا تھا۔

”آئیں اندر چلتے ہیں، مجھے لگتا ہے کہ یہاں بھی بارش ہونے والی ہے.....“ اس نے صاف بات کو بدلا تھا۔ اس کے پیچھے چلتے ہوئے وہ اس کے بات بدلنے پر اچھی خاصی کوفت کا شکار ہوئی تھی۔ جب کہ وہ اس کے آگے آگے لے لے ڈگ بھرتا ہوا سامنے ہوٹل کے داخلی دروازے پر پہنچ گیا تھا۔

”کیا لیں گی آپ.....؟“ وہ اب مینیو کارڈ ہاتھ میں پکڑے اس سے پوچھ رہا تھا جو اس سے دل ہی دل میں خفا ہوئی بیٹھی تھی۔

”کچھ بھی نہیں.....“ اس کے انداز سے ناراضگی صاف جھلکی تھی۔

”سوری اس مینیو میں تو اس نام کی کوئی چیز نہیں.....“ وہ خاصی سنجیدگی کے ساتھ کہہ رہا

تھا۔ وریشہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

دوستی ہے، مجھے ان کے ساتھ بہت زیادہ عقیدت ہے، اس لئے وہ اکثر مجھے ضرورت سے زیادہ رعایت دے دیتے تھے.....“ وہ نہ بھی ہٹاتا تو وریشہ کو اس کی حیثیت کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔ اما انی لاؤٹی بیٹی کے لئے کسی عام بندے پر تو اعتبار نہیں کر سکتے تھے۔

”لیکن میں نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا، نہ اپنے گھر، نہ بابا کے ساتھ.....“ وہ صاف گوئی سے کہہ رہی تھی۔

”ہاں ہو سکتا ہے۔“ اس نے اختلاف نہیں کیا تھا۔ وہ اب اپنی پلیٹ میں چاول نکال رہا تھا۔ ”لیکن میں نے آپ کو کئی دفعہ پہلے بھی دیکھ رکھا ہے.....“

”اچھا.....؟“ وہ منہ میں نوالہ ڈالنا بھول گئی تھی۔ ”کہاں پر.....؟“ اس کے چہرے پر تعب کی فراوانی تھی۔

ایک دفعہ آپ کے گھر، دوسری دفعہ ارسلہ کی شادی پر تیسری دفعہ آپ کی ماما کی ڈیڑھ پر اور چوتھی دفعہ اب.....“ وہ سرسری سے انداز میں کہہ رہا تھا۔

”کیا.....؟“ اسے خاصا جھٹکا لگا تھا۔ وہ اب ہاتھ میں پکڑا چھ پلٹ میں رکھ کر سخت حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی جو بڑی رغبت سے کھانا کھا رہا تھا۔

”کیا ہوا.....؟“ اس نے تعجب سے اسے دیکھا جو کھانا، کھانا بھول گئی تھی۔  
 ”آبِ ارسلہ کی شادی بر آئے تھے.....؟“ وریشہ کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آتا تھا۔

اے یاد تھا کہ ماما کی بیماری کی وجہ سے بابا نے بہت ہی کم اور سلیکٹو لوگوں کو مدعو کیا تھا۔

”نہیں، نہیں، ہم احمق نہیں۔ تو اصل میں اس کا کام دیکھو۔ یہ کم لگا، نہ ایڈیٹ

تھے اس لئے مجھے حیرت ہے کہ میں نے آپ کو کیوں نہیں دیکھا.....“

حالاتہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آپ سارا وقت میڈم شائستہ کے ساتھ میں اور اس فنکشن میں ان کی طبیعت خاصی خراب تھی.....“

”ہوں.....“ وہ کچھ اداس ہوئی۔ اسے یاد آیا کہ اس دن ماما کی خرابی طبیعت کی وجہ سے فنکشن بہت مختصر کر دیا گیا، نکاح کے فوراً بعد کھانا اور پھر رخصتی کر دی گئی تھی۔

”میڈم بہت گریس فل خاتون تھیں، اللہ ان کو جنت میں سب سے اچھے مقام پر

”میں آپ کی ماما کا نہیں بلکہ بابا کا اسٹوڈنٹ ہوں.....“ اس نے اس کے ناراض چہرے کے پیچھے چھپی ناراضگی کو تیزی سے پڑھا تھا اس لئے اب لاپرواہی سے کہہ رہا تھا۔  
دوریشہ کو اپنے بچکانہ انداز پر شرمندگی ہوئی اس لئے وہ اب میوہ دیکھ کر اسے ایک فریڈ رائس منگوانے کا کہہ رہی تھی حالانکہ اس کا قطعاً بھی دل نہیں کر رہا تھا۔ سارا دھیان بابا کی طرف تھا۔ اس کو ابھی تک اس ”ایمرجنسی“ دورے کی وجہ سمجھ نہیں آ رہی تھی پتا نہیں بابا ٹھیک بھی تھے کہ نہیں.....؟ وہ تھوڑا سا مضطرب ہوئی۔ اس کے چہرے پر پھیلی پریشانی ابہتاج کی زیرک نظروں سے نہیں چھپ سکی تھی۔

”کچھ چیزوں کے جواب نہیں ہوتے“ ان کو خدا پر چھوڑ دینا چاہیے، وقت بہت بڑا منصف ہے.....“ اس نے بہت سرعت سے اس کے چہرے کے تاثرات کو بڑھاتا تھا۔

”بابا ٹھیک ہیں ناں.....؟“ وہ کچھ بے چین ہوئی۔

”ابو صہیبؓ نے کہا: ”اے رسول اللہؐ! میں نے اپنے آپ کو اس سے زیادہ عزیز نہیں پایا۔“

”آپ نے ماما کو کہاں دیکھا ہے.....؟“ وہ اب اشتیاق سے پوچھ رہی تھی وہ مسکرایا۔

جی میں اسی یونیورسٹی میں تھا اور میڈم تو بہت ہر دلعزیز ہیں وہاں میں تو ان کا  
بر دست فین تھا اور اکثر سر سے کہتا تھا کہ کاش میں آپ کے دور میں پیدا ہو جاتا تو میڈم کو

سکریز آپ سے شادی کرنے نہ دیتا.....“ وہ ہنستے ہوئے انتہائی شرابی انداز سے کہہ رہا تھا۔

”میڈم کھانا بہت اچھا بناتی تھیں، ان کے ہاتھ کی بنی ہوئی حلیم کھانے کے لئے تو میں

کثر آپ کے گھر بھی آ جاتا تھا.....“ وہ اس کی بات پر بری طرح چوکی۔ بابا کے اور ماما کے سٹوڈنٹس دن رات ان کے گھر آتے تھے اس لئے ان دونوں بہنوں نے کبھی کوئی خاص نوٹس

”اصل میں میں روفنسہ صاحبہ کا بہت جیسا اسٹوڈنٹ تھا اور ان کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں حیرت پڑھ کر اب خوشگوار انداز سے کہہ رہا تھا۔

اس میں میں پرویز کا سب سے بہت پیارا دوست تھا اور ان سے ساٹھ سال پہلے

رکھے.....“ وہ بہت عقیدت بھرے انداز میں کہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلی اداسی کی کیفیت کو نکالنے کے لئے وہ ایک دم سے بولا تھا۔

”آپ ارسلہ سے بہت مختلف ہیں.....“ اس نے مسکراتے ہوئے انکشاف کیا تھا۔

”اچھا.....؟“ وہ مسکرائی..... ”آپ ارسلہ کو بھی جانتے ہیں؟“ وہ تحیر کے عالم میں کچھ دیر اس کی شکل دیکھتی رہی۔ اسے اس بات پر جھکا تو لگا تھا لیکن اس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا تھا۔

”ارسلہ نہ صرف میری کلاس فیلو تھی بلکہ بہت اچھی دوست تھی اس کی شادی میرے بیٹے فرینڈ اشعر سے ہوئی ہے میں ان دونوں کو ملنے جاپان بھی گیا تھا۔“

وہ ایک دفعہ پھر کھانا کھانا بھول گئی تھی..... ”اشعر بھائی آپ کے دوست ہیں.....؟“ ایک دفعہ پھر وہ خود کو حیران ہونے سے نہیں روک سکی تھی۔

”ہاں وہ میرا بہترین دوست ہے ہم دونوں کئی سال ہوٹل میں ایک ہی روم میں رہے ہیں وہ ارسلہ سے پہلی دفعہ میرے ہی توسط سے ملا تھا اور اس کے پرپوزل کا میں نے ہی آپ کے بابا کو بتایا تھا.....“ ابہتاج کی بات پر اسے یاد آیا تھا کہ ارسلہ کا پرپوزل بابا کے کسی اسٹوڈنٹ کے توسط سے آیا تھا اور مامانے یہ بات یونہی سرسری سے انداز میں بتائی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چلنا چاہیے.....“ وہ رسٹ وائچ پر وقت دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اب پہلے کی طرح سنجیدگی سی طاری ہو چکی تھی۔ وہ جو صرف اس کا ساتھ دینے کے لئے زبردستی کھا رہی تھی فوراً ٹینکین سے ہاتھ صاف کر کے کھڑی ہو گئی۔

وہ بل ادا کر کے اب باہر کی طرف قدم بڑھا چکا تھا۔ وریشہ نے بھی اس کی پیروی کی۔ باہر مکمل طور پر تیرگی کا راج تھا۔ مختلف قسم کی گاڑیاں وہاں کھڑی تھیں۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ ”اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو اگلی سیٹ پر آ جائیں مجھے کھانے کے بعد شدید قسم کی نیند آتی ہے اگر آپ پیچھے سو گئیں تو مجھے بھی نیند آ جائے گی..... اور ڈرائیور کی نیند کا انجام خاصا خطرناک ہوتا ہے۔“

”اوہ.....“ وہ چونکی..... ”نور مائنڈ.....!“ وہ زبردستی مسکراتے ہوئے بیٹھ گئی۔

”اگر آپ نہیں بیٹھنا چاہتے تو کوئی پرالتم نہیں اس اوکے.....“ وہ بہت اچھا چہرہ شال تھا یا اس کا چہرہ ہی مکمل کتاب تھا۔ وریشہ سمجھ نہیں پائی۔ ”نہیں کوئی مسئلہ نہیں.....“ وہ پراعناد

ہوئی۔

وہ بہت تیز رفتاری لیکن محتاط انداز میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اسے اس کام میں خاصی مہارت تھی۔ اس نے ایک دفعہ پھر چپ کی چادر تان لی تھی۔ وریشہ کو پہلی دفعہ اندازہ ہوا کہ وہ خاصا موڈی قسم کا بندہ ہے۔ ایک لمحے میں اس طرح سے بات شروع کر دیتا تھا جیسے ازلوں سے شناسائی ہو اور اگلے ہی لمحے ایسا اجنبیت کا خول اپنی ذات کے گرد تان لیتا تھا کہ اچھا خاصا بندہ نچل خوار ہو جائے۔ وریشہ نے اس کی اجازت کے بغیر ہی سی ڈیز کی سلیکشن کو دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کا انتخاب خاصا لا جواب تھا۔ خصوصاً اقبال بانو اور غلام علی کی غزلیں دیکھ کر اسے خوشی ہوئی۔

”آپ کو موسیقی سے شغف ہے.....“ وہ ایک دم ہی سوالیہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

”ہر وہ شخص جو جمالیاتی ذوق رکھتا ہو ادب سے اس کی شناسائی ہو زندگی کی خوبصورتیاں اسے اپنی طرف متوجہ کرتی ہوں وہ لطیف قسم کے احساسات کا حامل ہو اسے یقیناً موسیقی بھی بھاتی ہی ہے.....“ وہ بہت دھیمے انداز میں بولی تھی۔ اس کی بات کو ابہتاج نے خاصا انجوائے کیا تھا۔ ”بہت خوب.....“ میرا خیال تھا کہ میڈیکل کے لوگ ان چیزوں سے دور ہی بھاگتے ہوں گے.....“

”کیوں میڈیکل کی دنیا کے لوگ کیا انسان نہیں ہوتے.....؟“ اس نے برا مان کر کہا تھا۔

”نہیں انسان تو ہوتے ہیں لیکن سنا ہے کہ قدرے خشک اور بور.....“ وہ صاف گوئی سے بولا تھا۔

”سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرتے ورنہ ہم دیکھی انسانیت کی خدمت کرنے والے لوگ جتنے حساس ہوتے ہیں آپ لوگ اندازہ ہی نہیں کر سکتے..... اور ہر حساس دل کو نازک جذبات کی حامل چیزیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں.....“

”ہاں یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں.....“ ابہتاج نے مزید بحث کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا ورنہ اس کی بات پر وہ اچھی خاصی بحث کر سکتا تھا۔

”آپ کو پتا ہے کہ بابا نے مجھے اس طرح اچانک کیوں ہوٹل سے بلوایا ہے اور کہاں



اور پھر بھی کہہ رہے ہیں کہ سب ٹھیک ہے۔“ وہ تھوڑا سا چڑ کر بولی تھی۔  
 ”کیا آپ کو اپنے بابا پر اعتبار نہیں.....“ وہ حد درجہ سنجیدہ تھا۔  
 ”استغفر اللہ میں نے ایسا کب کہا.....؟“ اس کے چہرے پر حیرت کی فراوانی تھی، وہ  
 باقاعدہ برا مان گئی تھی۔

”آپ اس طرح ناراض جو ہو رہی ہیں.....“  
 ”میں ناراض نہیں ہو رہی، مجھے بس بابا کی ٹینشن ہے، انہوں نے پہلے کبھی ایسا نہیں کیا اور  
 ان کو پتا ہے کہ میرا میڈیکل کا آخری سال ہے.....“ وہ جذباتی ہوئی۔  
 ”ان کا تعلق بھی شعبہ تعلیم سے ہے اور ان سے زیادہ کون وقت کی اہمیت سے آگاہ ہو  
 گا۔ آپ تھوڑا سا صبر و تحمل کریں۔ کچھ چیزیں ٹائم مانگتی ہیں۔ سب کچھ انشاء اللہ جلد واضح ہو  
 جائے گا۔“ وہ بہت سکون سے اسے سمجھا رہا تھا۔

”مجھے وقت کے ضائع ہونے کا دکھ نہیں، آپ میرا پوائنٹ آف ویو سمجھ نہیں پارہے، مجھے  
 اس چیز کی ٹینشن ہے جس کی وجہ سے بابا نے اس طرح ایمر جنسی میں مجھے بلایا ہے، ورنہ وہ  
 اسٹڈی کے معاملے میں کس قدر پختی ہیں، آپ کو اس چیز کا بخوبی اندازہ ہوگا۔“

”اگر ایسی کوئی بات ہے تو آپ کو ٹینس ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں، وہ پندرہ دن کے  
 لئے کوئی سیمینار اینڈ کرنے اٹھا جا رہے ہیں، اور بالکل ٹھیک ہیں۔“ اس نے انکشاف کیا تھا۔  
 ”تو وہ کون سا پہلی دفعہ ملک سے باہر جا رہے ہیں.....“ وہ بالکل بھی نہیں چوکی تھی۔

”ہاں آپ کو پہلی دفعہ انہوں نے آپ کی مرضی کے خلاف بھجوایا ہے، یہ شاید آپ کو اچھا  
 نہیں لگا.....“ اس کی بات پر وہ بالکل ٹھنڈی ہو گئی، جبکہ وہ اس کے یوں خفت زدہ چہرے سے  
 محفوظ ہو رہا تھا۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں.....“ وہ بادل خواستہ بولی تھی۔

”ویسے آپ کے بابا کی ایک رائے تو آپ کے متعلق غلط ہے.....“ وہ خوشگوار انداز  
 میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وریشہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”ان کا خیال ہے کہ آپ خاصی کم گو ہیں اور بحث بالکل نہیں کرتیں.....“ احتجاج کی  
 آنکھوں میں بے حد دلچسپی تھی۔ اس کی بات پر وریشہ غلج سی ہو کر فوراً وضاحت دینے لگی۔  
 ”اصل میں سب کچھ اس طرح اچانک ہوا کہ میں بوکھلا گئی اور ایسی چوٹیشن میں اچھے خاصے

بھیج رہے ہیں.....؟“ جگجگت کی سی ڈی کو ہاتھ میں پکڑے اس نے اچانک ہی موضوع بدلا  
 تھا۔

”جی نہیں.....!“ اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ وریشہ کو اس کے جواب سے سخت مایوسی  
 ہوئی، اس نے ہاتھ میں پکڑی سی ڈی ڈیش بورڈ میں رکھتے ہوئے قدرے خفا انداز سے کہا۔  
 ”اچھا یہ تو آپ کو علم ہو گا کہ ہم جا کہاں رہے ہیں یا پھر یہ بھی پتا نہیں اور آپ شوقیہ ہی سڑکوں  
 پر گاڑی دوڑاتے پھر رہے ہیں.....“

اجتناب نے سبک رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے اس کو مسکرا کر دیکھا جو تھوڑا سا رخ  
 موڑے باہر اندھیرے میں بھاگتے دوڑتے درختوں میں پتا نہیں کیا چیز تلاش کر رہی تھی۔ باہر  
 تاریکی کے ساتھ گہرا سناٹا تھا۔

”آپ کو نیند تو نہیں آ رہی.....؟“ وہ فکر مندی سے پوچھ رہا تھا۔ اس کے اس طرح  
 بات پلٹنے پر وریشہ نے باقاعدہ مڑ کر اسے غصے سے گھورا تھا۔ ”ایسے نامعلوم سفر پر جاتے  
 ہوئے بھلا کس کا فر کو نیند آئے گی.....“ وہ بلند آواز میں بڑبڑائی تھی۔ اس کی بات پر اجتناب  
 بے ساختہ ہنسا تھا۔

”آپ ناراض نہ ہوں، ہم لوگ ملتان کے ایک گاؤں میں جا رہے ہیں۔“  
 ”ملتان کے گاؤں میں..... کون سے گاؤں میں.....“ وہ ناراضگی بھلائے اب باقاعدہ  
 اس کی طرف دیکھتے ہوئے سخت حیران تھی۔

”دیکھا میں انہی سوالوں کی وجہ سے نہیں بتا رہا تھا، گاؤں کا نام بتا دوں تو کیا فائدہ  
 آپ کون سا پہلے ملتان گئی ہیں.....“ اس نے صاف اسے چھیڑا تھا۔  
 ”آپ کو کس نے کہا کہ میں نے ملتان نہیں دیکھا.....؟“ وہ اسے گھورتے ہوئے پوچھ  
 رہی تھی۔

”آپ کے بابا نے.....“ اس کے جواب نے وریشہ کے غبارے سے ساری ہوا نکال  
 دی تھی۔ ”ہاں ٹھیک کہا تھا بابا نے.....“ وہ تھوڑا سا دھیمی ہوئی۔ ”وہاں کس کے پاس جا رہے  
 ہیں اور کیوں.....؟“ وہ تھوڑا سا فکر مند ہوئی۔

”یہ آپ کو پتا چل جائے گا وہاں جا کر.....“ وہ مبہم سے انداز میں مسکرایا۔  
 ”کیا پتا چلے گا، اچھا خاصا بیٹھے بیٹھائے مجھے اس ایمر جنسی اور خفیہ دورے پر بھجوا دیا ہے

”ڈانٹ وری.....! میں دیکھتا ہوں.....“ اس کے چہرے پر بڑی حوصلہ شکن مسکراہٹ تھی۔ وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا اور گاڑی کا بونٹ اٹھا کر انجن دیکھنے لگا۔ وہ بڑی ذبحہ سے مختلف تاروں کو گھما پھرا کر دیکھ رہا تھا۔

”کیا ہوا؟ کہیں انجن تو گرم نہیں ہو گیا؟“ دریشہ نے اسے گاڑی اشارت کرتے ہوئے دیکھ کر پریشانی سے پوچھا۔ وہ بار بار چابی گھما رہا تھا، لیکن انجن بالکل بے جان تھا۔

”نہیں! ابھی موٹروے سے اترتے ہوئے تو پانی ڈالا تھا.....“ وہ ابھی بھی پرسکون تھا۔ اس کے انداز میں بالکل بھی تشویش یا فکر مندی نہیں تھی۔ وہ ایک دفعہ پھر گاڑی سے اتر کر انجن کا معائنہ کر رہا تھا۔ جب اسے پانچ منٹ سے زائد ہو گئے تو دریشہ گھبرا کر نیچے اتر آئی۔ سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ دور کہیں گیدڑ کے بولنے کی آواز سے وہ خوفزدہ ہوئی۔

”کیا ہو گیا اس کو اس وقت.....؟“ دریشہ نے پریشانی بھری جھنجھلاہٹ سے کہا۔ ”کچھ نہیں ہوا، حوصلہ کریں، ہر کام کی کامیابی کی پہلی شرط صبر و تحمل ہوتا ہے.....“ اجتاج نے متبسم لبوں اور پرسکون لہجے میں کہا۔

”اتنی سنان جگہ پر صرف چور ڈاکو ہی صبر و تحمل سے کھڑے ہو سکتے ہیں.....“ ”بس پھر آپ کچھ دیر کے لئے خود کو چور ڈاکو ہی سمجھ لیں.....“ مشورہ مفت حاضر تھا، وہ ہنک انجن پر جھکا ہوا تھا۔ اس لئے دریشہ اس کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ پائی تھی۔ ”مجھے لگتا ہے کہ جزیئر ٹیل ہو گیا ہے.....“ اجتاج کے لہجے میں پہلی دفعہ تشویش کا عنصر شامل ہوا تھا۔ اس کی اطلاع پر دریشہ نے سخت ہراساں نظروں سے اسے دیکھا۔ ”اب کیا ہو گا.....؟“

”کچھ نہیں، بس تھوڑا سا مستری کا کام ہے.....“ اس نے سراٹھا کر دریشہ کا خوفزدہ چہرہ دیکھا۔ ”یہ آپ کو کیا ہوا؟ اتنی ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں.....؟ اس نے شرارت بھری سنجیدگی سے پوچھا۔

”ظاہر ہے اس طرح کے حالات میں ہر نارمل انسان پریشان ہو سکتا ہے، میں نے کون مانا تو کھا کام کیا ہے.....“ دریشہ چڑ گئی تھی، نہ جانے کیوں آج اسے بار بار غصہ کیوں آ رہا تھا، دیکھنے سے قاصر تھی۔

”آپ کے اس طرز پریشان ہونے سے کیا گاڑی خود بخود ٹھیک ہو جائے گی.....؟“

بندے کی مت ماری جاتی ہے اور میں تو ارسلہ کی طرح بالکل بھی مضبوط اعصاب کی مالک نہیں.....“

”میرا خیال اس کے برعکس ہے، آپ ارسلہ سے زیادہ مضبوط ہیں اور اس کی طرح بالکل بھی جذباتی نہیں.....“ دریشہ نے بوکھلا کر اس کی شکل دیکھی جس کی نظریں سامنے سڑک پر تھیں۔

”آپ کیسے کہہ سکتے ہیں.....؟“ دریشہ کو حد درجہ تعجب ہوا تھا۔ وہ بڑی مہارت سے گاڑی کا موڑ کاٹتے ہوئے بولا تھا۔ ”میں نے میڈم شائستہ کی ڈیجھ والے دن آپ کو دیکھا تھا، آپ ارسلہ کے مقابلے میں بہت حوصلے سے تھیں اور جس طرح اسے سنبھال رہی تھیں وہ بھی حیران کن تھا۔ پروفیسر صاحب اکثر آپ کی تعریف کرتے ہیں.....“

”میری تعریف کرتے ہیں؟“ وہ سخت حیران ہوئی۔ ”حالانکہ میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ ارسلہ کے زیادہ قریب ہیں اور ارسلہ نے ان کی خواہش کے مطابق CSS کیا، جبکہ میں ماما کے زیادہ قریب تھی اور ماما کی آرزو تھی کہ ان کی ایک بیٹی ڈاکٹر بنے۔“ وہ ناخن کھرچتی ہوئی بے نیازی سے بولی تھی۔

”اچھا، ہو سکتا ہے، لیکن میں نے ہمیشہ ان کو ارسلہ کی بجائے آپ کی تعریف کرتے زیادہ سنا ہے.....“ وہ سادہ سے انداز میں کہہ رہا تھا۔ وہ انتہائی سکون سے گاڑی چلا رہا تھا، چونکہ رات کافی زیادہ ہو چکی تھی۔ اس لئے باہر سڑک پر ٹریفک کم تھی زیادہ تر بڑے بڑے ٹرک اور ٹرالر ہی چل رہے تھے۔ وہ لوگ موٹروے سے اب پنڈی بھٹیاں والی سڑک پر تھے، جو خاصی خراب تھی۔ اس لئے گاڑی ہچکولے کھا رہی تھی۔

”بہت گنداروڈ ہے یہ.....“ دریشہ ناگواری سے بولی۔ ”کیا کیا جائے، اب کبیر والہ تک ایسی ہی سڑک کو برداشت کرنا پڑے گا۔“ وہ رست وادج سے ٹائمر دیکھتے ہوئے فکر مندی سے اسے بتا رہا تھا۔ اسی دوران گاڑی تھوڑا سا جھکا کما کر چلتے چلتے اچانک ہی رکی تھی۔ انجن نے کچھ لمحوں کے لئے شور مچایا اور اس کے بعد ساکن ہو گیا۔

”یہ کیا ہوا.....؟“ دریشہ کا دل دھک کر رہ گیا تھا۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے اس سنان سڑک کو دیکھا جس کے دائیں بائیں گندم کے کھیت تھے۔

پرتابو پایا تھا وہ اب لائق سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”آپ ٹینس نہ ہوں، اللہ بہتر کرے گا.....“ وہ اب بہت نرمی سے اس سے مخاطب تھا۔  
 ”نہیں! میں ادھر ہی ٹھیک ہوں.....“ اس نے سنجیدگی سے جواب دیتے ہوئے سامنے  
 جھاڑیوں میں دیکھنے کی کوشش کی، جہاں پر کسی جانور کی موجودگی کا احساس ہی اتنا خوفناک تھا  
 کہ اس کے چہرے پر بڑی برق رفتاری سے خوف کی پرجائیاں پھیلی تھیں۔ اہتاج نے چونک  
 کر اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور اسے تسلی دی۔

”میرا خیال ہے کہ وہاں جھاڑیوں میں کوئی گیدڑ ہے یا کوئی آوارہ کتا“ میں دیکھتا  
 ہوں.....“ وہ جیسے ہی آگے بڑھنے لگا، وریشہ نے بلا ارادہ اور بے ساختہ اس کا بازو پکڑا تھا۔  
 ”دفع کریں! پتا نہیں کیا چیز ہو، ہم گاڑی میں جا کر بیٹھتے ہیں.....“ خوف کے ایک بے ساختہ قسم  
 کے احساس کے زیر اثر اس نے بالکل لاشعوری طور پر اس کا بازو صرف ایک لمحے کو پکڑا تھا اور  
 اگلے ہی لمحے اپنی حرکت کا احساس ہوتے ہی وہ شپٹا گئی۔ اس کا سرخ چہرہ اہتاج نے بڑی  
 دلچسپی سے دیکھا تھا۔ چاند کی روشنی میں اس کے چہرے کے تاثرات بہت واضح تھے۔

”اُس اوکے.....!“ اس کا انداز متبسم و شریک تھا، جبکہ وریشہ خفت زدہ ہو کر خود کو اس بے  
 اختیار حرکت پر دل ہی دل میں کوس رہی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات اس قدر دلچسپ  
 تھے کہ اہتاج زور سے ہنس پڑا، جیسے کوئی پر لطف بات سنی ہو، جبکہ وہ اس کی معنی خیز ہنسی سمجھنے  
 سے بالکل قاصر تھی۔ اچانک ہی پولیس کی گشت کی گاڑی ان کے پاس آ کر رکی تھی۔ وریشہ فوراً  
 ہی گاڑی میں جا کر بیٹھ گئی تھی۔

پولیس کی گاڑی کی لائیں روشن تھیں، اس لئے سامنے کا منظر بالکل واضح تھا۔ وہ ان  
 دونوں سے گفت و شنید کرنے میں مگن تھا اور وریشہ کا دل بے قابو ہو رہا تھا۔ وہ عجیب سی  
 کیفیات میں گھر گئی تھی۔ وہ ابھی تک اس نظر کے حصار میں تھی۔ جب اس نے لاشعوری طور پر  
 اس کا بازو پکڑا تھا۔ تب اس نے اس قدر حیرت سے اسے دیکھا تھا کہ وریشہ کو اس کے  
 تاثرات بھلائے نہیں بھولتے تھے۔

”ہر مشکل اور ہر پریشانی کا اللہ پاک کوئی نہ کوئی حل ضرور نکال دیتا ہے، بس اللہ پر  
 بھروسہ ہونا چاہیے.....“ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بہت متوازن لہجے میں اس سے  
 مخاطب ہوا تھا۔

دونوں بازو سینے پر باندھے اسے انتہائی سکون سے کھڑے دیکھ کر وریشہ کو اس پر بے ساختہ  
 رہنمائی آیا تھا۔

”ایسے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے سے بھی ٹھیک نہیں ہوگی.....“ اس کے طنزیہ انداز  
 پر اہتاج قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔ رات کے سناٹے میں اس کی آواز دور تک گئی تھی۔

”چلیں آپ کو میرے ہاتھ باندھنے پر اعتراض ہے تو میں سیدھا کھڑا ہو جاتا  
 ہوں.....“ رات کے اس پہر اس کی شوخی وریشہ کو سخت بری لگی تھی۔ اس لئے وہ خاموش رہی۔  
 اسی وقت ایک ٹرک ست روی سے چلتا ہوا ان کے پاس آ کر رکا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ آپ اندر جا کر بیٹھیں! اس طرح آپ کا سڑک پر کھڑے ہونا  
 مناسب نہیں.....“ وہ بہت مہذب انداز میں اس سے مخاطب ہوا تھا۔ ٹرک سے دو بندے اتر  
 کر ان کی جانب آ رہے تھے۔ وریشہ فوراً گاڑی میں جا کر بیٹھ گئی، لیکن اس کا سارا دھیان ان  
 کی گفتگو کی طرف تھا۔ اسے تھوڑا سا غور کرنے پر اندازہ ہوا کہ وہ لوگ پشتو میں گفت و شنید کر  
 رہے تھے، جسے سمجھنے سے وہ قاصر تھی۔

وہ تینوں اب ایک دفعہ پھر گاڑی کے انجن پر جھکے ہوئے تھے۔ اہتاج نے ایک دفعہ پھر  
 گاڑی کو اشارت کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ پھر مایوس ہو کر سرنفی میں ہلانے لگا۔ اس کے  
 بعد ٹرک ڈرائیوروں نے دھکا لگا کر گاڑی کو ایک سائیڈ پر کیا۔ انہوں نے پھر دوبارہ آپس میں  
 کوئی بات کی اور اس کے بعد وہ اپنا ٹرک اشارت کر کے لے گئے۔ ان کے جاتے ہی وریشہ  
 بجلی کی سی تیزی سے نیچے اتری اور بے تابی سے بولی۔

”کیا ہوا.....؟ یہ لوگ کیوں چلے گئے.....؟“  
 ”ظاہر ہے، جانے والوں نے جانا ہی ہوتا ہے، کوئی کسی کے لئے کتنا ٹھہر سکتا ہے.....“  
 رات کے اس پہر وہ اس کا فلسفہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

”آپ نے ان کو کیوں جانے دیا.....؟“ وریشہ قدرے زچ ہو کر بولی تھی۔  
 ”کمال کرتی ہیں آپ! میں ان کو بھلا کیسے روک سکتا تھا.....“ اہتاج نے طنزیہ مسکراہٹ  
 کے ساتھ جتایا تو وہ چپ کی چپ رہ گئی۔

”فکرمات کریں! ان لوگوں نے وعدہ کیا ہے کہ آگے جا کر کسی ملکیت کو بھیجیں گے.....“  
 اس کی خاموشی پر اس نے مسکراتے ہوئے تسلی دی، جبکہ وریشہ نے بڑی سرعت سے اپنی کیفیت

یا قنوطیت کا ہی کیوں نہ ہوا سے بدلنا ہی ہوتا ہے۔ یہ ہی فطرت کا قانون ہے۔“ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”اور پتا ہے کہ غیر موافق حالات بھی اسپینڈ بریکر کی طرح ہوتے ہیں، کبھی کبھی تو اچانک ہی سامنے آ جاتے ہیں، وقتی طور پر جھکا ضرور لگتا ہے، لیکن کچھ ہی دیر بعد زندگی کی سڑک پھر ہموار ہو کر رواں دواں ہو جاتی ہے۔“

”آپ مجھے کیا سمجھانا چاہتے ہیں.....؟“ ایک پریشانی نے بے ساختہ ہی اس کا دامن پکڑا تھا۔ وہ بری طرح گھبرائی تھی۔ ابہتاج کا قہقہہ بڑا بے ساختہ اور جاندار تھا، اس نے اس کی بات کو خاصا انجوائے کیا تھا۔

”میں تو ویسے ہی کچھ فلسفہ چھاڑنے کے موڈ میں تھا، آپ نے سارا موڈ ہی غارت کر دیا، بانی داوے آپ چھوٹی چھوٹی چیزوں سے گھبرا کیوں جاتی ہیں.....“

”اس لئے کہ مجھے ٹارزن بننے کا کوئی شوق نہیں.....“ اس بار وریشہ نے قدرے تحمل سے کہا۔ وہ پھر ہنس پڑا۔

”کیوں ٹارزن انسان نہیں ہوتے کیا.....؟“ وہ اسی کے انداز میں بولا تھا۔ اس کا موڈ خاصا خوشگوار ہو چکا تھا۔ حالانکہ رات کے دو بج رہے تھے۔

”پتا نہیں.....“ وہ بے زاری سے بولی تھی۔

”اچھا یہ بتائیں کہ آپ نیکسٹ کس میں اسپیشلائزیشن کریں گی، خدا کے واسطے یہ مت کیجے گا کہ گائنی میں.....“ اس نے میڈیکل کے حوالے سے اس سے پوچھا تھا۔

”بے فکر رہیں، میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں.....“ وریشہ نے ابرو اچکا کر کہا تھا۔

”اچھا..... پھر کس میں.....؟“ وہ بڑی مہارت سے گاڑی چلاتے ہوئے اس سے پوچھ رہا تھا، وریشہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ صرف اپنی نیند کو بھگانے کے چکر میں اس سے زبردستی گفتگو کر رہا تھا۔

”میرا ارادہ نیورولوجی میں جانے کا ہے، ہمارے ملک میں نیوروفزیشن کی تعداد بہت کم ہے.....“ اس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔

”اگر تعداد کی بات کرتی ہیں تو پاکستان میں خواتین انکولوجسٹ (ماہر سرطان) کی تعداد اس شعبے میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ کچھ سال پہلے ایک سروے ہوا تھا اور مجھے سخت حیرت ہوئی کہ پاکستان میں اس وقت صرف چھ خواتین تھیں.....“ وہ بھی حد درجہ سنجیدہ تھا۔ وریشہ نے

وریشہ نے چونک کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ بولا۔ ”بس پانچ منٹ میں ملینک یہاں ہوگا، پولیس والے اسے لینے گئے ہیں.....“

”حیرت ہے آپ نے پولیس والوں کی بات کا اعتبار کر لیا.....“ اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے سادگی سے کہا۔

”کیوں نہیں کرنا چاہیے تھا کیا.....؟“ وہ ہمہ تن گوش ہوا۔

”ظاہر ہے کہ ان کا ایجنج ایسا بن چکا ہے کہ اعتبار کرنا بے وقوفی ہی لگتی ہے.....“ اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

”آپ کا کیا خیال ہے کہ اس شعبے کے سارے لوگوں کا ایجنج ہی منفی ہے، ان میں اچھے لوگ کوئی نہیں.....؟“ وہ بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا، وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

”نہیں، خیر ایسا بھی نہیں.....“ وہ اب خاموشی سے اپنی دوسری انگلی میں پہنی ہوئی انگلی کو بہت فرصت سے گھما رہی تھی۔

”وریشہ انصاری! زندگی گزارنے کے لئے اگر ہم مثبت رویہ اپنالیں تو یقین کریں زندگی بہت آسان ہو جاتی ہے، اللہ انسانوں کو وہ ہی دیتا ہے جس کا وہ گمان کرتے ہیں.....“ اس کی بات پر اس نے دہل کر اسے دیکھا۔

”اللہ نہ کرے جو میں اس وقت سوچ رہی ہوں ویسا ہو جائے.....“ وہ یکدم خشکی سے بولی تھی۔ وہ اس کے اس انداز پر محظوظ ہوا۔ ”اس لئے تو کہہ رہا ہوں کہ اچھا اچھا سوچا کریں.....“ اس نے مفت مشورہ دیا تھا۔

اگلے ہی پانچ منٹ میں پولیس وین واپس آ گئی تھی۔ ابہتاج نے کچھ بتاتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا تھا جو بے اختیار جھپٹ گئی تھی۔ پرانے سے کپڑوں میں جمائیاں لیتا ہوا ملینک اب انجمن پر جھکا ہوا تھا۔ کوئی تھوڑا سا ہی کام تھا، وہ جیسے ہی ہاتھ جھاڑتا ہوا کھڑا ہوا۔ ابہتاج نے فوراً گاڑی اشارت کی۔ انجمن اس دفعہ پوری قوت سے جاگ اٹھا تھا۔ وریشہ کے چہرے پر بڑی بے ساختہ سی خوشی جھلکی تھی۔ ”تھینکس گاڈ!“ اس نے خلوص دل سے کہا تھا۔

اگلے ہی دس منٹ میں گاڑی اب پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔

”زندگی بھی گاڑی کی طرح ہوتی ہے، کبھی کبھی پریشانیوں کے کسی جھکے سے رک سی جاتی ہے اور ہمیں لگتا ہے کہ یہ کبھی چلے گی ہی نہیں، لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ کوئی بھی موسم چاہے وہ ہالو

چونک کر اسے دیکھا۔

”ہاں ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ اصل میں خواتین ڈاکٹر کی ایک بڑی تعداد گائے میں چلی جاتی ہے، لیکن اب ٹریڈ تبدیل ہو رہا ہے اب تو لڑکیاں ان شعبوں میں بھی نظر آتی ہیں جو پہلے صرف مردوں کے لئے مخصوص سمجھے جاتے تھے۔ اب تو آرتھوپڈک شعبے میں بھی کافی لڑکیاں دیکھائی دینے لگی ہیں.....“ وریشہ نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ پھر کچھ یاد آنے پر بولی۔

”آپ کیا کرتے ہیں.....؟“

”کچھ خاص نہیں، بس زندگی گزار رہے ہیں.....“ وہ بہت عاجزی سے بولا تھا۔

”کیا کوالیفیکیشن ہے آپ کی.....؟“ وہ سادہ سے انداز میں گویا ہوئی۔

”ایک نالائق بندے کی کیا کوالیفیکیشن ہو سکتی ہے.....؟“ اس نے صاف ٹالا تھا۔

”خیر نالائق تو آپ نہیں ہو سکتے.....“ اس نے سامنے لمبی سرک کو غور سے دیکھتے ہوئے

کہا۔

”کیوں.....؟“ وہ ہنسا اور دلچسپی سے پوچھا۔

”اس لئے کہ میرے بابا نالائق لوگوں کو کوئی لفٹ نہیں کرواتے۔“ اس کے شرارتی انداز پر اس نے ایک زوردار تہقہ لگایا تھا۔ وریشہ نے بوکھلا کر اس کی شکل دیکھی۔

”خیر ایسی بھی کوئی بات نہیں میں واقعی بہت نالائق تھا، ارسلہ کے نوٹس پڑھ کر پاس ہوتا رہا ہوں۔“ اس نے بڑی مہارت سے موڑ کاٹتے ہوئے کہا تھا۔ اس کی آنکھیں شرارت سے جگمگا رہی تھیں۔ وریشہ کو پہلی دفعہ احساس ہوا تھا کہ اس کی آنکھیں نامی چمکدار اور روشن ہیں۔

”یہ بات تو میں مرکر بھی نہیں مان سکتی، کیونکہ ارسلہ اپنے نوٹس دینے کے معاملے میں بہت پٹی ہے۔ وہ اپنا لکھا ہوا ایک لفظ بھی کسی سے شیر نہیں کرتی۔ اس معاملے میں وہ بہت بد لحاظ ہے۔“ اس کی صاف گوئی پر ابہتاج نے باقاعدہ مڑ کر اسے دلچسپی سے دیکھا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست کئے بہت اطمینان سے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ بے تحاشا خوبصورت تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے سنگ مرمر سے تراشے ہوئے ہوں ابہتاج کچھ لمحوں کے لئے اس کے ہاتھوں سے نظریں ہٹاتا بھول گیا تھا۔ گاڑی ایک دم ہی اچھلی تھی۔

”سوری میں نے اسپڈ بریکر دیکھا نہیں.....“ وہ اپنا سر سہلاتے ہوئے ایک دم شرمندہ

ہوا تھا۔ وریشہ نے بمشکل اپنی ہنسی کو روکا تھا۔

”ایسے ہی اسپڈ بریکر کی کچھ دیر پہلے آپ بات کر رہے تھے ناں جو زندگی میں بھی اچانک آ جاتے ہیں، لیکن دیکھ لیں کچھ دیر کے لئے حواس باختہ تو کر دیتے ہیں ناں.....“ اس کے باقاعدہ جتانے پر وہ بے ساختہ مسکرایا تھا۔ اس کا اب سارا دھیان ڈرائیونگ کی طرف تھا۔

”آپ اگر تھک گئی ہیں تو سیٹ کو پیچھے کر کے ریٹ کر لیں۔ میری ٹینشن نہ لیں، میری نیند اڑ گئی ہے۔ اب میں آرام سے ڈرائیونگ کر سکتا ہوں۔“ وہ بہت سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھے بغیر کہہ رہا تھا۔

”اٹس اوکے.....!“ وریشہ نے تھوڑا سا سیٹ کو ریلکس کیا۔ وہ اب کیسٹ پلیئر چلا رہا

تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد گاڑی میں مغنیہ کی آواز گونج رہی تھی۔ ”ہم کہ ٹھہرے اجنبی، کتنی

مدارتوں کے بعد، پھر بنیں گے آشنا، کتنی ملاقاتوں کے بعد۔“

وہ آواز کے سوز اور شاعری کو غور سے سن رہی تھی باہر بالکل سناٹا تھا، سڑک پر اکا دکا

ٹریفک تھی، اس لئے وہ پوری قوت سے گاڑی کو دوڑا رہا تھا۔ اس نے سیٹ کی پشت کے ساتھ

ٹیک لگا کر ٹانگیں احتیاط سے قدرے پھیلا لی تھیں۔ اسے معلوم ہی نہیں ہوا کہ شاید کوئی تیسری

غزل تھی، جب اس کی آنکھ لگ گئی اور کچھ ہی دیر بعد وہ گہری تھکن کے احساس کے تحت نیند کی

واد یوں میں کھو چکی تھی۔ مختلف گاڑیوں کے ہارن اور شور کی آوازیں اس کی آنکھ کھلی تو وہ

سٹپٹا گئی۔ چمکدار دن پوری آب و تاب کے ساتھ نمودار ہو چکا تھا۔ باہر اچھی خاصی دھوپ تھی۔

وہ گاڑی ایک پٹرول پمپ پر روک چکا تھا۔ ”سامنے واش روم ہیں، آپ فریش ہو

جائیں.....“ ابہتاج کی آواز سے وہ ایک دم ہوش کی دنیا میں آئی تھی اور اسے فوراً احساس ہوا

تھا کہ وہ کہاں ہے، تبھی وہ ہڑبڑا کر ٹھیک ہو کر بیٹھ گئی۔ ”آپ نے مجھے اٹھایا ہی نہیں.....“ اس

نے شرمندگی سے وقت دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ نے اٹھ کر کیا کرنا تھا.....“ اس نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا، ٹھنکا، اور چند

لمحوں کے لئے اس کے خوابیدہ حسن سے نظریں ہٹاتا ہی بھول گیا۔ اس نے اپنے آپ سے

خائف ہوتے ہوئے بمشکل نظریں ہٹائی تھیں اور فوراً ہی دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

وریشہ بھی اس کے پیچھے ہی باہر نکل آئی۔ اس پٹرول پمپ کے واش روم خاصے صاف

”آپ کو ان کی سمجھ آ رہی ہے.....“ اس نے ہنستے ہوئے پوچھا، وہ اپنے گھر آ کر خاصا

خوش تھا۔

”بس کچھ کچھ لفظوں کی سمجھ آ رہی ہے اور کچھ کی نہیں.....“ اس نے بے بسی سے

اعتراف کیا۔

”اچھا، یہ تو پتا چل رہا ہے ناں کہ آپ کی آمد ان کے لئے خوشی کا باعث بن رہی

ہے.....“

”ہاں اس کا تو پتا چل رہا ہے کہ سب بہت پیار کرنے والے لوگ ہیں.....“ اس نے

صاف گوئی سے کہا۔

”آپ کو پتا ہے ابھی بے بے کہہ رہیں تھیں کہ پیار کی بولی سب کی سمجھ میں آ جاتی

ہے.....“ اس نے ہنستے ہوئے انکشاف کیا۔

”ریٹلی.....؟“ اس نے ہنستے ہوئے اماں کا کمزور اور ضعیف سا ہاتھ تھاما تو ان کے

چہرے پر بڑی خوبصورت روشنی پھیلی تھی۔ وہ سرانگی میں ابہتاج سے کچھ کہہ رہیں تھیں.....

”کیا کہہ رہی ہیں.....؟“ دریشہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

”ان کو اس چیز کی بہت خوشی ہے کہ آپ ڈاکٹر ہیں۔ کہہ رہی ہیں کہ سب خواتین کو آپ

سے ملوائیں گی۔ انہوں نے میری چھوٹی بہن کو ساتھ والے گاؤں سے بلوانے کے لئے بندہ

بھی بھیج دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ آپ کو بہتر کمپنی دے سکتی ہے۔“ وہ اب سامنے بیٹھا

بڑے ذوق و شوق سے لسی کا بڑا سا گلاس تھامے پی رہا تھا۔ اماں کو اور وہاں موجود خواتین کو

اردو تو سمجھ آ رہی تھی لیکن بولنے سے ہچکچا رہی تھیں۔ صرف ابہتاج کی بوا تھیں جو بلا جھجک ٹوٹی

پھوٹی ہی سہی لیکن بہت اعتماد کے ساتھ اس سے بول رہی تھیں۔ اماں نے بھی کچھ چھوٹے

چھوٹے سے سوالات کئے تھے۔

”اودہ آپ کی بہن کہاں رہتی ہیں؟“ اس نے ویسے ہی پوچھا تھا۔

”اس کی چھ ماہ پہلے ساتھ والے گاؤں میں شادی ہوئی ہے۔ وہ ہر ہفتے چکر لگاتی رہتی

ہے.....“ وہ جب سے ایک اور گلاس لسی کا بھر رہا تھا۔

”ہماری والدہ بہت سادہ خاتون ہیں، لیکن پڑھے لکھے لوگوں کی بہت قدر کرتی ہیں۔“

اس کے لہجے میں اپنی والدہ کے لئے حد درجہ عقیدت اور لگاؤ تھا۔ اس کے سامنے ناشتے کی

ستھرے تھے۔ اس لئے اس نے اطمینان سے نہ صرف منہ ہاتھ دھویا بلکہ برش بھی کیا تھا۔ اسے باہر نکل کر اچھی خاصی گرمی کا احساس ہوا تھا۔ دھوپ میں خاصی تپش تھی۔ وہ گاڑی میں آ کر بیٹھی تو اس نے دیکھا وہ دو ڈسپوزیبل کپوں میں گرم گرم چائے لئے بیٹھا تھا۔ دریشہ نے آرام سے چائے کا کپ پکڑ کر منہ سے لگا لیا تھا۔ چائے کی کمزوری تھی۔

”کتنا سرفرہ گیا اب.....؟“ وہ اطمینان سے پوچھ رہی تھی۔

”ہم ملتان پہنچ چکے ہیں اب گاؤں کی طرف جا رہے ہیں، مزید ایک گھنٹہ اور لگے گا۔“

اس نے رسٹ واپ پر ٹائم دیکھتے ہوئے کہا۔ اگلے ہی پانچ منٹوں بعد وہ اپنا سفر شروع کر چکے

تھے۔ اسی وقت بابا کی غیر متوقع کال نے اس کے اندیشے کافی حد تک دور کر دیئے تھے۔ وہ

اب خاصی مطمئن تھی۔



ان کی زبان وہ سمجھ نہیں سکتی تھی، لیکن محبت اور اشاروں کی زبان اس کے لئے اجنبی نہیں

تھی۔ گاؤں میں بلند و بالا حویلی نما بڑے سے گھر میں پہنچتے ہی اس کا بہت والہانہ استقبال ہوا

تھا۔ وہیں چل کر اس پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ وہ اسے لے کر اپنے گھر آیا ہے اس سے پہلے تو

وہ یہ ہی سمجھتی رہی تھی کہ بابا کے کسی دوست کے گھر میں چھوڑنے جا رہا ہے، لیکن حویلی میں

پہنچتے ہی اس کی غلط فہمی دور ہو گئی تھی۔ اس کی آمد کی پہلے سے ہی اطلاع تھی۔ اس لئے خاصے

جوش و خروش سے سب اس سے ملے تھے۔ ان کی زمینوں پر کام کرنے والے مزارعوں کے

گھروں کی خواتین اس کے ارد گرد جھکھٹا لگائے کھڑی تھیں۔ وہ تو اس بڑے سے صحن والی

حویلی کے بہت سے کمروں میں کہیں گم ہو چکا تھا۔ اس کے ارد گرد کھڑی دیہاتی عورتیں اسے

انتہائی محبت اور اشتیاق سے دیکھ رہی تھیں۔

”اسے آپ لوگوں کی بولی سمجھ نہیں آتی“ اس لئے آپ لوگ اپنا وقت ضائع نہ

کریں.....“ وہ تو لیے سے بال خشک کرتا ہوا باہر آیا تھا اور اب ہنستے ہوئے ان خواتین کو

سرانگی میں چھیڑ رہا تھا۔ وہ ابھی ابھی شاور لے کر آیا تھا اس لئے خاصا فریش تھا۔

”پیار کی بولی جو بھی ہو اگر بندہ قدر کرنے والا ہو تو سمجھ ہی لیتا ہے.....“ بڑے سارے

سبز لکڑی کے تخت پوش پر لیٹیں بے بے نے محبت بھرے انداز میں کہا تھا۔ وہ خاصی پیار تھیں۔

اس کا اندازہ دریشہ کو فوراً ہی ہو گیا تھا۔ وہ بالکل ان کے پاس بیٹھی تھی۔

”سوری مجھے تابندہ کہتے ہیں میں اب تاج بھائی کی چھوٹی بہن ہوں.....“ وہ بہت شائستگی سے اپنا تعارف کروا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بڑی چمک اور ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ تھی۔

”اوہو نائکس ٹو میٹ یو.....!“ وریشہ کو اسے دیکھ کر حقیقتاً خوشی ہوئی تھی۔ ”مجھے وریشہ کہتے ہیں.....“ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

”وریشہ نہیں ڈاکٹر وریشہ انصاری.....“ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے تابندہ نے اس کی تسخ کرتے ہوئے شرارتی لہجے میں کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”کوئی فرق نہیں پڑتا اس سے.....“ اس نے سادگی سے کہا۔

”بہت فرق پڑتا ہے جناب! اتنی محنت سے تو ڈاکٹر بننے ہیں پھر نام کے ساتھ بھی نہ لگائیں تو کیا فائدہ.....؟“ وہ خاصے دوستانہ مزاج کی حامل تھی۔ وریشہ کو ایک منٹ میں اس چیز کا اندازہ ہو گیا تھا۔

”کیسی ہیں آپ.....؟“ بھائی کو آپ کی بہت ٹینشن تھی۔ اس لئے خود ہی لینے آگئے ان کو ڈیوٹی پر جانا تھا اس لئے فوراً ہی نکل گئے۔

”کہاں چلے گئے.....؟“ اسے سخت حیرت ہوئی۔

”سرگودھا آج کل ان کی وہیں پوسٹنگ ہے ناں.....“ وہ سادگی سے کہہ رہی تھی۔ جب کہ مزید تفصیل جاننا اس نے مناسب نہیں سمجھا۔ اس لئے اس موضوع پر مزید بات نہیں کی۔

”کون کون رہتا ہے یہاں.....؟“ اس نے اندر بھیلی مایوسی کو چھپانے کے لئے ویسے ہی پوچھا۔

”پہلے تو بہت سارے لوگ تھے چچا کی فیملی تھی ان کے دو بچے تھے اور وہ دونوں نارروے میں سیٹل ہو گئے چچی کا انتقال ہو گیا تو چچا بھی چلے گئے۔ اب یہاں اماں کے ساتھ پھوپھو اور پھوپھا ہوتے ہیں۔ ان کے بچے نہیں ہیں اس کے علاوہ کچھ مزارعے ہیں ان کو پچھلے محن کی طرف گھر بنا کر دیئے ہوئے ہیں جبکہ ہمارے بابا کی وفات کو بھی اب تو پانچ سال ہو چکے ہیں۔ زمینوں کا حساب کتاب پھوپھا جی سنبھالتے ہیں۔“ اس نے تفصیل سے بتایا۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے محن میں بنی کیاریوں کے پاس آ گئی تھیں۔ وریشہ نے پھولوں کی ایک ٹہنی

ٹرے لگا دی گئی تھی۔ وہ اتنا بھاری ناشتہ دیکھ کر گھبرا گئی ”میں اتنا ہیوی ناشتہ نہیں کرتی.....“ اس نے دیسی مرغ کا کھی میں تر بتر سالن اور پراٹھے دیکھ کر کہا تھا۔

”کوئی بات نہیں سادہ روٹی بھی ہوگی.....“ اب تاج نے اس کی مشکل آسان کی۔ وہ تھوڑی سی آلو کی بجلیا نکال کر سادگی سے کھا رہی تھی۔ اماں بار بار اس سے کچھ اور لینے کا اصرار کر رہی تھیں۔ وہ نیچے کے ساتھ ٹیک لگا کر بمشکل بیٹھی تھیں۔ ناشتہ کرنے کے بعد وہ مہمان خانے میں چلی گئی شاور لے کر اس نے اسے سی آن کیا اور کچھ ہی دیر بعد وہ خاصی گہری نیند میں تھی۔ گھریلو ملازمائیں کئی دفعہ اسے آ کر دیکھ چکی تھیں۔

شام میں جب وہ اٹھی تو ایک بھر پور نیند کے بعد وہ خاصی تروتازہ ہو چکی تھی۔ بالوں میں برش کر کے وہ باہر آئی تو ایک خوبصورت شام اس کی منتظر تھی۔ وہ کچھ جھجکتے ہوئے باہر نکلی تو بڑے سارے محن کے ارد گرد بنے بڑے بڑے برآمدے اور ان میں چار پائیاں بچھا کر بڑے اہتمام سے سفید چادریں بچھائی گئی تھیں۔ ان پر مختلف خواتین بے تکلفی سے بیٹھی ہوئی تھیں۔ برآمدے کے ایک کونے میں بنے تندور میں آگ دہک رہی تھی اور دو خواتین بہت مہارت سے اس میں روٹیاں لگا رہی تھیں۔ اس نے پہلی دفعہ غور سے محن میں لگے جامن کے بڑے سے درخت کو دیکھا جس پر موسم کا پھل لگ چکا تھا۔ محن کے ایک طرف بے شمار کیاریاں تھیں اور ان میں موسم کی سبزیاں لگی ہوئی تھیں۔ وریشہ کو باہر آتے دیکھ کر سب نے تجسس سے اسے دیکھا ان سب کے کام کرتے ہاتھ ایک منٹ کو ساکت ہوئے تھے۔ وہ کچھ سوچ کر اماں کی بڑی ساری چارپائی کی طرف آئی انہوں نے بہت محبت سے اسے دیکھا تھا۔ اس نے جھک کر سلام کیا تو انہوں نے لیٹے لیٹے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ محبت کی اس تاثیر کو اس نے دل تک محسوس کیا تھا۔ وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ اس نے ان کے بازو کو ہاتھ لگایا تو وہ چونک گئی۔

”آپ کو بخار ہے.....؟“ اس نے تشویش زدہ انداز سے پوچھا۔ وہ پھیکے سے انداز کے ساتھ مسکرا دیں۔

”السلام علیکم! آپ وریشہ ہیں ناں.....؟“ کوئی ایک دم پیچھے بے آ کر بولا تھا۔ وریشہ نے بے ساختہ مڑ کر گلابی رنگ کے خوبصورت سے لان کے سوٹ میں ملبوس اس نازک سی لڑکی کو دیکھا۔ اس کے انداز میں بچوں کی سی سادگی اور بے ساختگی تھی۔ وریشہ نے مسکرا کر اس کے خوبصورت نقوش کو دیکھا وہ جھینپ گئی۔

پر بیٹھی اداس سی تلی کو دیکھا۔

”آپ دوہنیں ہیں ناں.....؟“ وہ اشتیاق سے پوچھ رہی تھی۔

”ہوں.....!“ ایک اداس سی مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں کا احاطہ کیا تھا۔

”بھائی اکثر آپ لوگوں کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ خصوصاً آپ کے بابا سے وہ بہت متاثر ہیں۔ وہ بہت محبت سے بتا رہی تھی۔ وہ دونوں چلتے چلتے گھر کے پیچھے بنے بڑے سارے صحن میں آگئی تھیں۔ یہاں چار پانچ بھینسیں اور کافی ساری بکریاں بندھی ہوئی تھیں۔ وریشہ نے کونے میں بنے ٹیوب ویل کو بہت دلچسپی سے دیکھا۔ وہ چل رہا تھا۔ سفید شفاف پانی ایک منہ زور جھرنے کی طرح بہہ رہا تھا۔ وہ بے اختیار سینٹ کے بنے بڑے سارے حوض پر بیٹھ گئی۔ ہاتھوں کی اوک میں پانی بھرتے ہوئے اس نے تابندہ سے یونہی پوچھا.....“ تم سارا دن گھر میں کیا کرتی ہو.....؟“

”آدھا دن تو میرا کالج میں گزر جاتا ہے.....“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”کالج میں؟ پڑھ رہی ہو؟“ وریشہ نے ہتھیلیوں میں پانی بھر کر اپنے چہرے پر اچھالا۔

”نہیں پڑھا رہی ہوں.....“ وہ کھلکھلا کر ہنسی اور وریشہ نے سخت بے یقینی سے اسے

دیکھا۔ ”تم لیکچرر ہو.....؟“

”ہاں کیوں لگتی نہیں ہوں کیا.....؟“ اس کی آنکھوں میں مسرت کا احساس بڑا فطری

ساتھا۔

”بالکل بھی نہیں کون سا بجیکٹ ہے تمہارا؟“ وریشہ نے تجسس سے پوچھا۔

”انگلش لٹریچر.....“ وہ اس کی حیرت سے محظوظ ہوتے ہوئے بولی تھی۔

”اچھا کہاں سے کیا ماسٹرز.....؟“

”ماسٹرز میں نے پنجاب یونیورسٹی سے کیا تھا.....“ وہ خوشدلی سے بتا رہی تھی۔

”ویری ٹائس.....!“ وریشہ نے کھلے دل سے اسے سراہا تھا۔ ”دیے مجھے توقع نہیں تھی.....“ اس نے صاف گوئی سے کہا تھا وہ ایک دفعہ پھر پانی اب فضا میں اچھال رہی تھی۔

”ہاں ہمارے گاؤں کو دیکھ کر آپ نے اندازہ لگایا ہوگا۔ ہم لوگ آج کے دور میں بھی

بہت پیچھے ہیں۔ یہاں ابھی تک صرف ایک پرائمری سکول ہے کوئی ہسپتال نہیں۔ ہم لوگ

بہت سی بنیادی سہولیات سے محروم ہیں لیکن اللہ کا شکر ہے کہ پھر بھی ہزاروں اور لاکھوں لوگوں

سے بہتر ہیں۔“ وہ خاصی قناعت پسند تھی وریشہ کو ابھی ابھی اس چیز کا اندازہ ہوا تھا۔

”ہاں خالص آب و ہوا میں رہنے والے خالص لوگ ہیں ناں۔“ وریشہ نے ٹھنڈے

پانی سے کھیلنے ہوئے کہا۔ وہ ٹیوب ویل کے پانی سے خوب لطف اندوز ہو رہی تھی۔

”اس میں تو کوئی شک نہیں.....“ تابندہ کھلکھلائی۔ وہ بھی اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئی

تھی۔ اس نے شلوار تھوڑی سی اوپر کر کے پاؤں پانی میں ڈبو لئے تھے۔ ٹھنڈا اور بخ پانی خاصی

طمأنیت کا باعث بن رہا تھا۔

”اس گاؤں میں رہتے ہوئے تم لوگوں نے کیسے پڑھ لیا.....“ وریشہ کی بڑی بڑی بادامی

آنکھوں میں خاصی حیرانی تھی۔

”مت پوچھیں۔ اماں نے ہماری خاطر کتنے محاذوں پر جنگیں لڑیں۔ بھائی کی اسٹڈی

کے لئے تو ابا خود ہی بہت کنوشس تھے ان کو تو انہوں نے قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے

لئے باقاعدہ امریکہ بھجوا دیا جبکہ خود بھی تحصیلدار تھے اور گریجویٹ تھے لیکن گاؤں کے ماحول

اور خاندان کے رسم و رواج کی وجہ سے ہمارے معاملے میں کچھ ہچکچاہٹ کا شکار ہو گئے۔“

”اچھا پھر کیا ہوا.....؟“ وریشہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

”ہونا کیا تھا اماں میدان میں اتر آئیں۔“ تابندہ کی آنکھوں کی روشنی میں ایک دم ہی

اضافہ ہوا تھا۔ ”دھان پان سی اماں بس دیکھنے میں ہی کمزوری لگتی ہیں لیکن اپنے ارادوں کی

حد درجہ مضبوط اور ثابت قدم ہیں۔ ابا کی ان کے سامنے ایک نہیں چلی ان کا کہنا تھا کہ اگر

ابہتاج پڑھائی کے لئے ہوسٹل میں رہ سکتا ہے تو میری بیٹیوں کو کیا کانٹے لگے ہوئے ہیں.....“

”اوہ دیس گریٹ.....!“ اسے حقیقتاً سن کر خوشی ہوئی تھی۔ ”اس کے بعد کیا ہوا.....؟“

”اس کے بعد ہم دونوں بھی بھائی کے پیچھے مری میں کانویٹ میں پہنچ گئیں.....“

تابندہ کھلکھلا کر ہنسی۔

”اوہ مائی گاڈ.....! مجھے یقین نہیں آ رہا.....“ وریشہ نے سخت تعجب سے اسے دیکھا جو

خاصی زندہ دل لڑکی تھی اور اب بھی مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”کسی کو بھی یقین نہیں آیا

تھا۔ پورے خاندان کے لوگ ہر دفعہ جب ہم چھٹیوں پر گھر آتے تو ہمیں دیکھنے کے لئے ایسے

آتے تھے جیسے کوئی عجوبے دیکھنے آتا ہے۔ بھائی کا پڑھنا تو عام سی بات تھی لیکن ہم لڑکیوں کا

ہوسٹل میں رہ کر پڑھنا سب کو بہت مشکل سے ہضم ہوا تھا۔ اماں بیچاری نے ہماری خاطر بہت



تلخ جملے سہ اور ان کو صبر سے برداشت کیا۔ ہم دونوں نے بھی اماں کے اس اعتماد کو کہیں نہیں نہیں پہنچائی.....“ اس کے لہجے میں ہلکا سا فخر جھلکا تھا۔

”سارہ نے نیشنل میڈیکل کالج ملتان سے ایم بی بی ایس کیا اور آج کل اپنے میاں کے ساتھ نیوزی لینڈ میں ہوتی ہے۔ اس نے گائنی میں اسپیشلائزیشن کی تھی۔ جب بھی گاؤں آتی ہے اماں سارے گاؤں کی خواتین کا مفت میں چیک اپ کرواتی ہیں چاہے کسی کو کوئی مسئلہ ہو یا نہ ہو.....“ تابندہ کی اس بات کو وریشہ نے خوب انجوائے کیا تھا۔

”دیکھ لیجئے گا“ صبح سے آپ کے ساتھ بھی یہی ہوگا.....“ وہ ہنستے ہوئے اسے ڈرا رہی تھی۔

”اچھا.....؟“ لیکن میرا تو یہ آخری سال ہے ابھی مجھے ڈگری بھی نہیں ملی.....“ وریشہ نے گڑبڑا کر کہا۔

”بے شک نہ ملی ہو یہ اماں کا مسئلہ تھوڑی ہے.....“ تابندہ نے اسے مزید ڈرایا جبکہ وہ اس کے لہجے میں شرارت کی فراوانی سے سمجھ گئی تھی کہ وہ محض اسے تنگ کر رہی ہے۔

وہ دونوں باتیں کرتی ہوئی اندر والے حصے میں آگئی تھیں۔ مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ گھر میں خواتین کا جھگڑا کم ہو گیا تھا کھانا بن چکا تھا۔ ایک ملازمہ اماں کو ان کی چارپائی پر ہی وضو کروا رہی تھی۔ ان دونوں کو دیکھ کر ان کے چہرے پر بڑی شفیق سی مسکراہٹ دوڑی تھی ایسی مسکراہٹ جو سامنے والے کو خاصی تقویت دیتی تھی۔

”پہنائٹس کی وجہ سے اماں کا جگر کافی حد تک خراب ہو چکا تھا۔ کافی دیر بعد علم ہونے کی وجہ سے اس بیماری نے ان کو کافی نقصان پہنچا دیا ہے اب بھی علاج تو ہو رہا ہے لیکن ہر وقت ان کی وجہ سے ہم تینوں بہن بھائی بہت اپ سیٹ رہتے ہیں۔“ تابندہ نے ان کے سامنے پڑی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے فکر مندی سے کہا۔

”اوہ ٹیسٹ وغیرہ کروائے ہیں.....؟“ وریشہ کے چہرے کے تاثرات بھی بڑی تیزی سے تبدیل ہوئے تھے۔

”سب کچھ کروایا ہے کچھ عرصہ یہ لاہور بھی ایڈمٹ رہی ہیں لیکن ہسپتال کے ماحول سے یہ بہت گھبراتی ہیں اس لئے مجبوراً ہمیں یہاں لانا پڑا۔ پرسوں میں بھی میاں کے ساتھ پندرہ دن کے لئے عمرہ کرنے جا رہی ہوں ہم لوگ ان کی وجہ سے پریشان تھے۔ بھائی نے

شاید آپ کے بابا کے سامنے ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ آپ کو بھجوا دیتے ہیں۔ بھائی نے تو بہت منع کیا تھا وہ خاصے شرمندہ بھی ہو رہے تھے لیکن.....“ وہ خاصی خفت محسوس کر رہی تھی۔

”اوہ آئی سی.....!“ وریشہ کو ڈھیروں وزن اپنے اعصاب سے اترتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے ایک دم ہی بابا پر بے انتہا غصہ آیا تھا کہ اگر ایسی کوئی بات تھی تو وہ اسے صاف صاف بھی بتا سکتے تھے اس طرح ”براسرار“ طریقے سے بھجوانے کی بھلا کیا تک جنتی تھی اور وہ موصوف بھی سارے راستے منہ میں ٹھکھکیاں ڈالے بیٹھے رہے۔ دنیا جہاں کی باتیں کر لیں لیکن اصل بات کو دل کے پتھر سے باہر نہیں نکالا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس قدر رازداری رکھنے پر بابا سے لڑنے کے منصوبے بنا رہی تھی جبکہ اس کی خاموشی سے گھبرا کر تابندہ شرمندگی سے وضاحت دے رہی تھی۔

”اصل میں سارہ بھی یہاں نہیں ہے اور باقی خاندان میں کوئی بھی لڑکی پڑھی لکھی نہیں کچھ دن پہلے پھوپھو بیچاری نے کچھ غلط قسم کی میڈیسن بھی اماں کو دے دی اندازے سے جس سے خوب مسئلہ ہوا تب سے بھائی بہت ڈر گئے ہیں۔“

”اٹس اوکے یار..... نو پر ایلیم تم ٹینشن نہ لو.....“ وریشہ نے اس کی الجھن دور کرتے ہوئے تسلی دی۔ ”مجھے بابا نے بتایا تھا.....“ اس نے اس کا دل رکھنے کو غلط بیانی کی تو وہ کچھ مطمئن ہوئی۔

”تھینکس گاڈ! اصل میں میں اور سارہ تو بہت ڈرے ہوئے تھے۔ سارہ کو بھی چھٹی نہیں مل رہی تھی ورنہ وہ پاکستان آ جاتی جبکہ میرے میاں بھی آج کل ہی فارغ تھے۔“ وہ ابھی بھی وضاحت دے رہی تھی۔

”کیا ہو گیا ہے تابندہ.....؟ میں نے کہا نا اٹس اوکے.....!“ وریشہ نے اس کا ہاتھ دبا کر بہت محبت اور خلوص سے کہا تھا جبکہ تابندہ یک ٹک وریشہ کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ ”کیا ہوا.....؟“ وریشہ نے گھبرا کر پوچھا۔

”کچھ نہیں اماں کہہ رہی تھیں کہ تمہاری آنکھیں بہت خوبصورت ہیں میں نے بھی ابھی ابھی دیکھا تو مجھے ان کی بات کا یقین آیا۔ بہت چمکدار اور دن کی روشنی کی طرح روشن اور بہار کی صبح کی طرح اجلی۔“ اس کی بات پر وریشہ بری طرح جھینپ گئی۔ اس کے رخساروں پر شرم کی سرخی بہت تیزی سے پھیلی تھی۔ تابندہ نے بہت دلچسپی سے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

دنوں راو پلنڈی تھیں۔“ وہ بہت مزے سے کہہ رہی تھی۔

”اچھا مجھے اس کا علم نہیں.....“ اس نے شرمندگی سے کہا، ویسے بھی ماما اور ارسلہ کا ملنا ملانا خاصا تھا، دونوں ہی اس معاملے میں ایک دوسرے سے بڑھ کر تھیں، جبکہ وہ حد درجہ تنہائی پسند اور اپنے آپ میں مگن رہتی تھی۔

”تمہاری ماما کے انتقال کا مجھے بھائی نے بتایا تھا، میں اس وقت بھی نیوزی لینڈ میں تھی، یقین مانو کہ بہت دل دکھا کہ اس قدر خوبصورت اور پردقار خاتون تھیں کہ کوئی ان کو بھلا ہی نہیں سکتا.....“ وہ بہت دل سے کہہ رہی تھی۔

”ہاں ماما کی ڈیجھ کا تو ہمیں بھی ابھی تک یقین نہیں آتا۔ ایسے لگتا ہے کہ اپنے ڈیپارٹمنٹ گئی ہیں اور شام کو یونیورسٹی سے گھر آ جائیں گی.....“ وہ افسردہ سے انداز سے گویا ہوئی۔ دوسری طرف شاید سائرہ نے بھی اس کی رنجیدگی کو محسوس کر لیا تھا، تبھی بات کو دانستہ پلٹتے ہوئے قدرے رازدارانہ مگر شریر انداز میں بولیں..... ”ویسے تم دیکھنے میں کیسی ہو؟ میں نے بھائی سے پوچھا تھا کہ کیا ارسلہ کی طرح خوبصورت ہے؟“ بھائی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”نہیں، اس سے زیادہ خوبصورت ہے، بالکل میڈم شائستہ کی طرح.....“ سائرہ کی بات پر وریشہ کا دل ایک لمحے کو بے ہنگم انداز میں دھڑکا تھا۔

دوسری طرف وہ اس کے جھینپ کر ہنسنے پر کلکھلا کر ہنس رہی تھی..... ”اماں تمہاری بہت تعریف کر رہی تھیں اور بوا بھی، کہہ رہی تھیں کہ بہت خیال رکھ رہی ہے اور وقت پر میڈیسن دیتی ہے اور صبح شام نمبر پچر بھی چیک کرتی ہے، میں نے تو ان کو سنجیدگی سے ایک مشورہ دیا ہے.....“

اپنی بات کر کے وہ ایک لمحے کو رکی..... ”پتا ہے کیا.....؟“

”کیا.....؟“ وریشہ نے سنبھل کر پوچھا، اتنا تو اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ تابندہ کے مقابلے میں خاصی پراعتماد بھی ہے اور صاف گو بھی، بغیر کسی گلی پٹی کے بات کرنے والی۔

”یہ بی بی کہ بھائی کے لئے کوئی ڈاکٹر لڑکی ہی ڈھونڈ لیں، فائدے میں رہیں گے۔“ وہ ایک دفعہ پھر بلند آواز میں ہنس رہی تھی۔ ”تمہاری کوئی کو لیگ وغیرہ ہو تو مجھے ضرور بتانا.....“ وہ خاصی بے تکلفی سے کہہ رہی تھی۔

”جی ضرور.....!“ وریشہ اس سے زیادہ بھلا کیا کہتی، اس لئے چپ رہی۔

وہ اگلا دن اس کے ساتھ رہی تھی، اس نے ایک لمحے کے لئے بھی وریشہ کو بور ہونے نہیں دیا تھا۔ وہ اپنے اڑوس پڑوس میں رہنے والے رشتے داروں کے گھر اور زمینوں پر بھی لے کر گئی تھی۔ وریشہ نے کافی عرصے کے بعد خوب کھل کر انجوائے کیا تھا۔ ان کے پڑوس میں رہنے والی ایک دولڑکیوں کو اردو سمجھ میں آتی تھی اور وہ کچھ نہ کچھ بول بھی لیتیں تھیں۔ تابندہ نے ان کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ کچھ نہ کچھ دیر ان کے گھر کا چکر لگاتی رہیں۔ تابندہ کے جانے کے بعد گھر میں ایک دم ہی خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ ہلے گلے کی خاصی شوقین تھی۔ اس کے جانے کے بعد وریشہ نے بابا کو کال کرنے کی کوشش کی، ان کا نمبر بند جا رہا تھا۔ کچھ ان کے گاؤں میں سیل فون کے سکنلز کا کافی مسئلہ تھا۔ سکنلز ایک دم ہی غائب ہو جاتے تھے۔ یہ چیز اسے خاصی جھنجھلاہٹ کا شکار کر رہی تھی۔

اجتاج جو اس دن کا گیا پھر لوٹ کر نہیں آیا تھا، البتہ اماں کے سیل فون پر اس کا صبح و شام فون باقاعدگی سے آ رہا تھا۔ وہ بھی اماں کو کبھی اس کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی تو کبھی وہ وہاں سے شور مچا رہا ہوتا تھا کہ آواز نہیں آ رہی۔ ایک دن سائرہ کی بھی نیوزی لینڈ سے کال آ گئی۔ اس دن خوش قسمتی سے سکنل کافی آ رہے تھے۔ اس لئے دونوں طرف کی بات سمجھ آ رہی تھی۔ اماں گول ٹیکے سے ٹیک لگائے بہت محبت اور شفقت سے اپنی زبان میں بہت روانی سے اس سے گفتگو کرنے میں مگن تھیں، جس کو سمجھنے سے وریشہ بالکل قاصر تھی۔ ایک آدھ لفظ ہی پلے پڑ رہا تھا۔ اماں نے بات کرتے کرتے سیل فون اس کی طرف بڑھایا تو وہ چونک گئی۔ دوسری طرف سائرہ بہت محبت اور بے تکلفی سے اس کا حال احوال پوچھ رہی تھی۔

”تم سے تو ملاقات نہیں ہو سکی، لیکن ایک دفعہ ارسلہ سے لاہور میں بھائی نے ملوایا تھا۔ وہ بہت مزے دار لڑکی ہے.....“ سائرہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔ وریشہ اس کی بات پر ہکا بکارہ گئی۔ یہ تینوں بہن بھائی ہی اسے قدم قدم پر چونکا رہے تھے۔

”اچھا کب کی بات ہے یہ.....؟“ وہ اس کے ”مزے دار“ والے کمنٹس سے لطف اندوز ہوتے ہوئے حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

”میرا خیال ہے کہ آج سے تین سال پہلے جب میں شادی کی شاپنگ کرنے لاہور آئی تھی، تب بھائی اور ارسلہ نے خوب مجھے لبرٹی اور ریگا اور فورٹریس میں گھمایا تھا، تمہاری ماما نے مجھے شادی کا لہنگا پسند کرنے میں خاصی مدد دی تھی۔ تمہارے گھر میں بھی آئی تھی، لیکن تم ان

کر دیا۔

وہ تنگ آ کر ایک دفعہ پھر باہر نکل آئی۔ موسم نے ایک دم ہی انگڑائی لی تھی۔ سرمئی دھنکی ہوئی روئی جیسے بادل اچانک ہی آسمان پر نمودار ہو گئے تھے۔ تخت پر اماں اور پھپھو نہ جانے کون سی باتوں میں مگن تھیں اسے دیکھ کر چونک گئیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔ آج اماں کی صبح سے طبیعت خاصی بہتر تھی اور آج کافی دن بعد انہوں نے کھانا بھی ڈھنگ سے کھایا تھا۔ وہ دونوں ٹوٹی پھوٹی اردو زبان میں اس سے بات کر کے اسے کہنی دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وریشہ کو ان کے اس انداز پر ہنسی آ گئی۔ ان لوگوں کو تو وریشہ کی بات سمجھ میں آتی تھی جبکہ اب تو اسے بھی کافی حد تک ان کی زبان سے واقفیت ہوتی جا رہی تھی۔

”رہنے دیں خالہ کہاں متھا مار رہی ہیں.....؟“ سدرہ ایک پلیٹ میں کڑی اور چاول ڈالے اچانک ہی پچھلے دروازے سے اندر داخل ہوئی تھی۔ گہرے نارنجی رنگ کے لباس میں اس کا سانولا رنگ اور بھی گہرا لگ رہا تھا۔ سارہ سے بات کے بعد وریشہ نے اب کے اسے غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے کے نقوش خاصے دلآویز تھے اور قد بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔ وہ بس رنگت میں تھوڑی سی مار کھاتی تھی یا پھر مزاج کی کرخشگی نے اس کی شخصیت کا حسن دھندلا دیا تھا۔ وریشہ کو ابھی ابھی اندازہ ہوا تھا کہ اسے بات بات پر طنز کرنے کی خاصی بری عادت تھی۔

اس کی آمد پر بوا کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کو متغیر ہوا تھا۔ انہوں نے خاصی ناگواری سے اماں کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی اشارہ کیا تھا۔ سدرہ کے بیٹھتے ہی وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔ سدرہ کے لبوں پر بڑی زہر آلودی مسکراہٹ پھیلی تھی۔

”بیٹھ جاؤ بوا“ کبھی ہم غریبوں کے پاس بھی بیٹھ جایا کرو۔ جن کو تمہاری زبان پلے نہیں پڑتی، ان کے ساتھ تو گھٹنوں گونگے بہروں والی اشاروں کی زبان میں بھی باتیں ہو جاتی ہیں جبکہ ہمارے لئے تو تمہیں نام ہی نہیں ملتا۔“ وہ دانستہ اردو میں بولی تھی اس کی بات پر وریشہ دنگ رہ گئی۔ اس نے صاف اس پر چوٹ کی تھی۔ اماں اور بوا کو بھی حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ اس حیرت میں ناگواری اور ناپسندیدگی کا عنصر واضح تھا۔

بوانے اپنی زبان میں انگلی اٹھا کر اسے کوئی وارننگ دی تھی جسے سن کر سدرہ کے چہرے

”ویسے تم ارسالہ کے مقابلے میں بہت کم گوسی لگ رہی ہو اماں بھی بتا رہی تھیں کہ فالٹو باتیں نہیں کرتی ہو میں نے کہا یہ بھی ٹھیک ہے، لیکن آپ کی زبان ہی اس بیچاری کو نہیں آتی تو وہ کیا بات کرے۔“ سارہ کے سو فیصد درست اندازے پر وریشہ کو خاصی حیرت ہوئی تھی۔ اس کا مشاہدہ خاصا تیز تھا جو اتنی دور بیٹھ کر بالکل ٹھیک ٹھاک اندازے لگا رہی تھی۔

”نہیں ایسی بھی کوئی بات نہیں پڑوس سے نالکھ لوگ آ جاتے ہیں ان سے کپ شپ لگتی رہتی ہے.....“ اس کی سادہ سی بات پر وہ بری طرح چونکی۔

”نالکھ کی بڑی بہن سدرہ تو نہیں آتی ہوگی.....؟“ اس نے قدرے رازدارانہ انداز میں دریافت کیا تھا۔

”جی ایک دفعہ آئیں تھیں، لیکن زیادہ بات نہیں ہوئی.....“ وریشہ نے کچھ سوچ کر کہا اور سچ بات تھی کہ اسے وہ تک چڑھی اور قدرے مغرور سی لڑکی بالکل اچھی نہیں لگی تھی جسے اپنے ایف اے پاس کرنے کا خاصا زعم تھا۔

”وہ زیادہ بات کرے گی بھی نہیں.....“ سارہ کی بات پر وہ بری طرح چونکی ”وہ کیوں.....؟“

”اصل میں اسے لگتا ہے کہ وہ خاندان کی سب سے پڑھی لکھی لڑکی ہے اس لئے اہتمام بھائی پر اس کا پہلا حق ہے۔ اس کی والدہ اماں کی خالہ زاد بہن ہیں۔ ان لوگوں نے خاندان والوں کے ذریعے کھلویا بھی تھا، لیکن بات تو یہ تھی کہ بھائی نے صاف انکار کر دیا اور دوسری بات یہ کہ اماں کو بھی وہ اپنی عادات کی وجہ سے اپنے اکلوتے بیٹے کے لئے بالکل پسند نہیں تھی۔“ وہ بڑی بے تکلفی سے بتا رہی تھی جبکہ وریشہ کو اس کی بات پر ایک عجیب سی الجھن اپنے اندر تیزی سے پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اس سے زیادہ بات نہیں ہو سکتی تھی، تبھی اس نے دو چار باتیں کر کے فون اماں کو پکڑا دیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ وہ حد درجہ ذہنی پراگندگی کا شکار ہو رہی تھی۔ بابا کو کال کی تو ان کا نمبر بند جا رہا تھا۔ ارسالہ کو کال ملائی تو بلیٹس کم تھا، مجبوراً اپنی روم میٹ نویلہ کا نمبر ملایا اور اس سے کالج کا حال احوال پوچھا تو پتا چلا کہ آج کل ہسپتال میں کوئی ہڑتال چل رہی ہے اور پروفیسرز اس میں مصروف ہیں اس لئے کلاسز بھی نہیں ہو رہیں اور وہ بھی اپنے شہر چکوال جا رہی ہے۔ وریشہ نے تنگ آ کر فون بند کیا۔ ٹی وی چلایا تو پتا چلا کہ یہاں صرف پی ٹی وی آتا ہے، کچھ دیر بعد اس نے جھنجھلا کر اسے بھی بند

”سارا مسئلہ اس چڑیل بوا کا ہے جس نے پتا نہیں کیا گند بلا اس کے ذہن میں بھر رکھا ہے۔ وہ تو اب شادی کے نام سے ہی خار کھانے لگا ہے حالانکہ خالہ کو سخت ضرورت ہے کہ کوئی ان کی دیکھ بھال کے لئے چوبیس گھنٹے موجود ہو۔ اب دیکھو ناں سارا خاندان باتیں بنا رہا ہے کہ پرانی جوان لڑکی کو گھر میں تیار داری کے لئے بلا رکھا ہے۔ سارا خاندان لڑکیوں اور عورتوں سے بھرا پڑا ہے مزارعوں کی گھر والیاں بھی سارا دن یہیں مفت کی روٹیاں توڑتی ہیں۔ کون سا خدمت کرنے والوں کی کمی تھی۔ بس ہماری ناک کٹوانی تھی.....“ اس کا لہجہ خاصا تلخ تھا۔ وریشہ نے الجھن بھرے انداز میں اسے دیکھا جو آج خاصی فرصت سے ہی بیٹھی تھی۔

”تم کب جاؤ گی اپنے گھر.....؟“ اس کا انداز وریشہ کو خاصا برا لگا تھا لیکن وہ زبردستی مسکرا کر بولی۔ ”جب تابندہ عمرہ کر کے آجائے گی.....“

”لو اسے آنے میں تو ابھی پورے دس دن پڑے ہیں.....“ اسے سن کر خاصی مایوسی ہوئی تھی اور اسے چھپانا بھی اس نے مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وریشہ خاموش رہی۔

”ویسے میرا تو خیال ہے کہ بندے کوچ اور عمرہ فارغ ہو کر بڑھاپے میں کرنا چاہیے تمہارا کیا خیال ہے.....؟“ سدرہ نے ایک اور اپنا ذاتی فلسفہ جھڑا تھا جس سے وہ قطعاً متفق نہیں تھی۔ ”بس جب بھی اللہ کسی کو بلا لے اپنے گھر۔“ اس کی بات سے سدرہ کو خاصی مایوسی ہوئی تھی۔

”دیکھو ناں ابھی جمعہ جمعہ چار دن تو ہوئے ہیں تاہی کی شادی کو جمال ہے کہ اپنے سرال میں تک کر بیٹھی ہو ماں کی بیماری کا بہانہ کر کے ہفتے میں چار دن تو وہ یہاں رہتی ہے.....“ اسے سب ہی سے شکایتیں تھیں۔ وریشہ پھر بھی خود کو کہنے سے روک نہیں پائی۔ ”خیر بہانہ تو وہ نہیں کرتی، اماں ٹھیک ٹھاک بیمار ہیں.....“

”تو وہ کون سا ڈاکٹر ہے.....“ اسے سخت برا لگا تھا۔ ”اب اگر اس کا میاں کوئی کورس کرنے ملک سے باہر گیا ہوا ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ سرال میں ٹکا ہی نہ جائے۔ اب میاں کو آئے پاکستان میں مشکل سے ہفتہ ہی ہوا ہے کہ محترمہ سعودیہ چلی گئی ہے۔“ اس کی باتوں نے وریشہ کے سر میں اچھا خاصا درد کر دیا تھا، لیکن مجبوری تھی کہ اماں سوچتی تھیں اور اسے جب تک وہ تھی وہیں بیٹھنا تھا۔

”اور پھر ساس سسر کو ساتھ لے جانے کا کیا فائدہ اب بندہ ان بوڑھوں کو ہی سنبھالتا

کا رنگ تیزی سے بدلاتھا جبکہ اپنی بات کہہ کر وہ رکی نہیں تھیں، سامنے بنے باورچی خانے میں چلی گئی تھیں۔ وریشہ کو اپنا آپ خاصا عجیب سا لگ رہا تھا۔ اماں نے بھی اپنا سفید ملل کا دوپٹہ منہ پر ڈال کر ٹانگیں سیدھی کر لی تھیں۔ وریشہ بھی ان کے تخت سے اٹھ کر قدرے فاصلے پر رکھی چارپائی پر سدرہ کے ساتھ آ کر بیٹھ گئی تھی۔ سدرہ کے چہرے پر بڑے عجیب سے تاثرات تھے۔ اس کی آنکھوں سے ٹپکتا حسد اور خود غرضی کے جذبات کوئی بھی سمجھ سکتا تھا۔

”یہ بوا خاصی کینہ پرور خاتون ہیں ان سے بچ کر رہنا، یہ نہیں چاہتی کہ ابہتاج کی شادی ہو اور ان کی راج دھانی میں کوئی اور آئے.....“ وہ اب اس کی طرف جھک کر خاصے دھیمے انداز میں اسے خبردار کر رہی تھی۔ وریشہ کو اپنے سے اس غیر متعلقہ بات پر خاصا جھٹکا لگا تھا۔ اس نے بے یقینی سے سامنے باورچی خانے کے فرش پر بیٹھی بے ضروری خاتون کو دیکھا جو پالک صاف کر رہی تھیں۔

وریشہ کے لبوں پر پھیکسی مسکراہٹ دوڑ گئی اور اس کی مسکراہٹ سے حوصلہ پا کر وہ مزید گویا ہوئی۔ ”ہماری خالہ تو بیچاری سیدھی سادھی خاتون ہیں ان کی اس مند نے ساری زندگی ان کی سادگی سے فائدہ اٹھا کر ان کو بیوقوف بنا کر اپنا الو سیدھا کیا ہے۔ اولاد ان کی تھی نہیں میاں کو بھی وغلا کر یہاں لے آئیں اور تب سے یہاں سے ہلنے کا نام نہیں لیتیں اور باقی خاندان والوں کے خلاف خالہ کو بھڑکاتی رہتی ہیں۔ اسی نے میرا اور ابہتاج کا رشتہ تڑوایا ہے.....“ وہ حد درجہ بدگمان تھی اس کی آنکھوں میں پھیلی نفرت اور بے زاری نے وریشہ کو بے اختیار پہلو بدلنے پر مجبور کیا تھا۔

”میں بچپن سے اتنی کی منگ ہوں اس نے دل سے اس رشتے کے ختم ہونے کو قبول نہیں کیا۔ اس لئے کہیں اور رشتے کے لئے تیار نہیں ہوتا.....“ وہ خاصی خوش فہم بھی تھی وریشہ کو ایک لمحے میں اس بات کا ادراک ہوا تھا۔

”اچھا، کیا انہوں نے ایسا تمہیں خود کہا تھا.....؟“ وریشہ کو اس کیس میں تھوڑی سی دلچسپی محسوس ہوئی تھی اس کی بات پر وہ فوراً شرمائی۔

”ایسی باتیں کہنے والی تھوڑی ہوتی ہیں ہر رشتے میں تو وہ کوئی نہ کوئی مین میخ نکال کر انکار کر دیتا ہے۔ اس کا یہی مطلب ہے ناں.....“ اس کی غلط فہمیوں کی داستان خاصی لمبی تھی۔

”اچھا، پھر مسئلہ کیا ہے.....؟“ اس نے بمشکل اپنی مسکراہٹ چھپا کر پوچھا۔

”بھرجائی“ بے شک پوچھ لے اس بچی سے، اسے یہ ہی کہانی سنا کے گئی ہوگی کم  
 بخت.....“ بوا کے سو فیصد اندازے پر دریشہ کو سخت تعجب ہوا تھا، لیکن وہ مصلحتاً خاموش رہی۔  
 ”ہیں ناں دھی رانی.....؟“ بوانے یقین دہانی کے لئے اس کی طرف دیکھا تو اسے  
 شدید حیرت ہوئی، جب اس نے اماں کو بڑی سرعت سے نفی میں سر ہلا کر اسے نہ بتانے کا  
 اشارہ کرتے ہوئے دیکھا، اسے یہ سوچ کر ہی دھچکا لگا تھا کہ انہوں نے سدرہ کی تلخ گفتگو کو  
 خود اپنی سماعتوں سے سنا تھا، ورنہ وہ اسے منع نہیں کرتیں۔

”نن نہیں بوا، وہ تو اپنی ہی باتیں کر رہی تھی.....“ اس نے گڑبڑا کر مصلحتاً جھوٹ بولا تھا۔  
 ”وہ کہاں کی پروفیسر لگی ہے جو اپنی باتیں کرے گی۔ صغراں کی بیٹیوں کی رگ رگ سے  
 میں واقف ہوں۔ آج کل وہ ہر جگہ بس مجھے بدنام کرنے کا کھاتہ کھول رہی ہیں۔“ بوا بھی ان  
 کے بارے میں ضرورت سے زیادہ آگاہ تھی۔ اس لئے ان کا موڈ ابھی تک خراب تھا۔  
 ”آج پتا نہیں کڑی کہاں سے پکا کر لے آئی، ورنہ پہلے تو ایسی سوغاتیں تو بس ہمارے  
 پتر کے آنے پر ہی دیکھنے کو ملتی تھیں.....“ وہ ابھی تک غصے سے بڑبڑا رہی تھیں۔  
 ”واہ بوا! چائے تو بہت مزے کی بنائی ہے.....“ اس نے محض ان کی توجہ دوسری جانب  
 مبذول کروانے کے لئے کہا تھا۔

”اچھا، واقعی.....؟“ وہ واقعی بچوں کے سے انداز سے خوش ہو گئی تھیں۔  
 ”یہ تمہارے سوٹ پر کڑھائی کس نے کی ہے.....؟“ ان کی توجہ اس کے کاسنی رنگ  
 کے سوٹ پر کی گئی کڑھائی کی طرف ہو گئی تھی۔

”یہ تو ریڈی میڈ ہے، مطلب کہ ایسے ہی بازار سے لیا تھا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا  
 تو انہوں نے تو صغریٰ نظروں سے ایک دفعہ پھر اس کو بغور پکڑ کر دیکھا۔ دوپٹے کے پلو پر بھی  
 بڑی نازک سی نیل بنی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا تھا کہ بوا کی توجہ دوسری جانب ہونے سے  
 اماں نے بوا لبا سکون کا سانس لیا تھا۔ وہ دونوں ایک دفعہ پھر اس کے ساتھ چھوٹی چھوٹی بے  
 ضروری باتوں میں مصروف ہو گئی تھیں۔



گرمی میں ایک دم ہی اضافہ ہو گیا تھا۔ اسے وہاں آئے ہوئے پورے سات دن ہو  
 چکے تھے۔ اس دوران ایک دفعہ بھی بابا سے بات نہیں ہو پائی تھی۔ یہ بات اسے حد درجہ کوفت

رہے، مجھے تو تابی کا میاں بڑا ہی خراٹ لگتا ہے۔ اب مجھے سمجھ آئی کہ وہ اپنی بیوی کو ماں باپ  
 کی خدمت کے لئے لے کر گیا ہوگا۔ میرے جیسی ہوتی تو جانے سے ہی انکار کر دیتی.....“  
 دریشہ نے تاسف بھری نظروں سے اس لڑکی کو دیکھا، جس کو خاندان میں اپنے پڑھے لکھے  
 ہونے کا دعویٰ تھا۔ وہ اپنی سمجھ میں آنے والی اس ”اچانک“ بات پر خاصی خوش دکھائی دے  
 رہی تھی۔ اپنی اس ”سمجھداری“ کی مزید تصدیق کروانا اس نے مناسب نہیں سمجھا تھا، اس لئے  
 اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسی وقت بوا تین چائے کی پیالیاں ٹرے میں رکھے نمودار ہوئیں۔ دریشہ نے  
 سکون کا سانس لیا۔ اسے شدید طلب ہو رہی تھی۔

”تم تو چائے نہیں پیتی ہو ناں؟ اس لئے میں نے تمہارے لئے نہیں بنائی.....“ بوا کی  
 بے مردتی اور بدگواہی بھی عروج پر تھی، بے رخی کے اس مظاہرے پر اور وہ بھی مہمان کے  
 سامنے سدرہ کے لئے انتہائی کوفت کا باعث بنی تھی۔ اس لئے وہ جل کر بولی تھی۔  
 ”مجھے کوئی شوق نہیں اتنی گرمی میں اپنا کلیجہ سڑانے کا، آپ ہی پو یہ چائے.....“ وہ  
 پاؤں پیٹتے ہوئے وہاں سے گئی تھی۔ دریشہ نے بمشکل اپنی مسکراہٹ کا گلا گھونٹا تھا، لیکن اس  
 کے جاتے ہی جس طرح فوراً اماں نے اپنے منہ سے دوپٹہ ہٹایا تھا۔ دریشہ کو دیکھ کر بے اختیار  
 ہنسی آ گئی۔ ”آپ سوئی نہیں تھیں کیا.....؟“

اماں نفی میں سر ہلا کر مصصومیت سے ہنسنے لگیں۔ دریشہ کو اس لمحے وہ بہت پیاری لگیں،  
 جبکہ بوا ذرا خفگی بھرے انداز میں بولیں۔ ”بھرجائی خود تو ایسے موقعوں پر چادر تان لیتی ہیں اور  
 یہ جنجال پورہ ہمیں بجھکتا پڑ جاتا ہے.....“

”خیر ہے سیکینہ اپنا دل وڈا کر.....“ اماں متانت سے بولی تھیں۔

”ہم سے نہیں ہوتے وڈے دل، پورے چک میں ماں بیٹیاں مجھے بدنام کرتی پھرتی  
 ہیں کہ میں نے ان کا رشتہ تڑوایا ہے۔ بندہ پوچھے جو رشتہ ہوا ہی نہیں، اس کے ٹوٹنے کا کیا  
 سوال؟ خود ہی مشہوری کر دی اور جب منڈے نے صاف انکار کر دیا تو اب دنیا کو بتاتے پھر  
 رہے ہیں کہ پچھپی نے ”لت“ (ٹانگ) مار دی رشتے میں۔ اکو اک میرا بھرا سی۔ تے اکو اک  
 میڈا بھتیجا۔ سب نالوں زیادہ تو مجھ نمائی کو اس کے ویاہ کے چاہ ہیں اور مجھ پر ہی الزام.....“  
 بوا غصے میں تیز تیز چسکیاں لے کر چائے پی رہی تھیں۔

”چل چھڑ تو اپنا دل برانہ کر.....“ اماں نے ان کو دلاسا دیا۔

اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔ ”حد ہے کسی کو میری پرواہ ہی نہیں.....“ یہ فقرہ تو آج اس نے کوئی بلا مبالغہ ہزار دفعہ سوچا تھا۔ پہلے تو ہر تیسرے یا چوتھے دن ارسلا کی بھی کال آ جاتی تھی، لیکن اس دفعہ تو اس نے بھی کمال کر دیا تھا۔ وہ ان سب سے بری طرح دل ہی دل میں خفا ہو چکی تھی۔ اس دفعہ تو اس نے بھی پکا تہیہ کر لیا تھا کہ اب خود سے ان کو کال نہیں کرنی۔ بابا کا نمبر تو ویسے ہی بند تھا اور پر سے وہ اسے چھوڑ کر جو گیا تو دوبارہ نہیں آیا۔ وہ اس سے بھی کئی گلے دل ہی دل میں پال چکی تھی۔ اس دن رات کو اماں کی طبیعت ایک دم ہی بگڑ گئی تھی۔ اس کے تو ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔ گھر کے سب لوگ جو اس کی وجہ سے مطمئن تھے، اسے حواس باختہ دیکھ کر خود بھی گھبرا گئے۔ اس نے پھپھا کو فوراً گاڑی نکالنے کو کہا۔ اماں کی حالت بالکل بھی ٹھیک نہیں تھی۔

پھپھا بار بار ابہتاج کو فون کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب اس نے قدرے سختی سے انہیں کہا کہ اماں کو جلد از جلد ایمر جنسی میں لے جانے کی ضرورت ہے۔ اس وقت رات کے تقریباً دو بج رہے تھے جب وہ لوگ نشتر ہسپتال ملتان کی ایمر جنسی میں پہنچے۔ راستے میں ہی وریشہ نے اپنے ایک دو سینئرز کو سوتے ہوئے اٹھا کر نشتر ہسپتال میں کسی جاننے والے ڈاکٹر کا پوچھا تھا۔ اس کی بھاگ دوڑ خاصی کام آئی تھی۔ جب تک وہ لوگ ایمر جنسی میں پہنچے ایک دو ڈاکٹر ز سے رابطہ ہو ہی گیا تھا جس کی وجہ سے ان کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ اماں کو جاتے ہی خاصا پروٹوکول مل گیا تھا۔ بوا کے ساتھ ایک ملازمہ بھی تھی۔ پریشانی سے ان کی رنگت زرد ہو چکی تھی۔ پھپھا خود بھی گھبراے ہوئے تھے۔ ابہتاج سے ان کا آخر رابطہ ہو ہی گیا تھا۔

”وریشہ کوئی خطرے کی بات تو نہیں.....؟“ اس کی اچانک ہی اس کے نمبر پر کال آ گئی تھی۔ وہ حد درجہ پریشان تھا، وہ کچھ لمحوں کے لئے بالکل چپ کر گئی اور پھر کچھ متقاط لفظوں میں بولی۔

”وہ بہتر نہیں ہیں.....“

”کیا مطلب.....؟“ وہ انتہائی بجلت میں بولا تھا۔

”مطلب یہ کہ اس قسم کے مرض میں جو کچھ خطرے کے سائن ہوتے ہیں ان میں سے کچھ ظاہر ہو رہے ہیں.....“ اس نے اب کہ کچھ کھول کر بتانے کی کوشش کی تھی۔ دوسری طرف اس کی بات پر اسے سخت دھچکا لگا تھا۔ اس لئے وہ کافی دیر تک کچھ بول نہیں سکا تھا۔

”اس اوکے..... میں آ رہا ہوں.....“ وہ فون بند کر چکا تھا۔ وریشہ کو ایک دم ہی ایسے لگا جیسے کائنات کی نبض ختم سی گئی ہو۔ وہ صبح تقریباً ساڑھے چھ بجے کے قریب پہنچا تھا۔ اس وقت اماں دوائیوں کے زیر اثر سو رہی تھیں۔ وہ سیدھا ہی وہاں آیا تھا۔ اس وقت وہ ڈاکٹر اسد کو اماں کی فریش رپورٹس دیکھا رہی تھی۔ انہیں پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ بلیک پیٹ پر گرے شرٹ میں وہ خاصا مضطرب تھا۔ اس کی آنکھیں رتجکے کی وجہ سے سرخ تھیں۔ پھپھا جی اس کے ساتھ تھے اور اس کو رات کا واقعہ تفصیل سے بتا رہے تھے۔

”اب کیسی حالت ہے اماں کی.....؟“ وہ حد درجہ بے چینی سے ان کی طرف لپکا تھا۔

”اب اللہ کا شکر ہے کہ ان کی حالت کافی بہتر ہے۔“ ڈاکٹر اسد نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دلاسا دیا تھا۔

”یہ ان کے چہرے پر سوچن کیوں محسوس ہو رہی ہے.....؟“ وہ تھوڑا سا مضطرب ہوا۔

ڈاکٹر اسد اور وریشہ نے ایک دم ہی ایک دوسرے سے آنکھیں چرائی تھیں۔

”اللہ بہتر کرے گا۔“ ڈاکٹر اسد نے ایک دفعہ پھر ان کو تسلی دی اور وریشہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ ”ایسا ہے وریشہ! کہ میری کال تو ختم ہو گئی ہے، اپنے ایک اور کو لیگ کو میں نے کہہ دیا ہے، وہ وقتاً فوقتاً یہاں کا وزٹ کرتا رہے گا، پھر بھی کوئی ایمر جنسی ہو، آپ مجھے کال کر سکتی ہیں۔“

”تھینک یو ڈاکٹر اسد.....“ وہ حد درجہ ان کی ممنون تھی۔

”یہ میرے ایک سینئر تھے، انہوں نے رات کافی ہماری ہیلپ کی تھی، ورنہ سرکاری ہسپتالوں میں تو آپ کو پتا ہے کہ جان پہچان کے بغیر اتنی جلدی کام نہیں ہوتے۔“ ڈاکٹر اسد کے جاتے ہی اس نے بتایا۔

”تھینکس وریشہ! آپ اگر نہ ہوتیں تو شاید کافی پر اہلم ہوتا۔ پھپھا بتا رہے تھے کہ ان کو تو کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔“ وہ حد درجہ مشکور تھا۔ اس کا انداز ویسا ہی تھا، انتہائی نرم اور دھیما، وریشہ کو نہ جانے کیوں اپنی دھڑکنیں بے ترتیب ہوتی محسوس ہوئی تھیں۔ وہ اپنی اس کیفیت کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ اب اماں کے بالکل پاس کھڑا تھا اور ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ مجھے سائرہ کو کہہ دینا چاہیے کہ وہ آ جائے.....“ وریشہ کو اس کا لہجہ بھیگا ہوا محسوس ہوا تھا۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے وہ اماں کی حالت کی یقینی کو سمجھ سکتی تھی۔

تعب سے اماں کا ہنستا ہوا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

”خیر ہے خالہ آج تو بڑے قہقہے لگائے جا رہے ہیں.....“ سدرہ کی طنزیہ نظریں ایسے ہی شرمندہ کرتی تھیں، لیکن اس وقت ابہتاج کی موجودگی نے اسے اور بھی جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔

”آؤ آؤ سدرہ، نائلہ کیسی ہوشیار لوگ.....“ ابہتاج نے ان کو دیکھ کر خوش دلی سے کہا۔  
”یہاں تو خالہ ماشاء اللہ بالکل ٹھیک ٹھاک لگ رہی ہیں اور پورے پنڈ میں بوائے خواخواہ شور مچا رکھا ہے۔“ اس نے سامنے موڑھے پر بیٹھتے ہی ناک چڑھائی۔

”ہاں بوا کو تو بہت شوق ہے ناں، خواخواہ شور مچانے کا، خود اپنی ماں کا پتا نہیں، ایک چھینک بھی آجائے تو سات گاؤں میں دہائی مچا دیتی ہے۔“ بوا ایک دم ہی گندم چھوڑ کر سامنے آن کھڑی ہوئی تھیں۔ انہوں نے کہا جانے والی نظروں سے سرخ لان کے نئے سوٹ میں ملبوس سدرہ کو دیکھا تھا۔

”لو بوا تم تو ویسے ہی غصہ کر جاتی ہو میں تو ویسے ہی بخول کر رہی تھی.....“ ابہتاج کی موجودگی اس کو خود بخود دھیمہ ہو جانے پر مجبور کر دیتی تھی اور اس وقت تو وہ خصوصی تیاری سے آئی تھی۔

”سینکھ بچیوں کو کچھ لسی پانی کا پوچھنا تھا.....“ اماں نے بوا کو بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں تنبیہ کی تھی۔

”ہونہہ کا جل کا ٹک لگتا ہے کل ہمارے ہی پنڈ میں گرا تھا.....“ وہ جاتے جاتے سدرہ پر طنز کرنا نہیں بھولی تھیں، جس نے اس وقت آنکھوں کو کالا سیاہ کر رکھا تھا۔ ابہتاج اس وقت نائلہ سے باتیں کرنے میں مصروف تھا، جب سدرہ نے شکایتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

دریشہ اب اماں کا بلڈ پریشر چیک کر کے ان کو اس وقت کی میڈیسن دے رہی تھی جبکہ وہ سدرہ اور نائلہ سے چھوٹی چھوٹی باتوں کے دوران اس کی تمام سرگرمیوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر بڑی خوشگوار سی حیرت ہو رہی تھی کہ اماں اور دریشہ کی کافی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ ان سے باتیں کرتے ہوئے ان کو مختلف دوایاں کھلا رہی تھی، جس کو اماں تھوڑے سے نخرے کے بعد بالآخر کھا رہی تھیں۔ یہ منظر سدرہ کے لئے ناقابل برداشت

لیکن وہ اس سے بھی زیادہ سمجھدار تھا۔

”اللہ بہتر کرے گا مایوس کیوں ہوتے ہیں.....؟“ دریشہ ایک دم ہی اس کے سامنے آ کر بولی تھی۔ اس نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا تو دریشہ کو بے اختیار ہی اس کی سرخ مگر کچھ بولتی ہوئی آنکھوں سے پہلی دفعہ ڈر لگا تھا۔ وہ فوراً نظریں چراگئی تھی۔

”آپ ڈاکٹر ہو کر جھوٹی تسلی دیتی ہیں.....“ اس کا انداز حد درجہ آزرہ تھا۔

”میں ڈاکٹر ہونے سے پہلے ایک مسلمان بھی ہوں اور مومن کبھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتا۔“ اس نے ایک دم ہی اسے لا جواب کر دیا تھا۔

اگلے دو دن اس نے لمحہ لمحہ اماں کے ساتھ گزارا تھا۔ اماں کی حالت کچھ بہتر ہوئی تو انہوں نے گھر جانے کی ضد شروع کر دی تھی۔ وہ اس وقت بالکل ایک ضدی بچے کی طرح لگ رہی تھیں، مجبوراً چار دن کے بعد ان کو گھر لے جانا ہی پڑا۔ گھر پہنچتے ہی وہ خاصی خوش تھیں اور دریشہ نے ان کو بات بے بات مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ سارہ اور تابندہ دونوں ہی ان کی وجہ سے بہت زیادہ پریشان تھیں۔ ان کی بار بار کالز آ رہی تھیں۔ دریشہ کو خود ان کی بیماری نے بوکھلا دیا تھا۔ وہ خود بھی سب کچھ بھلائے ہوئے تھی۔ آج کل تو اس کا دھیان بابا اور اسلہ کی طرف بھی نہیں جا رہا تھا۔ وہ تو اچانک ہی بابا کی غیر متوقع کال آگئی تو اسے احساس ہوا۔ اس دن سگنل کا بھی کچھ مسئلہ تھا، اس لئے کچھ بات سمجھ میں آ رہی تھی اور کچھ نہیں۔ اسے یاد تھا کہ وہ بار بار ابہتاج کی والدہ کا خیال رکھنے کو کہہ رہے تھے۔ اسی دوران کال کٹ گئی تھی، وہ بہت زیادہ افسردہ ہوئی۔ اس دن شام کو وہ اماں کا نمبر پچ چیک کر رہی تھی۔ وہ اپنے مخصوص تخت پوش پر لیٹی ہوئیں تھیں۔ ان کے بالکل پاس کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے ابہتاج آج کا اخبار پڑھنے میں مگن تھے۔ بوا سامنے مگن میں کچھ خواتین سے گندم صاف کروانے میں مصروف تھیں۔ اسی وقت سامنے سے سدرہ اور نائلہ آتی ہوئی دکھائی دیں۔ اماں نے بھی ان کو دیکھ لیا تھا۔ آج کل ویسے بھی ان کی عیادت کرنے والوں کی آمد و رفت بہت زیادہ تھی۔

”اماں آج دوپہ منہ پر رکھ کر سونے کا ارادہ نہیں.....“ اس نے اپنی طرف سے سرگوشی میں شرارت کی تھی، لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ اماں اس کی بات پر ہلکھلا کر ہنس پڑیں گی۔ ابہتاج نے چونک کر قدرے خوشگوار انداز سے ان کو ہنستے ہوئے دیکھا جبکہ وہ اپنی خجالت کو مٹانے کے لئے جھینپ سی گئی۔ ابہتاج اس کی بات کے پس منظر سے واقف نہیں تھا۔ اس لئے

تھا۔ وریشہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا جو گھبرا کر کہہ رہی تھی۔ ”نہ جی ناں! ایسے مریض کے جراثیم بہت تیزی سے اڑ کے لگتے ہیں! اس لئے تو اماں ڈر کے مارے نہیں آ رہی ہیں.....“

سدرہ کی بات پر ایک دم ہی سناٹا سا چھا گیا تھا۔ ابہتاج کے چہرے کی رنگت متغیر ہوئی تھی۔ اماں خوفزدہ نظروں سے وریشہ کو دیکھ رہی تھیں، جولا پرواہی سے ان کے ہی جھج میں ان کی چھوڑی ہوئی کچھڑی کھا رہی تھی۔ اس کی بات سے وہ دانستہ ہلکے پھلکے لہجے میں بولی۔ ”ایسا بالکل بھی نہیں ہے سدرہ، تمہیں کسی نے غلط بتایا ہے.....“ وہ ابھی اسی گلاس سے پانی پی رہی تھی۔ سدرہ اور نانکھ نے ایسے اسے دیکھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔ ابہتاج کے لئے مزید برداشت کرنا انتہائی مشکل تھا۔ اسے سدرہ کی بات سے سخت تکلیف ہوئی تھی۔ وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں پا رہا تھا۔ اس لئے فوراً اٹھ کر اندر چلا گیا۔ اس کے بعد وہ دونوں بھی زیادہ دیر نہیں بیٹھی تھیں۔

”کیا ہو گیا ہے اماں آپ کو.....“ وہ بہت نرمی سے بالکل خاموش اور ساکن سی اماں کا بازو پکڑ کر بولی تھی۔

”کچھ نہیں بیٹا.....“ انہوں نے ایک سردی آہ بھری تھی۔

”میری بات غور سے سنیں، ہم مسلمان ہیں ناں.....“ وہ بہت آہستگی سے ان سے مخاطب تھی۔ ”ہمارا تقدیر پر ایمان ہے ناں! یاد رکھئے گا! اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کے آنے جانے اور دنیا میں رہنے اور دولت، بیماری ہر چیز کے بارے میں پہلے سے لکھ دیا ہے۔ ان سب چیزوں کو بس دعا بدل سکتی ہے اور کوئی چیز نہیں۔ ہر چیز اللہ کی طرف سے ہوتی ہے، بیماری بھی اور صحت بھی۔ کسی کو کسی سے کچھ نہیں ہوتا! اگر ایسا ہو تو سب سے زیادہ تو ڈاکٹرز بیمار ہوں، جو سارا دن طرح طرح کے مریضوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ یہ ساری فضول باتیں ہیں۔ اس کے لئے دل چھوٹا نہیں کرتے.....“ وہ بہت پیار سے ان کو سمجھا رہی تھی۔

”بھرجائی دفع کرو! دیکھو کتنے مزے کا دلیہ بنایا ہے میں نے.....“ بوا ابھی ابھی اندر سے اپنی آنکھیں صاف کر کے باہر آئی تھیں۔ انہوں نے بھی سدرہ کی بات سن لی تھی، لیکن دانستہ اس بات پر تمبرہ نہیں کیا تھا۔

”قسم نے مجھے تو سدرہ کی شکل دیکھ کر بہت ہاسا (ہنسی) آیا! ایسے لگ رہا تھا جیسے

”بھئی آپ لوگ کب تک اس بیچاری سے اماں کی خدمتیں کروائیں گے؟ وہ بیچاری بھی سوچتی ہوگی کہ کہاں پھنس گئی۔ ہمیں بتائیں اگر سائرہ یا تانندہ نہیں ہیں تو میں اور نانکھ تو ہیں ناں.....“ اس کے لہجے میں تش جبکہ چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ تھی۔ اس کی بات پر ابہتاج نے چونک کر وریشہ کو دیکھا جس کی آنکھوں میں تحیر نمایاں تھا۔

”یہ بچی ایسی فضول باتیں نہیں سوچتی۔ ماشاء اللہ اچھے گھرانے کی ہے اور نیک ماں باپ کی اولاد ہے.....“ بوا کا لہجہ سلگتا ہوا لیکن انداز خاصا پرسکون تھا۔

”میں تو اس لئے کہہ رہی ہوں کہ دس دن سے بیچاری اماں کو سنبھال رہی ہے.....“ سدرہ نے سنبھل کر کہا۔

”رہنے دو بی بی! ان دس دنوں میں کسی اور کو تو توفیق نہیں ہوئی۔ اب خود کو دیکھ لو گھر کے دروازے کے ساتھ دروازہ جڑا ہوا ہے، لیکن تمہاری اماں کو دو قدم چل کر آنے کی ہمت نہیں ہوئی اور تم خود ان دس دنوں میں تیسری دفعہ نظر آئی ہو۔ باتیں کر رہی ہو خدمتیں کرنے کی.....“ بوا نے ایک منٹ میں اس کی طبیعت صاف کی تھی۔ ابہتاج کے سامنے یہ اتنی سچی باتیں اس کے لئے ناقابل برداشت تھیں۔ اس لئے اس کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس کی کاجل سے بھری آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو دیکھ کر سوائے بوا کے سب لوگ گھبرا گئے۔

”ہاں تو یہ کوئی ایسا بھی وقت نہیں ہے کہ خواخوہ پیٹھ کر گونگوں سے مٹی جماڑی جائے.....“ وہ بھی کسی کے رعب میں آنے والی نہیں تھیں۔ اس لئے اپنی بات کر کے آرام سے صحن کی طرف چل پڑیں۔ وریشہ نے گھبرا کر سدرہ کو دیکھا جس کے آنسوؤں کے ساتھ بے دریغ بہتا کاجل اس کے چہرے کی رنگت کو مزید سانولا کر رہا تھا۔ اس نے اماں کے پاس پڑے ہوئے پانی کے جگ سے ایک گلاس پانی ڈال کر سدرہ کی طرف بڑھایا، اسے حقیقتاً اس کے آنسوؤں سے تکلیف ہوئی تھی۔ وہ حد درجہ حساس لڑکی تھی! اس کے گلاس کو دیکھ کر سدرہ کو کرنت لگا۔

”میں خالہ کے گلاس میں پانی نہیں پیوں گی.....“ اس کے منہ سے بے اختیار پھسلا



لگیں تو زیادہ دکھ ہوتا ہے اور سدرہ کی والدہ تو میری اماں کی سگی خالہ زاد ہیں، اماں نے بہت سے موقعوں پر ہم سے چھپا کر ان کی مدد کی وہ نیکی کی تشبیہ کرنے کی قائل نہیں، اس لئے مجھے خاصا افسوس ہوا۔“ وہ خاصے رنجیدہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

”بس اپنے اپنے ظرف کی بات ہوتی ہے ناں اور پھر وہ ایک قول بھی تو ہے ناں کہ جب کسی پر احسان کرو تو پھر اس کے شر سے بچو۔“ وریثہ کا انداز بھی حد درجہ سنجیدہ تھا۔

”ہاں میں آئے دن اوٹ پٹانگ باتیں سنتا رہتا ہوں، لیکن نظر انداز کر جاتا ہوں، جبکہ بوا بیچاری بھڑک اٹھتی ہیں۔ اصل میں انہوں نے زندگی میں بہت مشکل حالات دیکھے ہیں، ان کے میاں کی والدہ سوتیلی تھیں، جنہوں نے ان کے سر کے انتقال پر دونوں کو خالی ہاتھ گھر سے نکال دیا تھا۔ ابا ان کو زبردستی یہاں لے آئے۔ ابا لوگوں کے صرف دو بھائی اور ایک بہن تھی اور معاشی حالات بہت مضبوط تھے، ماشاء اللہ۔ ان کے لئے اکلوتی بہن کوئی بوجھ نہیں تھی، لیکن اس کے باوجود پچھلا آج بھی زمینیں سنبھالنے کی تنخواہ کے علاوہ ایک پیسہ نہیں لیتے۔ بہت ایماندار اور محنتی ہیں، لیکن سارے خاندان والے ان کو باتیں سنانے اور گھر دامادی کے طعنے دینے سے باز نہیں آتے۔ بوائے بھی اب تنگ آ کر ان کی باتوں کا جواب دینا شروع کیا ہے، ورنہ وہ بہت صابر خاتون ہیں۔ اللہ ان کو اجر دے، انہوں نے اماں کی بہت خدمت کی ہے۔“ وہ پہلی دفعہ اپنے خاندان کے بارے میں اتنی ذاتی باتیں شیر کر رہا تھا۔ اسے ابھی ابھی خیال آیا تھا کہ وہ ابھی تک کھڑی ہے۔

”آئی ایم سوری“ میں نے ابھی تک آپ کو بیٹھنے کا نہیں کہا۔“ وہ ایک دم ہی شرمندہ ہو کر خود بھی کھڑا ہو گیا۔

”بلکہ ایسا کرتے ہیں، میں آپ کو اپنا لان اور اسٹبل دکھاتا ہوں، باہر ہی چلتے ہیں۔“ اس کا محتاط انداز وریثہ کو اچھا لگا تھا۔

”اچھا، گھوڑوں سے بھی شغف رکھتے ہیں آپ؟“ اس کے شرارت بھرے انداز پر وہ ایک دم قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔ اس کو ہنستے ہوئے اماں نے بڑی خوشگوار حیرت سے دیکھا تھا۔ ان کی آنکھوں میں بے شمار جتنو ایک دم ہی اتر آئے تھے۔ انہوں نے دونوں کو اکٹھے جاتے ہوئے دیکھا اور ساتھ بیٹھیں بوا کو مسکراتے ہوئے دیکھا اور وہ بھی ان کا اشارہ سمجھ کر مسکرا دیں۔

تارکول کا پورا ڈرم اس کے بوتھے پر آن گرا ہوا۔“ بوا زبردستی ہنس رہی تھیں، ان کی تشبیہ پر وریثہ اور اماں کو بھی ہنسی آ گئی تھی۔

”بیچاری کا سارا ہار سنگھار ضائع ہو گیا۔“ بوا کو اب واقعی میں ہنسی آرہی تھی۔

”سکینہ ایسے کسی کا مذاق نہیں اڑاتے۔“ اماں نے سرزنش کے انداز میں کہا۔

”بھرجائی! وہ کسی کی نہیں، مغراں کی بیٹیاں ہیں، جن کی بے عزتی مجھ پر فرض کر دی گئی ہے۔“ وہ ابھی بھی شرارت کے موڈ میں تھیں۔ اماں کو ان کے انداز پر دوبارہ ہنسی آ گئی تھی۔ وریثہ اٹھ کر اندر کی طرف آ گئی۔ سامنے ہی ابھتاج کا کمرہ تھا۔ وہ ہلکی سی دستک دے کر اندر چلی آئی تھی۔ وہ جو تکیہ منہ پر رکھے کمرے میں اندھیرا کئے لیٹا تھا، چونک گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سائیڈ دیوار پر لگے ٹن کے ذریعے کمرے کی ٹیوب لائٹس کو روشن کیا تھا۔

”کیا ہوا آپ کو ایسے کیوں اٹھ کر آ گئے۔؟“ وہ بے دھڑک اٹھ کر آ تو گئی تھی، لیکن اب اسے اپنی یہ حرکت بہت بچکانہ سی لگ رہی تھی۔

”مجھے کچھ بھی نہیں ہوا، آپ کو کس نے کہہ دیا۔؟“ وہ زبردستی ہنسا تھا۔

”آپ کا ہر انداز کہہ رہا ہے۔“ اس نے فوراً کہا تھا۔

”مثلاً، کیا کہہ رہا ہے۔؟“ اس نے الٹا اسی سے سوال کر دیا تھا۔

”یہی کہ آپ کو کوئی بات بری لگی ہے۔“ وہ اس قدر غور سے دیکھ رہا تھا کہ وریثہ کو اپنے سارے الفاظ بھک کر کے اڑتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔

”اچھا، کیا بات ہو سکتی ہے۔؟“ وہ اس کے کفیوڈ ہونے پر ہم سے انداز میں مسکرایا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ آپ کو سدرہ کی بات بری لگی ہے۔“ وہ بے مشکل بولی تھی۔

”ہوں۔۔۔۔۔!“ وہ کسی خیال میں الجھ کر بولا۔ ”بری کا تو پتا نہیں، لیکن مجھے دکھ ضرور ہوا

ہے۔“

”ہاں بعض دفعہ کہنے والے کو بھی پتا نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، آپ ذہن سے نکال دیں، اس بات کو۔“ خواجواہ خود کو پریشان کرنے کا کیا فائدہ؟“ وہ بہت محتاط انداز میں بات کر رہی تھی۔

”ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ، اصل میں جب اپنے ہی رشتے دار آپ کے زخموں سے کھیلنے

اس کے چہرے پر ڈر اور تذبذب تھا۔

”آج کل کے دور میں انسانوں کا اعتبار نہیں ہے جانور تو بہت معصوم ہوتے ہیں.....“ وہ اچھل کر اس پر سوار ہوا تھا۔ گھوڑی نے فوراً خوشی کا اظہار کیا تھا۔ وریشہ دو قدم اور پیچھے ہو کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کی یہ غیر ارادی حرکت اجتہاد کی تیز نظروں سے چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ وہ مسکرا کر نیچے اتر آیا تھا۔

وہ اس کے ساتھ ہی باہر نکل آیا تھا۔ وہ اب اس کو بتا رہا تھا۔ ”ابا ویسے تو تحصیلدار تھے لیکن ان کے اندر وہی زمینداروں والا ٹیپکل خون تھا۔ وہ اپنی زمینوں پر آ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ انہوں نے چند سال ہی نوکری کی اور جب چچا باہر چلے گئے تو وہ فوراً استعفیٰ دے کر گاؤں میں واپس آ گئے تھے۔ پھر ان کی ساری زندگی یہیں گزری۔“

”اس کا مطلب ہے کہ زمین سے محبت بھی پھر آپ کو جینز میں ہی ملی ہوگی.....“ وریشہ نے اسے چھیڑا۔ وہ لوگ پچھلے گیٹ سے باہر نکل آئے تھے۔ سامنے گندم کی فصل لہلہا رہی تھی۔ ”نہیں! یہ شوق مجھے وراثت میں نہیں ملا.....“ وہ ہنسا..... ”مجھے کوئی ایسا لگاؤ نہیں! اس لئے میں اس طرف آیا ہی نہیں! زمینوں کے معاملے سمجھا اور منشی صاحب ہی سنبھالتے ہیں! میں اصل میں چاہتا تھا کہ کچھ زمین جو فالتو پڑی ہے اس پر ہسپتال بنا کر سائرہ کے حوالے کر دوں! لیکن اس کے میاں کو پاکستان میں رہنا ہی پسند نہیں۔“

”آپ ہسپتال کیوں بنانا چاہتے ہیں.....؟“ اس نے بڑے خیر کے عالم میں پوچھا۔ اس کے لئے یہ بات بہت حیرت انگیز تھی۔

”سچ بتاؤں پہلے تو کبھی کبھی یہ خواہش بیدار ہوتی تھی! جب اپنے گاؤں کے لوگوں کو آج کے اس دور میں بھی بنیادی ضروریات کے لئے ترستے دیکھتا تھا۔ اب ہر کوئی تو شہر میں جانا انورڈ نہیں کر سکتا ناں۔ اس کے بعد جب اماں کی بیماری کا اس وقت پتا چلا جب بہت سا پانی پلوں کے نیچے سے گزر چکا تھا۔ اس کے بعد سے تو یہ خواہش جنون بن چکی ہے۔ میں نے سارا اسٹیٹ لگوا دیا ہے! لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ڈاکٹر زکوہم بھاری بھر کم پیکیج دے کر ہی اس گاؤں میں آنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔ کوئی اپنی خوشی سے اس پسماندہ گاؤں میں کیوں آئے گا۔ اس میں ان کا بھی تصور نہیں! معاشی ضروریات سارے انسانیت کے سبق بھلا دیتی ہیں۔“ وہ آخر میں تھوڑا سا تلخ ہوا۔

”آپ کو پتا ہے کہ بابا کا نمبر کیوں بند جا رہا ہے! اس دن کال بھی آئی تو نمبر ڈپلے نہیں ہو رہا تھا.....“ وہ اس کے ساتھ چلتے چلتے ایک دم بولی تھی۔

”اچھا! میرے ساتھ تو ان کی رات ہی بات ہوئی ہے! وہ انڈیا میں تھے اور بالکل ٹھیک ٹھاک تھے.....“ وہ چلتے چلتے رکا تھا۔

”واقعی.....؟“ وہ کچھ مطمئن ہوئی۔

”جی بلکہ کہہ رہے تھے کہ شاید ان کو مزید ایک ہفتہ اور لگ جائے! اس لئے جیسے ہی تابی واپس آ جائے تو میں آپ سے پوچھ کر ہوٹل چھوڑ آؤں.....“ وہ اصطبل کے سامنے پہنچ گئے تھے۔

”ہوٹل تو جانے کا ابھی فائدہ نہیں! ہڑتال چل رہی ہے اور دور دراز کے لوگ بے فکر ہو کر اپنے گھروں کو جا چکے ہیں.....“ اس نے لا پرواہی سے کہا تو اجتہاد کے منہ سے بے اختیار پرسکون سانس خارج ہوئی۔ وہ اپنے اصطبل میں موجود تینوں گھوڑوں کا تعارف کروا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں اور لہجے میں ان کے لئے بے تحاشا محبت تھی۔

”یہ عربی نسل کی گھوڑی بابا کو ان کے ایک شیخ دوست نے گفت کی تھی اور اس کے ساتھ میں نے پاکستان ڈربی کے کئی مقابلے جیتے ہیں۔ گھڑ سواروں کے شوقین افراد کے لئے پاکستان ڈربی کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اس میں ملک بھر کے چوٹی کے گھوڑے اور گھوڑیاں حصے لیتے ہیں۔ میں پاکستان ریس کلب کا ممبر بھی ہوں۔“ وہ اپنی سیاہ رنگ کی خوبصورت نسل کی گھوڑی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”گھوڑوں سے محبت مجھے بابا کی طرف سے جینز میں ملی ہے! مجھے انہوں نے چھ سال کی عمر میں ہی گھڑ سواری سکھنے کے کلب میں بھیج دیا تھا۔ ان کو گھڑ سواری کا جنون تھا اور وہ پولو کے بہت اچھے کھلاڑی تھے۔

”ہوں ناں.....“ وریشہ نے ڈرتے ڈرتے ایک گھوڑے پر ہاتھ رکھا تو وہ ایک دم جھپٹا! وہ ڈر کر فوراً پیچھے ہٹی تو اجتہاد اپنے بے ساختہ قہقہے کو نہیں روک پایا۔ ”اصل میں آپ کا لس ابھی اس کے لئے اجنبی ہے! اس لئے اس نے ناگواری کا اظہار کیا ہے۔ آپ بار بار آئیں گی! ان کے پاس بیٹھ کر باتیں کریں گی اور ان کو پیار سے سہلائیں گی تو یقین کیجئے گا! یہ بہت پیارا اور فادار جانور ہے! یہ آپ کو بہت اچھا رسپانس دے گا۔“

”نہ بھئی نہ! جانوروں کا کیا اعتبار.....“ وہ ڈر کے دیوار کے پاس جا کھڑی ہوئی تھی۔

”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں سب لوگ ایسا نہیں سوچتے.....“ وریشہ نے برا منایا۔

”وریشہ بی بی! کتنے فیصد لوگ ایسا سوچتے ہوں گے۔ آپ خود بتائیں کہ آپ یہاں آ کر کام کرنے کو تیار ہوں گی.....؟“ وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر بالکل اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وریشہ کو جھٹکا لگا تھا۔ اس نے چونک کر اسے دیکھا جس کی گہری نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ وریشہ کو ایسے لگا جیسے اس نے کوئی ایکس رے مشین اپنی آنکھوں میں فٹ کر دیا رکھی ہو۔ وہ اس کا دماغ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”دیکھا.....؟ چپ ہو گئیں ناں.....؟“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا تھا، وریشہ کو ایک دم غصہ آ گیا تھا۔

”میں نے کب انکار کیا.....؟“ اب کہ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھ رہی تھی۔

”جانے دیں وریشہ انصاری! ایسے جذباتی نہیں ہوتے۔ زندگی جذباتیت کے سہارے نہیں گزرتی۔“ وہ اب بھی اس کا سرخ چہرہ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔

”زندگی میں سے جذبات نکال دیئے جائیں تو اس مشینی زندگی کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔ آپ خود بتائیں کہ کیا ہسپتال بنانے کا ارادہ آپ نے بھی جذبات کے زیر اثر نہیں کیا؟“ وہ ترخ کر بولی تھی۔

”یہ میرا بالکل بھی جذباتی فیصلہ نہیں میں نے پورے دو سال اس پر سوچا اور پھر اس کو فائل کیا ہے میں نے اس جگہ آنکھ کھولی ہے ان لوگوں کے درمیان پلا بڑھا ہو۔ ان کی مشکلات کا مجھے اندازہ ہے۔ یہی جذباتی انیت مجھے ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ آپ کو کیا انس ہو سکتا ہے؟ آپ کیوں اپنے آپ کو اس جگہ پر ضائع کریں گی.....“ وہ بے حد سنجیدہ تاثرات لئے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میں یہاں کیوں خود کو ضائع کروں گی، بلکہ ہو سکتا ہے کہ میں اسٹڈی مکمل کر کے لاہور واپس جاؤں اور وہاں کسی اسٹیمپلش ہسپتال سے منسلک ہو جاؤں۔ جہاں میرے نہ ہونے سے کسی کو بھی فرق نہیں پڑے گا، کیونکہ وہاں پہلے سے بہترین لوگ ہوں گے۔ ہاں ایسی کسی پسماندہ جگہ جہاں میرے نہ ہونے سے بہت سے لوگوں کو فرق پڑے، میں خود کو وہاں کے لئے وقف کیوں نہ کروں؟“ اس کا لہجہ شکایتی تھا۔ ابہتاج مطمئن انداز میں ہنسا اور گہری سانس لے

کر اسے نظروں میں سمویا۔ ”سوچ لیں بہت بڑی بات کہہ رہی ہیں آپ.....“ اس کی آنکھوں میں لپکنے والی چمک نے وریشہ کو ٹھٹکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ گھبرا کر سامنے بنی پگنڈی پر چلتے ہوئے بولی۔ ”اپنی غلط فہمی دور کر لیں، میں آپ کے ہسپتال کی بات نہیں کر رہی، بلکہ کسی بھی پسماندہ علاقے میں بننے والے ہسپتال کی بات کر رہی ہوں، وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔“

وہ ایک دم ہی تیز تیز چلتا ہوا اس کے سامنے آ کر راستہ روک کر بولا تھا۔ ”اگر میرے ہسپتال میرے گھر یا میرے دل سے بہتر جگہ آپ کو کوئی لگے تو آپ جاسکتی ہیں.....“ اس نے بہت جذب سے کہا تھا۔ وریشہ کو اپنے پورے وجود میں کرنٹ سا دوڑنا ہوا محسوس ہوا تھا۔ وہ گھبرا کر پلٹی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اندر کی جانب بڑھنے لگی۔ اپنے عقب میں اس نے ابہتاج کا قہقہہ سنا تھا۔ اس کے چہرے کی سرخی میں اضافہ ہوا۔ اس کا دل عجیب سی لے پر دھڑک رہا تھا۔ وہ ایک لمحے کے حصار میں جکڑی گئی تھی۔



وہ ہکا بکا انداز سے تابی کو دیکھ رہی تھی جو پندرہ دن کے بجائے بارہ دن بعد ہی واپس آ گئی تھی اور اب بڑے مزے سے اماں کے تخت پر ان کے ساتھ لیٹی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ چھلانگ مار کر خوشی سے اتری تھی اور اب بڑے والہانہ انداز سے اس کے ساتھ چٹی ہوئی تھی۔

”تم کہاں سے آ گئیں؟ کیا سعودیہ سے ڈائریکٹ لینڈنگ یہیں گاؤں میں کی تھی.....“ اس نے بے ساختگی سے کہا۔

”ہمیں پتا چلا تھا کہ آپ اور اماں ہمیں بہت دل سے یاد کر رہی ہیں، بس ہم نے بھی فوراً واپس آنے کی ٹھان لی۔“ تابندہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

”ہم نے تو ایسی کوئی غلطی نہیں کی..... کیوں اماں.....؟“ اس کے لہجے میں شرارت ہی شرارت تھی۔ اماں بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا کر ہنسنے لگیں۔

”دیکھ لیں بھائی! آپ ڈاکٹر صاحبہ کو اور اماں کو دونوں آپس میں کتنا ”ایکا“ کر کے بیٹھی ہوئی ہیں۔ میں بیچاری دس دنوں کے لئے کیا گئی، دونوں نے آنکھیں ہی ماتھے پر رکھ لی ہیں۔“ وہ لاڈ بھرے انداز سے برآمدے کے ایک کونے میں رکھے بڑے سارے لکڑی کے جھولے میں اخبار منہ پر رکھے ابہتاج سے مخاطب ہوئی۔ وہ بھی وریشہ کی آواز پر فوراً اٹھ کر بیٹھ

”آئیے دیں سائرہ کو بتاؤں گی اسے وہ ہی آپ کو ٹھیک رکھتی ہے.....“ تابندہ روتے روتے ہنسی تھی۔

”آجائے وہ کون سا میرے اوپر ڈی سی لگی ہوئی ہے.....“ وہ بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ اسے چھیڑ رہا تھا۔

”چلیں آپ تو کافی لوگوں کے اوپر ڈی سی لگے ہوئے ہیں ناں ان کو جا کر ڈرائیں ہم ڈرنے والوں میں سے نہیں.....“ وہ حسب عادت زور سے ہنس دی۔

”تم لوگ مجھ سے چھوٹی ہو کر نہیں ڈرتی ہو کوئی اور کیا ڈرے گا.....“ اس نے اماں کے کندھے دباتے ہوئے مصنوعی مایوسی اپنے اوپر طاری کی۔ دریشہ نے چونک کر ان دونوں کو دیکھا۔ جواب ایک دوسرے پر تابو توڑ حملے کر رہے تھے۔ اس دن بوا بھی ان کے پاس آن بیٹھیں اور رات گئے تک گفت و شنید کا سلسلہ جاری رہا۔ اماں بھی باقاعدہ ساری بات چیت میں بھرپور حصہ لیتی رہیں۔ وہ بخار کے باوجود کافی فریش تھیں۔ صبح چار بجے کے قریب ان کی حالت کچھ خراب ہوئی اور ان کو دوبارہ ہسپتال لے جایا گیا اور وہاں کچھ گھنٹوں کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ سب ہکا بکا تھے۔ سب سے بری حالت سائرہ کی تھی۔ اس کی سیس اگلے ہفتے کی تھیں اور اماں اس کا انتظار کئے بغیر چلی گئی تھیں۔ وہ سخت صدمے کے عالم میں جب پہنچی تو اماں اپنی آخری آرام گاہ جا چکی تھیں۔ ایک ہفتے کے بعد سائرہ آئی تو گھر کا ماحول ایک دفعہ پھر سوگوار ہو گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اماں کا انتقال ابھی ابھی ہوا ہو۔ سارا گاؤں ایک دفعہ پھر اٹھ آیا تھا۔ تعزیت کا سلسلہ تو پچھلے ایک ہفتے سے ہی جاری تھا لیکن سائرہ کی آمد کے بعد لوگ ایک دفعہ پھر اس سے افسوس کرنے آ رہے تھے۔ بوا تو بالکل گم سم تھیں وہ اماں کی وفات کو ذہنی طور پر قبول کرنے کے لئے تیار ہی نہیں تھیں۔ اس لئے بیٹھے بیٹھے اماں کو آوازیں دینے لگتیں تو کبھی ان کے لئے پرہیزی کھانا تیار کر کے گھنٹوں میز پر رکھ کر اسے ہکتی رہتیں اور پھر بلند آواز میں رونا شروع کر دیتیں۔ دریشہ نے تو کچھ دن ان کو ڈیپریشن کم کرنے کی ادویات دیں لیکن کوئی افادہ نہ دیکھ کر اس دن وہ بوا کے سامنے آن بیٹھی۔

”آپ اس حقیقت کو مان کیوں نہیں لیتیں کہ اماں اب اس دنیا میں نہیں رہیں یقین کریں اس کو مان لینے سے آپ کی زندگی آسان ہو جائے گی۔“ دریشہ نے ان کے دونوں اٹھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر بہت محبت اور نرمی سے کہا تھا۔

گیا۔ وہ پچھلے تین دن سے اس کے سامنے آنے سے ہر ممکن طور پر کتر رہی تھی۔ اس وقت شاید اسے اندازہ نہیں تھا اس لئے بوکھلا کر وہ فوراً ہی اماں کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

”بھئی میں کیا کہہ سکتا ہوں یہ آپ خواتین کا معاملہ ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے اپنا دامن چھڑوایا۔ وہ اب متمسم انداز میں بخور اسے دیکھ رہا تھا جو اماں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”اس لئے تو ہم کہتے ہیں کہ آپ اپنی خاتون بھی گھر لے آئیں تاکہ خواتین کے معاملے میں بول سکیں.....“ اس نے بھائی کو چھیڑا۔

”نہ بابائے میں ایسے ہی ٹھیک ہوں.....“ اس نے ہنستے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

”سوچ لیں در نہ ہم تو بہت کچھ سوچ چکے ہیں.....“ تابندہ کے لہجے کی معنی خیزی نے دریشہ اور ابہتاج دونوں کو ہی چونکا دیا تھا۔

”کیوں اماں.....؟“ اس نے اپنی چھیڑ چھاڑ میں اماں کو بھی کھینچا، جن کو صبح سے ہکا بکا بخار تھا، لیکن وہ اس کے باوجود مسکرا رہی تھیں۔ ”میری تو بیٹا اب آخری یہی خواہش ہے کہ جو چند دن رہ گئے ہیں بیٹے کی خوشی بھی دیکھ لوں۔“ دل گرفتہ تو وہ پہلے سے ہی ہو رہی تھیں اب آنسو بھی چلے آئے تھے۔

وہ تینوں ہی بوکھلا گئے۔ ”کیا ہو گیا ہے اماں آپ کو کیوں ایسی باتیں کرتی ہیں.....“ تابندہ جذباتی ہو کر سب سے پہلے بولی تھی۔ ابہتاج بھی اٹھ کر ان کے پاس آ گیا تھا۔ دریشہ نے اٹھ کر فوراً اسے جگہ دی۔ وہ اب سامنے پڑی چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔ پورے ماحول میں ایک محسوس کی جانے والی سوگواریت پھیل گئی تھی۔ ابہتاج اپنے ہاتھوں سے ان کے آنسو صاف کر رہا تھا۔

”ان کی وجہ سے ہم لوگ پندرہ دن کے بجائے بارہ دن میں واپس چلے آئے اور اگلے ہفتے سائرہ بھی آجائے گی پھر بھی اماں ایسی دل دکھانے والی باتیں کرتی ہیں۔“ تابی نے بمشکل اپنے آنسوؤں پر قابو پا کر بھیکے لہجے میں کہا۔

”اماں کو اسی چیز کی تو مینش ہے کہ اتنی مشکلوں سے تم دونوں کو گھر سے نکالا تھا تم لوگ پھر تیسرے دن آجاتی ہو کیوں اماں.....؟“ ابہتاج نے ماحول کی سوگواریت دور کرنے کی ہلکی پھلکی کوشش کی۔

”میرا دل نہیں مانتا.....“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھیں۔

”آپ کے دل کے نہ ماننے سے حقیقت بدل تو نہیں جائے گی ناں۔ جب میری ماما انتقال ہوا تھا تو مجھے بھی لگتا تھا کہ بس یہ ایک ڈراؤنا سا خواب ہے، آنکھ کھلے گی تو سب کچھ ویسا ہی ہوگا، لیکن بوا سب کچھ ویسا نہیں ہو سکتا، حقیقت پہاڑ کی طرح ہوتی ہے، ہم جب بھی ڈر سے آنکھیں بند کر کے دوبارہ کھولتے ہیں وہ پہاڑ پوری طاقت کے ساتھ ہمارے سامنے ہوتا ہے۔ اس لئے ہمیں حقیقت کی طاقت کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ یقین مانیں بہت دکھ ہوتا ہے، دل پھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے لیکن اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ وقت اس کی تلخی کو خود بخود کم کر دیتا ہے.....“ وہ بہت اپنائیت سے ان کو سمجھا رہی تھی۔

”پتر تم سوچ نہیں سکتی ہو کہ میری بھر جانی میرے لئے کیا تھی؟ ایک ماں کی طرح اس نے مجھے پناہ دی، ایک بہن کی طرح مجھے محبت سے نوازا، ایک سہیلی کی طرح میرے دکھ سکھ سنے۔ میں جب اس گھر میں میاں کے ساتھ آئی تھی تو دنیا نے بہت ڈرایا تھا کہ بھر جانیاں مستقل طور پر نندوں کو برداشت نہیں کرتیں، لیکن میری بھر جانی تو ایسی نیک صفت عورت تھی کہ ساری زندگی میں نے اس عظیم عورت کے متھے پر کوئی بل نہیں دیکھا۔ مجھے تو لگتا ہے میری ماں ایک دفعہ بھر مر گئی۔“ بوا کی آنکھوں سے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ سائرہ بھی ان دونوں کو باتیں کرتا دیکھ کر وہاں آگئی تھی اور خاموشی سے بیٹھ گئی تھی۔

”میں مانتی ہوں بوا، اس بات کو۔ آپ کا دکھ بہت بڑا ہے لیکن یہ بھی تو سوچیں ناں کہ اللہ اپنے بندوں پر کبھی بھی ان کی برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ مبر کرنا بھی آسان نہیں، لیکن انسان اس معاملے میں بے بس ہے۔ آپ یہ بھی تو سوچیں کہ اماں نے اپنی تکلیف کو کس قدر بہادری اور حوصلے سے برداشت کیا۔ میں نے کبھی بھی ان کے منہ سے اف نہیں سنی، ورنہ جتنی تکلیف میں وہ تھیں، ایسے مریض بیمارے تو تکلیف کی شدت سے بے حال ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ ان کے گھر والے بھی اسی تکلیف کو محسوس کر رہے ہوتے ہیں۔“ اس کی بات پر بوانے بے اختیار اپنے آنسو صاف کئے تھے، جبکہ وہ اپنے مخصوص محبت بھرے انداز سے گویا تھی۔ ”جتنی تکلیف میں وہ تھیں، اللہ نے ان کو بہت آسانی دی ہے۔ آپ بس ان کے لئے دعا کریں کہ ان کی اگلی منزلیں بھی اللہ آسان کرے۔“

”انشاء اللہ.....!“ بوا اور سائرہ دونوں کے منہ سے ایک ساتھ ہی نکلا تھا۔

”دریشہ تم بہت اچھی لڑکی ہو، اللہ تمہاری قسمت بہت اچھی کرے، تم نے ہمارا بہت مشکل وقت میں ساتھ دیا۔“ سائرہ نے پر خلوص انداز سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔

”پتا نہیں سائرہ، میرے یہاں آنے میں خدا کی کیا مصلحت تھی، میں نے کبھی زندگی میں سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اس علاقے میں آؤں گی۔ لیکن میں نے یہاں جتنا بھی وقت گزارا، میں سب لوگوں کی محبت اور اپنائیت کو کبھی بھی نہیں بھلا پاؤں گی۔ آپ کی والدہ بہت اچھی اور نیک خاتون تھیں، انہوں نے مجھے بالکل ایک سگی ماں کی طرح ٹریٹ کیا، بعض دفعہ تو مجھے بے اختیار ماما یاد آ جاتی تھیں.....“ دریشہ کی آنکھوں سے اداسی جھلک رہی تھی، لیکن وہ زبردستی مسکرا رہی تھی۔

”تمہیں اس لئے اماں اچھی لگیں، کیونکہ تم اصل میں خود بہت اچھی اور خالص لڑکی ہو۔ تم میں بناوٹ قطعاً نہیں.....“ سائرہ نے کھلے دل سے اسے سراہا تھا۔

”تھینک یو سائرہ.....!“ دریشہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مجھے اہتاج بتا رہا تھا کہ تمہارے بابا تمہیں لینے آرہے ہیں.....“ سائرہ کی بات پر وہ زبردست چونکی، خوشی کا بڑا گہرا احساس بڑے فطری انداز سے اس کے چہرے پر نمودار ہوا تھا۔ ”اچھا واقعی..... کب.....؟“ اس نے بے اختیار پوچھا۔

”ابھی تو تم ہماری محبتوں کا اعتراف کر رہی تھیں اور اب ایسے خوش ہو رہی ہو جیسے کسی قیدی کو جیل سے چھٹکارا مل رہا ہو.....“ سائرہ نے شرارت سے اسے چھیڑا تو وہ فوراً جھینپ گئی۔ ”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، اصل میں بابا سے ملاقات ہوئے کافی عرصہ ہو گیا تھا ناں، اس لئے اور پھر میرے فائل ایئر کے ایگزٹام بھی قریب ہیں.....“

”چلو شکر ہے، ورنہ میں تو سمجھی تھی کہ شاید تم ہمارا دل رکھنے کے لئے کہہ رہی تھیں.....“ سائرہ نے اس کے بلش ہوتے چہرے کو دلچسپی سے دیکھا۔

”دریشہ بہت مروت والی لیکن بہت سادہ سی لڑکی ہے۔ اس کو کھسن گھیریاں دینی نہیں آتیں.....“ تابلی چائے کی ٹرے لئے اندر داخل ہوتی ہوئی بولی تھی۔

”تمہیں بہت پتا ہے ناں.....“ سائرہ نے چائے کی شوقین تابندہ کا بڑا گ اٹھاتے ہوئے شرارت سے کہا، جبکہ وہ اس کی شرارت پر گھور کر رہ گئی۔

”جوہر شناس نظریں ہیں ہماری.....“ تابندہ نے اپنا فرضی کار لٹھاتے ہوئے بڑے ٹھٹھ سے کہا تھا۔

”کس کی جوہر شناس نظریں ہیں، کیا میری.....؟“ اجتاج کوئی فائل اٹھائے اچانک اندر آیا تھا۔ اس نے تابندہ کی بات سنی تھی۔ اس لئے سوالیہ نظروں سے سامنے بیٹھی چاروں خواتین کو غور سے دیکھا۔ آج کافی دن بعد بوا کے چہرے پر کچھ اسے بشاشت نظر آئی تھی۔ اس نے آتے ہی وریشہ کا چائے کا کپ اٹھا کر منہ کو لگا لیا تھا۔

”بھائی یہ وریشہ کی چائے تھی.....“ تابی نے اجتاجی نظروں سے اسے دیکھا جو بہت مزے سے کھڑا کھڑا چائے پی رہا تھا۔

”زیادہ چائے پینے سے رنگ کالا ہو جاتا ہے تمہارا تو پہلے ہی پورا سورا ہے اب وریشہ کو تو احتیاط کرنی چاہیے.....“ وہ بھی آج کافی دن بعد مسکرایا تھا۔ سارہ نے غور سے بھائی کا چہرہ دیکھا اور مستی خیز انداز میں بولی۔ ”آپ کو وریشہ کے رنگ کی کیوں اتنی ٹینشن ہو رہی ہے.....؟“

”ظاہر ہے مجھے ہی تو ٹینشن ہوگی، کل پروفیسر صاحب آ رہے ہیں ایسا نہ ہو کہ اپنی بیٹی کو پہچاننے سے انکار کر دیں اور لے کر تو میں ہی آیا تھا ناں.....“ اس کا انداز سنجیدہ جبکہ آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

”بے فکر رہیں دوبارہ بھی آپ ہی لے کر آئیں گے.....“ سارہ کے ذومعنی انداز پر دونوں نے گڑبڑا کر اسے دیکھا جس کے چہرے پر شوخی اور شرارت رقصاں تھیں اور وہ بہت مزے سے چسکیاں لے لے کر چائے پی رہی تھی۔ وریشہ کو اندازہ ہوا کہ دونوں بہن بھائی میں حد درجہ بے تکلفی تھی۔ اسے یاد آیا کہ تابندہ نے بتایا تھا کہ دونوں میں صرف ایک سال کا فرق ہونے کی وجہ سے کافی دوستی تھی۔ سارہ بڑی بے تکلفی سے اس کا نام لے کر بلاتی تھی۔ اس کی بات کو نظر انداز کر کے وہ بولا تھا۔

”اب فائنٹ ان کاغذوں پر سائن کر دو اپنا اپنا حصہ لڑایا نہ ہو کہ کل میری نیت خراب ہو جائے.....“ وہ مختلف قانونی معاملات کے ڈاکومنٹس سامنے رکھتا ہوا بولا تھا۔

”یہ کیا خرافات ہیں میں نے بھائی پہلے بھی کہا تھا کہ ہمیں کچھ نہیں چاہیے.....“ تابی نے انتہائی خشکی سے کہا تھا۔

”یہ خرافات نہیں اماں کے نام پر جو چیزیں تھیں ان کے ڈاکومنٹس ہیں مجھے اسلام کے بنائے گئے قوانین پر چلنا ہے جو تم لوگوں کا حصہ بنتا ہے وہ تو میں کسی صورت نہیں رکھوں گا۔ میں کیوں گناہ گار بنوں اس لئے زیادہ بحث کی ضرورت نہیں فوراً سائن کرو.....“ اس نے انتہائی محبت بھرے انداز میں دھمکایا تھا۔

”آپ میرا سارا حصہ تو اپنے ہسپتال میں ڈال لیں اور ایک وارڈ اماں کے نام پر ضرور بنائیں.....“ اس نے سارہ کی سنجیدہ سی بات سنی تھی۔ وہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ آئی تھی۔ وہ ان کا انتہائی ذاتی معاملہ تھا۔ اس لئے اس نے وہاں بیٹھنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

”میں پورا ہسپتال ہی اماں کے نام پر بنا رہا ہوں.....“ وریشہ نے کمرے سے نکلتے ہوئے اجتاج کا جواب سنا تھا۔ ہسپتال کے نام پر اسے کچھ دن پہلے کی اس کی بات یاد آ گئی۔ اس کے چہرے پر بڑے خوبصورت رنگ پھیلے تھے۔



”اودہ مائی گاڈ.....!“ تم کا مرید کے گاؤں میں اس کے گھر پر ہو مجھے جب بابا نے بتایا یقین مانو مجھ سے صبر نہیں ہو سکا.....“ ارسلہ کی کافی دن کے بعد جاپان سے کال آئی تھی۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں چیخ کر بول رہی تھی۔ وہ جب بھی کچھ جوش میں آتی تھی اس کی آواز کا ولیم خود بخود تیز ہو جاتا تھا۔

”کہاں ہے وہ کمینہ انسان.....؟“ وہ ارسلہ کے انتہائی بے تکلفانہ انداز پر چونکی۔ ”اس خبیث کو میں نے اماں کے انتقال پر فون کیا اس سے پہلے ان کی بیماری کے دنوں میں بھی اس سے رابطہ رہا لیکن اس گھنے نے مجھے ایک دفعہ بھی نہیں بتایا کہ تم اس کے گھر میں ہو۔ یہ شروع سے ہی انتہائی کمینی حرکتیں کرتا آیا ہے۔“ ارسلہ کے انداز و بیان سے لگ رہا تھا کہ ان دونوں کے درمیان خاصے بے تکلفانہ مراسم تھے۔

”تم اس کو چھوڑ دو مجھے یہ بتاؤ تم کہاں مر گئی تھیں آج بیس پچیس دن کے بعد تمہیں میرا خیال آیا ہے.....“ وریشہ نے اس کی کلاس لی۔

”کہاں فون کرتی جس سرنگ میں تم رہ رہی ہو آج کل وہاں سنگٹل ہی کہاں ڈھنگ سے آتے ہیں ویسے یہ کامریڈ کا بچہ ڈپٹی کمشنر لگا ہوا ہے اور اپنے گاؤں میں ایک بوسٹر نہیں لگوا سکتا ذرا بات کراؤ مجھ سے۔ اس کی طبیعت میں سیٹ کر دوں گی۔“ ارسلہ کا غصہ کسی طور کم نہیں

پھر اشعر سے مل کر تو بابا بہت خوش ہوئے اور جھٹ پٹ ہماری شادی ہو گئی.....“  
 ”تم کتنی گھٹیا ہو ارسلہ تم مجھے آج یہ اپنی تھرڈ کلاس اسٹوری سنارہی ہو تمہیں شرم نہیں آتی.....“ وریشہ کو اس کی ہنسی سخت زہر لگ رہی تھی۔

”اس وقت تو قسم لے لو بہت شرم آتی تھی اور کچھ تم اپنی میڈیکل کی اسٹڈی میں اتنی غرق تھی کہ میں نے سوچا کہ کیا اپنی معصوم بہن کو تنگ کرنا خود ہی مسئلہ حل کر لیتے ہیں اور کچھ تم سے تھوڑی سی جھجک جو تھی کہ کیا سوچو گی.....“ اپنی بات کے آخر میں اس نے حسب عادت قہقہہ لگایا تھا۔

”یقین کرو کہ دل کر رہا ہے کہ میں آ کر تمہارا سارا منہ نہ سہی لیکن اگلے چار دانت تو ضرور ہی توڑ دوں.....“ اس کی ہنسی وریشہ کو تپا رہی تھی۔ اس نے کوفت اور جھنجھلاہٹ سے سامنے کھلی کھڑکی سے اندر آتی سدرہ کو دیکھا۔ اسی وقت ابہتاج بھی برآمدہ کر اس کر کے صحن میں پہنچا تھا۔ سدرہ نے اسے روک لیا تھا۔ وہ دھوپ سے بچنے کے لئے ہاتھ میں پکڑی فائل کو ماتھے پر چھاسا بنائے کھڑا تھا۔ وریشہ کی ساری توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔  
 ”وٹی شکر ہے کہ بابا کا مسئلہ حل ہوا مت پوچھو کتنی ٹینس تھی میں.....؟“ ارسلہ اب کچھ سنجیدہ ہو کر کہہ رہی تھی۔

”کون سا مسئلہ.....؟“ اس نے بے دھیانی سے پوچھا۔ آنکھیں اتنے فاصلے سے بھی سامنے کا منظر صاف دیکھ رہی تھیں۔ وہ سدرہ کو کچھ کہہ رہا تھا جبکہ اس کا شرمایا ہوا چہرہ اور اس پر پھیلے رنگ وریشہ کو جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر رہے تھے۔ مسکراہٹ لبوں پر سجائے وہ بھی نہ جانے کون سی داستان امیر حمزہ اسے سنارہا تھا۔ وہ یک ٹک ان دونوں کو دیکھنے جا رہی تھی۔

”بابا بہت اپ سیٹ تھے لیکن شکر ہے کہ اللہ نے عزت رکھ لی.....“ ارسلہ کی بات سمجھنے سے وہ قاصر تھی۔ آف وائٹ شلوار سوٹ میں ابہتاج کا دراز قد اور بھی نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ اب بالکل کھڑکی کے پاس آ گئی تھی۔ دوپہر کا وقت تھا اور اس وقت سب ہی کمروں میں دبک بیٹھے تھے۔

”کس کی عزت کی بات کر رہی ہو.....؟“ وریشہ اب کہ ابھی لیکن اسی وقت گنگل ڈراپ ہونا شروع ہو گئے تھے اور ابہتاج بھی گیٹ کی طرف بڑھ گیا تھا۔ سدرہ اپنا پراندہ فضا میں گھماتی بڑے سرشار انداز سے اندر آ رہی تھی۔ وریشہ کو آج پہلی دفعہ اس سے تھوڑا سا حسد

ہو رہا تھا۔

”یہ تم کا مریڈ ابہتاج کو کہتی تھیں..... یہ ڈپٹی کمشنر ہے؟“ وریشہ کے دماغ میں کچھ باتیں کلک کر کے روشن ہوئی تھیں۔ اس کو جھٹکا ہی تو لگا تھا۔

”یہ کا مریڈ وہی ہے ناں جس کی سی ایس ایس میں سیکنڈ پوزیشن تھی.....؟“ اس نے سخت حیرت سے پوچھا تھا۔ کا مریڈ کے حوالے سے اس کا نام اس کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ اس نے کئی دفعہ بابا اور ارسلہ کے منہ سے یہ نام سنا تھا۔

”ہاں وہی میرا خبیث کلاس فیلو ہے اتنا مشکل اس کا نام تھا۔ کون ایک منٹ لگا کر ابہتاج ہاشمی کہے۔ اس لئے جب بابا نے اس کا نام کا مریڈ رکھا تو ہم سب نے بھی اسے یہ ہی کہنا شروع کر دیا۔“ وہ بہت مزے سے کہہ رہی تھی۔

”میرا اور اس کا ہر معاملے میں مقابلہ چلتا تھا جب میں نے سی ایس ایس میں ٹاپ کیا تھا تو اس کی شکل دیکھنے والی تھی لیکن ان سب باتوں کے باوجود ہماری بڑی مزے والی دوستی تھی بلکہ ہے۔ ابھی بھی ہر پندرہ دن بعد بات ہو جاتی ہے اور زیادہ وقت ہمارا لڑنے میں ہی گزر جاتا ہے۔ یہ کئی دفعہ تو ہمارے گھر بھی آیا ہے تمہیں یاد ہے.....؟“

”نہیں مجھے یاد نہیں اور ویسے بھی پچھلے چار سالوں سے تو میں ہوٹل میں ہوں.....“ اس نے سادگی سے کہا۔ اسے سخت حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اتنا سادہ دکھائی دینے والا بندہ ڈپٹی کمشنر تھا نہ اسے اور نہ ہی اس کے گھر میں سے کسی کو اس کی اس پوسٹ پر اس نے اتراتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ سارے ہی حد درجہ سادہ اور درویش صفت لوگ تھے۔

”حیرت ہے مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں.....“ وہ بات کرتے کرتے کمرے کی کھڑکی کے پاس آ کر رک گئی تھی۔

”پتا ہے وریشہ بابا کی بہت خواہش تھی کہ میری اس کے ساتھ شادی ہو جائے..... میرا ان دنوں عشق اشعر کے ساتھ زوروں پر تھا اور کا مریڈ کو اس کا پتا تھا۔ یہ تھا تو کمینہ لیکن اس نے اس معاملے میں ہمارا خوب ساتھ دیا کیونکہ اشعر اس کا بیٹ فرینڈ تھا۔ بابا کو آج تک ہمارے عشق کی خبر نہیں ہو سکی اتنی نے بڑے اچھے انداز سے اس کا پروزل بابا کے سامنے پیش کیا اور بیچارے بابا کو بتا رہے تھے کہ ان کی خواہش تو ابہتاج کے لئے تھی لیکن اس نے پہلے ہی اپنے دوست کا پروزل بھیج دیا۔ اس لئے انہوں نے اس معاملے کو وہیں ختم کر دیا اور

کہ لہجہ بشارت کا بھرپور انداز لئے ہوئے تھا۔ وہ بھاگ کر ان کے سینے سے لگی تھی۔ ”بابا یہ آپ کو کیا ہوا ہے؟.....“ اس نے غور سے ان کا کمزور جسم اور بڑھی شیوہ کو دیکھا۔ کپڑے بھی شاید اچھی طرح سے پرلے نہیں تھے۔ اس کو شدید حیرت کا جھٹکا لگا۔ وہ جانتی تھی کہ بابا کتنے دیر ڈرلے اور نفیس انسان تھے۔ ایسا حلیہ تو ان کا ماما کے انتقال کے روز بھی نہیں تھا۔

”بابا آپ کو انڈیا والوں نے کہیں قید میں تو نہیں رکھا ہوا تھا؟ یہ کیسا حلیہ بنایا ہوا ہے آپ نے؟.....“ اس کی خوشی پریشانی میں ڈھل چکی تھی۔ وہ اب غور سے بابا کے سرخ و سفید چہرے میں چھلکتی زردی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے اور جھریوں کو دیکھ رہی تھی۔ بائیس دن سے وہ یہاں تھی اس سے پہلے پندرہ دن سے وہ راولپنڈی میں تھی۔ اس نے تقریباً ان کو ڈیڑھ ماہ بعد دیکھا تھا۔ ڈیڑھ ماہ پہلے وہ بالکل فریش ان کو چھوڑ کر آئی تھی۔

بابا اپنے ازلی پر وقار انداز سے مسکرا رہے تھے۔ اسی وقت سارہ ایک اور چائے کا مگ لئے اندر سے نمودار ہوئی تھی۔

”یار کیا ہے تم لوگوں کو صبح شام بس ایک ہی کام ہے؟ جب دیکھو اتنی گرمی میں یہ بڑے بڑے مگ منہ سے لگا رکھے ہوتے ہیں۔“ ابھاج نے بہت سرعت سے بات تبدیل کی تھی۔ سارہ سے ملنے کے بعد وہ اب بابا کا ہاتھ پکڑ کر مہمان خانے کی طرف جا رہا تھا۔

”یہ ابھاج کا بھی کچھ پتا نہیں چلتا مجھے ڈھنگ سے پروفیسر صاحب کا حال احوال بھی پوچھنے نہیں دیا.....“ سارہ جھنجھلاہٹ سے کہتے ہوئے سامنے والی کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔ ”ہمیں چائے پینے سے منع کرتے ہیں اور خود اللہ بخشے اماں کہا کرتی تھیں کہ ابھاج کے جسم میں خون کم اور چائے زیادہ ہوگی۔“

”بابا پتا نہیں کیوں اتنے کمزور لگ رہے ہیں.....“ وہ حد درجہ پریشان اور بے چین ہو گئی تھی۔ سارہ نے غور سے اس کا الجھا ہوا چہرہ دیکھا۔ ”ہاں مجھے بھی کافی ویک لگ رہے تھے کہیں بیمار تو نہیں رہے.....“ سارہ کی بات نے اس کی بے چینی میں اضافہ کر دیا تھا۔ وہ بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میں مہمان خانے میں بابا کے پاس جا رہی ہوں.....“ اس نے چائے کا آدھا مگ ویسے ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ سارہ کچھ کہتی وہ فوراً چل پڑی تھی۔ راستے میں ہی اس کا ابھاج سے ٹکراؤ ہو گیا تھا۔ وہ ٹھٹھک گئی۔

”آپ کہیں پروفیسر صاحب کے پاس تو نہیں جا رہیں.....“ اس کی قدرے سنجیدہ آواز

محسوس ہوا تھا۔ وہ اپنے محسوسات خود بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ اسے واقعی غصہ آ رہا تھا۔ کال ڈراپ ہو چکی تھی۔

”یہ ارسلہ کس کی عزت کی بات کر رہی تھی۔ وہ اب فراغت سے سامنے بڑے بیڈ پر لیٹی تھی جب معا سے یاد آیا۔ کچھ دیر اس نے بے مقصد اپنا دماغ لڑایا لیکن دماغ پر سدرہ کا رنگوں میں نہایا ہوا چہرہ کسی بھی نکتے کی جانب اس کی توجہ مبذول ہونے نہیں دے رہا تھا۔ اس نے تھک ہار کر پلنگ کی پشت سے ٹیک لگا لی وہ خاصی طول بیٹھی ہوئی تھی۔ سدرہ شاید گول کمرے میں تابندہ اور سارہ کے پاس تھی۔ اس کے آج کل یہاں کے خوب چکر لگ رہے تھے۔

”میری طرف سے جائے بھاڑ میں مجھے کسی سے کیا لینا دینا آج ہی بابا کو فون کرتی ہوں کہ جلد آئیں اتنا زیادہ میرا پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے۔ ان کو احساس ہی نہیں.....“ اسے پہلی دفعہ احساس ہوا تھا کہ خود کو سمجھانا دنیا کا مشکل کام ہے اور یہ مشکل کام وہ انتہائی وقت سے ہی سرانجام دے رہی تھی۔ سوچوں میں گم نہ جانے وہ کس وقت نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا۔



اس نے سخت بے یقینی سے سامنے کا منظر دیکھا.....

وہ ایک دم ہی آگے بڑھی اس کے چہرے کی حیرت بڑی تیزی سے مسرت کے رنگوں میں ڈھلی تھی۔ ”اوہ مائی گاڈ بابا! یہ آپ ہیں.....؟“ اس نے ابھی ابھی ابھاج کے ساتھ اندر داخل ہوتے بابا جانی کو دیکھا تھا۔ صبح سات بجے کا وقت تھا اور وہ چپا کے خوشبو اڑاتے پیڑوں کے پاس کرسی رکھے بڑی فراغت کے ساتھ چائے کا مگ لئے بیٹھی تھی۔ آج موسم خاصا اچھا تھا اور وہ سارہ کے ساتھ موسم کی دلفریبی کو محسوس کرنے کے لئے اپنے پسندیدہ گوشے میں بیٹھی تھی اور سدرہ کے دوہنی پلٹ کزن سے اس کی اچانک متکئی کا قصہ دلچسپی سے سن رہی تھی۔ اسے کل سدرہ کے چہرے پر پھیلی خوشی کی وجہ سمجھ میں آ گئی تھی۔ سارہ ابھی ابھی کسی کام سے اندر گئی تھی جب اس نے بابا کو ابھاج کے ساتھ گیٹ سے اندر داخل ہوتے دیکھا۔

”بابا! یہ آپ ہی ہیں ناں.....“ دریشہ کے چہرے پر بڑی بھرپور قسم کی مسکراہٹ تھی۔ ”نہیں! بیٹا! ابھی کلوننگ کروا کر آ رہا ہوں.....“ بابا کے چہرے پر صدیوں کی تھکن جب



دریشہ کی ساعتوں سے ٹکرائی۔ دریشہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کوئی ضرورت نہیں، وہ ابھی بہت تھکے ہوئے ہیں۔ ان کو شاور لے کر آرام کرنے دیں۔ جب وہ اٹھ جائیں تب مل لیجئے گا۔“ اہتاج کے لہجے میں ہلکی سی خفگی تھی۔

”لیکن کیوں.....؟ مجھے ان سے ابھی ملنا ہے، وہ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے۔“ اس کا انداز بھی دو ٹوک تھا۔ اہتاج نے اس کا سر دلچہ اور ضدی انداز غور سے دیکھا تھا۔ وہ ہلکا سا جھنجھلایا تھا۔ ”یہ کیا بچکانہ پن ہے دریشہ، جب میں کہہ رہا ہوں کہ وہ خاصے تھکے ہوئے ہیں اور زیادہ سوال جواب کی پوزیشن میں نہیں، تو آپ میری بات کیوں نہیں مان رہیں.....“

”میرا تعلق کون سا خفیہ ایجنسیوں سے ہے جو میں ان سے سوال جواب کروں گی۔ اب کیا میں اپنے باپ سے بھی نہیں مل سکتی.....“ اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ تھی، اس نے شکوہ کنناں نظروں سے اسے دیکھا۔ اہتاج کو وہ کچھ خفا خفا سی لگی تھی، لیکن وہ اس کی ناراضگی کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

”میں کون سا ان کا یا آپ کا دشمن ہوں۔ ان کے فائدے کے لئے ہی کہہ رہا تھا۔ وہ کئی راتوں کے جاگے ہوئے ہیں۔“ وہ بھی لائق کا انداز لئے غصے میں بولا تھا۔

”وہ کئی راتوں سے کیوں نہیں سو سکے، یہی بات تو میں پوچھنا چاہ رہی ہوں.....“ وہ ایک دم ہی پریشان ہو گئی تھی، لیکن اس کی نگاہوں میں موجود ناراضگی اور خفگی کی لہر اس سے پوشیدہ نہیں تھیں۔ اس لئے وہ تھوڑا سا نرم ہوئی۔

”ادھر آئیں میں بتاتا ہوں.....“ اس نے لاشعوری طور پر اس کا بازو پکڑا تھا۔ دریشہ کے دل میں عجیب سی پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا، وہ کب اس کے ساتھ سامنے والے کمرے میں آ گئی تھی۔ اہتاج کو ایک دم ہی خیال آیا تھا۔ اس نے گڑ بڑا کر اس کا بازو چھوڑا تھا۔ وہ اسے اماں کے کمرے میں لے آیا تھا۔ وہ اب کھڑکیاں کھول کر پردے پیچھے کر رہا تھا۔ دریشہ سامنے پڑی کرسی پر بڑے محتاط انداز میں بیٹھ گئی تھی۔ جبکہ وہ اب دروازے میں کھڑا ہو کر کسی ملازمہ کو کھانا مہمان خانے میں بھیجنے کی ہدایات دے رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے سیل فون پر نشی صاحب کو کچھ فائلیں لانے کو کہا تھا۔ دریشہ حد درجہ بے چین تھی۔ اس کا دل عجیب ہی قسم کے سنسنزدہ رہا تھا۔

”آپ بتا کیوں نہیں دیتے، یہ سب کام بعد میں کر لیجئے گا.....“ وہ اسے ایک اور نمبر

ملاتے دیکھ کر جھنجھلائی تھی۔

”محترمہ میں پچھلے پندرہ دن سے چھٹی پر ہوں، میری ایک منہمی سی جان پر ڈھیروں ذمے داریوں کا بوجھ ہے۔ اتنے بڑے شہر کی انتظامی مصروفیات کم نہیں ہوتیں.....“ وہ پرسکون انداز میں اسے کہہ کر ایک دفعہ پھر اپنے سیل فون کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ دوسری طرف شاید آواز نہیں جا رہی تھی۔ اس لئے اس نے ہیلو ہیلو کی گردان ختم کر کے فون ہی بند کر دیا تھا۔ دریشہ کو پہلی دفعہ خراب میٹ ورک اتنا برا نہیں لگا تھا۔ اس نے سکون کا سانس لیا کیونکہ وہ اب سامنے والی کرسی سنبھال چکا تھا۔

”مجھ سے کیوں ناراض ہیں آپ.....“ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بڑے اطمینان سے پوچھ رہا تھا۔

”میں آپ سے ناراض نہیں ہوں، مجھے صرف بابا کی ٹینشن ہے.....“ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔

”اتنے دن سے بابا یاد نہیں تھے آج دیکھتے ہی ساری پریشانی اٹھ آئی ہے.....“ وہ ہلکے پھلکے انداز سے کہہ رہا تھا۔

”آپ کو زیادہ پتا ہے ناں.....“ اس کو ایک دم غصہ آیا۔

”مجھ سے زیادہ کسی کو پتا بھی نہیں ہو سکتا.....“ اس کا معنی خیز انداز دریشہ کو اس وقت کوفت میں مبتلا کر رہا تھا۔ ”آپ بتائیں گے یا میں بابا کے پاس جاؤں.....“ اس نے دھمکی دی۔

”زیادہ دھمکیاں نہ دیں، ان سے بات اگلوانا بھی اتنا آسان نہیں.....“ اس نے صاف چڑایا تھا۔ دریشہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ اس کی غم آنکھیں دیکھ کر بوکھلا گیا۔ ”اُس اوکے“ میں بتاتا ہوں آپ آنکھیں صاف کریں فوراً.....“ اس کے حکم بھرے انداز پر دریشہ نے سر جھکا کر بازو کی پشت سے آنکھوں کو باقاعدہ رگڑا تھا۔

”اصل میں آپ کے بابا اٹھنا نہیں گئے تھے۔ وہ یہیں تھے اور مختلف قسم کی انکوائریاں بھگت رہے تھے۔ اصل میں جب ان کو اپنی فیکٹی کا ڈین بتایا گیا تھا تو یہ بات یونیورسٹی کی کچھ گندی مچیلیوں کو پسند نہیں آئی اور ان کے خلاف باقاعدہ ایک منظم انداز سے مہم کا آغاز کر دیا گیا.....“ وہ بہت اطمینان سے بتا رہا تھا۔ دریشہ نے حواس باختہ انداز میں اسے دیکھا جو کہہ رہا

”آپ کو علم ہوگا کہ آپ کے بابا کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جن کو اسٹوڈنٹس اپنا آئیڈیل مانتے ہیں۔ ایک دنیا ان سے متاثر ہے اور جس شخص کو اتنا زیادہ سراہا جاتا ہو وہاں کچھ پروڈنشل جیسی رکھنے والے لوگ حسد کی آگ میں جلتے ہوئے بہت گھٹیا قسم کے ہتھکنڈوں پر اتر آتے ہیں۔ پروفیسر صاحب کو پہلے دھمکایا گیا کہ وہ ڈین بننے سے خود ہی انکار کر دیں۔ جب وہ نہیں مانے تو اس گروپ نے ایک اور وار کیا۔“ وریشہ کا دل کچھ اور بے چین ہوا۔ اس کے چہرے سے ہوائیاں اڑنے لگیں۔

”انہوں نے ایک اسٹوڈنٹ کو مختلف قسم کی ترغیبات دے کر آمادہ کیا اور اسے اپنا مہرہ بنا کر استعمال کیا۔ اس نے پروفیسر صاحب پر ریپ کا الزام لگا کر میڈیا والوں کو بلالیا۔“

”کیا.....؟“ وریشہ کے سر پر آسمان ہی تو گرا تھا۔ وہ کچھ ساعتوں کے لئے بالکل سن سی ہو گئی۔

”ایک دفعہ تو یہ خبر الیکٹرانک میڈیا پر آ گئی تھی.....“ اجتناب کی بات پر اس کا دل بھی دھڑکنا بھول گیا تھا۔ ”اس کے بعد میں نے ارسلہ نے اور کچھ اور لوگوں نے اس خبر کو چلنے سے رکوا یا۔ آپ کے بابا کو آپ کی ٹینشن تھی کہ آپ اپنے کالج میں اپنے ساتھیوں کو کیسے فیس کریں گی اس کا حل ہمیں یہ ہی نظر آیا کہ آپ کو وہاں سے نکالا جائے۔ پروفیسر صاحب کو میں نے اپنے گھر کی آفر کی انہوں نے فوراً اپنی رضامندی ظاہر کی جس کے نتیجے میں آپ یہاں آ گئیں یہاں نہ تو کیبل تھی نہ کوئی اور ذریعہ اس وجہ سے آپ کا رابطہ باقی دنیا سے کٹ گیا۔ پروفیسر صاحب نے ارسلہ کو بھی نہیں بتایا تھا کہ آپ یہاں ہیں ان کو ڈر تھا کہ وہ کہیں جذباتی ہو کر کچھ آپ کو بتائی نہ دے۔ اتفاق سے اس پریشانی میں ارسلہ نے آپ سے بھی رابطہ نہیں کیا۔ اس کا مجھ سے مسلسل رابطہ تھا، لیکن آپ کی یہاں آمد کا اسے پروفیسر صاحب نے ہی بتایا تھا.....“

”بابا کے معاملے کا کیا بنا.....؟“ وریشہ رندگی ہوئی آواز میں بولی تھی اس کا لہجہ پریشانی کا غماز تھا۔ بابا کی ذہنی تکلیف کا سوچ کر ہی اس کا حساس سادل کٹ کر رہ گیا تھا۔

”جس طرح جھوٹ کے کوئی پاؤں نہیں ہوتے اور اسے اپنے ٹھکانے سے بہت محبت ہوتی ہے اسی طرح دھوکا فریب بھی ساری دنیا میں گھوم پھر کر اپنے ٹھکانے پر واپس آ ہی جاتا

ہے۔ اس کے مالکوں کے حصے میں پھر رسوائی اور ندامت ہی آتی ہے۔ یونیورسٹی انتظامیہ نے ایک تحقیقاتی کمیٹی بنائی، ہم نے اس لڑکی کو ہی ٹریپ کیا اس کے ضمیر کو جھنجھوڑا اس نے سارا بھانڈا کھول دیا۔ ساری گرہیں کھل گئیں۔ پروفیسر صاحب کی بے گناہی ثابت ہوئی۔ ان کے مخالفین اب جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہیں.....“ وہ سارے واقعے کی سنگینی کو حد درجہ کم کر کے مختصراً بتا رہا تھا۔

”تو جب ساری دنیا کو پتا تھا تو مجھ سے چھپانے کی کیا ضرورت تھی بابا نے اتنے تکلیف دہ دن پتا نہیں کیسے گزارے ہوں گے.....“ اس کے آنسو پھسل کر گالوں پر بہہ رہے تھے۔

”آپ نے ان تکلیف دہ دنوں میں یہی کچھ کرنا تھا جو آپ اب کر رہی ہیں.....“ وہ ٹٹو اس کی طرف بڑھاتے ہوئے شرارتی انداز میں بولا تھا۔ ”اصل میں آپ کے بابا کو آپ سے بہت محبت ہے وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ ان کی لاڈلی اس تکلیف سے گزرے جس سے وہ پورے پچیس دن گزرے تھے۔“

”اب کون سا نہیں ہو رہی.....“ اس نے ٹٹو سے آنکھیں صاف کیں۔ اس کا لہجہ ابھی بھی نمی لئے ہوئے تھا۔

”اب تو کچھ گھنٹوں کی تکلیف ہے۔ آپ نے تو پچھلے پچیس دنوں میں ٹینشن سے فوت ہی ہو جانا تھا پھر میرا کیا بنتا.....؟“ اس کی آنکھوں میں شرارت جگمگا رہی تھی۔

”پھر آپ کسی اور لڑکی کو ایسے ہی بیٹھا کر پٹا رہے ہوتے.....“ وہ غم آنکھوں سے مسکرائی تھی۔ اجتناب کو اس لمحے بے شمار ستارے اس کی آنکھوں میں چمکتے دکھائی دیئے تھے۔

”استغفر اللہ میں آپ کو ایسا لگتا ہوں.....“ وہ مصنوعی تاسف بھرے انداز میں پوچھ رہا تھا۔ وہ تعجب سے یوں اس کو دیکھ رہا تھا جیسے کوئی بڑی غیر معمولی بات سنی ہو۔

”جی ہاں اس سے بھی زیادہ بڑھ کر لگتے ہیں جتنا کہ آپ سوچ رہے ہیں.....“ وہ بھی متبسم انداز سے بولی تھی۔

”اوہ اس کا مطلب ہے کہ میں بہت خوش قسمت ہوں جو ایک خوبصورت لڑکی کو اتنا ”اچھا“ لگتا ہوں واہ میرے مولا جب بھی دیتا ہے چھپڑ پھاڑ کر دیتا ہے.....“ اس کے چہرے پر پھیلی حیرانی اور بھلاہٹ پر اجتناب کا انتہائی جاندار اور محظوظ کن قہقہہ گونجا تھا۔

”بہت خوش فہم ہیں آپ.....!“ وہ تھوڑا سا سنبھل کر بولی تھی۔

”جناب ” غلط فہمی“ سے تو ”خوش فہمی“ پھر بھی بہتر ہوتی ہے۔ کم از کم بندے کو خوش تو رکھتی ہے۔ ہم تو دیے بھی عوام کی خدمت کے لئے اپنی زندگی متعین کر چکے ہیں۔ عوام ہمیں پسند کرتی ہے، بس اسی خوش فہمی سے زندگی کو جینے کے لئے ایک مضبوط جواز مل جائے گا۔“ وہ دلفریبی سے مسکرایا اور اس کے بالکل قریب کھڑا ہو گیا۔

”یہ ”عوام“ کس کو کہا ہے آپ نے.....؟“ وہ تپ کر کھڑی ہوئی۔

”جناب کو.....!“ اس نے گردن کو خم دے کر اس کی طرف اشارہ کیا۔ وریشہ تھوڑا سا بلش ہوئی۔ ”منہ دھو کر رکھیں آپ، عوام خاصی عقلمند ہو چکی ہے۔ ایسی ”سرکار“ کو لفٹ نہیں کرواتی.....“ وہ اس کی نگاہوں کی شوخی سے گھبرا کر باہر نکلنے کی نیت سے دروازے کی طرف بڑھی۔ وہ لمحہ بھی ضائع کئے بغیر اس کے راستے میں حائل ہو گیا۔

”آپ ٹینشن نہ لیں، میرے دوٹ خاصے پکے ہیں۔ ارسلہ کو میں نے بتا دیا ہے کہ اب وہ میرے احسان کا بدلہ اتارے جو میں نے اس کی اور اشعر کی شادی کروا کر کیا تھا۔ حالانکہ اس کا ذاتی خیال ہے کہ یہ میری کمینگی ہے، لیکن پہلی دفعہ اسے میری کوئی کمینگی اتنی پسند آئی ہے کہ وہ جاپان سے اگلے ہفتے پاکستان آرہی ہے.....“

”کیا.....؟“ وریشہ کو بہت خوشگوار قسم کا جھٹکا لگا تھا۔ اس نے گھور کر اسے دیکھا اور اس کے چہرے پر پھیلی مصنوعی قسم کی مسکینیت کو دیکھ کر اسے ہنسی آ گئی۔ موسم ایک دم ہی بدلا تھا۔ سیاہ سرمئی رنگ کے سیاہ بادل بھی شرارت سے مسکرائے تھے۔ ہلکی ہلکی سی کن من سے شہوت کے پتوں کے جھونکوں سے آنے والی موجی کی دلفریب مہک نے باہر کا موسم تو مہکایا ہی تھا، لیکن اس کے دل کے موسم کو بھی خاصا معطر کر دیا تھا۔

(تمت بالخیر)